READING SECTION
Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION
Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

جلد46 • شمارہ11 • نومبر2016 • زرسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر229 کراچی74200 • فون (021)35895313 فیکس (021)35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

نکتہ چینی

عزیزان من۔۔۔۔ السلام علیکم!

یہ سال بھی اپنی رفتار سے گزر رہا ہے۔ نومبر کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ ایک قدم باقی ہے پھر ہم نئے سال میں داخل ہو جائیں گے۔ دعا ہے کہ 2017 خوشیوں اور خوش حالی کا سال ہو ورنہ اس برس پاکستان نے جو خوں ریزیاں دیکھی ہیں۔۔۔۔ وہ بہت ہی روح فرسا اور اندوہناک ہیں۔ دنیا کے کسی خطے میں انسانی لہو کی وہ ارزانی نہیں رہی جو ہمارے وطن میں تھی۔ جب ہر طرف ایسی ہوش رُبا وارداتوں کا تسلسل ہو تو دل کسی اچھی خبر کی تلاش میں بے قرار سا رہتا ہے۔ یوں تو ایک اچھی سرکاری خبر یہ ہے کہ غریب 2 فیصد کم ہو گئے۔۔۔۔ ملک معاشی بحران سے نکل گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اصل خوشی کی بات یہ ہوئی کہ آخر کار ہمارے کرکٹر کالی آندھی سے ٹکرا کر ہر شعبے میں کامیاب اور سرخ رُو رہے۔ حاسد کہتے ہیں کہ وکٹیں بے جان تھیں۔۔۔۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ دونوں ٹیموں کو پورا میچ ایک ہی وکٹ پر کھیلنا ہوتا ہے اور پھر وکٹ کی تیاری میزبان ٹیم کی مرضی پر منحصر ہوتی ہے۔ ہر میزبان ملک اپنے مطلب کی وکٹ بناتا ہے ایسے میں ہماری ٹیم انگلستان کے میدانوں میں کچھ عرصے پہلے اپنے جوہر دکھا چکی ہے۔ ریاست اور سیاست میں خوش گمانی کی راہیں مسدود ہوں تو کھیل کو ہی دل بہلانے کا سامان رہ جاتا ہے یا پھر ہماری محفل، ہمارا ماہنامہ بھی تو دل کو بہلانے کا خوب صورت ذریعہ ہے۔۔۔۔ تو چلتے ہیں اپنی چوپال میں۔۔۔۔

مظفرآباد آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان کی دل گداز یادیں ”اکتوبر کا جاسوسی بروقت ہی مل گیا، اکتوبر سے ہماری بہت سی یادیں منسوب ہیں۔ آج سے گیارہ سال قبل 2005 میں آنے والے زلزلے کے ہولناک مناظر آج بھی تازہ ہیں۔ اس زلزلے نے مجھ سے کیا کچھ چھینا، اس سے قطع نظر ہم آج بھی اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں ہمیں اس زلزلے نے چھوڑا تھا۔ جلد بحالی کے دعوے ہمیشہ سے کھوکھلے ثابت ہوتے آرہے ہیں۔ 8 اکتوبر کو بس ریلیاں نکالی جاتی ہیں، شہدا کی یاد میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔ دھواں دھار تقریریں کی جاتی ہیں اور بس۔۔۔۔ رات گئی بات گئی۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اس دھرتی پہ فاروق اعظم جیسا حکمران اتارے، آمین۔ کافی عرصہ محفل میں حاضری نہیں لگا سکا۔ سوشل میڈیا پر جے ڈی پی گروپ میں بہت سے قارئین واحباب سے بات ہوتی رہتی ہے وہ جانتے ہیں چند نامساعد حالات نے اس محفل سے دور رکھا البتہ جاسوسی و سسپنس سے رشتہ کبھی نہیں ٹوٹا، انہی دوستوں کی ایما پر آج ایک بار پھر حاضر ہونے کی گستاخی کر رہا ہوں۔ ٹائٹل اس بار کچھ سوگوار سا لگا، ٹائٹل گرل بھارتی اداکارہ کترینہ کیف کی ہم شکل تھی۔ اسپتال کا منظر، ٹوٹے ہوئے شیشے، پستول، جاسوسی کے عین مطابق۔ ایک عرصے بعد پڑھنے کا من کیا سو اشتہارات میں من خراب نہ کرتے ہوئے چینی نکتہ چینی کی محفل میں بھی سرسری جھانکنے پر اکتفا کیا اور خطوط پر تبصرے کو آئندہ کے لیے چھوڑتے ہوئے سیدھا سلسلے وار ناول پر پہنچا۔ آوارہ گرد حسبِ معمول انتہائی فاسٹ اور دلچسپ رہی، کلی سنجارد اور وحشی قبائل سے ٹکراؤ اب نجانے شہزی کو مہنگا پڑے گا یا سستا یہ اگلی قسط ہی بتا سکتی ہے۔ شہزی جہاں اپنے دشمنوں میں اضافہ کرتا جا رہا ہے وہاں اس کے بہی خواہ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ سوشیلا کا بار بار اللہ کا نام لینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ بھٹی صاحب اسے کلمہ پڑھا کر ہی چھوڑیں گے، اگر ایسا ہو جائے تو ڈاکٹر صاحب ایک اچھا تاثر قائم کرنے میں کامیاب ٹھہریں گے۔ انگارے، طاہر جاوید مغل کی تعریف میرے بس سے، قلم کی اوقات نہیں۔ شاہ زیب کو سیف خان عرف سیفی کا ملاپ مستقبل میں ایک اچھا شگون ثابت ہوگا۔ شاہ زیب اگر سیف خان کو بروناتی اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ اس کے لیے بہت بہتر رہے گا، خیر۔۔۔۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ عشق زہرناک، احمد اقبال کسی تعریف کے محتاج نہیں۔ فہرست میں ان کا نام پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ایسا سحر طاری کیا کہ پورا رنگ پڑھ کر ہی کر سید ہی کی۔ عشق کے بہت سے رنگ دیکھنے میں آئے۔ عشق واقعی زہرناک ہے اور ہر عاشق یہ زہر کتنی آسانی سے ہنستے مسکراتے پی جاتا ہے۔ رشید اور رانی، کا عشق لیلیٰ مجنوں جیسا لگا۔ دولت کی سولی، سلیم فاروقی اگر مختصر تحریریں لکھیں تو بہت کامیاب ٹھہریں گے۔ رنگ میں کوئی رنگ نہیں جما سکے۔ ان کی کہانیوں میں جابجا اتفاقات کہانی کا حسن گہنا دیتے ہیں اور قاری کو الجھن ہو جاتی ہے۔ زیرِ نشتر، امجد رئیس کو ترجمہ کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔ انتہائی سنسنی خیز اور بہترین کاوش، بہترین منظر کشی، اس ماہ کی ٹاپ اسٹوری رہی۔ مختصر کہانیوں میں مظلوم عاشق ہلکی پھلکی تحریر رہی اور سبق آموز بھی۔ انوکھا کاروبار، جرائم پیشہ افراد کے گرد گھومتی تحریر تقریباً اچھی رہی۔ سپرمین نسبتاً اچھی، ادھوری خواہش لکھنے والے نئے رائٹر ہیں مگر شگفتہ پیرائے میں بہترین کہانی لکھی۔“

ڈسٹرکٹ جیل اٹک سے اسرار ساقی کی خوش امیدی ”اس ماہ کا شمارہ 5 تاریخ کو بطور تحفہ پیارے دوست نصیر خان نے دیا، دوست کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فوراً سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی۔ حسبِ روایت ذاکر صاحب کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس کے بعد آئے اداریے کی طرف۔ سعودی سرکار کی جتنی بھی بے عزتی کی جائے اتنی کم ہے جس طرح وہ لوگ ہمارے ملک کے وزیرِ اعظم کے سر کی قیمت رکھتے ہیں ان کے اپنے وزیرِ اعظم کی قیمت دو کوڑی بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے پیارے ملک پاکستان کی حفاظت فرمائے، آمین۔ اس کے بعد آئے اپنے دوستوں کی محفل میں جہاں پر کراچی سے بھائی محمد اقبال صاحب پُراثر تبصرہ کرتے نظر آئے، جناب کا ذوق بہت اعلیٰ ہے۔ مرحا گل صاحبہ تعریف کا شکریہ آپ بھی کمال لکھتی ہیں۔ آپ سے سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو بھی صحت والی زندگی عطا فرمائے، آمین۔ لاہور سے۔۔۔ عبدالجبار رومی انصاری اچھا تبصرہ کرتے نظر آئے تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ یہ کھاریاں سے میرے تینوں بھائی عباس برادران تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر تھے اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و

تندرستی عطا فرمائے۔ دعاؤں کے لیے شکریہ۔ میں اپنے بارے میں آپ سمیت تمام قارئین کو بھی بتاؤں گا کہ جیل واقعی اچھی جگہ نہیں ہے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ سے شکوہ ہے کہ ہمارا تبصرہ آپ پڑھتی نہیں ہیں یا کوئی اور بات ہے، آپ واحد تبصرہ نگار ہیں جو کھل کر سچے دل سے تعریف یا تنقید کرتی ہیں، ہمیں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ آپ کا اپنا تبصرہ ہمیشہ سے شاندار رہا ہے اس کے علاوہ رانا بشیر ایاز، احسن زمان، شفقت محمود، ادریس احمد خان کے عمدہ تبصرے تھے۔ کراچی سے ہی حرا افتخار کافی اچھا تبصرہ نے کر محفل میں رنگ جما رہی تھیں۔ رضوان تنولی، بلقیس خان، چودھری سرفراز، مشال نوال، نادر سیال، سجاد خان آپ سب لوگ جلدی سے محفل میں انٹری دیں ورنہ آپ پر ہوگا جرمانہ، اس بار میرے محترم بھائی صفدر معاویہ غیر حاضر تھے۔ ان کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے اپنی پسندیدہ کہانی انگارے پڑھی۔ طاہر جاوید مغل دی گریٹ، بہت عمدہ کہانی لکھی ہے۔ ہر کردار کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے، مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سجاول نے واقعی دلہن ہو کر بھی ہیرو والا کام کر دکھایا۔ شاہ زیب صاحب بھی ایکشن میں نظر آئے۔ بڑے صاحب کی نظر میں ان کی عزت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس دفعہ شاہ زیب کا تاجور کے گاؤں جا کر بھی تاجور سے بات نہ کرنا ذرا اچھا نہیں لگا۔ باقی پتا نہیں شاہ زیب نے کس کی تصویر دیکھ لی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی۔ عبدالرب بھٹی نے بھی کمال کر دکھایا۔ شہزادہ عرف شہزی بہت تیزی کے ساتھ اپنے دشمنوں پر بجلی بن کر برس رہا ہے۔ سی جی بھجوانی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اب آگے کی صورتِ حال بڑی خطرناک نظر آ رہی ہے۔ ابتدائی صفحات پر زیرِ نشتر اچھی کہانی تھی، موضوع زبردست تھا۔ منظر امام کی مظلوم عاشق، سہیل نے اقرارِ محبت میں دیر کر دی حالانکہ نمرہ پہلے بھی اشارہ دے چکی تھی۔ میرے خیال میں کہانی کا نام مظلوم عاشق کے بجائے ڈرپوک عاشق ہونا چاہیے تھا۔ دیگر کہانیوں میں خدشہ، معقول معاوضہ، سپرمین اچھی کہانیاں تھیں۔ اینڈ کی دونوں کہانیاں بہترین تھیں۔“

فیصل آباد سے سیف الرؤف اور شعیب الرؤف کی یوریت ”پچھلے ماہ کی غیر حاضری کے بعد اس ماہ پھر حاضر ہوں۔ اپنے پیارے راج دلارے جاسوسی کا انتظار اس قدر تھا کہ یکم اکتوبر سے ہی اخبار فروش کے پاس صبح شام چکر لگانے شروع کر دیے۔ ہر بار انکار میں جواب ملتا اور میں پاؤں پٹختا واپسی کی راہ لیتا۔ صورتِ حال یہ ہو چلی تھی کہ میری صورت دور سے دیکھتے ہی وہ نفی میں سر ہلانے لگتا اور میں غصے سے تلملاتا لوٹ آتا۔ بالآخر 4 اکتوبر کی روشن نکھری صبح میں جاسوسی ہاتھ آیا۔ خوشی سے اچھلتے کودتے واپسی کے سفر میں ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی مجھے بریکیں لگ گئے۔ ارے یہ کیا.... ٹائٹل گرل افسردہ سی صورت بنائے الٹی لٹک رہی تھی۔ ایک آدمی چھت پر لیٹ کر نیچے جھانک رہا تھا اور ایک پسٹل والا ہاتھ شاید دیواروں پر کا کروچ مار رہا تھا۔ ہم تو دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملنے لگے اور دوبارہ غور سے ٹائٹل کی جانب دیکھا تو علم ہوا کہ ڈائجسٹ الٹا پکڑ رکھا ہے۔ سیدھا کیا تو ٹائٹل جینیئہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آئی اور چھت سے جھانکنے والا آدمی آرام کی گولی کھا کر ہمیشہ کی نیند سو رہا تھا۔ کہانیوں کی فہرست پر نظر دوڑاتے چینی گلی چکنی میں انٹری دی۔ نریندر مودی کو دی گئی وارننگ پوری قوم کے جذبات کی ترجمان ہے۔ اب بھی وقت ہے مودی! سنبھل جاؤ! ورنہ پچھتاؤ گے۔ ابتدائی تبصرے پر محمد اقبال آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ بہت مبارک۔ رانا بشیر کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ رانا صاحب! میں طویل عرصے بعد کہاں سے آیا وہ تو میرا پہلا تبصرہ تھا۔ مرحا گل عجیب ہی گل کھلا رہی تھیں۔ عبدالجبار کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ سجاد احمد، حرا افتخار، محمد احسن اور عمران خان کے تبصرے بھی خوب تھے۔ خان صاحب! آپ میاں صاحب پر کچھ رحم کریں۔ پھولوں اور باغوں کے شہر پشاور سے طاہرہ آنٹی آگ برساتی نظر آئیں۔ طاہرہ آنٹی کا تبصرہ پڑھ کر مجھے اپنے محلے کی ایک بوڑھی خاتون یاد آ گئیں جنہیں اہلِ محلہ احتراماً نانی جی کہتے تھے لیکن ان کا بی پی ہر وقت ہائی رہتا تھا۔ طاہرہ آنٹی ابھی کی عمر کی ہیں، ہم سب جاسوس ان کا بھی ویسے ہی احترام کرتے ہیں اس لیے ان سے گزارش کرتے ہیں کہ خوامخواہ اپنا بی پی ہائی نہ رکھا کریں، ابھی تو ہم نے آپ کے بہتر سے بہتر رنگ برنگے تبصرے پڑھنے ہیں۔ کہانیوں کا آغاز انگارے سے کیا۔ مغل صاحب پڑھنے والے کو اپنی کہانی میں اس قدر محو کر دیتے ہیں کہ اردگرد کا کوئی ہوش ہی نہیں رہتا۔ شاہ زیب اگر تاجور کے سامنے چلا جاتا تو اچھا ہی ہوتا، بے چارہ اب پچھتا رہا ہوگا۔ رضوان ٹی کی رسوائی دیکھ کر دل افسوس سے بھر گیا۔ امید ہے ڈاکٹر ارم کی موت کے بعد وہ اپنی مردانگی کا بھرم رکھ لے گا۔ بھٹی صاحب کی آوارہ گرد میں شہزی آوارہ گردیاں کرتا نظر آیا۔ سی جی بھجوانی کی اتنی آسان موت ہضم نہیں ہوئی۔ خدشہ ہے کہ اگلی اقساط میں اس کی واپسی ضرور ہوگی۔ احمد رئیس کی زیرِ نشتر بھی تجسس سے بھرپور تھی۔ سرورق کے دونوں رنگوں نے بہت بور کیا۔ کبیر عباسی اور رزدیا اعجاز کی جانب سے مزید تحریروں کا انتظار ہے۔ فاروق انجم کو بھی اس بار بہت مس کیا۔“

کھاریاں سے بابر عباس کی رام کتھا ”سرجی، جاسوسی کا اکتوبر کا شمارہ 19 اکتوبر کو بڑے جاں گسل انتظار کے بعد ملا۔ اس بار ویسے بھی جاسوسی کا کچھ زیادہ ہی انتظار تھا کیونکہ دو سال بعد خط جو لکھا تھا۔ اس بار پہلے تبصرے پر محمد اقبال صاحب آف کراچی براجمان تھے۔ اپنا خط محفل میں پا کر مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی کہ فواد خان کو اپنی پہلی ہٹ فلم پر ہوئی ہوگی مگر یہ کیا آپ نے میرے خط کا وہ حال کیا ہے جو کہ پاکستانی کرکٹ ٹیم نے ویسٹ انڈیز کا کیا ہے۔ سر آپ سے یہ امید نہ تھی (رکھنی چاہیے تھی) دوسرے نمبر پر رانا بشیر احمد ایاز کا خط تھا بھیا جی یہ خط شاید آپ نے غنودگی کی حالت میں لکھا ہے کیونکہ خط میں زیادہ تر بونگیاں ہی بونگیاں تھیں، ایک طرف تو آپ طاہرہ گلزار کو آنٹی کے بجائے باجی کہہ رہے ہیں یعنی اسکوپ بھی رکھ رہے ہیں دوسری طرف آپ شعیب الرؤف، شکیل کاظمی اور ماہ تاب گل رانا کے وارنٹ بھی نکال رہے ہیں، کیا آپ پولیس میں ہیں اگر پولیس میں ہیں تو پھر مجھے بھی ڈرنا چاہیے کیونکہ میں نے بھی دو سال بعد حاضری دی ہے۔ مرحا گل پہلے تو آپ یہ وضاحت کر دیں کہ آپ کیا ہیں اور کیوں ہیں؟ میرا مطلب یہ ہے کہ کس نام سے پکاروں کیا نام ہے تمہارا۔ خط پڑھتے ہی کیوں ہوش کھو گیا ہمارا۔ باقی سرجی کو زیادہ مکھن نہ لگاؤ ورنہ وہ پھسل پھسل جائیں گے۔ (ہم بابر عباس نہیں ہیں) عبدالجبار رومی بھائی بلقیس خان پتا نہیں ذہین ہیں کہ نہیں آپ ویسے بڑے ذہین ہیں کیونکہ آپ کا تعلق لاہور سے ہے۔ باقی آپ کا کہنا صحیح ہے کوئی کسی کو یاد نہیں رکھتا۔ میں نے دو تین سال سے خط نہیں لکھا تھا کسی نے یاد نہیں کیا۔ سجاد احمد ساحر خوش آمدید ہم آپ کو اپنی خوب صورت محفل میں ویلکم کہتے ہیں، چلیں آپ بھی اپنے تیر چلائیں، ہم بھی تو دیکھیں آپ کو ... تیر چلاتے ہیں۔ ادریس احمد خان بھائی کیا حال ہے آپ کا، کیسی گزر رہی ہے۔ محفل میں

آپ کا مختصر ساخط دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی باقی وہ وقت بہت اچھا تھا جب سارے پرانے دوست محفل میں اکٹھا ہوا کرتے تھے۔ تنویر عباس بابر، رمضان پاشا، نورین خاکوانی، سعدیہ ہما شیخ، اریبہ بخاری، اعجاز احمد راحیل، سعدیہ بخاری، قیصر اقبال کچھ، ہمایوں سعید اب تو سب ایویں ہی ہیں۔ کہانیوں میں حسب معمول، حسب دستور طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے پڑھی۔ اس میں کوئی شک نہیں وہ جب بھی لکھتے ہیں کمال کا لکھتے ہیں۔ انگارے بڑے خوب صورت انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ طاہر جاوید صاحب یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی آوارہ گرد کو بڑے خوب صورت انداز میں اور زبردست طریقے سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جب بھی لکھا کیا خوب لکھا۔ پہلا رنگ سلیم فاروقی کا دولت کی سولی اپنی تیز رفتاری اور فل ایکشن کے ساتھ زبردست رہی۔ شروع سے لے کر آخر تک ایکشن، دولت کی سولی کا اینڈ بڑا چونکا دینے والا تھا۔ ملک کا کردار یک دم سامنے آیا شاک سا لگا۔ دوسرا رنگ اپنے انداز کے ایک خوب صورت لکھاری اور جاسوسی کے معتبر نام سب کی جان اور 90 سال کی عمر میں بھی جوان۔ عزت مآب احمد اقبال کا عشق زہرناک۔ عشق کے کئی رنگ ہیں اور ہر رنگ اپنی جگہ خوب صورت ہے اور یہی عشق اگر منفی صورت اختیار کر جائے تو عشق زہرناک بن جاتا ہے۔ احمد اقبال کی یہی خاصیت ہے وہ جب بھی لکھتے ہیں زبردست لکھتے ہیں۔ اس بار جاسوسی کے پہلے صفحات کو امجد رئیس نے سنبھال رکھا ہے اور حسب روایت اور حسب دستور خوب سنبھالا۔ امجد رئیس کی تحریر کردہ زیرِ نشتر گو کہ مغرب سے درآمد شدہ تھی مگر خوب تھی۔ محمد یاسر اعوان کی ادھوری خواہش، حسنین رضا کی معقول معاوضہ، منظر امام کی مظلوم عاشق، تنویر ریاض کی انوکھا کاروبار، سلیم انور کی خدشہ، عکس فاطمہ کی دوسرا طریقہ اچھی تحریریں تھیں۔ اور آخر میں سرور اکرام کی سپر مین بہت اچھی اور خوب صورت تحریر تھی بہت اچھے سرور اکرام صاحب۔"

میانوالی سے احسان سحر کی بے قراری وادای ”آخر کار بے رحم اور بدصورت مصروفیت کی بانہوں سے خود کو آزاد کر ہی لیا، وہی مصروفیت جس نے پچھلے دو ماہ سے بانہوں میں جکڑ رکھا تھا۔ میں خوشگوار ہار بن کر دل میں تو قید رہ سکتا ہوں لیکن مصروفیت میں جکڑے رہنا مجھے پسند نہیں۔ جاسوسی کافی لیٹ ملا۔ اس دفعہ ٹائٹل دیکھ کر بھی موڈ پر خوشگوار اثر نہیں پڑا۔ بعض لمحے انسان کو بہت بے بس کر دیتے ہیں۔ ایسی حالت کچھ ہماری بھی تھی۔ (دل کی راہداریوں میں افسردہ کیوں گھوم رہے تھے؟) محفل رونق میں پہنچے، جہاں روز بروز رونق کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ وجہ یہاں بھی پاکستان کی طرح کچھ لوگوں میں غرور و تکبر بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ بھی دوسروں کو خوش کرنے کی خاطر حدیں پار کر رہے ہیں۔ اللہ بچائے ایسے لوگوں سے۔ محمد اقبال صاحب اس دفعہ وزآف دی منتھ رہے۔ وقت کا کام ہی ہے گزرتے جانا رکنا اس کی فطرت نہیں۔ رانا بشیر احمد ایاز نے اپنے نام کی طرح طویل اور اچھا تبصرہ کیا۔ ہر جا گل کی امیر حمزہ نے خوب لطف دوبالا کیا۔ کھاریاں سے بابر عباس، اللہ پاک سے دعا ہے کہ آپ کی آنکھیں اور آنکھوں کا نور ہمیشہ سلامت رکھے۔ دو سال بعد آئے اور خوب برسے۔ کمال کر دیا۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے اچھے رہے۔ ڈھلتے ہوئے دن سے دھوپ آہستہ آہستہ جدا ہو رہی ہے۔ جاتا ہر کوئی واپس آنے کے لیے ہے جب کوئی واپس نہ آنے کے لیے جائے تو تب تکلیف ہوتی ہے۔ مختار آزاد کے لیے دل سے دعائیں نکلتی رہیں گی۔ پہلی کاوش سے آغاز کیا جس نے ابتدا ہی سے اپنے وجود میں جکڑ لیا۔ سسپنس، تل واقعات نے ایسا متاثر اور شاد کیا کہ ناول پڑھ ہی ڈالا بیٹھے بیٹھے۔ ڈاکٹر گائے اور سوزن آخر میں مطلوب افراد نکلے۔ کیٹ کی بہادری اور جرأت پسند آئی، بہت خوب۔ مظلوم عاشق، بزدل اور ارادوں کے کچے انسان زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ایسا کچھ یہاں بھی پڑھنے کو ملا۔ انوکھا کاروبار واقعی انوکھا ہی رہا۔ نیا پڑھنے کو ملا۔ چوروں سے ہیروں کو اسمگل کرنا حیرت انگیز لگا۔ خدشہ میں ڈرین بورڈ پر نظر ڈال کر کچھ پڑھ لیتا تو مار نہ کھاتا۔ کبھی کبھی جو کام کرنے جاؤ وہ نہیں ہوتا۔۔۔۔ یعنی مارنے جاؤ اور خود مر جاؤ۔ انگارے کافی ایکشن اور سسپنس تل تسلط رہی۔ سجاول نے پہلی دفعہ کوئی کارنامہ کر دکھایا۔ قادر خان کا انجام بھی برا ہوا۔ طبیعت کے بوجھل پن کی وجہ سے صرف اتنا ہی پڑھ پایا ہوں، زندگی دل میں دھڑکن بن کر دھڑکتی رہی تو اگلے ماہ حاضر ہوں گے۔“ (انشاء اللہ آپ کے مکتوب کا انتظار رہے گا)

نادلیانوالہ سے اے زیڈ وصلی کا مکتوب ”اکتوبر کے شمارے کے لیے بک اسٹال پر بار بار سرجیکل اسٹرائک کیے مگر جاسوسی کا دیدار سات اکتوبر کی ایک خوب صورت شام کو ہوا۔ ٹائٹل اس مرتبہ منفرد اور شاندار تھا۔ گالوں پر سرخی سجائے حسینہ معصوم حسن کی عمدہ تصویر نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف طاہرہ گلزار کا زنانہ ہاتھ پستول لیے ہمارے جیسے معصوم مریض پر فائرنگ کے لیے تیار تھا۔ مدیر اعلیٰ نے اداریہ میں مودی کو موذی قرار دیا جو کہ بالکل درست ہے۔ ڈرائنگ سیٹ پر محمد اقبال شاندار تبصرے کے ساتھ موجود تھے، مبارک باد۔ ہر جا گل کی داستان اتنی لمبی تھی کہ پڑھی ہی نہیں گئی۔ عباس بھٹی زیادہ شوگر کی وجہ سے آؤٹ آف کنٹرول لگ رہی تھی اور سب پر برس رہی تھی۔ انسولین کا استعمال ضروری ہے۔ ہمارے استاد شفقت محمود کا تبصرہ شاندار تھا۔ سجاد احمد ساحر کی پہلی انٹری پسند آئی۔ احسن زمان کے والد صاحب کی وفات کا شدید افسوس ہوا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ طاہرہ گلزار جلے کٹے تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ رانا بشیر احمد ایاز، عبدالجبار روی انصاری اور حرا حنا، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ کہانیوں میں حسب معمول انگارے سے آغاز کیا۔ قسط شاندار تھی۔ گاؤں والے سین میں مغل صاحب کی شاندار منظر نگاری نے دل کو چھو لیا۔ دیکھتے ہیں سیفی کا کردار کیا گل کھلاتا ہے۔ آوارہ گرد میں خضری کا کے کی آوارہ گردی جاری ہے۔ کہانی میں مزاح اور رومانس کی شدید کمی محسوس ہو رہی ہے۔ سلیم فاروقی کی کہانی پڑھ کر سوچا کہ خود پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا لیں۔ دوسرے رنگ میں احمد اقبال صاحب نے جدید معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو بیان کیا۔ رانی کا کردار عجیب لگا۔ اولین صفحات پر امجد رئیس کی زیرِ نشتر کہانی آف دی منتھ ٹھہری۔ اتنا شاندار ناول تھا کہ اس کی تعریف کے لیے علیحدہ خط کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مظلوم عاشق میں کھیل کو کتری کا احساس لے ڈوبا۔ سپر مین کچھ خاص نہیں لگی۔ معقول معاوضہ اور ادھوری خواہش بہترین کہانیاں تھیں۔ مجموعی طور پر اکتوبر کا شمارہ زبردست رہا۔“

نامعلوم جگہ سے بے نام خط ”3 تاریخ کی سرمئی شام کو تھیکی وغیر یقینی صورتِ حال کے گرداب میں غوطہ زن بک اسٹال کی طرف رواں دواں تھا، غالب امکان یہی تھا کہ ابھی تک جاسوسی مارکیٹ میں نہیں آیا ہوگا۔ لیکن جونہی شاپ پر پہنچا تو شاپ کیپر نے انتہائی پھرتی سے جاسوسی نکال کر میرے آگے رکھ دیا۔ ٹائٹل انتہائی زبردست تھا، البتہ مظلوم آدمی کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا۔ امید ہے سردیوں کے موسم کی مناسبت سے

ٹائٹل خوشنما نظر آئے گا۔ اداریہ کافی جاندار تھا، بہت پہلے سنا/پڑھا ہے کہ مودی کا صفائی نام مودی پڑ رہا تھا جب یہ گندی نالی کا مودی کیز گجرات صوبے کا وزیر اعلیٰ ہوا کرتا تھا۔ انڈیا کے لیے اس سے زیادہ نقصان اور شرمندگی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا وزیر اعظم مودی ہے، جہاں جاتا ہے انڈیا کے لیے شرمندگی کا باعث بن جاتا ہے، جاہلانہ حرکتوں میں اور ظلم میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ خطوط میں اس دفعہ محمد اقبال بھائی کا خط سب سے اوپر تھا۔ تین چکروں میں جاسوسی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، آپ کی ہمت پر اکیس توپوں کی سلامی۔ رانا صاحب بھی اس دفعہ جاسوسی کی تعریف میں مجموم رہے تھے اور سرور اکرم صاحب کی تحریر میں ان کو شاید منظر امام صاحب کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ مرحا کل کی داستان امیر حمزہ کافی طویل تھی، متولی کے ڈائیلاگ کی ناکام کاپی کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور کچھ نئے و پرانے تبصرہ نگاروں کو آوازیں لگا کر واپس بلا رہی تھیں۔ رومی صاحب کا تبصرہ بھی کافی جاندار تھا۔ کھاریاں سے بیمار باباجی نے اس دفعہ کافی دھماکے دار انٹری دی ہے۔ بیماری اور بڑھاپے میں یہ حال ہے تو جوانی میں تو باباجی کسی کو خاطر میں نہ لاتے ہوں گے۔ امید ہے آئندہ بھی باباجی حاضری ضرور لگائیں گے لیکن ہاتھ پیر بچا کے۔ سجاد احمد کی سحر انگیزی بھی بہت اچھی تھی۔ محمد احسن خان کا ترکی کے حالات پر تبصرہ پُراثر تھا۔ اس کے علاوہ ادریس صاحب، ماہرہ گلزار اور حرا افتخار کے نامے بھی بہت خوب تھے۔ شاہ جی خلافِ معمول اس دفعہ غائب تھے، پتا نہیں کدھر غائب تھے؟ کہانیوں میں امجد رئیس نے تو کمال کر دیا۔ زیرِ نشتر کیا کمال کی کہانی تھی۔ ایک جرم کو چھپانے کے لیے لاتعداد جرم کر کے پردہ پوشی کرنی پڑتی ہے، لیکن جرم جرم ہی ہوتا ہے جتنا بھی چھپاؤ کے آخر ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔ منظر امام کی مظلوم عاشق کے تبصرے کے لیے الفاظ نادارد ہیں۔ کاش پروفیسر صاحب نے اخلاقیات صفحہ نمبر 333 پڑھا ہوا ہوتا۔ انگارے اس دفعہ تھوڑا اینچ لے کر آئی ہے، تاجور کی جھلک نے شاہ زیب کا سیروں خون بڑھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ زیب، سیف سے دنگا کر بیٹھا ہے اور آقا جان میرے خیال میں بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہونے والا ہے۔ اس دفعہ سیف کی انٹری اور اس کے بٹوے سے برآمد ہونے والی تصویر نے کافی سنسنی پھیلائی ہوئی ہے۔ مجموعی طور پر انگارے سپرہٹ تھی۔ آوارہ گرد نے بھی کچھ کم تہلکہ نہیں مچایا ہوا۔ شہزی پورا سپرمین بنا ہوا ہے۔ بجھوانی کی موت نے اطمینان دلا دیا ہے۔ جزائر کو بارانڈیمان کے تصور نے تاریخ کے کالے پانی کی یاد دلا دی ہے۔ کافی دہشت ناک حقیقت جڑی ہوئی ہے کالے پانی کے جزائر سے۔ سرور اکرام کی سپرمین کافی فضول کہانی تھی۔ ادھوری خواہش اور معقول معاوضہ بہت مناسب کہانیاں تھیں۔ سلیم فاروقی کی دولت کی سولی بہت تیز رفتار اور بہت سے اتفاقات سے بھری ہوئی تھی لیکن انجام نہایت غیر متوقع تھا۔ احمد اقبال کی عشق زہرناک انتہائی لاجواب کہانی تھی۔ حالات، واقعات کے پس منظر کو انتہائی باریک بینی سے جائزہ لے کر پیش کرتے ہیں۔ سنجیدہ مزاح اور معنی خیز جملے بہت لاجواب ہوتے ہیں، بلاشبہ کہانی لاجواب تھی۔ پنڈ دادن خان کا ذکر کر کے پھر بھول گئے ہیں۔“

سینٹرل جیل میانوالی سے سجاد خان آف موچھ کی ذرہ نوازی ”جاسوسی 16 اکتوبر کو ملا۔ ہمیشہ کی طرح خوب صورت سرورق کے ساتھ آنکھوں میں نمی لیے خوب صورت کھوزا نرم دل حسینہ کے کیا کہنے۔ توپ نما پستول کے ہوتے ہوئے زیادہ دیر دیدار کرنا مناسب نہیں لگا۔ سرجیکل اسٹرائک کا ڈھونگ کرنے والی انڈین فورس ابھی تک اپنے زخم چاٹ رہی ہے۔ کاش ہماری فوج کی طرح ہمارے حکمران بھی دلیر ہوتے، کوئی بات نہیں جب ہمارے شیر دل جوان سرحدوں پر جاگ رہے ہیں تو انڈیا کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑے گی۔ محفل میں سب سے پہلے محمد اقبال صاحب پر نظر پڑی جو حسینہ کا ایکسرے کرتے نظر آئے۔ بادشاہو مبارکاں۔ رانا بشیر احمد ایاز صاحب کسی کو وارنٹ کی دھمکی دے رہے تھے۔ ہتھ ہولا رکھو جی۔ واہ جی واہ مرحا کل صاحبہ آپ کی تبصرہ نگاری واقعی لاجواب ہے لگتا ہے ہمیں بھی کسی کی شاگردی میں جانا پڑے گا۔ کچھ لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو ایک بار محفل میں آتے ہیں اور چھا جاتے ہیں خدا پاک آپ کو ڈھیروں خوشیاں عطا کرے، آمین۔ عبدالجبار رومی انصاری بھائی سچ کہا آپ نے جس طرح خلوص ہونا چاہیے تھا، ویسا نہیں ہے۔ ایک، دو بار غیر حاضری ہو جائے تو نام تک بھول جاتے ہیں اور جو دوستی نبھانا جانتے ہیں ان کی محفل تک رسائی نہیں ہوتی۔ بابر عباس کمیل، عباس بھائی دوستوں کی محفل پر اتنی شدید گولہ باری دیسے اگر ایک توپ کا منہ انڈیا کی طرف کر دیتے تو کیا کہنے، یہاں محفل میں پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے اور شریف لوگ ہوتے ہیں ویسے اب خود کو جوابی کارروائی کے لیے تیار رکھنا۔ دوستوں کی قدر کرنے والا ایک دوست آج کل محفل سے غیر حاضر ہے۔ لگتا ہے آلو پیاز بیچنے لگا ہے باہر جا کر تب ہی تو فرصت نہیں ہوگی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے امجد رئیس کی زیرِ نشتر پڑھی۔ آخر کار کیٹ نے قاتل تلاش کر لیا جو کہ عورت تھی اور ڈیوڈ کا پیار بھی ملا۔ منظر امام کی مظلوم عاشق مختصر مگر اچھی رہی۔ کاش سہیل نے صفحہ نمبر 333 پڑھا ہوتا۔ طاہر جاوید مغل کی انگارے پڑھی، جو اس بار سلو رہی۔ شاہ زیب تاجور کو دیکھنے گیا تاجور نے بھی دیکھا ہوتا تو مزہ آتا۔ اگلی قسط مزیدار ہو گی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد اس بار بہترین رہی، شہزی انڈیا میں قدم جما رہا ہے۔ ناناشکور جیسے آدمی مل گئے ہیں اسے اب کھل کر فائٹ کرے گا۔ بی جی بجھوانی سے جان چھوٹی۔ سلیم فاروقی کی دولت کی سولی نے اداس کیا، رومی اور فراز کے ساتھ برا ہوا۔ ہمارے معاشرے کو خراب کرنے والی پولیس کی کالی بھیڑیں ہیں۔ احمد اقبال کی عشق زہرناک نے گزارا کیا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ دوستوں کی نذر ایک شعر۔

ہم کب تجھ سے مانگتے ہیں اپنی وفاؤں کا صلہ
بس ملتے رہا کرو درد بڑھانے کے لیے۔“

رانا بشیر احمد ایاز، احسان پور ضلع رحیم یار خان سے لکھتے ہیں ”اکتوبر کا جاسوسی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اس دفعہ 4 کو ہی جلوہ گر ہو گیا۔ لمبی پلکیں سیاہ سُرخیں آنکھوں والی دوشیزہ اس دفعہ ٹائٹل کی ملکہ بنی بیٹھی تھی۔ ساتھ میں ایک پستول بدست ہاتھ کی جھلک بھی دیکھنے کو ملی۔ بستر پر پڑے خوابِ خرگوش کے مزے لیتے ہوئے بھائی صاحب کے اوپر چٹخا ہوا شیشہ اس دفعہ بالکل جاسوسانہ ماحول پیش کر رہا تھا۔ ویلڈن ذاکر انکل۔ اس دفعہ محمد اقبال کا تبصرہ عمدہ رہا، آپ کے یاد کرنے کا شکریہ۔ اس دفعہ ون ڈاؤن پوزیشن پر بادولت خود بیٹنگ کرتے نظر آئے۔ بہت اچھے رہے ہم بھی۔ مرحا کل نے کرسیِ صدارت کو پائے دان قرار دیا۔ چلو خیر تحریر مرحا کل جی۔ اچھا لکھا آپ نے۔ عبدالجبار رومی تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ لیکن تجویز تو اس

وقت ہی دیتا پڑی جب سرورق کا معیار ایویں سا ہو گیا تھا۔ باجی طاہرہ گلزار آخر کار واپس آ ہی گئیں۔ بہت ہی گرم جوش ویلکم ٹیک۔ باجی اچھے اور پیارے لوگوں کی کمی محسوس ضرور ہوتی ہے۔ کافی دلکش اور جامع تبصرہ تھا آپ کا۔ آخر کار میرے بڑے بھائی اور استاد سجاد احمد ساحر بھی اس دفعہ محفل میں تشریف لے ہی آئے۔ ست بسم اللہ۔ جی آیاں نوں۔ آپ نے تو آتے ہی مبارک باد دینے کے ساتھ کان بھی کھینچ لیے۔ مستقل لکھتے رہا کریں اور ہاں اگلی دفعہ تبصرہ دھواں دار ہونا چاہیے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے منظر امام کی مظلوم عاشق پڑھی۔ زبردست مزہ آ گیا۔ کہانی پڑھتے ہوئے ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔ پروفیسر صاحب اپنی باتوں سے جہاں سب کو سحر زدہ کر دیتے تھے انہوں نے کتاب اخلاقیات کا صفحہ نمبر 333 ہی نہیں پڑھا اور آخر میں کریانہ اسٹور کھول لیا۔ ارے بھائی کتاب تو پوری پڑھی ہوتی۔ مغل اعظم نے اس دفعہ انگارے کچھ زیادہ ہی دہکا دیے۔ رضوان کو بچانے میں انیق اور شاہ زیب کامیاب رہے۔ ڈاکٹر ارم کی موت میں ملوث لوگوں کا سراغ ملا جو فوراً ہی معدوم ہو گیا کیونکہ گارڈ وحید کو منظرِ عام سے ہی ہٹا دیا گیا ہے۔ سجاول اور انیق کے درمیان تلخ کلامی اور نوک جھوک بہت زبردست رہی۔ ویسے سجاول کو امریش پوری کا نام انیق نے کیا خوب دیا ہے۔ وڈے صاحب آخر کار انیق، سجاول اور شاہ زیب کو اپنے ساتھ بروناٹی لے جانے پر رضامند ہو گئے۔ مجموعی طور پر پوری قسط شاندار رہی۔ سرور اکرام اس دفعہ سپر مین کے روپ میں نظر آئے۔ سہیل ریلوے اسٹیشن پر آئینہ کو دیکھتے ہی پہلی نظر میں گرفتارِ محبت ہو گیا لیکن کہانی میں کچھ ایسا خاص نہیں تھا جو اسے یونیک بنا سکے۔ عظیم بھی آئینہ کا طلبگار نکلا مگر اینڈ وہی دقیانوسی اور روایتی۔ دونوں ہی اپنی جگہ محبت سے دستبردار ہونے کو تیار۔ سرور اکرام صاحب آپ اپنا اسٹائل بدل لیں۔ آوارہ گرد میں شہزی کی 6G کی اسپیڈ سے آوارہ گردیاں جاری ہیں۔ بلراج سنگھ سے جھڑپ کے بعد شہزی سی جی بھجوانی کو لے کر نکلنے میں کامیاب رہا۔ سی جی بھجوانی کو مارنے کے باوجود بھی شہزی مشکلات کے گرداب میں پھنس گیا ہے اور اب کلی منجارو کا شوشا بھی بیچ میں کود پڑا ہے۔ کہانی بہت زیادہ بور کر رہی ہے۔ کیونکہ ایک تو کہانی کا نمبر دو اتنا فاسٹ دوسرے کرداروں کی غیر حاضری اور تیسرے کلی منجارو والی فینٹسی۔ لگتا ہے ڈاکٹر صاحب ٹریک سے ہٹ گئے ہیں۔ کہانی بہت زیادہ بور کر رہی ہے۔ سرورق کے پہلے رنگ کے ساتھ سلیم فاروقی موجود تھے۔ فراز اور روبی دونوں بے گناہ پھنسے۔ شروع میں یہی لگا کہ کردار آگے کھلیں گے اور اس دفعہ کہانی پچھلی کہانیوں سے مختلف ہو گی مگر فاروقی صاحب کا ہیرو شاید کسی نفسیاتی مرض کا شکار ہے یا لوگوں کو ویسے ہی قتل کرنے کا شوق رکھتا ہے۔ وہی مار دھاڑ اور قتل و غارت گری سے لبریز کہانی پڑھ کر سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ احمد اقبال عشق زہرناک کے ساتھ جلوہ گر ہوئے اور پہلے رنگ کی ساری بوریت اور بیزاری کو گویا دس روپے والے سرف ایکسل سے دھو ڈالا۔ زبردست کردار نگاری، اچھا پلاٹ اور بہترین ڈائیلاگ۔ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔''

کراچی سے سجاد احمد ساحر کا اندازِ تحریر ''اس بار جاسوسی 14 اکتوبر کو ملا۔ اپنا نام محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی، شکریہ انکل۔ ٹائٹل کو دیکھ کر ہی دل خوش ہو گیا کیونکہ طاہرہ گلزار نے 2 فائر جھونکے لیکن سیف الرؤف پھر بھی سوتے رہے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ چانا کی گن بھی بس ایویں ہی ہے۔ کراچی سے محمد اقبال صاحب کو انتظار اور صبر کا پھل مل ہی گیا۔ وکٹری اسٹینڈ پر حکمرانی کی صورت میں۔ بہت مبارک باد قبول فرمائیں۔ سب سے پہلے امجد رئیس صاحب زیرِ نشتر کے ساتھ نظر آئے، کہانی بہت اچھی رہی۔ منظر امام مظلوم عاشق کو لے کر آئے اس بار۔ عاشق مظلوم نہیں بے وقوف اور احمق تھا، کم بخت صفحہ 333 پڑھ لیتا تو زندگی کامیاب ہو سکتی تھی لیکن قسمت۔ سہیل جیسے ناکام عاشق چھابڑی اور کریانہ کی دکان ہی چلاتے ہیں۔ تنویر ریاض الوکھا کاروبار کرتے نظر آئے۔ ریڈنے آخر کار کیس حل کر لیا اور اہم مجرم رالف نکلا جو قانون کا رکھوالا تھا۔ کھوے کے اندر ہیرے اسمگل کیے جا رہے ہیں، کیا آئیڈیا ہے سر جی۔ سلیم انور صاحب کا خدشہ صحیح تھا۔ طاہر جاوید مغل انکل نے اس بار انگارے کچھ زیادہ دہکا دیے ہیں جن کی تپش اب بروناٹی اور ملائیشیا تک جائے گی۔ اس بار ہمارے فائٹر نے زہر خورانی کا راز اگلوا لیا ابراہیم سے کہ اولاد کی زندگی کے لیے ان کو زہر دیا جا رہا ہے، سجاول نے کچھ اور اعتماد جیت لیا وڈے صاحب کا۔ آقا جان اور حلمی سے غداری کی بو آ رہی ہے۔ ہیرو ہمارا اتاجور کا دیدار کر ہی آیا۔ خوشی ہوئی۔ نگس فاطمہ کا دوسرا طریقہ حیران کن تھا۔ سادہ رین کے بجائے قاتل ہیری پوٹر نکلا، اچھی رہی کہانی۔ سپر مین سرور اکرام صاحب کی کہانی گزارہ لائق تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد نے تہلکہ مچا دیا ہے۔ شہزی نے بلراج کے ساتھ سی جی بھجوانی کو بھی ختم کر دیا۔ چلو مٹی پاؤ۔ اب شہزی کو ناناشکور کی مدد حاصل ہو گئی ہے شہزی ضرور کامیاب ہو گا۔ ویل ڈن ڈاکٹر صاحب۔ ادھوری خواہش میں یاسر اعوان نے فرینک کی خواہش پوری کر دی۔ بلائنڈ رائیڈر نے 20 ہزار ڈالر کا صحیح حق ادا کیا دیری گڈ۔ تحسین رضا کا معقول معاوضہ بھی معقول تھا۔ سلیم فاروقی صاحب حسبِ معمول مار دھاڑ، خون خرابا سے بھرپور دولت کی سولی لے کر آئے۔ حسبِ سابق ہر کہانی کی طرح اس بار بھی کہانی کے ہیرو نے دس بارہ قتل کر کے کوئی پشیمانی محسوس نہیں کی۔ سلیم فاروقی صاحب کی ہر کہانی میں صرف ہیرو کا نام تبدیل ہوتا ہے باقی وہی مار دھاڑ، قتل و غارت گری۔ احمد اقبال صاحب کی کیا تعریف کروں زہرناک تو لاجواب تھی۔ کرداروں کے ساتھ انصاف، جیل کی ہولناک سچائی۔ مجرم اور بے گناہ انسان کی مجبوریاں، شاندار کہانی رہی۔ رشید کو سچ بولنے کی سزا ملی لیکن نشاط کی صورت میں نجات دہندہ بھی ملی۔ نیلوفر کی بے وفائی کو رانی نے اپنی وفا سے دھو دیا اور پروفیسر صاحب دنیا سے جاتے جاتے ہوئے جیلر کو بھی ٹھکانے لگا گئے۔ محفلِ دوستاں میں رانا ایاز احمد بشیر سرورق کی حسینہ کی تعریف میں پل باندھتے نظر آئے۔ مرحا گل، سید شکیل کاظمی کو لسوار تجویز کرتی ہوئی دکھائی دی تھیں خوشبو لگا کے (خوشبو نسوار کی تھی غالباً) عبدالجبار انصاری کی نظر بلقیس خان کے چشمے پر تھی کہ موقع ملے تو پار کر لیں۔ عباس برادرز کا تبصرہ خوب رہا۔ آپریشن کے بعد سے انہیں چڑیل حسینہ اور حسینہ چڑیل دکھائی دینے لگی ہے (ساتوں کی) معراج انکل نے پڑوسی ملک کے سوزی (اوہ) سوری کے کان کے کیڑے جھاڑتے ہوئے دل کو بھاگ بھاگ کر دیا۔''

چشمہ بیراج میانوالی سے ساگر تکو کر کا غم اور معذرت ''لمبی جدائی کے بعد حاضرِ خدمت ہوں۔ محفل سے دوری آٹھ سالہ بھتیجے کی بیماری اور پھر اس کا انتقال۔ بھتیجے کے انتقال کے ہفتے بعد دادی جان بھی دنیا چھوڑ گئیں تو میری دنیا اندھیر اور ویران ہو گئی (اس تکلیف دہ سانحے پر اللہ تعالیٰ آپ کو صبر کی دولت۔ بیٹا ادب) اکتوبر کا جاسوسی جلد مل گیا۔ وہ دہ زیب سرورق خوشبودار لگوں۔ بہترین سرورق خوبصورت ہو تو تحریریں تو لازوال ہی ہوں گی۔

اداریہ مودی پر تھا۔ بالکل درست تھا۔ چیکی نکتہ چینی میں اقبال کا اقبال بلندی پر تھا۔ مبارکاں۔ رانا بشیر کی فرمائش بہت اچھی ہے۔ واقعی نواب صاحب کی کوئی کہانی پلیز جلد شائع کریں۔ مرحا گل، بابر عباس اور احسن زماں طویل تبصروں کے ساتھ چھائے ہوئے تھے۔ طاہرہ گلزار بھی اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ زیرِ نشتر پڑھتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کہانی کاشف زبیر صاحب کی لکھی ہوئی ہو۔ مظلوم عاشق منظر امام ہمیشہ منفرد کہانی لکھتے ہیں۔ کاش سہیل پوری کتاب پڑھ لیتا تو اسے یوں پچھتانا نہ پڑتا۔ انوکھا کاروبار واقعی انوکھا کاروبار تھا۔ ہیروں کی اسمگلنگ اور وہ بھی اسمگل شدہ بچھوؤں کے ذریعے۔ ریڈ نے اپنا کام بہت عمدگی کے ساتھ کیا۔ خدشہ، ڈین ہیلنگر سائن بورڈ نہ پڑھنے کی وجہ سے موت کی آغوش میں چلا گیا۔ انگارے رسالے کی جان اور زینت ہے۔ سجاول، اشتی کی ہر وقت بے عزتی کرتا رہتا ہے۔ شاہ زیب کو نوٹس لینا چاہیے۔ پہلوان کا کردار تو بہت دلچسپ ہے، پہلوان سے ملنے اور باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے اور اس کی شاعری کی تو کیا بات ہے۔ مہربانی فرما کر پہلوان کے کردار کو زیادہ ان رکھا کریں۔ سیفی کی انٹری نے بھی تجسس بڑھا دیا ہے۔ دوسرا طریقہ، مجرم نے انوکھے طریقے سے واردات کی۔ سرور اکرام سپر مین لے کر آئے۔ عظیم واقعی سپر مین تھا۔ ان کی پہلے ایک ٹارزن نامی کہانی بھی پڑھ چکے ہیں۔ آوارہ گرد، شہزی نے ایک بڑا دشمن تو مار ڈالا ہے اور اسے ڈان نانا شکور بھی مل گیا ہے۔ ادھوری خواہش، یاسر اعوان نئے لکھاری مگر کہانی اچھی تھی۔ اگر اس کے کردار مشرقی ہوتے تو کہانی بہت مزے دار ہو جاتی۔ معقول معاوضہ لیوک کی کوشش بے کار نہ گئی۔ آئرین تو نہ ملی مگر معاوضہ تو معقول مل گیا۔ سرورق کی پہلی کہانی دولت کی سولی۔ فراز کا باپ دولت کی سولی پر چڑھ گیا اور فراز کرب کی سولی پر۔ بہت افسوس ہوا۔ عشق زہرناک نے کوئی خاص متاثر نہیں کیا۔ کوئی بات بری لگے تو معذرت۔‘‘

ٹوبہ ٹیک سنگھ سے رانا حبیب الرحمان کا آواز دوست ’’کافی عرصے بعد وقت پر جاسوسی اور تبصرے کے متعلق مکمل کاغذات ملے تو فوراً دل میں آیا کہ اس دفعہ ضرور تبصرہ لکھ دینا چاہیے۔ جاسوسی سے انڈر گراؤنڈ رہنے والے عرصے میں کسی بھی پرانے یا نئے تبصرہ نگار نے بھولے سے بھی ہمیں یاد نہ کیا اور نہ ہی دوبارہ لوٹ آنے کے لیے کہا مگر ہم دوستوں کو بھولتے نہیں۔ جاسوسی کی ورق گردانی کرنے پر سب سے پہلے سلسلہ وار کہانی آوارہ گرد پڑھی جو فقیر یا بہت اچھی جا رہی ہے، انگارے کی قسط بھی اچھی رہی مگر تاجور کی ایک نظر شاہ زیب پر اچانک دیوار پر سے جھانکتے پڑ جاتی تو کہانی کا ایک انوکھا سرور ہوتا۔ انوکھا کاروبار بھی انوکھی کہانی تھی جیسے کہ وہ قتل ہوا اور یقیناً اس کی وجہ بچھوے کا کاروبار رہی ہوگی۔ سپر مین کہانی مزہ دے گئی۔ ادھوری خواہش اور دولت کی سولی بہترین کاوشیں تھیں۔ چیکی نکتہ چینی میں مسند صدارت پر محمد اقبال براجمان تھے مگر آپ نے ٹائٹل پر ایسا تبصرہ کیا ہے جیسے یہ جاسوسی کا نہیں بلکہ کسی بھیت کی کہانیوں کے رسالے کا ٹائٹل ہے حالانکہ ٹائٹل بیکار قسم کے ہوتے ہیں۔ (یہ آپ کی رائے ہے) طویل عرصے بعد ماہ گل کی حاضری بالکل بھی اچھی نہیں لگی کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ ماہ تاب گل ہر ماہ حاضر رہا کریں۔ مرحا گل کا تبصرہ بھی جاندار ہوتا ہے۔ بابر عباس کھاریاں سے، بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔ جناب اتنی زیادہ مصروفیت صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی ویسے بھی اب تمام پرانے تبصرہ نگاروں کو لوٹ آنا چاہیے۔ میرے ہمسائے شہر سے (ضلع ایک ہی ہے) کمالیہ سے شفقت محمود کا تبصرہ بھی اچھا رہا۔ پشاور سے ہماری پیاری دوست طاہرہ گلزار کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ ویسے ادارے سے درخواست ہے طاہرہ گلزار کو تبصروں کی ملکہ کا خطاب دے دیں، طاہرہ جی اب ٹھیک ہے۔ (جیسا آپ کا حکم) آخر میں نازپری، بشریٰ افضل، روشنی رشید، راجا ثاقب نواز، ثاقب ایڈووکیٹ، قیصر اقبال کچھ، ہمایوں سعید، سعدیہ بخاری، داؤد اشفاق، رمضان پاشا اور جن کے نام نہیں لکھ سکا تمام تبصرہ نگار پرانے جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کریں کیونکہ محفل سے پہلے والے رنگ و خوشبو کیں پہلے والی نہیں مل پاتیں۔‘‘

جہلم سے نوال اینڈ مشال کی مصروفیت ’’اللہ پاک نے ہماری مشال کو ایک پیاری سی رحمت سے نوازا ہے۔ ہم سب اس کو دیکھنے اسپتال گئے تھے کہ جاسوسی کے درشن بھی ہو گئے۔ مجھے تو دو دو خوشیاں ایک ساتھ مل گئیں کہ 14 اکتوبر کو بھانجی ہوئی اور 5 کو جاسوسی مل گیا۔ سب سے پہلے سرورق دیکھا اور ساتھ ساتھ گلاب جامن منہ میں ڈالی، واہ! مزہ آ گیا۔ بہت زبردست سرورق تھا۔ حسینہ کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں اور ایک صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے سوچا یہ تو کہانی میں پتا چلے گا کہ یہ ہیں کون۔ اس کے بعد پہنچے چیکی نکتہ چینی میں وہاں انکل بھی پاک بھارت حالات پر بات کرتے نظر آئے۔ بالکل صحیح فرمایا کہ یہ نریندر مودی نہیں زہیندر موذی ہے۔ پہلا تبصرہ محمد اقبال صاحب کا تھا، کمال کا تبصرہ تھا۔ اس کے بعد رانا بشیر احمد تھے ان کو شمارہ 3 کو ملا واہ بھئی قسمت والے ہیں آپ تو جو اتنا جلدی مل گیا شمارہ۔ اس کے بعد اپنی مرحا گل تھیں جو ہمیں یاد کر رہی تھیں بہت بہت شکریہ یاد کرنے کا، بہت زبردست تبصرہ تھا ان کا بھی۔ عبدالجبار رومی درست فرمایا عبدالستار ایدھی کو کون بھول سکتا ہے وہ سب کے دل میں زندہ ہیں۔ ادریس احمد خان، حرا مختار، عمران خان کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے زیرِ نشتر پڑھی۔ زبردست کہانی رہی، اس کے بعد آوارہ گرد میں بہت مار دھاڑ تھی۔ انگارے ہمیشہ کی طرح زبردست سسپنس سے بھرپور رہی، باقی کہانیاں ابھی نہیں پڑھیں۔ ٹائم نہیں مل رہا چھوٹی بھانجی کو دیکھنے مہمان آتے ہیں اس لیے بھرپور تبصرہ آئندہ ماہ۔ اس بار بھی مرحا گل کے یاد کرنے پر لکھ رہی ہوں۔‘‘

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی تفصیل نگاری ’’کیا سچ اور کیا جھوٹ محبت کے بہت سے روپ ہیں۔ ایک دوسرے کی خاطر محبت بہت کچھ کرواتی ہے اور محبت کے لیے بہت کچھ سہنا بھی پڑتا ہے۔ یہ سب کچھ عشق زہرناک میں ہے جہاں کسی کو کوئی مروا رہا ہے تو کسی کو جیل یاترا کروا رہا ہے۔ جاسوسی سرورق پر تبصرہ کرنے کے لیے ذہن میں کچھ نہیں آ رہا۔ ابتدائی تبصرہ محمد اقبال کا تھا اور عمدگی سے تبصرہ کیا۔ رانا بشیر احمد ایاز نے بھی اچھا لکھا۔ مرحا گل کی بھرپور داستان بھی اچھی لگی۔ واقعی ماننا پڑے گا ہر قاری دوسرے کی غیر حاضری نوٹ کرتا ہے اچھی بات ہے اور بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس تینوں میں سے کس کے سسرالی لاہور رہتے ہیں۔ شفقت محمود، سجاد احمد کا عمدہ تبصرہ۔ محمد احسن زمان، اللہ آپ کے والد کو جنت الفردوس میں جگہ دے، بھرپور تبصرہ اچھا لگا۔ سویٹ سی دوست طاہرہ گلزار کا تبصرہ بھی اس کی طرح سویٹ سی لگا۔ حرا مختار اور عمران خان کی انٹری بھی بیسٹ رہی۔ لیجیے ماہتاب گل رانا اور حسنین خان پھر مصروف ہو گئیں۔ ان کے علاوہ سید کمیل حسین کاظمی، معراج محبوب، چوہدری سرفراز، احسان سحر، عمران جونانی، افتخار

حسین اعوان اور ماہ نور سلمان کہاں گم ہیں۔ اسپتال سے کرد گھومتی تحریر زیر نشتر میں کئی لوگ مارے گئے۔ وہ بھی سب تھے کے نام پر جنہیں سوزن نے بیٹے کی خاطر انجام تک پہنچایا۔ زیر نشتر زبردست اسٹوری تھی۔ انگارے میں پاراہاؤس کے قادر خان نے خوب حرامی کی اور مال و دولت لوٹ کے فرار ہوا تو سارا نزلہ شاہ زیب اور سجاول پر آ گرا مگر عین موقع پر سجاول نے قادر کو پکڑ لیا اور پاراہاؤس میں سرخرو ہو گیا۔ شاہ زیب تاجور کے لیے گیا تو بس سڑکیں ہی ناپ کے آ گیا کم سے کم اپنی محبوب کو مل کے تو آتا۔ کڑی سے کڑی ملی تو آوارہ گرد کو بھی اول خیر وغیرہ تک کچھ رسائی مل گئی مگر اس رسائی میں ملک دشمن بھجوانی اور بھولا ناتھ کے آدمیوں کو جان کی قیمت چکانا پڑی، اب ناناشکور ہے اور شہزی دیکھیں کل منجارو کی سرزمین پر کون سا دمادم مست قلندر پیش آتا ہے۔ ایکشن سے بھرپور آوارہ گرد ایک دم زبردست جا رہی ہے۔ مظلوم عاشق مظلوم ہی رہا۔‘‘

کراچی سے اویس احمد خان کا نوازش نامہ’’جاسوسی کے بروقت دیدار ہوئے جو ذاکر صاحب کی مہارت اور دیگر رفقا کی کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ادارے سے مستفید ہوئے، پھر سب سے پہلے محمد اقبال صاحب کے نامے پر نظر پڑی، مبارک باد۔ دیگر دوستوں کی بھی حاضری بھرپور نظر آ رہی تھی۔ سب سے پہلی تحریر زیر نشتر دلچسپ ثابت ہوئی۔ مظلوم عاشق میں بے چارے عاشق سہیل کے اوپر بڑا ترس آیا کہ کنوئیں پر کھڑے ہو کر پیاسے ہی رہے۔ عورت کی فطرت کو ہی نہ سمجھ سکے اور محرومی کا سمندر پار کر گئے۔ وائے افسوس۔ انوکھا کاروبار اور خدشہ بھی اچھا تاثر لیے ہوئے تھیں۔ انگارے تو مقبول ترین تحریر ہے۔ قاری پڑھتے ہوئے تحریر میں ڈوب جاتا ہے حتیٰ کہ آخری سطر آ جاتی ہے تو سحر ٹوٹ جاتا ہے اور تشنگی کا احساس بڑھ جاتا ہے بہت خوب مثل صاحب۔ ادھوری خواہش، معقول معاوضہ بھی دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے تھیں اور آخری صفحات کی دونوں کہانیاں اپنی روایت قائم رکھنے میں کامیاب رہیں۔ تراش خراش کے عنوان پر مبنی کترنیں بھی دلچسپی سے پڑھیں۔ جنہوں نے خوب مزہ دیا۔‘‘

طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے’’جاسوسی 14 اکتوبر شام 6 بجے ملا۔ اپنا خط پا کے دل باغ باغ ہو گیا کہ ایک ایک لفظ شائع ہوا جو کہ میں چاہتی تھی۔ میں نہ کسی سے الجھنا چاہتی ہوں نہ کسی سے جھگڑا چاہتی ہوں لیکن کچھ لوگوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں کسی کا برا نہیں چاہتی لیکن کوئی مجھ سے الجھنا چاہے تو پھر اس کا دماغ درست کرنا بھی اپنا فرض اور حق سمجھتی ہوں۔ دوسروں سے کہانیاں لکھوا کے اپنے ناموں سے شائع کرنا ایسے چور لوگوں کا کام ہے جو مجھے یا دوسروں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ عزت دینے والی اور لینے والی ذات اللہ کی ہے۔ کاش کہ ان لوگوں کو شرم اور سب سے بڑھ کے سمجھ آئے کہ کسی پر الزام لگانا کتنی بری بات ہے۔ کراچی سے بھائی محمد اقبال اپنے شاندار اور جامع تبصرہ لے کر حاضر، مبارکاں بھائی مبارکاں۔ بھائی خوش قسمت ہو کہ مختار آزاد صاحب کو اتنے قریب سے دیکھا ہے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ انکل نواب اور کاشف زبیر بھائی کے سیت آمین۔ اتنا بڑا اور جامع تبصرہ کر کے بھی آپ کہتے ہو کہ وقت نہیں ملا واہ—— دوسرے نمبر پر بھائی رانا بشیر احمد ایاز کا تبصرہ رہا۔ شکریہ بھائی آپ نے میری کمی محسوس کی۔ ہر حال بہت ہی دلچسپ اور مزیدار تڑکے والا تبصرہ لے کر حاضر تھی۔ بڑی چہک رہی ہو ہر حال ڈیئر۔ میں تو بس دوستوں کو خوشبوؤں کا تڑکا لگا کے تھک گئی کہ واپس آ جاؤ۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس بار ہمارے سینئر اور بہت عزیز تبصرہ نگار آخر ٹھیک ہو کر دو سال بعد حاضر ہوئے۔ عبدالجبار رومی انصاری بھی حسب عادت، بہت خوب صورت، بہت میٹھے میٹھے اور سر میں لکھنے والا تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ رومی بہت نفیس انسان ہیں۔ شفقت محمود مختصر لیکن جامع تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ کراچی سے سجاد احمد ساحر بھی پہلی بار ہی بہت خوب صورت تبصرہ لے کر حاضر تھے، ویلکم جناب۔ محمد احسن زمان بھائی گھر کے لیے سودا لانا آپ کا فرض ہے۔ پہلے کام پھر کچھ اور۔ عمران صاحب آپ کا تبصرہ بھی بہت اچھا رہا۔ کہانیوں میں حسب عادت سب سے پہلے اپنے فیورٹ رائٹر مثل اعظم کی تحریر انگارے کی طرف لپکے۔ شروع ہی رضوان ٹی ٹی کے حالات سے ہوئی۔ واہ کیا ایکشن تھے، اب شاہ زیب کی روانگی بروناکی کو ہے۔ بہت خوب اس بار تو لگتا ہے مثل اعظم نے بہت ہی ترنگ میں لکھا ہے۔ دوسرا پسندیدہ سلسلہ آوارہ گرد ہے۔ سوشیلا نے مہاراج سنگھ کو ختم کیا خس کم جہاں پاک۔ شہزی ان ایکشن دیری گڈ۔ اب تو بھجوانی کو بھی ختم کر دیا۔ شہزی کے ایک، ایک دشمن ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ چلو ایک دوست تو ملا دیا رغیر میں۔ اب شہزی اپنے دوستوں کو چھڑانے کے لیے کلی منجارو کے سفر پر گامزن ہے ویلڈن بھئی۔۔۔۔ سلیم فاروقی کی تحریر دولت کی سولی بہت ہی شاندار اور ایکشن سے بھرپور کہانی۔ دولت کے حصول میں لوگ رشتے ناتے تک بھول جاتے ہیں لیکن باپ بیٹی کا رشتہ تو ایک مقدس رشتہ ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ باپ بھی اتنا گھٹیا ہو سکتا ہے۔ فراز نے ری ایکشن میں جو کیا خوب کیا۔ دوسرے رنگ کی کہانی احمد اقبال کی تحریر عشق زہرناک واہ کیا شاندار تحریر۔ معاشرے کے ناسور میں سوئی چبھو چبھو کر ان کے اندر کا زہر اپنے قلم کے ذور سے نکالا ہے۔ رشید کو غریبی اور اس معاشرے کی غلط رسومات نے اس مقام پر لا کھڑا کیا۔ پروفیسر بھائی کی محبت میں سزا کاٹ کے زندگی بھی ہار بیٹھا۔ احمد اقبال صاحب معاشرے کے مسائل پر بہت خوب لکھتے ہیں۔ سرور اکرام صاحب سپر مین کے نام سے ایک شاندار تحریر لائے۔ محبت جیسے موضوع کو ایسا لکھا کہ حیرت ہو رہی ہے کہ ابھی اس دنیا میں عظیم اور سہیل جیسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ سلیم انور کی مختصر مغربی تحریر خدشہ پڑھ کے ہنسی بھی آئی کہ ڈین بیلنگر برنارڈ کو مارنے گیا تھا اور خود مر گیا۔ مظلوم عاشق میں منظر امام صاحب نے سہیل جیسے لوگوں کے بارے میں تحریر کیا ہے جو بنا سوچے سمجھے اور پڑھے دوسروں پہ دھاک بٹھانے کے لیے بس بولتے ہی رہتے ہیں۔ اور پھر انجام بھی سہیل جیسا ہی ہوتا ہے۔ امجد رئیس کسی تعارف کے محتاج نہیں، ان کی تحریر میں جو معاشرتی پہلو اجاگر ہوتے ہیں وہ ذہن کو گہری ورزش کراتے ہیں۔ لیکن ان کے قلم سے نکلے ہوئے لفظ معاشرے کے ناسور کو ہمیں دکھانا مقصود۔‘‘

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔
احسان الٰہی، سیالکوٹ۔ حرا افتخار، کراچی۔ انصار احمد، کراچی۔ سونیا جنید، کوٹری۔ عمران خان، حیدرآباد۔ وقار احمد، میرپور خاص۔ زیب حنیف، کراچی۔

آتشِ بغاوت

ایچ اقبال

ہر طرف رواں دواں ظلمتوں کے کارواں
حادثے قدم قدم راستے دھواں دھواں
مشعلیں بجھا گئیں روز و شب کی آندھیاں
پھر بھی اے مسافرو تم رہو رواں دواں

صلاحیت بالکل آگ کی طرح ہوتی ہے... آگ اگر بے وقوفوں کے ہاتھ لگ جائے تو اردگرد کی ہر چیز کو جلا کر راکھ کرسکتی ہے... یہ ذہانت ہی ہے جو اسے قابو میں رکھتی ہے... اور آگ ہی کیوں... ذہانت تو جسن کو بھی اس طرح گرفت میں کرلیتی ہے جس طرح کوئی ہوشیار شہسوار تندخو گھوڑے پر غالب آجاتا ہے... کارزارِ سیاست میں بھڑکتی آگ کے شعلوں کا احوال جو ہر دم ہر نفس کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے تیار تھی... اقتدار کے ایوانوں میں چلتی پھرتی کہانی کے اسرار ورموز... جہاں سازشوں کے ساتھ ساتھ محبتوں کے کھلاڑی اپنی بازی دل و جاں سے کھیل رہے تھے... انجام سے بے خبر ایک کھلی جنگ کی تباہ کاریاں...

آتشِ بغاوت میں گھری ایک نازک اندام حسینہ کے آہنی ارادوں کی داستانِ حیات

اُس رات صدارتی محل پر غیر معمولی سکوت طاری تھا۔ ایک کمرے میں ملک کا صدر حیات بیگ ایک خفیہ ایجنسی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل چنگیزی سے میٹنگ کررہا تھا۔ گفتگو بہت مدھم لہجے میں ہورہی تھی۔ نصف گھنٹے کی میٹنگ کے بعد چنگیزی رخصت ہوا۔ حیات بیگ اپنی خواب گاہ میں پہنچا۔ اس کی بیوی روبینہ حیات بستر پر لیٹی کسی سوچ میں گم تھی۔ چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہورہا تھا۔ جب حیات بیگ لیٹا تو روبینہ حیات نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔ حیات بیگ نے اس کی طرف بس ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر اس کی نظریں چھت پر جم گئیں۔ چہرے پر فکرمندی اور پریشانی کے آثار بہت واضح تھے۔

اِدھر قصرِ صدارت کا یہ حال تھا اور دوسری طرف ملک کے سیاسی حلقوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کے اثرات ٹی وی چینلز پر بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ کیونکہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اس لیے جو ٹاک شوز ہوچکے تھے، وہ دوبارہ نشر ہونے لگے تھے۔ تقریباً سبھی کا موضوع ایک ہی تھا۔ وزیرِ تعلیم ثمینہ حیات نے نہ صرف وزارت سے استعفا دے دیا تھا بلکہ اپنی ایم این اے کی رکنیت ختم کرنے کے ساتھ ساتھ حکمران سیاسی جماعت سے بھی علیحدگی اختیار کرلی تھی۔

کسی بھی ایم این اے یا کسی بھی وزیر کا استعفا اتنی ہلچل نہیں مچاتا لیکن پشمینہ حیات صدرِ مملکت حیات بیگ کی اٹھائیس سالہ بیٹی تھی۔

ایک سال سے سیاسی جماعتوں اور ٹی وی چینلز کے رپورٹرز کی طرف سے صدرِ مملکت پر مالی بے ضابطگیوں کے جو الزامات لگ رہے تھے، تمام وزرا کی جانب سے انہیں رد کیا جا رہا تھا اور اس معاملے میں پشمینہ حیات سب سے پیش پیش تھی کیونکہ الزامات کا کوئی ٹھوس ثبوت کسی کے پاس نہیں تھا لیکن گزشتہ ماہ جب صدر حیات کا ''اسکینڈل'' اس طرح سامنے آیا تھا کہ ایک ٹی وی چینل کے اینکر نے اس کی وڈیو بھی اپنی ویب سائٹ پر ڈال دی تھی۔ اس کے بعد تو صدر حیات کے خلاف بلا کا شور مچ گیا تھا اور معمول کے مطابق کئی وزرا اپنے صدر کا دفاع کرتے ہوئے اس وڈیو کو جعلی قرار دیتے رہے تھے لیکن اس کے بعد پشمینہ نے مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی جس نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ بہت سے ٹاک شوز کے اینکر پرسنز نے اس سے رابطے کی کوششیں کی تھیں لیکن کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ اس کا وہ موبائل نمبر بند تھا جس پر میڈیا کے لوگ اس سے رابطہ کیا کرتے تھے۔

لیکن یہ کسی کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ پشمینہ کوئی ایسا انتہائی قدم اٹھائے گی۔

کیا پشمینہ نے ''اسکینڈل'' پر یقین کر لیا تھا اور اسی باعث یہ قدم اٹھایا تھا؟

ٹاک شوز میں اسی سوال پر مباحث ہوتے رہے تھے اور مختلف النوع قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ ان میں ایک قیاس آرائی یہ بھی تھی کہ پشمینہ این پی پی (نیشنل پالیٹکس پارٹی) میں شامل ہو سکتی ہے۔

اس قیاس آرائی کا ایک سبب بھی تھا۔ خاصے دن پہلے دبے دبے الفاظ میں یہ سرگوشیاں ہوئی تھیں کہ پشمینہ کا این پی پی کے سربراہ دانش یزدانی سے کچھ تعلق ہے لیکن کچھ ہی دن میں ان سرگوشیوں نے دم توڑ دیا تھا کیونکہ انتہائی کوششوں کے باوجود کوئی رپورٹر ''دانش پشمینہ ملاقات'' کی کوئی مستند خبر یا تصویر نہیں لا سکا تھا۔

ان سرگوشیوں کا سبب صرف یہ تھا کہ پشمینہ اور دانش نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں ساتھ ہی تعلیم حاصل کی تھی۔

تین سال قبل دانش یزدانی نے ایک سیاسی پارٹی بنائی تھی جو پہلے ایک سال میں تو ذرا بھی اہمیت حاصل نہیں کر سکی تھی لیکن پھر دو ایک ایشوز پر اس نے ایسا زبردست کام کیا تھا کہ پھر وہ ابھرتی ہی چلی گئی اور اب چند نمایاں سیاسی جماعتوں میں سے ایک تھی۔

☆☆☆

قصرِ صدارت پر جو سکوت رات کو چھایا رہا تھا وہی دوسری صبح ناشتے کی میز پر تھا۔ میز پر صدر حیات، اس کی بیوی روبینہ حیات، صدر کا بڑا بیٹا آفتاب حیات، اس کی بیوی قدسیہ آفتاب اور پشمینہ حیات، پانچوں ہی تھے۔ پشمینہ کسی کی طرف دیکھے بغیر سر جھکائے ناشتا کر رہی تھی۔ باقی افراد کبھی کبھی اس پر اچٹتی سی نظر ڈال رہے تھے۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ ان کے ہاں ناشتے کی میز پر ایسا سکوت طاری ہو۔

ان میں سے کوئی قدرے جلدی ناشتا کر لیتا تھا تو اس وقت تک میز سے نہیں اٹھتا تھا جب تک صدر حیات ناشتا نہ کر لے۔ اس دن پشمینہ نے معمول سے کم ناشتا کیا لیکن حسبِ معمول بیٹھی رہی، البتہ اس کی نظریں بدستور جھکی رہیں۔

''کیوں پشمینہ؟'' قدسیہ آفتاب بولی۔ ''آج تم نے بہت کم ناشتا......''

''تمہیں اس کی فکر کیوں ہوئی؟'' آفتاب حیات نے اپنی بیوی سے سخت لہجے میں کہا اور جن نظروں سے پشمینہ کی طرف دیکھا، ان میں غصہ تھا۔

پشمینہ بدستور خاموش اور میز کے ایک گلدان پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

صدر حیات نے ان تینوں ہی پر اچٹتی سی نظریں ڈالیں لیکن اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پریشانی اس کے چہرے پر بدستور رہی۔

صدر حیات کی بیوی روبینہ نے اپنے بیٹے کی طرف کچھ ناراض نگاہوں سے دیکھا، پھر پشمینہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تم ناشتے میں دو مرتبہ چائے پینے کی عادی ہو بیٹی! آج ایک ہی پیالی پی!''

''جی ممی!'' پشمینہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''آج جی کچھ ٹھیک نہیں۔''

آفتاب اتنی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ اپنی بیوی کی طرح ماں کو بھی ٹوک سکتا۔

صدر حیات اس وقت بھی خاموشی اختیار کیے رہا تھا۔ آخر اس نے بھی ناشتا ختم کر لیا مگر اس سے پہلے کہ سب لوگ ناشتے کی میز سے اٹھتے، صدر حیات نے پشمینہ کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے ابھی...... ناشتے کی میز پر آتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ آج شام تم کوئی پریس کانفرنس کر رہی ہو؟''

''جی ڈیڈی!''

''اور یہیں...... قصرِ صدارت میں؟''

''جی۔''

ان باتوں کی وجہ سے باقی تینوں افراد بھی بیٹھے رہ گئے اور توجہ سے باپ بیٹی کی باتیں سننے لگے۔

''کیا کہنا چاہتی ہو، پریس کانفرنس میں؟''

''میں معذرت چاہتی ہوں ڈیڈی! یہ میں ابھی نہیں بتا سکتی۔''

اب صدر حیات کے چہرے سے غصہ ظاہر ہوا۔ ''تو پھر یہ پریس کانفرنس یہاں نہیں ہوگی۔''

''بہتر ہے۔'' پشمینہ نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''میں کچھ اور بندوبست کر لیتی ہوں۔''

''لیکن پریس کلب میں نہیں۔'' صدر حیات نے زور دے کر کہا۔ ''تمہیں اس ملک کے صدر کی بیٹی کے وقار کا خیال رکھنا ہوگا۔''

پشمینہ نے صدر حیات کی طرف دیکھا۔ ایسا بھی معلوم ہوا کہ وہ کوئی جواب دیتے دیتے رکی ہو۔ وہ قدرے توقف سے بولی۔ ''بہتر بہتر! میں کوئی اور بندوبست کر لوں گی۔ یہ اور عرض کر دوں کہ میں اب وہ سیکیورٹی نہیں لوں گی جو سرکاری طور پر مجھے دی جاتی رہی ہے۔ کسی قسم کا پروٹوکول بھی نہیں۔''

صدر حیات اس طرح ایک جھٹکے سے اٹھا جیسے غصہ آ گیا ہو، پھر وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

باقی افراد بھی میز سے اٹھے۔

آفتاب غصے سے بولا۔ ''تم نے ڈیڈی سے بدتمیزی کی ہے پشمینہ!''

''میرا خیال ہے کہ میرا ایک لفظ بھی تہذیب سے گرا ہوا نہیں تھا بھائی جان!'' پشمینہ نے جواب دیا۔ ''میں ایک بہت عام سا محاورہ استعمال کروں گی کہ میں نے چنے دے کر نہیں پڑھا ہے۔ میرے علم ہی کی بنیاد پر مجھے وزارتِ تعلیم ملی تھی۔ میں میرٹ پر وزیرِ تعلیم تھی اور تعلیم، تہذیب سکھاتی ہے۔ میں تہذیب سے گری ہوئی کوئی بات کر ہی نہیں سکتی۔''

اب آفتاب بھی غصے کے عالم میں دروازے کی طرف مڑ گیا۔ قدسیہ کو اس کے پیچھے جانا ہی تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہولی۔

روبینہ حیات نے پشمینہ کے قریب جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور نرم لہجے میں بولی۔ ''مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟''

''کیا ممی؟''

''کیا کرنے جا رہی ہو؟''

''میں آپ سے بھی معذرت چاہوں گی ممی! میں ابھی کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ در و دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں اور قصرِ صدارت کے در و دیوار تو کان ہی نہیں آنکھیں بھی رکھتے ہیں۔ شاید کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں خفیہ کیمرے لگے نہ ہوں۔'' پشمینہ کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ ''صدرِ مملکت نے سارے ملک میں ہی نہیں، اپنے گھر میں بھی جاسوسی کا انتظام کچا نہیں رکھا ہے۔''

روبینہ حیات نے ٹھنڈی سانس لی اور پشمینہ کے کندھے پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

☆☆☆

ملک کے سیاسی ماحول میں سنسنی اس بات سے بھی بڑھی تھی کہ پشمینہ آج پریس کانفرنس کرے گی، پھر اس سنسنی میں مزید اضافہ ہوا جب یہ بات سامنے آئی کہ پریس کانفرنس اب قصرِ صدارت کے بجائے دانش یزدانی کے گھر پر ہوگی۔

حالات میں تیزی سے آتی ہوئی ان تبدیلیوں نے عوام کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی ٹی وی چینلز نے اس پر خصوصی شو کر ڈالے۔ دو چینلز نے تو یہ اعلان بھی کر دیا کہ ان کے خصوصی شوز پشمینہ کی پریس کانفرنس کے ایک گھنٹے بعد تک مسلسل جاری رہیں گے اور عوام کو ایک ایک پل کی رپورٹ ملتی رہے گی۔

میڈیا کے لوگوں کو قصرِ صدارت اور دانش منزل کے آس پاس دیکھا جانے لگا۔ کئی ٹی وی چینلز کی گاڑیاں بھی دونوں مقامات کے نزدیک موجود تھیں۔

ٹی وی شوز میں کہا جانے لگا کہ کچھ عرصے قبل پشمینہ اور دانش یزدانی کے تعلقات کی نسبت سے جو خبر اڑی تھی، وہ آخر درست ثابت ہوگئی۔ اس کے علاوہ یہ تجزیہ بھی کیا جانے لگا کہ پشمینہ پریس کانفرنس میں دانش یزدانی کی پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر سکتی ہے۔

پریس کانفرنس کا وقت پانچ بجے دیا گیا تھا۔ میڈیا کے لوگوں نے اس سے پہلے ہی وہاں جمع ہونا شروع کر دیا۔ جگہ وہی تھی جہاں دانش یزدانی پریس کانفرنس کیا کرتا تھا۔

وہاں ٹی وی کیمرے بھی سیٹ کیے جارہے تھے۔ دانش یزدانی نے صحافیوں کے لیے چائے اور کافی کا بندوبست بھی کیا تھا جو وہ اپنی پریس کانفرنسز میں بھی کیا کرتا تھا۔ کیونکہ ہلکی ہلکی سردی ہونے لگی تھی اس لیے ٹھنڈے مشروبات کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔

اخبارات اور ٹی وی چینلز کے رپورٹرز پشمینہ سے رابطے میں تو ناکام رہے ہی تھے، اب ان کا رابطہ دانش یزدانی سے بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے موبائل نمبرز بھی بند مل رہے تھے اور وہ خود بھی اپنے گھر میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی نسبت سے ٹی وی چینلز پر صرف یہ خبر آئی تھی کہ اس کی پارٹی کے سرکردہ لوگ بھی اس وقت اس کے گھر میں موجود تھے اور کسی معاملے میں ان کی مشاورت جاری تھی۔

ساڑھے چار بجے پارٹی کے کچھ اور لوگوں کی کاریں بھی وہاں پہنچیں۔ ٹی وی اسکرینز پر انہیں بھی کاروں سے اترتے دکھایا گیا تھا۔ میڈیا کے لوگوں نے انہیں گھیرنے کی کوشش کی تھی اور ان پر سوالات برسائے تھے لیکن وہ بھی مسکراتے اور ''نو کمنٹس'' کہتے ہوئے دانش منزل میں چلے گئے تھے۔

چار بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے جب دانش یزدانی کو باہر آتے دیکھا گیا۔ اس کی شخصیت وجیہہ اور پروقار تھی۔ وہ ملک کے ایک بہت بڑے بزنس مین کا بیٹا تھا اس لیے دانش منزل کوئی چھوٹی موٹی عمارت نہیں تھی۔ اس کا احاطہ بھی اتنا بڑا تھا کہ باہر سے آنے والی کاروں کو بھی پھاٹک میں داخل ہونے کے بعد عمارت تک پہنچنے میں دو منٹ تو لگ ہی جاتے تھے۔

دانش یزدانی باہر نکلتے ہی برآمدے کے سامنے کھڑی اپنی کار کی طرف بڑھا۔ میڈیا کے لوگوں نے اسے گھیر لیا جس کی وجہ سے وہ فوری طور پر اپنی کار تک نہیں بڑھ سکا۔

اس پر سوالات کی بوچھاڑ بھی ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا۔ ''پریس کانفرنس کا وقت قریب ہے، اس وقت آپ کہاں جارہے ہیں؟''

''میں کہیں دور نہیں جارہا ہوں۔'' دانش یزدانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بس پھاٹک کے باہر تک۔''

''کیا کسی اہم شخصیت کا استقبال کرنا ہے؟''

''کوئی بڑی شخصیت آرہی ہے؟''

اس نوع کے کئی سوالات بہت سے صحافیوں نے کر ڈالے جس کا جواب دانش یزدانی نے اثبات میں دیا۔

ٹی وی چینلز سے یہ خبر ''بریکنگ نیوز'' کے طور پر نشر کی گئی اور جو دو تین ٹی وی چینل مستقل ''خصوصی شو'' جاری رکھے ہوئے تھے، ان پر موجود تجزیہ کار اندازہ لگانے سے بھی قاصر دکھائی دیے کہ ایسی اہم شخصیت کس کی ہوسکتی ہے جس کا استقبال کرنے کے لیے خود دانش یزدانی باہر آیا تھا۔

تجزیہ کاروں کے خیال کے مطابق وہ اہم شخصیت پشمینہ کی نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ قصرِ صدارت پر مامور رپورٹرز میں سے کسی نے بھی اب تک یہ خبر نہیں دی تھی کہ پشمینہ کی کار قصرِ صدارت سے روانہ ہو رہی ہے یا روانہ ہو چکی ہے۔

دانش یزدانی کی کار پھاٹک کے باہر نکل کر رک گئی۔ اس کی کار کے پیچھے پیچھے سیکیورٹی گارڈز کی ایک کار بھی تھی اور پھاٹک کے باہر سیکیورٹی گارڈز کی دو گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔

دانش یزدانی کو پھاٹک پر آکر رکے ہوئے آدھا منٹ گزرا ہوگا کہ ایک چمکتی ہوئی سیاہ رنگ کی کار وہاں آکر رکی۔ دانش یزدانی اپنی کار سے اتر کر اس کار کی طرف بڑھا۔ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے تین چار سیکیورٹی گارڈز تو تھے ہی لیکن میڈیا کے لوگ بھی تھے۔

کار کا پچھلا دروازہ کھول کر جو شخصیت باہر آئی، اسے دیکھ کر دانش یزدانی کے علاوہ سبھی ہکا بکا رہ گئے۔

وہ پشمینہ تھی، پشمینہ حیات!

کار کی اگلی نشست کا دروازہ کھول کر ڈیرا باہر آئی جو شرٹ اور جینز میں ملبوس تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک وینٹی بیگ تھا۔ لوگ اس سے ناواقف نہیں تھے۔ اسے ہمیشہ پشمینہ کے ساتھ دیکھا جاتا رہا تھا۔ پشمینہ اسے اپنی دوست کہتی تھی۔

ٹی وی چینلز پر پھر ہلچل مچی۔ پشمینہ نے میڈیا کو دھوکا دے دیا تھا۔ وہ اپنی مخصوص کار کے بجائے اس سیاہ کار میں قصرِ صدارت سے نکلی تھی۔ کار کے شیشے بھی سیاہ تھے۔ وہاں موجود میڈیا کے لوگوں نے اس کار پر توجہ نہیں دی ہوگی کیونکہ اور بھی کاریں قصرِ صدارت میں آجا رہی تھیں۔

اس پر بھی حیرت کا اظہار کیا گیا کہ پشمینہ پروٹوکول کے بغیر وہاں پہنچی تھی۔ اس کار کے آگے پیچھے دوسری کوئی کار نہیں تھی۔

وہ دانش یزدانی سے مصافحہ اور دو ایک باتیں کر کے پھر کار میں جا بیٹھی۔ اخباری صحافیوں کے کیمروں کی فلیش گنز تو بار بار چمکتی رہی تھیں لیکن کسی صحافی کو پشمینہ سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

اس کے بعد کئی کاروں کا قافلہ پھاٹک میں داخل

ہوا۔ آگے ایک کار میں دانش یزدانی کے سیکیورٹی گارڈز تھے۔ اس کے بعد پشمینہ کی اور اس کے پیچھے دانش یزدانی کی کار تھی۔ اس کی کار کے پیچھے سیکیورٹی گارڈز کی دو گاڑیاں تھیں۔

عمارت کے برآمدے کے سامنے پہنچ کر گاڑیاں رکیں۔ دانش یزدانی بڑی سرعت کے ساتھ اپنی کار سے اتر کر پشمینہ کی کار کے قریب پہنچا تھا۔ اسی وقت پشمینہ اور ڈیبرا کار سے اتری تھیں۔

اس وقت میڈیا کے لوگوں نے انہیں گھیر ہی لیا۔ دانش یزدانی انہیں ٹالنے والے جوابات دیتا رہا۔ پشمینہ نے صرف ایک بات کہہ کر خاموشی اختیار کرلی تھی۔ ''مجھے جو کچھ کہنا ہے، وہ میں کانفرنس میں کہوں گی اور وہیں آپ لوگوں کو اپنے سوالوں کے جواب بھی مل جائیں گے۔ اس سے پہلے ایک جملہ بھی نہیں۔''

سوالات کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا لیکن پشمینہ کے ہونٹ نہیں کھلے۔ پشمینہ اس وقت بہت گمبھیر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دانش یزدانی اور ڈیبرا کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی عمارت کے اندر چلی گئی تھی۔ اس نے فوری طور پر اس ہال کا رخ نہیں کیا تھا جہاں اسے پریس کانفرنس کرنی تھی۔

اعلان کیا گیا کہ پریس کانفرنس پندرہ منٹ کی تاخیر سے شروع ہوگی۔ ایک ٹی وی چینل کے خصوصی شو میں یہ باتیں شروع ہوگئیں کہ فی الحال پشمینہ اور دانش یزدانی میں پریس کانفرنس کی نسبت سے مشاورت ہو رہی ہوگی۔

دوسرے ٹی وی چینل کے خصوصی شو میں پشمینہ کے ساتھ سیکیورٹی اور پروٹوکول کا نہ ہونے کے علاوہ ڈیبرا بھی زیر بحث آچکی تھی۔

ڈیبرا کی پیدائش اسی ملک میں ہوئی تھی۔ ڈیبرا نے تعلیم بھی پشمینہ کے ساتھ حاصل کی تھی۔ دونوں میں دوستی اتنی گہری ہوگئی تھی کہ اس نے پشمینہ ہی کے ذریعے یہاں کی شہریت حاصل کرلی تھی اور برطانیہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا تھا۔ برطانیہ سے اس کا دل اچاٹ ہوجانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی ماں کے انتقال کے بعد اس کے باپ نے دوسری شادی کرلی تھی۔

یہاں وہ ایک اچھے اپارٹمنٹ میں دو ملازمین کے ساتھ، گویا تنہا رہتی تھی۔ اخراجات کے لیے اس کا باپ پیسا بھیجتا رہتا تھا۔ خاصے عرصے پہلے ڈیبرا نے ایک خفیہ ایجنسی میں شمولیت کرنا چاہی تھی۔ ایجنسی کی تربیت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا لیکن کئی ماہ کی سخت تربیت کے بعد اس میں کوئی نقص نکال کر اسے ایجنسی میں نہ لینے کا فیصلہ کیا گیا تھا، لیکن اس کی اصل وجہ کچھ اور تھی۔ یہ خیال کسی کو بعد از وقت آیا تھا کہ اگر اسے خفیہ ایجنسی میں رکھا گیا تو مذہبی سیاسی جماعتیں واویلا شروع کردیں گی کیونکہ وہ نسلاً کرسچن تھی۔

اس کے بعد ہی سے ڈیبرا کو مستقل طور پر پشمینہ کے ساتھ دیکھا جانے لگا تھا۔ لوگوں کے خیال کے مطابق پشمینہ نے اسے اپنا ذاتی باڈی گارڈ بنا لیا تھا۔ اس پر بھی مذہبی سیاسی جماعتوں کی طرف سے نکتہ چینی ہوتی رہتی تھی لیکن پشمینہ نے کبھی اس کی پروا نہیں کی تھی۔

''وہ کرسچن ہو یا کوئی خلائی مخلوق۔'' پشمینہ کہا کرتی۔ ''وہ میری دوست ہے اور ایسی دوست جو میرے پسینے کی جگہ اپنا خون بہا سکتی ہے، تو ایسی دوست کے لیے میں کیا کچھ نہیں کروں گی۔''

☆☆☆

میڈیا کے لوگ دیکھ چکے تھے کہ پریس کانفرنس کے لیے پشمینہ کو جہاں بیٹھنا تھا وہاں صرف دو کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ اسی لیے خیال کیا جارہا تھا کہ پشمینہ کے ساتھ صرف دانش یزدانی بیٹھے گا لیکن اس وقت سب حیران رہ گئے جب دوسری کرسی پر انہوں نے ڈیبرا کو بیٹھتے دیکھا۔

ٹھیک سوا پانچ بجے پشمینہ نے بولنا شروع کیا۔ ابتدائی رسمی کلمات کے بعد اس نے کہا۔ ''میں محسوس کررہی ہوں کہ ڈیبرا کو میرے ساتھ بیٹھا دیکھ کر بھی کو حیرت ہورہی ہے۔ میں اس بارے میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ ڈیبرا کہنے کو میری صرف دوست ہے لیکن میں اسے سگی بہن کی طرح عزیز رکھتی ہوں۔ آپ اسے ہمیشہ میرے برابر ہی دیکھیں گے۔ یہ کہنے کے بعد میں اس موضوع کی طرف آتی ہوں جس کے لیے پریس کانفرنس ضروری سمجھی گئی۔'' پشمینہ لکھے بغیر بول رہی تھی۔ ''خاصے عرصے سے صدر مملکت کے خلاف میڈیا پر جو کچھ آرہا تھا، میں اس کا دفاع کرتی رہی ہوں جس کا سبب یہ نہیں تھا کہ صدر مملکت کے وزرا کی طرح میں ان کی خوشامد جاری رکھوں اور یہ بھی سمجھوں کہ اگر وہ صدر نہ رہے تو میری وزارت بھی جائے گی اور میں ملک میں جاری قانونی قسم کی لوٹ مار بھی نہیں کرسکوں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ میڈیا پر ان وزرا کی لوٹ مار کے متعلق بھی کہا جاتا رہا لیکن آج تک میرے خلاف اگر کچھ کہا گیا ہے تو صرف یہ کہ میں بھی دیگر وزرا کی طرح صدر مملکت کی بے جا حمایت کرتی

ہوں۔ آج مجھے واشگاف الفاظ میں تسلیم کرنا ہے کہ یہ الزام بہر حال غلط نہیں تھا۔ میں واقعی بے جا حمایت کرتی رہی ہوں جو ایک فطری امر تھا۔ سبھی جانتے ہیں کہ میں ان کی صرف وزیر تعلیم نہیں تھی، کچھ اور بھی تھی اور اب بھی ہوں۔ عین ممکن ہے کہ میری یہ غلطی جاری رہتی لیکن اب صدر مملکت کے خلاف جو اسکینڈل سامنے آیا ہے، اسے میں برداشت نہیں کر سکی جس کے نتیجے میں میرے جو اقدامات تھے، وہ آپ سب کے اور پوری قوم کے علم میں آچکے ہیں۔ عوام پر جس حکومت کی زیادتیاں بڑھتی ہی چلی جارہی ہیں، میں اب اس حکومت کا حصہ بنی رہنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ایک ماہ پہلے تک میں صدر مملکت کی نسبت سے جو جھوٹ بولتی رہی ہوں، اس کے لیے قوم سے معافی کی خواستگار ہوں۔ اگر ممکن ہو تو یہ سوچ کر مجھے معاف کر دیا جائے کہ خونی رشتے، اور خاص طور سے ایسے قریبی رشتے انسان کو بہت کمزور کر دیتے ہیں۔'' پشمینہ کی آواز قدرے بھرا گئی۔ اس نے خاموش ہو کر سامنے رکھا ہوا گلاس اٹھا کر پانی کے دو چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیے۔

صحافیوں کے تیزی سے چلتے ہوئے قلم رک گئے اور وہ بہ نظر تحسین پشمینہ کی طرف دیکھنے لگے۔ اسی طرح ٹی وی چینلز پر بیٹھے ہوئے تجزیہ کاروں کا لہجہ بھی نرم پڑ گیا جو پشمینہ کے خلاف سخت الفاظ بولتے رہے تھے۔

اس دوران میں ڈیبرا کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا رہا تھا کہ وہ پشمینہ کی باتیں توجہ سے نہیں سن رہی تھی۔ اس کی نظریں مسلسل ہر طرف ''گشت'' کر رہی تھیں۔ سارا ماحول اس کی آنکھوں میں سمٹا ہوا تھا۔ وہ پشمینہ کی باڈی گارڈ کی حیثیت سے پوری طرح چوکس تھی۔

پانی کا گلاس رکھ کر پشمینہ نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''میں آپ حضرات کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتی۔ مجھے صرف دو باتیں اور کہنی ہیں۔ ایک تو اب یہ قیاس آرائیاں ختم ہو جانی چاہئیں کہ میں دانش یزدانی کی پارٹی میں شامل ہو رہی ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دانش میرے بہت اچھے دوست ہیں لیکن ان کے پارٹی منشور کے بعض نکات سے مجھے شدید اختلاف ہے اور اختلاف کرنا یا اختلاف برداشت کرنا ہی جمہوریت کا خوب صورت پہلو ہے۔'' پشمینہ پہلی بار مسکرائی۔ ''میں اور دانش ایک دوسرے کے انداز فکر کا احترام کرتے ہیں۔ دانش اپنے نظریات پر مضبوطی سے قائم ہیں اور میں اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی ہوں لیکن اس کا اثر ہماری دوستی پر نہ کبھی پڑا تھا، نہ پڑا ہے۔ نہ پڑے گا۔ یہاں میری ایک بات ختم ہو جاتی ہے۔ اب مجھے دوسری بات کہنا ہے۔'' پشمینہ نے خاموش ہو کر پانی کا گلاس اٹھایا۔

صحافیوں کے قلم پھر رک گئے۔ اُن کی انگلیوں کو قدرے تھکاوٹ دور کرنے کے لیے کچھ لمحات میسر آگئے۔

دوسری بار بھی پشمینہ نے پانی کے دو گھونٹ لیے۔ پھر چاروں طرف ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''میری خواہش تھی، اور ہے کہ میں اپنی ایک پارٹی بناؤں لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس کے لیے میرے پاس فنڈز نہیں۔ میرے پاس اگر کچھ ہے تو وہ ایک مضبوط پارٹی بنانے کے لیے استعمال نہیں کر سکتی کیونکہ وہ میرے والد کا دیا ہوا ہے۔'' پشمینہ نے پہلی مرتبہ ''صدر مملکت'' کے بجائے ''والد'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تجزیہ نگار اب تک یہ قیاس کرتے رہے ہیں کہ میں دانش یزدانی کی پارٹی میں شامل ہونے والی ہوں۔ اب چونکہ میں نے اس بارے میں اپنا فیصلہ سنا دیا ہے تو شاید مجھے دوسری سیاسی پارٹیوں سے نتھی کرنا شروع کر دیا جائے لہٰذا میں یہ واضح کرنا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ ملک میں اس وقت ایک بھی پارٹی ایسی نہیں جس سے مجھے کچھ نہ کچھ اختلافات نہ ہوں۔ اسی لیے کسی اور پارٹی میں بھی میری شمولیت ممکن نہیں۔ بس! مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔ آپ لوگ کچھ سوالات کرنے کے لیے بے چین ہوں گے کیونکہ پریس کانفرنس کی ریت ہی یہی ہے۔'' پشمینہ دوسری مرتبہ مسکرائی۔ ''میں جواب دینے کے لیے تیار ہوں لیکن ضروری نہیں ہے کہ میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں۔''

پھر پشمینہ نے تیسری بار پانی کا گلاس اٹھایا تو سوالات کی بارش ہو گئی۔ سبھی صحافیوں نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ اچھا خاصا شور مچ گیا۔

سوالات کچھ اس قسم کے تھے۔

''آپ نے سیکیورٹی اور پروٹوکول کیوں نہیں رکھا؟''

''اگر آپ کسی طرح اپنی پارٹی بنا سکیں تو آپ کا منشور کیا ہوگا؟''

''آپ کے استعفے کا صدرِ مملکت پر کیا ردِعمل ہوا؟ آخر آپ اُن کی بیٹی ہیں!''

''آپ نے یہاں آنے کے لیے اپنی کار کیوں استعمال نہیں کی؟''

''کیا آپ اب بھی قصرِ صدارت ہی میں رہیں گی؟''

"دانش یزدانی صاحب سے آپ کا تعلق کس قسم کا ہے؟"

"آپ تو گھر کی بھیدی ہیں میڈم! کیا آپ کچھ ایسی باتیں بتانا پسند کریں گی جو اب تک عوام کو نہیں معلوم؟"

اسی نوعیت کے کچھ اور سوالات بھی تھے لیکن شور اتنا بچ گیا تھا کہ پشمینہ وہ سوالات سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمایاں ہو گئے لیکن وہ جانتی تھی کہ اس قسم کی پریس کانفرنس میں یہ سب کچھ تو ہوتا ہے۔

اس موقع پر ڈیبرا نے ماحول درست کرنے کے لیے بولنا شروع کیا اور بمشکل تمام ماحول کو قابو میں کر سکی۔ تب پشمینہ نے کہا۔

"آپ لوگ جانتے ہیں کہ یہ میری پہلی پریس کانفرنس ہے۔ مجھے کبھی پریس کانفرنس کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ بس جب ٹی وی چینلز والے مجھے لائن پر لیتے تھے تو میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیتی تھی۔ اسی لیے مجھے الجھن ہو رہی ہے کہ میں فرداً فرداً سب کے سوالات سنوں اور ان کے جوابات دوں۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔ میں درخواست کروں گی کہ میری بات مان لی جائے۔ آپ ایک ایک کر کے سوالات کریں، یہ ڈیبرا کی ذمے داری ہو گی کہ وہ سب سوال لکھ لیے جائیں۔ میں وہ سوالات پڑھ پڑھ کر ایک ہی بار میں سب کو جواب دے دوں گی۔"

پشمینہ کی اس تجویز پر بھی بمشکل تمام عمل ہو سکا۔ تاہم سب سوالات جمع ہو گئے۔ ڈیبرا نے برطانوی ہوتے ہوئے بھی اردو اس حد تک سیکھ لی تھی کہ وہ لکھ بھی سکتی تھی اور اہلِ زبان کی طرح بول بھی سکتی تھی۔

لگ بھگ تیس سوال جمع ہو گئے تھے۔ پشمینہ نے ان سب پر نظر ڈالنی شروع کی۔ اس کے بعد اس نے بولنا شروع کیا۔

"بہت سے سوالات ایسے ہیں جو یکساں نوعیت کے ہیں۔ بہرحال میں کوشش کرتی ہوں کہ آپ سب کو مطمئن کر سکوں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے یہاں پارلیمانی نظام ہے اور اس وقت خودمختار سیکولر پارٹی کی حکومت ہے جس کے سربراہ صدر مملکت خود ہیں۔ آپ لوگوں کا یہ احتجاج اب تک رائگاں ہی رہا ہے کہ انہیں پارٹی کی سربراہی چھوڑ دینی چاہیے۔ وہ ایسا ہرگز نہیں کریں گے کیونکہ اسی صورت میں پارٹی کے ہر فرد پر ان کی گرفت مضبوط رہ سکتی ہے۔ وزیراعظم بھی ان کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔"

"یہ تو ڈکٹیٹر شپ ہو گئی!" کہیں سے ایک آواز آئی۔

"جو کچھ بھی ہے، آپ کے سامنے ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گی۔ دوسری بات یہ کہ دانش یزدانی میرے دوست ہیں۔ یہ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔ میں نے سرکاری سیکیورٹی اور پروٹوکول یوں نہیں لیا کہ....." پشمینہ کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔

پے در پے دو گولیاں چلی تھیں۔ دونوں گولیاں چلنے کا درمیانی وقفہ شاید ایک سیکنڈ کا بھی نہ ہو۔ ایک گولی پشمینہ کا بایاں بازو زخمی کرتی ہوئی گزری تھی اور دوسری گولی کے نتیجے میں وہاں موجود لوگوں میں سے ایک شخص گر کر تڑپنے لگا تھا۔

پشمینہ دیکھ ہی نہیں سکی تھی کہ ڈیبرا نے کتنی پھرتی سے ریوالور نکال کر اس شخص کو نشانہ بنایا تھا جس نے پشمینہ پر گولی چلائی تھی۔

فوراً ہی بھگدڑ مچ گئی اور شور بھی گونج اٹھا۔

پشمینہ تو پل بھر کے لیے دم بخود رہ گئی تھی۔ اسے بازو پر لگنے والے زخم کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔ اسے اس کیفیت سے نکالنے والی ڈیبرا تھی جس نے اسے دایاں... بازو پکڑ کر اٹھایا تھا۔ اسی وقت دانش یزدانی اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ دوڑتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔

☆☆☆

ٹی وی چینلز اس پریس کانفرنس کو براہِ راست دکھا رہے تھے اس لیے کیمروں نے وہ منظر بھی قلم بند کر لیا تھا جب ڈیبرا نے ریوالور نکال کر گولی چلائی تھی۔ اس کے ریوالور کا رخ لوگوں کی طرف تھا اس لیے یہ بات تو سمجھی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ پشمینہ کا بازو جس گولی سے زخمی ہوا تھا، وہ گولی ڈیبرا کے ریوالور سے نکلی ہو گی۔ اس کی گولی یقیناً اس شخص کے لگی تھی جس نے پشمینہ کو نشانہ بنانا چاہا تھا۔

کئی ٹی وی چینلز پر فوراً ہی "بریکنگ نیوز" کی سلائڈ چلی اور لوگوں نے اناؤنسر کی چیختی ہوئی آواز سنی۔

"پشمینہ حیات پر عین اس وقت گولی چلائی گئی ہے جب وہ صحافیوں کے سوالات کے جواب دے رہی تھیں۔"

اناؤنسر کی آواز پس منظر میں تھی۔ اسکرین پر پریس کانفرنس کے ہال کا منظر چل رہا تھا۔ دانش یزدانی اور اس کے باڈی گارڈ پشمینہ اور ڈیبرا کو اپنے نرغے میں لیے ہوئے ہال کے اندرونی دروازے سے عمارت میں جا رہے تھے۔

اناؤنسر نے جائے واردات پر موجود اپنے چینل کے نمائندے سے رابطہ کر کے اس سے وہاں کی صورتِ حال

کے بارے میں پوچھا۔

اسکرین پر جائے واردات کے منظر میں ٹی وی کا نمائندہ بھی دکھائی دینے لگا جو کہہ رہا تھا۔ ''جی ہاں، پریس کانفرنس میں اس وقت گولیاں چلیں جب پشمینہ حیات صحافیوں کے سوالوں کا جواب دے رہی تھیں۔ فوراً ہی بھگدڑ مچ گئی تھی جو اَب رک گئی ہے۔ پشمینہ حیات اور ان کی ساتھی ڈیبرا کو دانش یزدانی اور ان کے باڈی گارڈز عمارت کے اندر لے جا چکے ہیں۔ یہاں ایک لاش پڑی ہوئی ہے اور اس کے قریب ہی ریوالور بھی دیکھا جاسکتا ہے۔''

کیمرے نے لاش کے ساتھ اس کے قریب ہی پڑا ہوا ریوالور بھی دکھایا۔ لاش خون میں لت پت اوندھی پڑی تھی اس لیے اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ وہ شخص کس عمر کا ہوگا۔

ٹی وی کا نمائندہ کہہ رہا تھا۔ ''اب یہاں پولیس بھی پہنچ چکی ہے اور تیزی سے لاش کی طرف بڑھ رہی ہے۔ صحافی حضرات بہت پریشان نظر آرہے ہیں۔ انہیں اب پولیس نے یہاں روک بھی لیا ہے۔ کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں ہے اور اب یہ دیکھیں، دانش یزدانی اپنے باڈی گارڈز کے ساتھ دوبارہ ہال میں آرہے ہیں۔''

ٹی وی نے ان لوگوں کو بھی دکھایا۔

''پشمینہ حیات کے بارے میں کچھ بتائیں؟'' اناؤنسر نے کہا۔

''وہ اپنے پیروں پر چل کر اندر گئی ہیں اس لیے سمجھا جاسکتا ہے کہ ان کے بازو پر ہی زخم آیا ہے۔ ان کی زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا۔ میں دانش یزدانی کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ پشمینہ حیات کے بارے میں اب انہی سے پوچھا......''

نمائندے کی آواز یکایک بند ہوگئی۔

اناؤنسر کی آواز آئی۔ ''معاف کیجیے گا۔ نمائندے سے ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ ہم کوشش کررہے ہیں کہ رابطہ دوبارہ ہوجائے اور آپ کو ایک ایک پل کی صورتِ حال سے آگاہ کیا جاتا رہے۔''

اسی وقت ٹی وی اسکرینز سے ہال کا منظر غائب ہوگیا اور چند لمحے بعد بتایا گیا کہ پولیس نے کیمرے بند کروا دیے تھے۔

ٹی وی اسکرینز پر اب صرف اناؤنسر دکھائی دے رہی تھی اور ٹی وی کا نمائندہ موبائل پر کہہ رہا تھا۔ ''دانش یزدانی سے بات نہیں ہوسکی۔ باڈی گارڈز نے ان کے قریب جانے ہی نہیں دیا۔ اب یہاں کسی کو بھی لاش کے قریب جانے کی اجازت نہیں ہے۔ دانش یزدانی کو بھی لاش کے قریب نہیں جانے دیا گیا۔ اب پولیس ان سے کچھ بات کررہی ہے۔''

☆☆☆

ڈاکٹر رفیقی، دانش یزدانی کا مستقل ڈاکٹر تھا جو دانش منزل ہی میں رہتا تھا اور دانش یزدانی کہیں جاتا تھا تو اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اسی نے پشمینہ کے بازو کی ڈریسنگ کی تھی۔ زخم بھی معمولی نوعیت کا آیا تھا۔ اس وقت پشمینہ دانش منزل کے جس کمرے میں تھی، وہیں اس کے ساتھ دانش یزدانی کی والدہ اور بہن بھی تھیں۔ ڈیبرا وہاں نہیں تھی۔

کمرے میں ٹی وی پر خبریں نشر ہورہی تھیں۔ ان تینوں کی توجہ ٹی وی ہی پر تھی لیکن پشمینہ کے معاملے میں بظاہر ہی ایسا تھا۔ اس کے دماغ میں بہت سے خیالات گردش کررہے تھے۔

دانش یزدانی وہاں آیا تو ان تینوں ہی نے اس کی طرف دیکھا۔

''پولیس ڈیبرا کو گرفتار کرنا چاہتی ہے۔'' اس نے پشمینہ سے کہا۔ ''مجھ سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اسے ان کے حوالے کردوں۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ یہاں سے جاچکی ہے لیکن انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔ اس کا امکان ہے کہ جلد ہی وہ دانش منزل کی تلاشی کا اجازت نامہ حاصل کرلیں۔ فی الحال تو وہ تمہارا بیان لینا چاہتے ہیں۔ میں انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر آرہا ہوں۔''

پشمینہ فوراً کھڑی ہوگئی۔ ''ٹھیک ہے۔''

''خدا سب خیر کرے۔'' دانش کی والدہ نے متفکر لہجے میں کہا۔

بہن متفکر نظر آرہی تھی۔ وہ کچھ نہیں بولی۔

دانش یزدانی کے ساتھ پشمینہ ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ وہاں دو پولیس آفیسر موجود تھے۔ ایک کانسٹیبل بیرونی دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔

''میڈم!'' ایک پولیس آفیسر بولا۔ ''آپ کا زخم معمولی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے۔''

''جی ہاں۔'' پشمینہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''آپ اس کی ایف آئی آر کس کے خلاف درج کروائیں گی؟''

''میں ایف آئی آر ہی درج نہیں کرانا چاہتی۔ پولیس اپنے طور پر درج کرنا چاہے تو کرلے۔''

''معاملہ کیا ہوا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے جس کی لاش باہر پڑی ہے۔ اس نے مجھے ختم کرنا چاہا تھا لیکن ڈیبرا کی پھرتی نے میری جان بچالی۔ وہ میرے برابر میں بیٹھی تھی۔ اس کا ڈیٹیچی بیگ اس کی گود میں تھا۔ ریوالور اسی میں تھا۔ جیسے ہی اس نے ایک شخص کو ریوالور نکالتے دیکھا، اس نے پھرتی سے اپنا ریوالور نکال کر اس پر گولی چلا دی۔ وہ گولی اسے غالباً عین اس وقت لگی جب وہ ٹریگر دبا چکا تھا۔ ڈیبرا کی گولی لگنے ہی کی وجہ سے اس کا نشانہ خطا گیا ورنہ اس قسم کے کام جس سے بھی کروائے جاتے ہیں، وہ بڑا اچھا نشانے باز ہوتا ہے۔ ڈیبرا اتنی پھرتی اس لیے دکھا سکی کہ اس کا ہاتھ کھلے ہوئے ڈیٹیچی بیگ میں رکھے ریوالور کے دستے پر تھا۔''

''تو کیا ڈیبرا کو اس کا علم تھا کہ آپ پر کوئی گولی چلائے گا؟''

''باڈی گارڈ کو ہر قسم کی صورتِ حال کی توقع رکھنی پڑتی ہے۔''

''وہ آپ کی دوست ہے یا باڈی گارڈ؟''

''دوست بھی اور باڈی گارڈ بھی۔''

''کیا اس امکان کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ وہ شخص دراصل کسی اور کو نشانہ بنانا چاہتا تھا لیکن ڈیبرا کی گولی لگنے کی وجہ سے اس کا نشانہ خطا گیا اور وہ گولی اس کے اصل ٹارگٹ کے بجائے آپ کے بازو پر جالگی۔''

''خوب!'' پشمینہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔ ''پولیس کو اتنا ہی سمجھدار ہونا چاہیے۔''

''پہلی گولی ڈیبرا نے چلائی۔ یہ آپ ابھی خود بھی کہہ چکی ہیں۔ اس طرح ان پر قتل کا الزام ہوتا ہے۔ ہم اس کی گرفتاری چاہتے ہیں۔ وہ کہاں ہے؟''

''اسے میں نے یہاں سے فوراً بھگا دیا تھا۔'' پشمینہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''جی!'' پولیس آفیسر کے منہ سے نکلا۔ اسے اس جواب کی توقع نہیں ہوگی۔

''ہاں۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''مجھے اندازہ تھا کہ ایسی کوئی بات ہوسکتی ہے لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ اسے بھگا دیا جائے۔ وہ صرف کل تک روپوش رہے گی۔ کل اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کرالی جائے گی۔''

''یہ فرار تو ممکن نہیں۔ پولیس شروع ہی سے عمارت کے سامنے موجود رہی ہے۔''

''اسے پچھلی دروازے سے نکالا گیا ہے۔ اس نے بجائے آپ مجھے گرفتار کرلیں۔'' پشمینہ نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''آپ کے مجرم کو بھگایا ہے میں نے، جرم میں معاونت بھی تو جرم ہے۔''

''ہمیں جو حکم ملا ہے، ہم وہی کرسکتے ہیں۔''

''کہاں سے حکم ملا ہے؟''

''بہت اوپر سے۔''

''تو آپ تعمیل کی کوشش کیجیے..... اب آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکی۔''

دونوں پولیس افسروں کے چہروں سے بے بسی کا اظہار ہورہا تھا۔ انہیں کتنی ہی سختی کرنے کے احکام کیوں نہ ملے ہوں، ان کے ذہن سے یہ بات بہرحال نہیں نکل سکتی تھی کہ وہ ملک کے صدر کی بیٹی سے مخاطب تھے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے اور پھر وہ کھڑے ہوگئے۔

''ہمیں اجازت؟'' ایک نے پشمینہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

پشمینہ بولی۔ ''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں، اب آپ جا سکتے ہیں۔''

ان باتوں کے دوران میں دانش یزدانی بالکل خاموش رہا تھا۔ پولیس افسروں کے جانے کے بعد اس نے کہا۔ ''تم نے تو انہیں گیدڑ بنا دیا!''

''ہماری پولیس اسی قابل ہو چکی ہے۔ یہ شیر دل اس وقت بنتی ہے، جب مقابل کوئی غریب، کوئی معمولی شخص ہوتا ہے۔''

''مجھے گھیرنے کی کوشش تو کی جائے گی۔ الزام مجھ پر ہی لگے گا ڈیبرا کو فرار کرانے کا۔''

''تم فوری طور پر اپنے قانونی مشیروں سے بات کرو۔ میں اب چلتی ہوں۔ آئندہ وقت کے لیے تو سیاست دانوں، قلم کاروں اور میڈیا والوں کو بدترین حالات کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوجانا چاہیے۔ میرے علم کے مطابق صدر مملکت کی تیاری تو غالباً مکمل ہو چکی ہے۔ میں یہ بات صرف تمہیں بتا رہی ہوں۔ جو تیاری کی گئی ہے، اس پر بہت جلد عمل بھی شروع ہوگا اور لوگوں کو معلوم ہوجائے گا کہ اب ملک پر مکمل ڈکٹیٹر شپ قائم ہو چکی ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' دانش یزدانی بہت سنجیدہ نظر آیا۔ ''کیا تیاری کی ہے صدر حیات نے؟''

''کنٹری سیورز (COUNTRY SAVERS) کے نام سے ایک ادارہ بہت جلد کام شروع

کرنے والا ہے۔ اس کے اہلکاروں کے اختیارات سمجھ لو کہ لامحدود ہوں گے۔ کسی کو بھی کوئی جواز بتائے بغیر گرفتار کیا جاسکے گا۔ اس کا سربراہ غالباً لیفٹیننٹ جنرل چنگیزی کو بنایا جائے اور یہ بات تو اب خاصی مشہور ہو چکی ہے کہ وہ صرف نام کا چنگیزی نہیں، واقعی چنگیزی ہے۔''

''بہت ہی خوفناک اور تشویش کن خبر دے رہی ہو تم!'' دانش یزدانی خاصا متفکر ہو گیا۔

''اور یہ تیاری اتنی رازداری سے کی گئی ہے کہ میڈیا کے زیرک ترین رپورٹرز کو اس کی ہوا بھی نہیں لگ سکی۔ مجھے اس کا علم اس لیے ہے کہ نیا اسکینڈل سامنے آنے سے پہلے صدر مملکت کو مجھ پر مکمل اعتماد تھا۔ میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ یہ میں صرف تمہیں بتا رہی ہوں۔ مطلب یہ کہ ابھی کسی اور کو نہ بتانا۔ بات کا شہرہ ہو گیا تو صدر مملکت یہی سمجھیں گے کہ میں نے ہی یہ سب کچھ آشکارا کیا ہے۔ میری ممی اور بھائی جان بھی اس سے واقف نہیں۔ مجھے یہ بات اس لیے بتا دی گئی کہ شاید مجھے وزارتِ تعلیم سے ہٹا کر کنٹری سیورز میں کوئی منصب دیا جاتا۔''

اب دانش یزدانی کے چہرے پر تفکر کے ساتھ ساتھ غور و فکر کے تاثرات بھی تھے۔

''اچھا!'' پشمینہ کھڑی ہو گئی۔

''پولیس اور اب تمہاری ان باتوں کی وجہ سے میں سوال ہی نہیں کر سکا کہ اب رہو گی کہاں؟'' دانش بھی کھڑا ہو گیا۔

''کیا مطلب؟ ظاہر ہے کہ وہیں رہوں گی جہاں رہتی ہوں۔''

''اس واقعے کے بعد بھی؟'' دانش یزدانی نے حیرت سے کہا۔

''تمہارا اشارہ قاتلانہ حملے کی طرف ہے؟''

''یقیناً'' دانش نے زور دے کر کہا۔ ''اب تم قصرِ صدارت میں خود کو محفوظ کیسے سمجھ سکتی ہو؟''

''نہیں دانش۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ابھی وہ اس حد تک نہیں جا سکتے کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کروائیں۔ اس میں کسی اور کا ہاتھ ہے۔ کھوج لگانا پڑے گا اس کا۔''

''میں تو کہوں گا کہ تم خوش فہمی کا شکار ہو رہی ہو۔ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ اقتدار کے لیے باپ اور بھائیوں تک کو بلکہ اولاد کو بھی نہیں بخشا گیا۔ ابھی تم کنٹری سیورنامی ادارے کی بات کر چکی ہو، ممکن ہے کہ اسے آج ہی سے فعال کیا گیا ہو۔ تم پر فائر کرنے والے کا تعلق اس ادارے سے ہو سکتا ہے۔''

''نہیں دانش! اگر اس ادارے کو فعال کیا جا چکا ہوتا تو تم اب تک گرفتار کیے جا چکے ہوتے۔ تمہاری گرفتاری کے لیے تو جواز بھی دے دیا جاتا۔''

''میرے خلاف کیا جواز بنتا؟''

''یہی کہ تم نے یہ پریس کانفرنس اپنے گھر میں اسی لیے کروائی تھی کہ مجھے بہ آسانی ختم کر سکو۔''

''تمہیں قتل کروانے کا میرے پاس کیا جواز ہو سکتا ہے؟''

''میں اب جس روپ میں سامنے آئی ہوں، اس روپ میں اگر کوئی سیاسی پارٹی بناتی ہوں تو بہت تیزی سے وہ پارٹی ملک کی سب سے مقبول سیاسی پارٹی بن جائے گی جس سے تمہاری پارٹی کی مقبولیت میں بھی کمی آئے گی۔''

دانش یزدانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ اندازہ تو مجھے ہے کہ اگر تم نے پارٹی بنائی تو وہ اس ملک کی سب سے مقبول پارٹی ہو گی جو اگلے سال ہونے والے انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گی۔''

''انتخابات میں کامیابی۔'' پشمینہ ہنس پڑی۔ ''خام خیالی ہے تمہاری کہ انتخابات ہوں گے۔ صرف ریفرنڈم ہو گا اور وہ بھی کچھ اس انداز سے کہ اس میں برسرِاقتدار پارٹی ہی کامیاب ہو گی۔ اس کا پلان تو تیار بھی کیا جا چکا ہے۔''

''او، مائی گاڈ!'' دانش یزدانی کے منہ سے نکلا، پھر اس نے کہا۔ ''پریس کانفرنس میں کسی صحافی کی یہ بات ٹھیک ہی تھی کہ گھر کی بھیدی ہو اس لیے بہت کچھ بتا سکتی ہو!''

''ٹھیک کہا تھا اس نے۔'' پشمینہ نے اب دروازے کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیے تھے۔ ''لیکن جو باتیں میں تمہیں بتا رہی ہوں، پریس کانفرنس میں ہرگز نہیں کہتی۔ انہی باتوں کی روشنی میں تم اپنا مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرو۔''

دانش یزدانی نے متفکرانہ انداز میں سر ہلایا۔

''ہاں! ایک بات پوچھنا تو بھول ہی گئی۔'' پشمینہ ڈرائنگ روم سے نکلتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے دو باڈی گارڈ بھی ڈیبرا کے ساتھ گئے تھے۔ ڈیبرا نے انہیں کہاں سے واپس کیا تھا؟''

''میں بھی تمہیں یہ بتانا بھول گیا۔ باڈی گارڈز نے بتایا ہے کہ وہ ایک بارونق سڑک پر گاڑی سے اتر گئی تھی۔ کسی محفوظ ٹھکانے تک نہیں پہنچی تھی۔''

''اس بارے میں مت سوچو۔ وہ بہت ذہین ہے۔ اپنی حفاظت کرنا خوب جانتی ہے۔ میں نے بھی اس سے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ بس اتنا ہی کہا تھا کہ وہ فوری طور پر یہاں سے نکل جائے۔''

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے برآمدے تک پہنچ گئے تھے۔ سامنے ہی پشمینہ کی کار موجود تھی۔ شوفر کار کے قریب کھڑا تھا۔ پشمینہ کو دیکھ کر وہ کار کے پچھلے دروازے کے بالکل قریب ہوگیا تاکہ پشمینہ کے قریب آتے ہی اس کے لیے پچھلا دروازہ کھول سکے۔

''میں کوشش کروں گی کہ تم سے مستقل رابطہ رہے۔''

''تو تم اپنے فیصلے پر نظرثانی نہیں کرو گی؟ قصرِ صدارت ہی جاؤ گی؟''

''ہاں۔''

''میرے لاشعور میں کوئی بات کھٹک رہی ہے۔ وہ کوئی دلیل ہے جو تمہیں خطرے کا یقین دلا دے اور تم قصرِ صدارت نہ جاؤ۔''

''محض خیال ہے تمہارا۔ ایسی کوئی دلیل نہیں ہوگی تمہارے دماغ میں۔'' پشمینہ نے کہا، پھر مسکرا کر بولی۔ ''اگر وہ تمہارے لاشعور سے شعور میں آجائے تو مجھے اطلاع دینا۔'' وہ بات ختم کرکے بھی مسکراتی رہی۔ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ قاتلانہ حملے نے اسے ذرا بھی خوف زدہ نہیں کیا تھا۔

''فی الحال تمہاری باڈی گارڈ ڈیبرا بھی تمہارے ساتھ نہیں ہے۔'' دانش نے اس وقت کہا جب شوفر نے پشمینہ کے لیے کار کا دروازہ کھول دیا تھا۔ ''میں اپنے باڈی گارڈز کی ایک گاڑی تمہاری کار کے پیچھے بھیجوں گا۔ قصرِ صدارت سے وہ گاڑی واپس آجائے گی۔ اب تم سرکاری سیکیورٹی نہیں لینا چاہتیں تو میری ہی طرح پرائیویٹ گارڈز کا بندوبست کرو۔''

پشمینہ جواب میں کچھ کہے بغیر صرف سر ہلاتے ہوئے کار میں بیٹھ گئی۔

اس وقت وہاں اس اعتبار سے سناٹا تھا کہ لاش ہال سے اٹھوانے کے بعد پولیس بھی رخصت ہوچکی تھی اور صحافی حضرات بھی جاچکے تھے۔

☆☆☆

ڈیبرا، دانش یزدانی کے گارڈز کی گاڑی سے جس جگہ اتری تھی، وہاں سے ایک چوراہے کا سگنل چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ ڈیبرا یہ بھی دیکھ چکی تھی کہ سگنل کی سبز روشنی بند ہونے کے بعد زرد روشنی نظر آنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ٹریفک کی رفتار بہت بڑھی تھی اور سرخ روشنی ہوئی تو سب گاڑیاں رک چکی تھیں۔

ڈیبرا انہی گاڑیوں کے ہجوم میں داخل ہوکر باڈی گارڈز کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اسے ایک خاص قسم کی کار کی تلاش تھی۔ آخر اسے وہ کار دکھائی دے گئی۔ اس کار کی ''خصوصیت'' یہ تھی کہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان کے سوا کار میں کوئی نہیں تھا۔

''پلیز! کیا آپ مجھے لفٹ دے سکتے ہیں؟''

نوجوان اسے دیکھ کر چونکا۔ وہ یقیناً اسے پہچان کر چونکا ہوگا۔ پشمینہ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے عام لوگ بھی اسے پہچانتے تھے۔

''جی..... جی ہاں، ضرور۔'' نوجوان نے جلدی سے کہا۔

ڈیبرا بہت تیزی سے دروازہ کھول کر نوجوان کے برابر میں بیٹھ گئی اور بولی۔ ''دراصل اچانک میری کار خراب ہوگئی اور مجھے کہیں پہنچنے کی بہت عجلت ہے۔'' کار کا دروازہ کھولتے وقت اس نے دستانے پہن لیے تھے جو اس کے ڈبیٹی بیگ میں رہتے ہی تھے۔

''آپ پشمینہ حیات صاحبہ کے ساتھ تھیں نا پریس کانفرنس میں!'' نوجوان بولا۔ ''وہاں قتل ہوگیا۔ ٹی وی پر خبریں چل رہی تھیں لیکن مجھے ایک ضروری کام تھا اس لیے گھر سے نکل پڑا۔''

''آپ نے مجھے پہچاننے میں غلطی نہیں کی ہے۔'' ڈیبرا نے دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ اس کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اسے پسند آیا ہو۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ ایسی مسکراہٹ اور نگاہِ غلط انداز کا نوجوانوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔

''جی..... جی.....'' نوجوان ریشہ خطمی ہوتا نظر آیا۔

''آپ کو..... آپ کو کہاں جانا ہے؟''

''آپ جس طرف جارہے ہیں اسی طرف چلیے۔ اگر مجھے کہیں اور جانا ہوگا تو میں اس جگہ آپ کی گاڑی سے اتر کر کسی اور سے لفٹ لے لوں گی۔ شاید ٹیکسی ہی مل جائے۔ جہاں سے آپ کی کار میں بیٹھی ہوں، وہاں سے ٹیکسی ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

''آپ میرے کام کی پروا مت کیجیے۔ میں آپ کو وہیں پہنچادوں گا جہاں آپ کو جانا ہے۔''

ڈیبرا کو نوجوان سے اسی جواب کی توقع تھی۔ اس کی نگاہِ غلط انداز نے نوجوان کو ''ڈھیر'' کردیا تھا۔

''ابھی تو سیدھے چلتے رہیے!'' ڈیبرا نے کہا۔

"جہاں سے کسی طرف مڑنا ہوگا، میں بتادوں گی۔"

"میری خوش قسمتی ہے کہ آپ کو اتنے قریب سے دیکھ رہا ہوں۔" نوجوان کی آواز اس مرتبہ بھرائی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً جذباتی ہو چکا ہے۔

ڈیبرا نے اسے ایک بار پھر اسی مسکراہٹ اور نگاہِ غلط انداز سے دیکھا جیسے ایک بار دیکھ چکی تھی۔ پھر فوراً ہی ایک جگہ اسے گاڑی بائیں سڑک پر موڑنے کے لیے کہا۔

ڈیبرا کو اب یقین تھا کہ نوجوان اس کے اشارے پر ناچتا رہے گا۔ اس وقت اس نے اپنا موبائل نکالا اور گریٹا میلسی کے موبائل سے رابطہ کیا۔

گریٹا میلسی کہنے کو تو اس کی ملازمہ تھی جس کی عمر پینتالیس سال سے کچھ زیادہ ہوگی لیکن ڈیبرا نے اسے کبھی ملازمہ نہیں سمجھا تھا۔ برطانیہ میں وہ اس کی گورنس تھی۔ ڈیبرا کا زیادہ وقت اس کی گود میں گزرا تھا۔ وہ جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھی اور اس نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے ڈیبرا سے اتنی محبت ہوگئی تھی کہ جب ڈیبرا برطانیہ چھوڑ کر یہاں آئی تو گریٹا بھی اس کے ساتھ آگئی تھی۔ اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ ڈیبرا سے دور ہو جائے۔ سو ڈیبرا کے اپارٹمنٹ میں ہی رہتی تھی اور تمام گھریلو کام کی ذمے داریاں اسی نے سنبھال رکھی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد ڈیبرا اسے "ماسی" کہنے لگی تھی۔

"یس ڈیبو!" دوسری طرف سے گریٹا میلسی کی آواز آئی۔ "شکر ہے کہ تم نے مجھے فون کرلیا۔ میں ٹی وی کی خبریں سن سن کر بہت گھبرا رہی تھی۔ تم ٹھیک ہو نا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں ماسی!" ڈیبرا نے انگریزی میں کہا۔ گریٹا اردو بہت کم جانتی تھی۔ "میں جو کچھ کہوں، اس پر بہت تیزی سے عمل کرنا ہے۔ تم میرا وہ لباس نکالو جو میں بہت خاص موقعوں پر پہنتی ہوں۔" وہ لباس "ساڑی" تھی لیکن اس نوجوان کے سامنے وہ "ساڑی" کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی...... اس نے ایسے الفاظ میں، جن سے نوجوان واضح طور پر بات نہ سمجھ سکے، گریٹا کو ہدایت کی کہ وہ ساڑی لے کر نکلے اور ٹیکسی کر کے وہاں سے روانہ ہو۔ اس نے ٹیکسٹائل ملز کے علاقے کی ایک سڑک کا نام بتایا جہاں گریٹا کو پہنچنا تھا۔ اس نے اس سڑک پر لگے ہوئے ایک ہورڈنگ کی بھی نشاندہی کی جہاں پہنچ کر اسے کار چھوڑ دینی تھی اور موبائل پر اس سے رابطہ کرنا تھا۔

"اس علاقے میں کیوں جارہی ہیں آپ؟" نوجوان نے اس سے اس وقت پوچھا جب وہ موبائل بند کر چکی تھی۔

"اگر تمہیں جلدی ہے ڈیئر تو مجھے کہیں بھی اتار دو۔" ڈیبرا نے اس مرتبہ بے تکلفی اختیار کی۔ لفظ "ڈیئر" نے تو نوجوان کے دماغ میں چٹخاکا کر دیا ہوگا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" نوجوان نے جلدی سے کہا۔ "بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔"

"وہاں سے میں کہیں اور جاؤں گی۔ وہاں ایک صاحبہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ وہ ایک ٹیکسٹائل مل کے مالک کی بیٹی ہیں۔ تمہیں بس وہیں تک زحمت دوں گی۔"

"اچھا اچھا۔" نوجوان نے سر ہلایا۔ "وہ میٹنگ پوائنٹ ہے۔"

"ہاں۔" ڈیبرا ہنسی۔ "یہی کہہ لو۔"

"کیا آپ سے آئندہ بھی ملاقات ہوسکتی ہے؟" نوجوان نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "صدارتی محل تو میں شاید...... میرا مطلب ہے وہاں تو آپ مجھے بلا نہیں سکتیں شاید......"

"میرا اپنا اپارٹمنٹ ہے۔ قصرِ صدارت تو میں اس وقت جاتی ہوں جب پشمینہ صاحبہ مجھے طلب کرتی ہیں۔"

"آپ اپنا موبائل نمبر دے دیں گی؟" نوجوان کا انداز ملتجیانہ سا تھا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔"

ڈیبرا نے اسے ایک فرضی فون نمبر بتایا جو اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر اپنے موبائل میں فیڈ کرتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی آپ کو مس کال دے دیتا ہوں۔ میرا نمبر بھی آپ کے پاس آجائے گا۔"

"نہیں، پلیز! جلدی سے اسٹیئرنگ سنبھالیے۔ کوئی ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتا ہے تو مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔"

"ارے!" وہ ہنسا۔ نمبر اس نے فیڈ کرلیا تھا۔ موبائل اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ "جب آپ میری کار سے اتر کر اپنی دوست کی کار میں جائیں گی، اس وقت دے دوں گا آپ کو مس کال۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

پھر نوجوان اس سے پریس کانفرنس کی واردات کے بارے میں پوچھنے لگا۔ ڈیبرا نے اسے مختصر طور پر جواب دینے کے بعد کہا۔ "اس کے بعد ہی میں پشمینہ صاحبہ کا ایک پیام لے کر کسی سے ملنے جارہی ہوں۔"

"آپ ان کی باڈی گارڈ ہیں نا، آپ نے اس آدمی پر گولی چلائی تھی جس نے پشمینہ صاحبہ پر فائر کیا تھا۔"

ڈیبرا نے اس بات کی نفی نہیں کی کیونکہ اس کے

انداز ے کے مطابق ٹی وی چینلز پر یہ بات نشر ہو جانا لازمی تھا۔

"باڈی گارڈ کی حیثیت سے مجھے یہ کرنا ہی تھا۔" اس نے کہا۔

"آپ انگلش ہیں لیکن بہت صاف اردو بولتی ہیں۔"

ڈیبرا ہنس دی۔

ابھی باتوں میں وہ سڑک آ گئی جہاں ڈیبرا نے گریٹا کو بلایا تھا۔

"اب......" ڈیبرا نے کہا۔ "بائیں جانب کی ایک گلی چھوڑ کر دوسری گلی میں مڑنا ہے۔"

"یہ تو بڑی تنگ گلیاں ہیں۔" نوجوان کچھ الجھ کر بولا۔

"بات نہیں سمجھو گے تم ڈیئر! کوئی وجہ ہے اس کی۔" ڈیبرا نے کہتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔

یہ بڑا موثر حربہ تھا۔ اگر کوئی خوب صورت اور اجنبی لڑکی کسی نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دے تو وہ شاید کسی اندھے کنویں میں بھی چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔

نوجوان نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کار اس گلی میں موڑ دی جہاں ڈیبرا جانا چاہتی تھی۔

اس گلی میں دو بہت بڑی ٹیکسٹائل ملز کی عقبی دیواریں تھیں۔ یہاں کسی کا آنا جانا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود یہ گلیاں کیوں تھیں؟ ڈیبرا کو اس کا علم نہیں تھا۔ وہ تین مرتبہ وہ اس سڑک سے گزر چکی تھی اس لیے یہ گلیاں بھی اس کی نظروں میں آئی تھیں۔ ان کا نظر میں آنا آج اس کے کام بھی آنے والا تھا۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتی تھی، وہ سڑک پر ممکن نہیں تھا۔ اِکّا دُکّا گاڑیاں یا ٹرک وہاں سے گزرتے ہی رہتے تھے لیکن ان گلیوں میں سناٹا ہی رہتا تھا۔

سڑک کی بہ نسبت وہاں کچھ تاریکی بھی تھی۔ شام کے چھ ساڑھے چھ بجے کا درمیانی وقت ہو چکا تھا۔

بمشکل ایک فرلانگ آگے نکلنے کے بعد ڈیبرا نے کار رکوائی اور پھر نوجوان کے سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ دیکھ ہی نہیں سکا تھا کہ ڈیبرا نے کب اپنے دستی بیگ سے ریوالور نکالا تھا۔ وہ اس نے نال سے پکڑ کر اس کا دستہ نوجوان کی کنپٹی پر مارا تھا۔ ضرب لگتے ہی نوجوان اپنی سیٹ پر ایک طرف ڈھلک گیا۔

جس زمانے میں ڈیبرا خفیہ ایجنسی میں جانے کے لیے تربیت حاصل کر رہی تھی، اسی زمانے میں اس نے سیکھا تھا کہ کسی انسان کی کنپٹی پر کس جگہ کتنی زور سے ضرب لگا کے اسے کتنی دیر کے لیے بے ہوش کیا جا سکتا ہے۔

ڈیبرا کے انداز ے کے مطابق وہ نوجوان اب آدھے گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آ سکتا تھا۔

نوجوان کو بے ہوش کرنے کے بعد ڈیبرا نے گلی میں دونوں جانب دور تک نظر دوڑائی اور پھر اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔

پھر دس منٹ گزرے تھے کہ موبائل پر گریٹا میلسی کی کال آ گئی۔ اس نے اطلاع دی کہ اس نے ڈیبرا کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ کر ٹیکسی چھوڑ دی ہے۔

ڈیبرا نے اسے بتایا کہ وہ کس جانب کتنا چل کر اس گلی میں پہنچ سکتی ہے جہاں وہ اس وقت ایک بے ہوش نوجوان کی کار میں تھی۔ اس نے گریٹا کو کار کا نمبر اور رنگ بھی بتا دیا۔

تین چار منٹ بعد ہی گریٹا وہاں پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ وہ سب کچھ تھا جو ڈیبرا نے منگوایا تھا۔

گریٹا جب ڈیبرا کے کہنے پر دروازہ کھول کر کار میں بیٹھی تو اس نے بے ہوش نوجوان کو بھی دیکھ لیا اور اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"سب کچھ بتا دوں گی۔ پہلے میں تیار ہو جاؤں۔" ڈیبرا نے اس سے کہا۔

کار میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے لباس تبدیل کیا۔ ساڑی باندھنے کے بعد اس نے ایک مرتبہ اپنے کٹے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا جو اس کے شانوں تک تھے۔ پھر اس نے گریٹا کی لائی ہوئی باسکٹ سے لمبے بالوں کی ایک وِگ نکال کر اپنے سر پر سیٹ کی۔ اس کے بعد اپنے چہرے پر گہرا میک اپ شروع کیا۔ عام حالت میں وہ میک اپ تو کیا، ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک بھی نہیں لگاتی تھی۔ سب کچھ اس نے بڑی تیزی سے کیا تھا، پھر بھی اس میں دس منٹ لگے۔ نوجوان کو بے ہوش ہوئے پچیس منٹ گزرنے کو تھے۔ پانچ منٹ بعد اسے ہوش آ سکتا تھا۔

گریٹا کی مدد سے اس نے نوجوان کو پچھلی نشست کے پائیدان میں ڈال دیا اور خود بھی پچھلی نشست پر بیٹھی گھڑی دیکھتی رہی۔ اسے نوجوان کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا تھا تاکہ اسے دوبارہ بے ہوش کر سکے۔ اسے تربیت کے دوران میں بتایا گیا تھا کہ کسی کو بے ہوشی کی حالت میں کنپٹی پر ضرب لگا کر دوبارہ بے ہوش کرنے سے کبھی اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بیٹھی گریٹا خاموشی سے

سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ڈیبرا کا یہ بدلا ہوا حلیہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ اس کا متعدد بار کا دیکھا ہوا تھا۔

بے ہوش نوجوان کلبلایا تو ڈیبرا نے نال کی طرف سے ریوالور پکڑ لیا پھر جیسے ہی نوجوان نے ہڑبڑا کر اٹھنا چاہا، ڈیبرا نے اس کی دوسری کنپٹی پر ضرب لگا دی۔ وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔ ڈیبرا نے اس پر ایک چادر ڈال دی جو اسی سامان میں تھی جو اس نے گریٹا سے منگوایا تھا۔

ڈیبرا بڑی تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آئی اور انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔ ''پچیس منٹ کے اندر اندر مجھے یہ کار چھوڑنی ہوگی۔''

کار وہ سیدھی لیے چلی گئی اور دوسری جانب کی سڑک پر پہنچ کر اس کا رخ شہر کی طرف جانے والے راستے پر موڑ دیا۔

اب رات کا اندھیرا اتر آیا تھا اس لیے ڈیبرا کار کی ہیڈلائٹ بھی کھول چکی تھی۔

کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے ڈیبرا نے گریٹا کو سب کچھ بتانا شروع کیا۔ وہ اس پر اتنا ہی اعتماد کرتی تھی جتنا خود پر۔

سب کچھ بتانے کے بعد اس نے کہا۔ ''کل تک تمہیں اکیلا ہی رہنا ہے۔ ابھی میں نہیں کہہ سکتی کہ کب آسکوں گی۔ انحصار اس بات پر ہے کہ کل مجھے ضمانت قبل از گرفتاری مل سکے گی یا نہیں۔ امید تو ہے کہ پشمینہ کی وجہ سے کل ہی یہ کام ہو جائے گا۔''

سب کچھ جاننے کے بعد گریٹا متفکر تو ہوئی لیکن اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ پندرہ منٹ بعد ہی کار ایک ایسی سڑک پر دوڑ رہی تھی جہاں ٹریفک بہت زیادہ تو نہیں لیکن کم بھی نہیں تھا۔

ڈیبرا نے کار ایک ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب روکی۔

''اب تم گھر جاؤ ماسی!...... میرا کوئی بھی فون آئے تو یہی جواب دینا کہ میں ابھی گھر نہیں آئی۔''

''اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر گریٹا کار سے اتر گئی۔

ڈیبرا نے انجن اسٹارٹ ہی رکھا تھا۔ وہ فوراً کار حرکت میں لے آئی۔ نوجوان کو دوبارہ بے ہوش ہوئے پچیس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ڈیبرا نے کار ایک بڑی مارکیٹ کے سامنے روکی جہاں اور بھی کاریں کھڑی تھیں۔

جب وہ کار سے اتری تو اس کی آنکھوں پر بظاہر نظر کا چشمہ تھا لیکن اس میں لگے ہوئے سفید شیشے پلین تھے۔ اس وضع قطع میں اسے کوئی ڈیبرا کی حیثیت سے اس وقت تک نہیں پہچان سکتا تھا جب تک قریب آکر اسے غور سے نہ دیکھے۔ اس حلیے میں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی مغربی لڑکی ہے۔

کچھ دور پیدل چلنے کے بعد اس نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر ڈرائیور کو وہ پتا بتا دیا جہاں اسے جانا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد ٹیکسی ایک پوش علاقے کی سات منزلہ عمارت کے سامنے رکی۔ اس عمارت میں اپارٹمنٹس تھے۔ دوسری منزل پر ایک اپارٹمنٹ اس نے بیس دن قبل پشمینہ ہی کے کہنے سے لیا تھا۔

''حالات کچھ ایسے ہی ہیں ڈیبرا!'' پشمینہ نے کہا تھا۔ ''ہمیں کسی وقت بھی کسی ایسی جگہ کی ضرورت پڑ سکتی ہے جس کا علم ہمارے کسی جاننے والے کو نہ ہو۔''

اپارٹمنٹ خریدتے ہوئے اس نے ظاہر کیا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور یہ اپارٹمنٹ اس نے اپنے والدین کے لیے خریدا ہے جو کچھ عرصے میں امریکا سے آنے والے ہیں۔

اس کے بعد وہ ان بیس دنوں میں دو چار بار ہی اس اپارٹمنٹ میں آئی تھی اور اسے پشمینہ کا جملہ یاد آگیا تھا کہ ''ہمیں کسی وقت بھی کسی ایسی جگہ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد وہ سب سے پہلے بیڈروم کی ایک الماری کے قریب گئی۔ اسے کھولا، پھر اسی میں ایک خفیہ دراز بھی کھولی۔ اس میں سے اس نے سیٹلائٹ فون نکالا اور کسی سے رابطہ کیا۔

دوسری طرف سے کال ریسیو کرنے والے نے کہا۔ ''میں سب حالات سے آگاہ ہوں۔ تم صرف اپنی خیریت سے آگاہ کرو۔ ٹی وی پر میں یہ خبر سن چکا ہوں کہ پولیس تمہیں گرفتار کرنا چاہتی تھی لیکن تم دانش منزل سے کہیں غائب ہو چکی ہو۔ میں صرف اسی سلسلے میں زیادہ فکرمند تھا۔''

ڈیبرا نے طویل سانس لی۔ ''تو پشمینہ کا یہ خدشہ غلط نہیں تھا کہ پولیس مجھے گرفتار کر سکتی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں فوراً دانش منزل سے غائب ہو جاؤں۔ اب میں ایک محفوظ جگہ پر ہوں اعلیٰ حضرت! میں نے آپ کو صرف اسی لیے فون کیا تھا کہ آپ فکرمند ہوں گے۔''

''یقیناً میں فکرمند تھا۔''

ڈیبرا نے جس شخصیت کو اعلیٰ حضرت کہہ کر مخاطب کیا تھا، اس سے اس کی گفتگو کئی منٹ جاری رہی۔ پھر اس نے فون بند کر کے خفیہ دراز میں رکھا اور الماری بند کر دی۔ وہ

اب بہت تھکی ہوئی تھی۔ ساڑی اور سینڈل اتارے بغیر ہی بستر پر ڈھیر ہوگئی۔

☆☆☆

پشمینہ کو رخصت کرنے کے بعد دانش یزدانی سوچ میں ڈوبا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں اس کی پارٹی کے سرکردہ افراد شروع ہی سے جمع تھے۔ ظاہر ہے کہ اس اجلاس کی صدارت دانش ہی کرتا۔ اس اجلاس میں یہ طے کیا جانا تھا کہ پشمینہ کی نسبت سے جو واردات ہو چکی ہے، اس پر پارٹی کی طرف سے کیا ردِعمل ظاہر کیا جاتا۔ ٹی وی کی خبروں کے مطابق سیاسی پارٹیوں کی اکثریت اپنا اپنا ردِعمل دے چکی تھیں۔ قصرِ صدارت کے ترجمان نے بھی خود ٹی وی پر آکر کہہ دیا تھا کہ پشمینہ حیات پر قاتلانہ حملہ دراصل حکومت پر حملہ ہے جس کی مکمل تفتیش کی جائے گی۔

دانش نے اپنی پارٹی کے لوگوں کو ہدایت کر دی تھی کہ مشاورت کے بغیر کوئی ردِعمل نہ دیا جائے۔ اس کے لیے یہ معاملہ اس لیے نازک تھا کہ واردات خود اس کے گھر میں ہوئی تھی۔ ٹی وی پر یہ تبصرے شروع ہو چکے تھے کہ اگر پشمینہ حیات اپنی پارٹی بنالے تو وہ بہت جلد ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی بن جائے گی جس سے دانش یزدانی کی پارٹی کو بھی نقصان پہنچے گا۔ اس طرح ڈھکے چھپے الفاظ میں شبہ ظاہر کیا جارہا تھا کہ پشمینہ کو قتل کرنے کی سازش دانش یزدانی کی بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ اسی قسم کا ایک آدھ جملہ صدارتی محل کے ترجمان نے بھی اپنے بیان میں کہا تھا۔

اس بارے میں دانش کی پارٹی کی خاموشی کو بھی میڈیا والے پُراسرار رنگ دینے کی کوشش کر رہے تھے جن میں ان صحافیوں کا خاصا دخل تھا جو دانش کی مخالف سیاسی پارٹیوں سے ملے ہوئے تھے۔

اسی وجہ سے دانش کی پارٹی کے لوگوں کا خیال تھا کہ ان کا ردِعمل جلد از جلد سامنے آجانا چاہیے لیکن اب تک کوئی فیصلہ اس لیے نہیں ہو سکا تھا کہ اس اجلاس کی صدارت کے لیے دانش کو وقت ہی نہیں مل پایا تھا، مسلسل مصروفیت رہی تھی۔

اجلاس کی صدارت کے لیے کرسی پر بیٹھتے وقت بھی دانش کسی گہری سوچ میں تھا کہ یکایک اس کے دماغ میں ایک خیال جیسے بجلی کے کوندے کی طرح آیا اور وہ فوراً کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

''ابھی مجھے پھر ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ آپ لوگ ابھی کچھ دیر اور انتظار کریں۔''

دانش کی اس بات پر کچھ چہروں پر ناپسندیدگی کا تاثر ابھرا لیکن وہ کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ پارٹی پر دانش کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

کمرے سے باہر آتے آتے دانش نے اپنی جیب سے موبائل بھی نکال لیا تھا۔ اس نے پشمینہ سے رابطہ کیا۔

دوسری طرف سے پشمینہ کی آواز آئی۔ ''خیریت؟ اتنی جلدی تمہارا فون.....''

''تم ابھی زیادہ دور تو نہیں نکلی ہوگی۔'' دانش نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اتنی جلدی فون آگیا تمہارا۔ زیادہ دور تو نہیں آئی ہوں۔''

''فوراً واپس آؤ!''

''تمہارا یہ انداز میرے لیے پریشان کن ہے۔''

''جو خیال میرے ذہن میں آیا ہے، وہ بہت زیادہ پریشان کن ہے۔ پلیز! فوراً واپس آؤ۔''

''اچھا!'' پشمینہ نے طویل سانس لی۔ ''آتی ہوں۔'' پھر اس نے رابطہ بھی منقطع کیا تھا۔

دانش برآمدے تک بڑھتا چلا آیا اور بے چینی سے وہیں ٹہلنے لگا۔ وہاں موجود اس کے دو باڈی گارڈ چوکس ہو گئے۔

جلد ہی پشمینہ واپس آگئی۔ دانش اسے فوراً ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

''ایک بات بتاؤ!'' اس نے پشمینہ سے کہا۔ ''تم نے ڈیبرا کو یہاں سے فوراً کیوں نکالا تھا؟''

''یہی خیال تھا کہ اسے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ صدرِ مملکت نے اسے کبھی پسند نہیں کیا۔ خاص طور پر اس کی ہر وقت میرے ساتھ موجودگی انہیں بہت گراں گزرتی رہی ہے۔ مجھے خیال آیا تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ڈیبرا کو گرفتار کرا سکتے ہیں۔''

''ٹھیک!'' دانش نے کہا۔ ''اور پولیس نے یہاں پہنچنے میں بالکل دیر نہیں لگائی تھی۔''

''ہاں۔'' پشمینہ الجھی ہوئی نظروں سے دانش کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اور......'' دانش بولا۔ ''پولیس والے خود بتا چکے ہیں کہ انہیں یہ حکم بہت اوپر سے ملا ہے اور تمہاری بات کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس کا حکم قصرِ صدارت سے چلا ہوگا۔''

''ہوں۔''

’’اور قصرِ صدارت نے اس علاقے کے ایس ایچ او سے خود رابطہ نہیں کیا ہوگا۔ بات پہلے وزارتِ داخلہ گئی ہو گی۔ وزیرِ داخلہ نے آئی جی سے کہا ہوگا۔ وہاں سے بات ہمارے علاقے کے ڈی ایس پی تک پہنچنا چاہیے اور اس کے بعد ہمارے پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او تک۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟‘‘

’’تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اس سے تم نے نتیجہ کیا نکالا ہے؟‘‘

’’جو نتیجہ نکالا ہے، وہ بہت پہلے نکل آنا چاہیے تھا اور وہ بات تمہارے ذہن میں بھی نہیں آسکی جس کا سبب ہم دونوں کی پریشانی ہے۔ تم پر قاتلانہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ ہم دونوں ہی کے دماغ منتشر ہو گئے تھے۔‘‘

’’بات آگے بڑھاؤ۔‘‘ پشمینہ کے لہجے میں اضطراب تھا۔

دانش نے کہا۔ ’’ایک صورت یہ بھی ممکن تھی کہ ڈی ایس پی علاقے کے ایس ایچ او کو بائی پاس کرتا لیکن ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ یہاں ڈی ایس پی نہیں، ایس ایچ او ہی آیا تھا۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ قصرِ صدارت سے چلا ہوا حکم اتنی جلدی ایس ایچ او تک پہنچ سکتا ہے؟‘‘

’’اوہ۔‘‘ یکایک پشمینہ کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ غالباً وہ بھی اب حقیقت کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔

دانش بولتا رہا۔ ’’اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قصرِ صدارت کو پہلے سے علم تھا کہ تم پر قاتلانہ حملہ ہوگا اور پہلے سے اس کا علم اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب تمہارے قتل کی ہدایات بھی پہلے سے دی جا چکی ہوں۔ یہ بھی سمجھ لیا گیا ہوگا کہ ڈیبرا بہت ہوشیار اور تیز باڈی گارڈ ہے۔ وہ قاتل کو دیکھ لے گی اور اس پر ضرور گولی چلائے گی۔ اس کا نشانہ بھی خطا نہیں ہوتا۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ اس مرتبہ پشمینہ کے ہونٹ بھنچ گئے پھر اس نے کہا۔ ’’مجھے یہ خیال اس لیے نہیں آیا کہ میرے دل و دماغ میں باپ بیٹی کا رشتہ رچا بسا ہوا تھا۔ غالباً میں سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایسا قدم اٹھانے کا تصور بھی کر سکتے ہیں۔‘‘

’’تو اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟‘‘

’’جو تم نے کہا تھا۔ اب مجھے قصرِ صدارت نہیں جانا چاہیے لیکن...... میڈیا والے سوال تو کریں گے۔ انہیں کیا جواب دوں گی۔ قصرِ صدارت چھوڑنے کا یہ جواز میں پیش نہیں کرنا چاہتی کہ ہاں مجھے جان کا خطرہ ہے۔ دوسرے یہ

بھی سوچا ہوگا کہ میں جاؤں کہاں؟"

اس سے پہلے کہ دانش کوئی جواب دیتا، پشمینہ کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے موبائل کے اسکرین پر نظر ڈالی۔

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا۔ "انہی کا فون ہے۔ یہ نمبر صرف گھر کے افراد تک محدود ہے۔ دوسرے لوگ یہ نمبر نہیں جانتے۔"

"سنو تو!" دانش نے کہا۔ "اب کیا فرمانا چاہتے ہیں وہ!"

پشمینہ نے کال ریسیو کی۔ "جی!" وہ مختصراً بولی۔

"اتنی بڑی بات ہو جانے کے باوجود تم نے مجھے اس کی اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا!" صدر حیات کے لہجے میں تلخی تھی۔

"میرے خیال میں آپ اس ملک کی سب سے باخبر ہستی ہیں اور جو بات سارے ملک کے علم میں آچکی ہو، کیسے ممکن ہے کہ آپ کو علم نہ ہو۔ میں تو یہ توقع کر رہی تھی کہ آپ مجھے فون کریں گے، میری خیریت معلوم کریں گے۔ مجھے تو ممی نے بھی فون نہیں کیا۔ خیر، ان کو تو شاید روکا گیا ہو۔"

صدر حیات نے ان باتوں کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ "تم اس واقعے کے بعد فوری طور پر واپس کیوں نہیں آگئیں؟ کیا یزدانی سے کچھ شرائط طے کرنے میں مصروف ہو؟" لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ "کب کر رہی ہو اس سے شادی؟"

پشمینہ کے چہرے پر قدرے غصے کی سرخی آگئی، تاہم اس نے ضبط سے کام لیا اور بولی۔ "اگر آپ نے یہ بات باپ کی حیثیت سے کہی ہے تو میں جواب دینے کے بجائے خاموش رہوں گی۔ بیٹیاں ایسی باتوں میں لب کشائی بہت مشکل سے کر سکتی ہیں۔ کم از کم میری تربیت میری ماں نے اسی طرح کی ہے۔ اگر آپ نے یہ بات ملک کے صدر کی حیثیت سے کہی ہے تو میں عرض کروں گی کہ سر، مائی پریذیڈنٹ! حکومت کو میرے اس حد تک نجی معاملات میں پرسش کا کوئی حق نہیں۔"

پشمینہ نے ساری گفتگو دانش کو سنانے کے لیے موبائل کا اسپیکر شروع ہی میں کھول دیا تھا۔

"بدتمیز!" صدر حیات گرجا۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے ہر لفظ تہذیب کے دائرے میں رکھتے ہوئے کہا ہے۔ کوئی بدتمیزی نہیں ہوئی ہے مجھ سے۔"

"ہوں...... ہوں...... ہوں......" دوسری طرف سے فوراً جواب نہیں آیا اور کچھ رک کر کہا گیا۔ "وزارت اور پارلیمنٹ سے مستعفی ہونے کے بعد تم نے حکومت سے اپنا رابطہ تو ختم کر ہی لیا تھا۔ اب بدتمیزی کر کے باپ بیٹی کے رشتے کا بھی خون کر دیا۔ اب میں تمہیں قصرِ صدارت میں دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گا۔"

"شکریہ!" پشمینہ نے ایک طویل سانس لی۔ "آپ نے میری ایک مشکل حل کر دی۔ میں خود سوچ رہی تھی کہ اب وہاں نہ آؤں۔ صرف یہ الجھن تھی کہ میڈیا کے سامنے اس کا جواز کیا پیش کروں گی۔"

"تمہیں سوچنا ہی چاہیے کہ یہاں نہ آؤ۔ پریس کانفرنس میں تم نے میرے خلاف جو زہر اگلا ہے، اس کے بعد تم مجھ سے نظر نہیں ملا سکتیں۔"

"میں نے پریس کانفرنس میں جو کچھ بھی کہا ہے، اسے میں زہر اگلنا نہیں کہہ سکتی اور جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ اپنے والد کے لیے نہیں، اس ملک کے پریسیڈنٹ کے بارے میں کہا ہے۔"

"میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔" صدر حیات نے سخت لہجے میں کہا۔ "اپنے رہنے کا انتظام تم آسانی سے کر سکتی ہو۔ تمہارا بینک اکاؤنٹ اتنا ہے کہ تم ایک اچھا بنگلا آسانی سے خرید سکتی ہو۔"

"اب نہیں خرید سکتی۔" پشمینہ نے کہا۔ "آپ کے کہنے کے مطابق میں باپ بیٹی کے رشتے کا خون کر چکی ہوں اور میرے بینک میں جو بڑی رقم ہے، وہ مجھے اپنے باپ سے ملی تھی۔ اصولی طور پر اس کا ایک پیسا بھی اب مجھ پر حرام ہے۔ میری اپنی رقم صرف وہ ہے جو مجھے تنخواہ کے طور پر ملتی رہی ہے اور وہ رقم اتنی نہیں ہے کہ میں کوئی اچھا بنگلا خرید سکوں لیکن آپ کو اس بارے میں سوچنے کی تکلیف نہیں کرنی چاہیے کہ اب میں کیا کروں گی اور کہاں رہوں گی۔"

"تم غصے، جذبات اور جوش میں بولتی چلی جا رہی ہو پشمینہ!" دانش بول پڑا۔ "لائن بے جان ہو چکی ہے۔ دوسری طرف سے رابطہ اسی وقت منقطع کر دیا گیا تھا جب تم نے ان کا پیسا خود پر حرام قرار دیا تھا۔"

پشمینہ نے ایک طویل سانس لی۔ ریسیور میں آتی ہوئی "بیپ" کی آواز ظاہر کر رہی تھی کہ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا لیکن شدید غصیلی، جذباتی اور جوشیلی ہونے کے باعث اس آواز کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اس نے اپنا موبائل بند کر دیا۔

"بہت غصے میں لائن کاٹی ہے انہوں نے۔" دانش بولا۔ "اور تمہیں قصرِ صدارت سے الگ کرنے کا فیصلہ انہوں نے اس لیے کیا ہے کہ اگر وہاں رہتے ہوئے تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو بات انہی پر آتی مگر ان کے اس فیصلے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی عقل اس وقت غصے کا ایندھن بنی ہوئی ہے۔ اس طرح انہوں نے تمہیں باقاعدہ اپنے خلاف کھڑا کر لیا ہے اور وہ بھول گئے ہیں کہ تم گھر کی بھیدی ہو۔ اب تم بہت کچھ کہہ سکتی ہو۔"

"اور میں کہوں گی۔" پشمینہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "جبکہ آنے والا وقت بہت خطرناک ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ عنقریب متحرک ہونے والا ان کا ادارہ سی ایس..... یعنی کنٹری سیور بہت خطرناک ہوگا۔ اس ادارے کی تشکیل تقریباً اسی طرز کی ہے جیسی ایران کے رضا شاہ پہلوی کی ذاتی پولیس ساوک، کی تھی۔ اس پولیس نے ایران کے عوام کو شدید دہشت زدہ کر دیا تھا۔"

"میں بھی سیاست میں ہوں پشمینہ!" دانش بولا۔ "عالمی سیاست پر نظر میری بھی ہے۔ ساوک ہی کی وجہ سے رضا شاہ پر تباہی بھی آئی اور اب یہ سی ایس! غالباً صدر حیات نے اس طرح اپنے ایک ہولناک انجام کو دعوت دے ڈالی ہے۔"

"اب فوری مسئلہ تو یہ ہے کہ میں کہاں رہوں؟" پشمینہ نے کہا۔

"یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے لیکن تم یہاں رہیں تو عجیب عجیب باتیں بنائی جانے لگیں گی اور جو فیصلہ ہم دونوں کر چکے ہیں، اس پر عمل درآمد، حکومت سے تمہاری علیحدگی اور آج کی واردات کے بعد دور چلا گیا ہے۔"

وہ دونوں شادی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اگر پشمینہ نے حکومت نہ چھوڑی ہوتی اور حالات اتنے سنگین نہ ہو جاتے تو شاید اسی سال وہ دونوں شادی کر لیتے لیکن اب جس سیاسی بحران کے خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی، اس کی وجہ سے دانش کے خیال کے مطابق انہیں اب اس وقت تک شادی نہیں کرنی چاہیے تھی جب تک حالات دوبارہ ٹھیک نہ ہو جائیں۔

"ہاں۔" پشمینہ نے کہا۔ "موجودہ حالات میں وہ سب کچھ اب مناسب نہیں ہے۔ فی الحال تو مجھے اپنے قیام کے بارے میں سوچنا ہے۔"

"بنگلا خریدنے کے لیے جتنے پیسوں کی بھی ضرورت پڑے گی، میں دے دوں گا۔"

"نہیں۔" پشمینہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تو آئی لیکن فکر مندانہ ہی اور اس نے کہا۔ "فی الحال تمہارے پیسے پر میرا کوئی حق نہیں۔ تم کسی ہوٹل میں میرے لیے ایک سوئٹ بک کرا دو۔"

"اب تمہیں بلٹ پروف میں بھی رہنا چاہیے۔ کار بھی بلٹ پروف ہونی چاہیے۔ پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈز کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔ اس وقت تم کس کار میں ہو؟"

"ممی کی ہے۔" پشمینہ نے جواب دیا۔ "گویا ان کے شوہر کی۔" وہ بے حد سنجیدہ نظر آئی۔ "میں یہ کار واپس بھیج دوں گی۔ ممی کو فون کر کے معذرت کر لوں گی۔ انہیں سمجھا دوں گی کہ ایسا کیوں کر رہی ہوں۔"

"میں ابھی ایک اجلاس کر رہا ہوں۔ سب لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ منتظر ہیں میرے۔ مجھے ایک گھنٹا تو لگ ہی سکتا ہے۔ اس کے بعد میں سب انتظامات کروا دوں گا۔ تم اتنا وقت میری والدہ اور بہن کے ساتھ گزار لو۔"

سوچ میں ڈوبی ہوئی پشمینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

لیفٹیننٹ جنرل چنگیزی نے موبائل پر آئی جی سے رابطہ قائم کیا۔

"آپ کو صدارتی محل سے احکام تو مل چکے ہوں گے!"

"کون سے احکام؟ آپ کون ہیں؟" آفیسر نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"جنرل چنگیزی۔"

"او، سر!" آئی جی نے جلدی سے کہا۔ "مل چکے ہیں احکام۔ مجھے بتایا جا چکا ہے کہ آج دوپہر سے سی ایس فعال ہو چکی ہے اور آپ......"

"اب میری بات سنیے!" چنگیزی نے دبنگ لہجے میں کہتے ہوئے آئی جی کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

"جی، جی۔" آفیسر نے جلدی سے کہا۔

"آج میڈم پشمینہ کی پریس کانفرنس میں جو کچھ ہوا ہے، اس کی تحقیقات اب سی ایس کرے گی۔ آپ کے محکمے کا اب اس سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ میڈیا پر ظاہر تو کرتے رہیے کہ پولیس تحقیقات کر رہی ہے لیکن تحقیقات کی نہیں جائیں گی۔"

"بہتر ہے۔"

"لاش کی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تو آپ کا محکمہ میڈیا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کو دے سکتا ہے اور......" چنگیزی نے شناختی کارڈ کے بلکے کا نام لے کر بات جاری رکھی۔ "وہاں سے آپ کو یہی رپورٹ ملے گی کہ ان کے محکمے میں اس شخص کے بارے میں کسی قسم کا ریکارڈ نہیں۔ پولیس کو اس کی جیب سے جو شناختی کارڈ ملا ہے، وہ جعلی ہے۔"

"جی بہتر۔ میں آپ کی بات ختم ہونے کا منتظر ہوں۔"

"مجھے بس اتنا ہی کہنا تھا۔ کیوں؟"

"آپ کے لیے میرے پاس ایک اطلاع ہے جو مجھے ابھی ملی ہے۔ اس قسم کی وارداتوں کی رپورٹ عموماً مجھ تک فوراً نہیں پہنچتی لیکن نام کیونکہ ڈیبرا کا آیا تھا اس لیے مجھے فوراً اطلاع دی گئی۔"

"کیا اطلاع ہے؟" چنگیزی نے تیزی سے پوچھا۔

"ایک نوجوان نے ڈیبرا کے خلاف ایک پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کرائی ہے۔"

"کیا رپورٹ ہے؟" چنگیزی بے تاب ہو گیا۔

اس نوجوان پر ڈیبرا کی وجہ سے جو کچھ گزری تھی، وہ اس نے پولیس اسٹیشن میں من و عن بیان کرتے ہوئے آخر میں بتایا تھا کہ جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنی کار کی پچھلی سیٹ کے پائیدان میں پڑا ہوا تھا، اس کے اوپر ایک چادر پڑی ہوئی تھی اور کار ایک مشہور مارکیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔

یہی سب کچھ آئی جی نے چنگیزی کو بتا دیا۔

"اس حرکت کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟" سوچ میں پڑ جانے والا چنگیزی بڑبڑایا۔

"یہ تو ڈیبرا ہی بتا سکتی ہے یا شاید وہ عورت جس کو ڈیبرا نے فون کر کے اس سے کسی قسم کا سامان مل ایریا میں منگوایا تھا۔"

"ہوں، اچھا کیا آپ نے مجھے بتا دیا۔"

"کیا ڈیبرا کی تلاش جاری رکھی جائے؟"

"یقیناً۔" چنگیزی نے زور دے کر کہا۔ "اس کی تلاش سی ایس نے بھی شروع کر دی ہے۔ آپ نے جو رپورٹ مجھے دی ہے، اس سے بھی شاید کچھ مدد مل سکے...... خیر! اور کچھ؟"

"بس یہی بتانا ضروری سمجھا تھا میں نے۔"

چنگیزی نے مزید کچھ کہے بغیر رابطہ منقطع کر کے گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بج کر چالیس منٹ ہو چکے تھے۔ عین ممکن تھا کہ آئی جی نے سوتے سے اٹھ کر اس کی کال ریسیو کی ہو۔

چنگیزی جس شاندار کمرے میں بیٹھا تھا، وہ ایک سہ منزل عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ یہ نو تعمیر شدہ عمارت شہر کے وسط میں قدیم طرز کی بنی ہوئی ایک عمارت گرا کر بنائی گئی تھی اور اسے سی ایس ہیڈ کوارٹرز کا نام دیا گیا تھا۔

یہاں سے چند منٹ پہلے ہی ٹی وی چینلز اور اخبارات کے لیے پریس ریلیز بھی جاری کی گئی تھی جس میں لکھا گیا تھا کہ آج ہی سے فعال ہونے والا یہ ادارہ چنگیزی کی سربراہی میں قائم کیا گیا ہے اور یہ محکمۂ پولیس کے علاوہ اور کئی اہم محکموں سے زیادہ بااختیار ہے۔ نیز یہ کہ جنرل چنگیزی صدرِ مملکت کے علاوہ کسی کو بھی جواب دہ نہیں ہے۔

آئی جی سے بات کرنے کے بعد چنگیزی نے محکمے کے ایک اہم آدمی کو طلب کیا اور اسے آئی جی سے ملنے والی رپورٹ سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ "اس گلی میں جا کر بھی چھان بین کی جا سکتی ہے جہاں ڈیبرا اس نوجوان کو لے گئی تھی۔ عین ممکن ہے کہ وہاں اس عورت کے قدموں کے نشانات مل جائیں جسے ڈیبرا نے بلایا تھا۔"

"ممکن ہے سر کہ ان نشانات سے تحقیقات میں کچھ مدد ملے اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ ڈیبرا کہاں روپوش ہوگئی ہے۔ اس کی ملازمہ گرینا سے جو پوچھ گچھ کی گئی تھی، اس بارے میں تو کیپٹن مخدوم نے آپ کو رپورٹ دے ہی دی ہوگی۔"

"ہاں، لیکن مجھے اس پر یقین نہیں آرہا ہے کہ وہ عورت بالکل بے خبر ہے اور پریشان ہے کہ ڈیبرا نے اس سے رابطہ ہی نہیں کیا۔"

"سر! اگر اس نے غلط بیانی کی ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ بلا کی عیار عورت ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مخدوم کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہوگی۔"

"تاہم اس پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ میں مخدوم کو ہدایت دے چکا ہوں۔"

چنگیزی نے اس شخص کو رخصت کر دیا جس کا نام شمشاد تھا، بریگیڈیئر شمشاد۔ سی ایس میں وہ جنرل چنگیزی کے بعد سب سے زیادہ بااختیار تھا۔ اس ادارے میں خاصے لوگ وہ تھے جو فوج سے ریٹائر ہو چکے تھے لیکن چنگیزی ریٹائرڈ نہیں تھا۔ اس کا بس تبادلہ ہوا تھا۔ وہ جس خفیہ ایجنسی کا ڈائریکٹر تھا، وہاں اسی دن صدرِ حیات کے حکم سے کسی اور کو مامور کیا جا چکا تھا۔

چنگیزی نے دوبارہ گھڑی پر نظر ڈالی۔ بارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ چنگیزی کو بارہ بجنے کا انتظار تھا۔ وہ

خبریں سننا چاہتا تھا۔

بارہ بجے چند اشتہارات کے بعد خبریں شروع ہوئیں۔ سب سے پہلی خبر "سی ایس" ہی کے بارے میں تھی۔ وہ سننے کے بعد اس نے میز پر رکھی ہوئی آرمی کیپ اٹھا کر اپنے سر پر جمائی۔ وہ فوجی وردی میں ملبوس تھا۔ پھر اس نے اپنا موبائل اٹھایا۔ اب اسے اپنے گھر جانا تھا۔ اس وقت ٹی وی پر یہ خبر آرہی تھی کہ پشمینہ حیات ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سوئٹ میں منتقل ہو چکی تھی۔

چنگیزی کو اس خبر سے اب کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دس بجے سے کچھ پہلے ہی یہ بریکنگ نیوز سن چکا تھا کہ دانش یزدانی کے گھر سے پشمینہ قصرِ صدارت نہیں گئی تھی بلکہ شہر کے ایک سب سے مقبول ہوٹل میں منتقل ہو گئی تھی۔ دانش نے اپنے تین باڈی گارڈز بھی اس کے ساتھ کر دیے تھے۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد اس نے کار واپس قصرِ صدارت بھیج دی تھی۔

☆☆☆

گاڑی بھیجنے کے بعد پشمینہ نے اپنی ماں کو فون بھی کیا تھا اور معذرت کی تھی اور جواز یہ پیش کیا تھا کہ وہ کار بہرحال ان کو صدر حیات سے ملی تھی۔

جواب میں اس کی ماں روبینہ حیات نے کہا تھا۔ "تم باپ بیٹی کی اس جنگ نے تو مجھے آدھا کر دیا ہے۔" آواز بھرا گئی۔ "یہاں سے تمہاری علیحدگی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے۔"

"لیکن علیحدگی کا قدم میں نے نہیں اٹھایا۔"

"معلوم ہے مجھے۔ کبھی کم از کم مجھ سے تو ملنے آؤ گی نا!"

"ڈیڈی نے کہا تھا کہ اب وہ مجھے قصرِ صدارت میں دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔"

"نہ دیکھیں وہ...... اس طرف نہ آئیں جہاں تم میرے ساتھ ہو۔" روبینہ حیات کے لہجے میں تلخی آگئی تھی۔ "جب بھی تم آسکو، مجھے اطلاع دے دینا۔ میں گیٹ پر آکر خود تمہیں اندر لاؤں گی۔"

"بہتر ہے ممی۔ میں کوشش کروں گی۔ ڈیڈی کا یہ اسکینڈل سامنے آنے کے بعد تو آپ بھی کچھ خوش ہرگز نہیں ہیں۔ میں یہ جانتی ہوں۔"

"کچھ بھی ہو۔" روبینہ کی آواز دل گرفتہ تھی۔ "مجھے تو انہی کے ساتھ مرنا جینا ہے۔ عورت کو مساوی حقوق ملتے ہیں نا۔" اب لہجے میں تیکھا پن بھی تھا اور تلخی بھی!

"میں آپ سے پھر کسی وقت بات کروں گی۔ ابھی کوئی مجھ سے ملنے کے لیے آنے والا ہے۔" پشمینہ نے جھوٹ بولا۔ ماں کی جذباتی کیفیت محسوس کر کے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اس وقت زیادہ بات نہ کی جائے۔

وہ بستر پر لیٹ کر سوچ میں ڈوب گئی۔ ایک ماہ سے وہ مسلسل اسی فکر میں غلطاں تھی کہ ان حالات میں اسے کیا رول ادا کرنا چاہیے۔

ڈیبرا کے سلسلے میں وہ فکرمند نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ ڈیبرا نے اسی اپارٹمنٹ کا رخ کیا ہوگا جو کچھ ہی عرصے پہلے لیا گیا تھا۔ غیر معمولی حالات پیدا ہونے کی صورت میں یہ ہدایت بھی ڈیبرا کو پشمینہ ہی نے دی تھی کہ موبائل فون کے استعمال سے جس حد تک ممکن ہو گریز کیا جائے۔

اس وقت بھی پشمینہ کو یقین تھا کہ فوری طور پر تو نہیں لیکن ڈیبرا کے فرار اور قصرِ صدارت سے اس کی علیحدگی کی بات ہونے کے بعد صدر حیات نے تمام سیلولر کمپنیز میں موجود اپنے خاص آدمیوں کو ہدایت کر دی ہوگی کہ ان دو نمبروں پر، یعنی ڈیبرا اور پشمینہ کے موبائل نمبروں پر خصوصی طور پر نظر رکھی جائے۔ ڈیبرا نے اس سے رابطہ نہیں کیا تھا، تو اس کی وجہ یہی تھی۔

پشمینہ کو دو ایک افراد سے رابطہ بہرحال کرنا تھا جس کے لیے اس نے ڈیبرا کو سیٹلائٹ موبائل فون کا بندوبست کرنے کی ہدایت بھی کر دی تھی اور اس کے علم کے مطابق چوبیس گھنٹے پہلے ہی دو سیٹلائٹ موبائل آ چکے تھے جو ڈیبرا کے باپ نے اسے سفارت خانے کے ذریعے بھجوائے تھے۔ ریٹائر ہو جانے کے باوجود اس کا اتنا اثر ورسوخ تھا کہ وہ اپنے سفارت خانے کے ذریعے بھی چھوٹے موٹے کام تو آسانی سے کر سکتا تھا۔

اس وقت ان میں سے ایک فون حال ہی میں حاصل کردہ اپارٹمنٹ میں اور دوسرا ڈیبرا کے اس گھر میں تھا جہاں وہ گریٹا کے ساتھ رہتی تھی۔ پشمینہ نے اس سے کہا تھا کہ وہ دوسرا موبائل اس سے اس وقت لے گی جب اس کی ضرورت محسوس کرے گی۔

اب ضرورت پڑی تھی تو حالات سازگار نہیں تھے تاہم اسے توقع تھی کہ ڈیبرا کسی نہ کسی طرح اس سے ملے گی ضرور اور سیٹلائٹ موبائل اس کو پہنچائے گی۔

رات گئے کسی وقت اسے نیند آگئی۔ صبح وہ ناشتے سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ ہوٹل کے ریسپشن سے فون پر اسے بتایا گیا کہ حاجی اشفاق اس سے ملنے آئے ہیں۔

"کون حاجی اشفاق؟" پشمینہ نے پوچھا۔

''مشہور بزنس مین میڈم!'' جواب ملا۔ ''ایک وولن اور ایک سلکن ٹیکسٹائل مل کے مالک۔''

''اوہ، وہ!'' پشمینہ الجھ گئی۔ حاجی اشفاق سے ملنے کا اسے کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ بس یہ جانتی تھی کہ معاشرے میں حاجی اشفاق کو بہت شریف انسان اور غریبوں کا ہمدرد سمجھا جاتا تھا۔ اس کی ملز میں کام کرنے والوں کی تنخواہیں تمام ٹیکسٹائل ملز کے ملازموں سے زیادہ تھیں۔ اس کے باوجود پشمینہ کو یہ فیصلہ کرنے میں تذبذب تھا کہ حاجی اشفاق سے مل لینا چاہیے۔ معلوم تو ہو کہ وہ کیوں آیا ہے۔

موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ کال دانش یزدانی کی تھی۔

''ایک منٹ ہولڈ کیجیے۔'' پشمینہ نے ریسپشنسٹ سے کہا۔

''اوکے میڈم!''

پشمینہ نے انسٹرومنٹ کے ''ہولڈ'' کا بٹن دبایا، پھر موبائل پر دانش کی کال ریسیو کی۔ ایک لمحہ قبل اسے خود یہ خیال آچکا تھا کہ وہ دانش کو فون کر کے اس کو حاجی اشفاق کے بارے میں بتائے۔

''ہاں دانش!'' اس نے مادھ پیس میں کہا۔

''ابھی کسی نے مجھے اطلاع دی ہے کہ وہ تم سے ملنے ہوٹل پہنچ گئے ہیں۔ ان سے ملنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نے تمہیں مجبوراً اس لیے فون کیا ہے کہ تم حالات کے باعث کسی اجنبی سے ملنے میں گریز کر سکتی ہو۔ مجبوراً کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ..... خیر، چھوڑو، پھر بات ہوگی۔''

''اچھا کیا تم نے مجھے بتادیا۔ ابھی ابھی ریسپشن سے اطلاع ملی تھی مجھے۔ میں الجھن میں تھی کہ ملوں یا نہ ملوں۔''

''مل لو۔'' دانش نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

پشمینہ نے موبائل بند کر کے فون پر ریسپشن سے بات کی اور کہا کہ وہ ملاقات کرلے گی۔

اگرچہ سفارش دانش کی تھی پھر بھی پشمینہ نے احتیاط ضروری سمجھی اور انٹرکام کا ریسیور اٹھایا جس پر وہ قریب کے ایک کمرے میں موجود باڈی گارڈز سے بات کرسکتی تھی۔ دانش کے کہنے پر ہوٹل والوں نے یہ انتظام خصوصی طور پر اس لیے بھی کیا کہ وہاں قیام کرنے والی ملک کے صدر کی بیٹی تھی۔

کال ریسیو کرنے والے باڈی گارڈ سے پشمینہ نے کہا۔ ''ابھی ایک صاحب مجھ سے ملنے آرہے ہیں۔ میں ان سے ڈرائنگ روم میں ملوں گی۔ باہر کے دروازے پر تم میں سے کوئی ایک ان کا استقبال کرے اور ان کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں آئے اور دروازہ اندر سے بند کر کے ان کے قریب ہی کھڑا رہے۔''

''بہت بہتر میڈم۔''

پشمینہ نے رابطہ منقطع کیا۔

ذرا دیر بعد ہی وہ ڈرائنگ روم میں حاجی اشفاق کے ساتھ بیٹھی تھی۔

حاجی اشفاق اپنی وضع قطع سے روایتی حاجی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہترین کپڑے کے اعلیٰ تراش کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ اس کی عمر پچاس پچپن کے قریب ہوسکتی تھی۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ محتاط ہیں۔'' حاجی اشفاق نے دروازے پر کھڑے باڈی گارڈ پر ایک نظر ڈال کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

جواب میں پشمینہ بھی مسکرائی لیکن کچھ بولے بغیر استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''کل آپ کی پریس کانفرنس میں جو سانحہ ہوا، اس پر میں اظہارِ افسوس ہی کر سکتا ہوں۔'' حاجی اشفاق نے کہا۔ ''اور جس نے وہ حرکت کی، اس کی مذمت میں ٹی وی چینلز پر بھی کر چکا ہوں۔''

''شکریہ۔''

''اب آپ کا زخم کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہی سمجھیں۔ معمولی زخم آیا تھا اسی لیے ڈریسنگ بھی معمولی ہے جو میری ساڑی کے پلو میں چھپی ہوئی ہے۔ آج رات یا کل صبح تک ڈاکٹر یہ ڈریسنگ بھی ختم کردے گا۔''

''شکر ہے خدا کا۔'' حاجی اشفاق نے کہا۔ ''بہرحال میں آپ کا قیمتی وقت زیادہ ضائع نہیں کروں گا۔ کل آپ کی پریس کانفرنس نے لوگوں کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا ہے۔ دو ایک ہی طبقات ایسے ہوں گے جو آپ کی باتوں سے متاثر نہ ہوئے ہوں۔ آپ کو شاید تعجب ہو کہ میرے دو ہم پیشہ حضرات کل رات ساڑھے بارہ بجے میرے گھر آئے تھے۔ ہماری وہ میٹنگ آدھے گھنٹے جاری رہی۔ طے یہ پاتا رہا کہ آپ کو ہر صورت میں اپنی سیاسی پارٹی بنانی چاہیے۔ آپ نے پریس کانفرنس میں فنڈز نہ ہونے کی بات کی تھی۔ میں اور میرے وہ دونوں احباب جن سے کل رات میٹنگ ہوچکی ہے، آپ کا یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ کو جتنے

فنڈ کی ضرورت ہوگی وہ مہیا کردیا جائے گا، اگر آپ ہم سے قبول کروانا پسند فرمائیں۔ فی الحال میں آپ کی خدمت میں یہ پیش کرنے کی جسارت کررہا ہوں۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک چیک نکال کر پشمینہ کی طرف بڑھایا۔ ''یہ بلینک چیک ہے۔ آپ جو رقم چاہیں، اس میں بھر لیجیے گا۔ میرے وہ دونوں احباب بھی بلینک چیکس مجھے دے جائیں گے۔ اس سلسلے میں یہ ذمے داری مجھے ہی سونپی گئی ہے کہ آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کروں۔''

''خوب!'' پشمینہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چیک پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکی تھی کہ یہ مسئلہ اتنی جلدی اور اس حد تک حل ہوسکتا ہے۔''

''آنے والے انتخابات میں آپ کی پارٹی یقیناً جیتے گی۔'' حاجی اشفاق نے کہا۔ ''میں آپ کو مستقبل میں ملک کی وزیراعظم دیکھ رہا ہوں۔''

یکایک پشمینہ کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے کہا۔ ''کچھ دنوں سے سننے میں آرہا ہے کہ ملک کے کئی دولت مند افراد پر کرپشن کے الزامات لگنے والے ہیں۔ متعلقہ ادارے اس کی تحقیقات کریں گے۔ فرض کریں...... اور فرض کی بات میں اس لیے کررہی ہوں کہ مجھے یقین نہیں ہے اس پر کہ میں مستقبل میں اس ملک کی وزیراعظم بنوں گی۔ میرا ٹارگٹ بھی وہ نہیں ہے۔ میں اپنے وطن میں بس انصاف دیکھنا چاہتی ہوں، اور بالفرض آپ کا خیال درست نکلا، یعنی میں وزیراعظم بنی، اور آپ میں سے کسی پر کرپشن ثابت ہوگیا تو مجھ سے کسی فیور کی توقع اس بنیاد پر نہ رکھی جائے کہ آپ لوگوں نے میری پارٹی کو فنڈز دیے تھے۔''

''بہت دل خوش ہوا آپ کی یہ بات سن کر۔'' حاجی اشفاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے بارے میں تو پُریقین ہوں کہ مجھ پر کرپشن ثابت ہونا تو دور کی بات ہے، مجھ پر اس کا الزام بھی نہیں لگ سکتا۔ رہی بات میرے باقی دو احباب کی، تو میں انہیں آپ کا یہ جواب پہنچادوں گا۔''

''اور دوسری بات یہ۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''بلینک چیک میں نہیں لوں گی۔ اس پر رقم تو لکھی جائے گی جس کی میں رسید بھی دوں گی۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' حاجی اشفاق نے جلدی سے کہا۔

''ضرورت ہے۔'' پشمینہ نے زور دے کر کہا۔ ''لیکن ابھی میں رسید اس لیے نہیں دے سکتی کہ میرے پاس پارٹی کا لیٹر ہیڈ نہیں ہے۔'' وہ ہنسی۔ ''بلکہ ابھی تو پارٹی ہی نہیں ہے۔ وہ اب میں جلد ہی قائم کرلوں گی۔ ذاتی لیٹر ہیڈ پر میں رسید دینا نہیں چاہتی۔ فی الحال یہ چیک آپ اپنے پاس رکھیے۔ جب ضرورت ہوگی تو......''

حاجی اشفاق نے اس کی بات کاٹی۔ ''مجھے خوشی ہوگی اگر آپ یہ چیک اپنے پاس رکھیں۔ جب پارٹی لیٹر پیڈ چھپ جائے گا تو رسید دے دیجیے گا جس کی کم از کم مجھے ضرورت نہیں، اور اگر آپ یہ چیک کسی بھی وجہ سے کیش نہ کروانا چاہیں تو پھاڑ کر پھینک دیجیے گا۔ میری خوشی کی خاطر آپ یہ اپنے پاس رکھ تو لیں۔''

''اچھا'' پشمینہ نے طویل سانس لی۔ ''اگر بات آپ کی خوشی کی ہے تو...... ٹھیک ہے۔''

☆☆☆

ڈیبرا نے دوسرا دن بھی اپارٹمنٹ میں ہی گزارا۔ ایک منٹ کے لیے بھی باہر نہیں نکلی۔ خورونوش اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ یہاں کم ہی آئی تھی مگر جب بھی آئی تھی، پھل وغیرہ یا کھانے پینے کی دوسری اشیا لاکر ڈیپ فریزر یا فریج میں رکھتی رہی تھی۔

اس دن وہ شام کے وقت گھر سے نکلی تو ایسی ہی وضع قطع میں تھی کہ اسے ڈیبرا کی حیثیت سے پہچاننا بہت مشکل تھا۔ اپارٹمنٹس کے پارکنگ لاٹ میں کار بھی موجود تھی اور موٹر سائیکل بھی جو انہی دنوں خریدی گئی تھیں جب اپارٹمنٹ لیا گیا تھا۔ پشمینہ نے تو صرف کار ضروری سمجھی تھی لیکن ڈیبرا نے موٹر سائیکل بھی خریدی تھی۔ وہ موٹر سائیکل بھی نہایت تیز رفتاری اور مشاقی سے چلاسکتی تھی لیکن اس وقت اس نے کار ہی سنبھالی اور اپنے اس اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہوگئی جہاں وہ گریٹا کے ساتھ رہتی تھی۔

کار اس نے اپارٹمنٹس کے پارکنگ لاٹ کے بجائے سڑک پر ہی ایک ایسی جگہ کھڑی کی جہاں دوسری کاریں بھی کھڑی تھیں۔ یہ ''احتیاط'' تھی اس کی۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر اس نے کسی قسم کا خطرہ محسوس کیا تو پارکنگ لاٹ سے کار نکال کر فرار ہونے میں دشواری ہوسکتی تھی۔ اس کا اسے یقین تھا کہ اس کے گھر کی نگرانی کی جارہی ہوگی۔ کیونکہ اس نے خبروں میں سن لیا تھا کہ بی ایس فعال ہوچکی تھی اس لیے خطرات بھی زیادہ ہوسکتے تھے۔

کار کھڑی کرکے وہ اپارٹمنٹس کی طرف بڑھی۔ اس وقت بھی اس نے بظاہر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اگر وہ اس وضع

قطع میں دن کے وقت باہر نکلی تھی تو دھوپ کا سیاہ چشمہ لگائی تھی۔

اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے رک کر اس نے بظاہر اطمینان سے کال بیل کا بٹن دبایا لیکن دراصل وہ پوری طرح ہوشیار تھی۔ اسے ایک سنٹ بھی انتظار نہیں کرنا پڑا۔ گریٹا نے دروازہ کھولا۔ ڈیبرا تیزی سے اندر داخل ہوگئی۔ گریٹا نے بھی دروازہ بند کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ڈیبرا کو اس نے اس وضع قطع میں کئی بار دیکھا تھا۔

''رات کو ہی سی ایس والے دھمک پڑے تھے ڈیبو۔'' گریٹا بولی۔

''مجھے یقین تھا۔'' ڈیبرا نے اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی سختی تو نہیں کی؟''

''میں نے انہیں اتنی معصومیت سے جواب دیے تھے کہ انہوں نے یقین کرلیا۔ اگر انہیں شبہ ہوجاتا تو ضرور سختی کرتے۔ تم نے بتا تو دیا تھا کہ جب یہ ادارہ کام شروع کرے گا تو پولیس سے زیادہ پریشانی کا سبب بنے گا لیکن میرے ساتھ انہوں نے فوری طور پر تو کوئی سخت قدم نہیں اٹھایا۔''

ڈیبرا اس کا جواب سنتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں داخل ہوچکی تھی۔ اس نے اپنے بیڈ کی سائڈ کی دراز کھول کر اس میں سے ایک پیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ''اگر انہیں شبہ ہوگیا کسی وجہ سے تو وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ محتاط رہنا۔'' وہ پیکٹ اپنے وینٹی بیگ میں رکھتی ہوئی واپس دروازے کی طرف بڑھی۔ ''آج میری ضمانت قبل از گرفتاری ہونی تھی۔ پشمینہ نے تو بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ ہوجائے گی اور شاید ہوگئی ہو لیکن ابھی اس سے میرا رابطہ نہیں ہوا ہے۔'' وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ ''اب وہیں جارہی ہوں۔ پشمینہ ہی سے معلوم ہوسکے گا کہ کیا ہوا۔ ضمانت ہوچکی ہوگی تو اب میں زیادہ تر اسی کے ساتھ رہوں گی۔ موجودہ حالات میں مجھے اب ہر وقت اس کے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ تم اکیلے میں گھبرانا مت۔''

ڈیبرا نے جب بیرونی دروازہ کھولا تو گریٹا بولی۔

''میں تمہارے لیے فکرمند تو رہوں گی ڈیبو!''

ڈیبرا نے کوئی جواب نہیں دیا، بس مڑ کر گریٹا کی پیشانی چومی اور اپارٹمنٹ سے نکل آئی۔ اپارٹمنٹ میں وہ عجلت کا شکار ہی تھی لیکن باہر نکلتے ہی اس نے پرسکون، مطمئن انداز اختیار کرلیا۔ اپارٹمنٹس کی عمارت سے نکل کر وہ اس طرف بڑھی جہاں اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔

یہاں آتے ہوئے اسے اندیشہ تو تھا کہ وہ کسی خطرے سے دوچار ہوسکتی ہے مگر ایسا ہوا نہیں۔ وہ معمول کی رفتار سے ڈرائیونگ کرتی رہی لیکن ماحول سے غافل وہ اب نہیں تھی۔ ماحول سے غافل رہنا اس کی فطرت ہی نہیں رہی تھی جب سے اس نے خفیہ ایجنسی میں جانے کے لیے تربیت حاصل کی تھی۔

اسی فطرت کی وجہ سے اس کو معلوم ہوگیا کہ نیلے رنگ کی ایک کار اس کا تعاقب کررہی تھی۔

یہ کہاں سے؟ وہ سوچنے لگی، گریٹا کے پاس جانے تک کوئی اس کے تعاقب میں نہیں تھا۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ یہ تعاقب بعد میں شروع ہوا تھا۔ اس کے گھر کی نگرانی کی جارہی تھی لہٰذا اسے وہاں جاتے ہوئے دیکھ تو لیا گیا لیکن اسے شناخت نہیں کیا جاسکا۔ روپ بدلنے کے بعد وہ اپنی چال میں بھی تبدیلی لے آئی تھی۔ اب اس کے تعاقب کا مقصد یہ جاننا ہی ہوسکتا تھا کہ وہ کون ہے، کہاں رہتی ہے اور اس کے گھر کیوں گئی تھی۔

ڈیبرا کو یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ فی الحال اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ فی الحال وہ صرف اس کا تعاقب کرنا چاہتے تھے۔ ان کا تعلق پولیس سے بھی ہوسکتا تھا اور سی ایس سے بھی۔

تعلق کسی سے بھی ہو، اب اس کا اس طرح پشمینہ کے پاس جانا مناسب نہیں تھا کہ اس کا تعاقب جاری ہو۔ مناسب تو کیا، یہ بات خطرناک بھی ہوسکتی تھی۔ اس نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ کے بعد ایک بڑی ڈپارٹمنٹل مارکیٹ آنے والی تھی۔ وہیں وہ تعاقب کرنے والوں کو دھوکا دے سکتی تھی۔

مارکیٹ قریب آتے ہی اس نے کار کی رفتار بتدریج کم کرنا شروع کی۔ مارکیٹ کے سامنے کاروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اسے پارکنگ کے لیے بمشکل ہی جگہ مل سکی۔

☆☆☆

ریسپشن سے فون پر پشمینہ کو اطلاع دی گئی۔ ''کوئی خاتون زاہدہ صاحبہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

بستر پر لیٹی ہوئی پشمینہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ زاہدہ کے نام سے ڈیبرا ہی سنٹ لیے ہوئے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی لیکن احتیاط ضروری سمجھتے ہوئے پشمینہ نے فون پر کہا۔ ''ان سے میری بات کرائیے۔''

''جی، بہتر۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

چند لمحے بعد آواز آئی۔ ''میں زاہدہ بول رہی ہوں

پشمینہ صاحبہ! میرے شوہر نے آپ کے لیے کچھ بھجوایا ہے۔''

پشمینہ نے پہچان لیا۔ وہ ڈیبرا ہی کی آواز تھی۔

''میں تو بہت بے چینی سے منتظر ہوں تمہاری۔''

ڈیبرا نے فوراً ہی ریسیور ریسپشنسٹ کو دے دیا تھا۔ پشمینہ نے اس کی آواز سنی تو کہا۔ ''ہاں، میں ان سے ملوں گی۔'' اس نے ریسیور رکھ دیا اور کھڑی ہو کر تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی۔

ہوٹل کی انتظامیہ پشمینہ کے معاملے میں بہت محتاط تھی۔ انہوں نے خصوصی طور پر یہ انتظام کیا تھا کہ اپنے دو سیکیورٹی گارڈز اس کے سوئٹ کے دروازے پر مامور کر دیے تھے۔ انہیں ہدایت کر دی گئی تھی کہ کسی کو بھی سوئٹ کے دروازے تک بھی نہ جانے دیا جائے جب تک انہیں ریسپشن سے اس کی اجازت نہ مل جائے۔ ریسپشن ہی سے ایک اور سیکیورٹی گارڈ ملاقاتی کے ساتھ آتا تھا جو وہاں مامور دونوں سیکیورٹی گارڈز کو بتاتا تھا کہ اس ملاقاتی کو پشمینہ صاحبہ کے پاس جانے دیا جائے۔

ڈیبرا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ پشمینہ نے اسے اسی وضع قطع میں دیکھا جس وضع قطع میں وہ نئے اپارٹمنٹ میں آتی جاتی رہتی تھی۔

''ہوٹل والے بہت محتاط ہیں تمہارے معاملے میں۔'' ڈیبرا نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''اس قسم کا بندوبست ہوٹل میں قیام کرنے والے کسی شخص کے لیے نہیں ہوا ہوگا۔''

''میرے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے، اس کی وجہ سے انہیں یہ فکر تو ہوگی نا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہونے کی صورت میں ہوٹل بھی بدنام ہوگا۔ خیر، یہ بتاؤ کہ تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟''

''پہلے میں اپنے گھر گئی تھی، یہ لینے۔'' ڈیبرا نے ہینڈ بیگ سے سیلائٹ موبائل فون کا پیکٹ نکالتے ہوئے کہا اور پشمینہ کو دیتے ہوئے بولی۔ ''وہاں سے چلی ہوں تو ایک کار میرے تعاقب میں تھی۔ اس سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ میرے گھر کی نگرانی کی جا رہی تھی اور وہ بھی اتنے قریب سے کہ مجھے اپارٹمنٹ میں آتے جاتے بھی دیکھ لیا گیا۔ بہرحال میں ان کو ڈاج دے کر نکل آئی۔'' اس نے مارکیٹ کے بارے میں بتایا جہاں کار کھڑی کر کے وہ مارکیٹ میں گئی تھی۔

''وہاں اس وقت لوگ خاصی تعداد میں ہوتے ہیں اس لیے نگرانی کرنے والوں کو چکما دینا میرے لیے مشکل نہیں ہوا۔ ان کی نظروں سے بچنے کے بعد میں مارکیٹ کے اس دروازے سے باہر نکلی جہاں عموماً ٹیکسیاں کھڑی رہتی ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ اس مارکیٹ میں آنے جانے کے چار دروازے ہیں۔ اب امکان تو یہ ہے کہ یہاں اس ہوٹل کی نگرانی بھی کی جا رہی ہوگی۔ دیکھا جا رہا ہوگا کہ تم سے ملنے کون آتا ہے۔ وہ ریسپشن سے بھی پوچھ گچھ کر رہے ہوں گے۔ انہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں تم سے ملنے آئی ہوں۔''

''بہرحال تمہیں پہچانا تو نہیں گیا ہوگا اور فی الحال تمہاری قانونی گرفتاری کا امکان تو نہیں رہا۔ میں تمہاری ضمانت کروا چکی ہوں آج!''

''میرا خیال تھا کہ اس سلسلے میں مجھے بھی عدالت جانا ہوگا۔''

''تمہارے لیے کوئی وارنٹ تو نکلا نہیں ہے۔ دوسرے میں گئی بھی اس مجسٹریٹ کی عدالت میں جو صدرِ مملکت سے میرے تعلق کے باعث مجھ سے مرعوب تھا۔ بہرحال اب تمہیں ہر وقت میرے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ میرے سامنے ہی ایس والے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہ کریں۔ تمہیں اپنا یہ بہروپ تو ختم کرنا ہی ہوگا۔''

''وہ تو ہو جائے گا لیکن پہلے مجھے یہاں سے نکلنا چاہیے۔ واپس نئے اپارٹمنٹ جا کر یہ بہروپ ختم کر کے آؤں گی۔''

''اب یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا ڈیبرا! یہاں نگرانی کرنے والوں کو شاید علم ہو چکا ہو کہ جس وضع قطع میں انہوں نے تمہیں یہاں دیکھا ہے، اسی وضع قطع کی کوئی لڑکی یا عورت اپنا تعاقب کرنے والوں کو چکما دے چکی ہے۔ ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہو جس کا خیال مجھے آیا ہے لیکن خدشہ تو ہے نا۔ ایسی صورت میں تم جیسے ہی ہوٹل سے باہر نکلو گی، تمہیں روک لیا جائے گا۔ قریب سے تم کو دیکھ کر وہ تمہیں پہچان بھی لیں گے۔''

''لیکن اگر میں یہیں رکتی ہوں تو میرا یہ بہروپ کیسے ختم ہوگا؟''

''تمہارے ملبوسات قصرِ صدارت میں بھی تھے۔ آج ممی نے میرے کپڑوں کے چھ سوٹ کیس بھجوائے ہیں۔ ان میں تمہاری جینز وغیرہ بھی ہیں۔''

ڈیبرا نے سر ہلایا، پھر کہا۔ ''گریٹا کا خیال آ گیا ہے مجھے۔ اب اس کے لیے کوئی خطرہ نہ ہو جائے۔''

''ہاں یہ اندیشہ تو ہے۔ اب یہ بات کھل ہی جائے گی

کہ اس بہروپ میں تم ہی مجھ سے ملنے آئی ہو۔ اب تم موبائل کا استعمال کرسکتی ہو۔ فوراً گریٹا کو فون کرو۔ تم دونوں کو اشاروں میں بات کرنا خوب آتا ہے۔ تم اس سے کہو وہ کہ وہ فوراً وہ اپارٹمنٹ چھوڑ کر تمہارے نئے اپارٹمنٹ چلی جائے اس کی ایک چابی اس کے پاس بھی ہے نا؟''

ڈیبرا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وینیٹی بیگ سے اپنا موبائل نکالا۔

اسی وقت پشمینہ کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ کال چنگیزی کی تھی۔

''مبارک ہو میڈم!'' چنگیزی کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔ ''جب زاہدہ کا نام اختیار کرنے والی خاتون ہوٹل کے ریسپشن پر آپ سے بات کر رہی تھی، اس وقت میرا ایک آدمی بھی سادہ لباس میں ریسپشن کے قریب موجود تھا۔ اس نے ڈیبرا کو پہچان لیا۔''

پشمینہ کے ہونٹ بھنچ گئے۔

چنگیزی کہتا رہا۔ ''اسی لیے مبارک باد دی ہے کہ آپ کی باڈی گارڈ آپ تک پہنچ گئی ہے اور آپ نے اس کی ضمانت بھی کرالی ہے۔''

پشمینہ نے جواب میں ایک لفظ بھی کہے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔

اسی دوران میں ڈیبرا اپنے موبائل پر گریٹا کے موبائل سے رابطہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

کال بیل کی آواز سن کر گریٹا دروازے پر گئی اور ''آئی گلاس'' سے باہر جھانکا۔ اس کا چہرہ رنگ بدل گیا۔ باہر سی ایس کے تین اہلکار کھڑے تھے۔ ان کی شناخت اس لیے آسان تھی کہ پولیس کی طرح ان کی بھی مخصوص طرز کی وردیاں ہوتی تھیں۔ کانسٹیبل کی سطح کے اہلکاروں کی وردی ہلکے نیلے رنگ کی ہوتی تھی۔ سینے پر سی ایس کا آکٹوپس جیسا مونوگرام ہوتا تھا۔ افسران کی وردی قدرے گہرے نیلے رنگ کی ہوتی تھی۔ سینے پر آکٹوپس مونوگرام کے ساتھ تاج کی تصویر ہوتی تھی۔ منصب کے اعتبار سے تاج کی تعداد میں اضافہ ہوتا تھا۔ دو تاج والوں کی کمر کی چوڑی بیلٹ پر بھی آکٹوپس کا دھاتی نشان ہوتا تھا اور بیلٹ کے ساتھ ہی ہولسٹر میں ریوالور بھی ہوتا تھا۔ بغیر تاج یا ایک تاج والے کو ریوالور رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی طرح بغیر تاج والا بھی ریوالور نہیں رکھ سکتا تھا۔ ایک تاج والے کے ہاتھ میں صرف ڈیڑھ فٹ کا موٹا سا رول ہوتا تھا۔

گریٹا نے جن اہلکاروں کو دیکھا، ان میں سے دو کے سینے پر صرف مونوگرام تھا۔ تیسرے کے سینے پر مونوگرام کے ساتھ دو تاج تھے۔ اس کی کمر سے لٹکے ہوئے ہولسٹر میں ریوالور بھی تھا۔

گریٹا نے پُرسکون تاثر کے ساتھ دروازہ کھولا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بہرحال کچھ بڑھ گئی تھیں۔ اہلکاروں کو دیکھ کر اس نے خفیف سے تعجب کا اظہار کیا جیسے اس نے آئی گلاس سے انہیں نہ دیکھا ہو۔

''یس؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

افسر ایک ہاتھ سے گریٹا کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے اندر آگیا۔ اس کے ساتھ دونوں اہلکار بھی تھے۔ ان میں سے ایک نے دروازہ بند کرلیا۔ اسے ان کے افسر سے یہ ہدایت پہلے ہی مل چکی ہوگی۔

''ابھی یہاں کون آیا تھا۔ کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے پہلے؟'' افسر نے گریٹا کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

گریٹا اردو ٹوٹی پھوٹی ہی بولتی تھی لیکن دوسرے کی کہی ہوئی بات پوری طرح سمجھ لیتی تھی۔ اس نے انگریزی میں کہا کہ وہ اردو میں بات نہیں کرسکتی۔

افسر نے اپنا سوال انگریزی میں دہرایا۔

''وہ مس ڈیبرا کی کوئی دوست تھیں۔ انہی سے ملنے آئی تھیں۔'' گریٹا نے جواب دیا۔

''آج سے پہلے بھی میرا محکمہ تم سے پوچھ کچھ کر چکا ہے۔'' افسر نے کچھ غصیلی آواز میں کہا۔ ''اس وقت بھی تم نے جھوٹ بولا ہوگا اور اب پھر جھوٹ بول رہی ہو۔''

''نہیں، یقین کیجیے، وہ مس ڈیبرا کی کوئی دوست تھیں۔''

افسر کا ہاتھ بڑی تیزی سے گھوما۔ اس نے گریٹا کی عمر کا لحاظ نہیں کیا تھا۔ اس کا زناٹے دار تھپڑ گریٹا کے بائیں گال پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ سی ایس کے اہلکار خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ گریٹا اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا گال اندر سے پھٹ گیا تھا۔ باچھوں سے خون کی پتلی سی دھار بہہ نکلی تھی۔ اس نے بے بسی سے سی ایس کے اہلکاروں کی طرف دیکھتے ہوئے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ''یہ...... یہ ظلم ہے۔''

''سی ایس سے جھوٹ بولنے والوں کے ساتھ اس سے بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔''

''میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔''

''تو وہ ڈیبرا کی دوست تھی؟'' افسر طنزیہ انداز میں

بولا۔

''ہاں۔'' گریٹا کو علم نہیں تھا کہ بات کھل چکی ہے اس لیے وہ اپنی بات پر جمی رہی۔

افسر کا ہاتھ پھر اٹھا ہی تھا کہ گریٹا جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔

افسر نے اپنے ساتھ آئے ہوئے اہلکاروں سے کہا۔ ''اسے گھسیٹتے ہوئے لے چلو یہاں سے۔''

دونوں اہلکار تیزی سے گریٹا کی طرف بڑھے۔

''کہاں لے جانا چاہتے ہو مجھے؟'' گریٹا اب خوف زدہ ہوئی۔

''ہیڈ کوارٹر۔''

دونوں اہلکار نے گریٹا کو اس کے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹنا چاہا۔

''پلیز! گھسیٹو مت مجھے۔ میں خود چلنے کے لیے تیار ہوں۔''

اہلکاروں نے اس کا جواب نظر انداز کر دیا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھے۔ گریٹا کے بازو ان کی گرفت میں تھے۔ اس لیے گریٹا کو جھٹکا لگا اور اس کے پیر پھسل گئے۔ وہ گھسٹنے لگی۔

''مجھے گھر کو لاک کرنے دو ظالمو۔'' گریٹا نے چیخ کر کہا۔

فوراً ہی عقب سے افسر نے اس کے اتنی زوردار ٹھوکر ماری کہ گریٹا کے منہ سے زور کی آہ نکل گئی۔

اپارٹمنٹ کے باہر دو چار افراد ادھر ادھر کھڑے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے یقیناً سی ایس کے اہلکاروں کو ڈیبرا کے گھر میں جاتے دیکھ لیا ہوگا۔ انہوں نے جو یہ دیکھا کہ گریٹا کو گھسیٹ کر باہر لایا جا رہا ہے تو وہ تیزی سے کھسک لیے۔

افسر کا مقصد بھی غالباً یہی تھا کہ لوگ یہ منظر دیکھ کر خوف زدہ ہوں اور سی ایس کے دبدبے میں اضافہ ہو۔

نیچے سی ایس کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ ان کی گاڑی مخصوص طرز کی تھی جو یقیناً آرڈر دے کر بنوائی اور منگوائی گئی ہوگی۔ اس پر بھی سی ایس کا بڑا سا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ چھت پر ویسی ہی گردش کرنے والی لائٹس تھیں جو ایمبولینس یا پولیس کاروں پر ہوتی ہیں۔

گریٹا کو اٹھا کر اس گاڑی میں ڈال دیا گیا۔

ادھر اُدھر جاتے ہوئے لوگ رک کر یہ منظر دیکھنے لگے۔ خوف زدہ وہ بھی نظر آنے لگے تھے۔

گاڑی کے قریب ہی دو موٹر سائیکلیں بھی کھڑی تھیں۔ ان کی قدرے بڑی ہیڈ لائٹ پر بھی سی ایس کا مونوگرام کندہ تھا۔

جو اہلکار وہاں پہلے سے موجود تھے، انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ اوپر جا کر ڈیبرا کا اپارٹمنٹ سیل کر دیں۔

افسر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا اہلکار انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ وہ گاڑی حرکت میں لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہوٹر بھی کھول دیا تاکہ راستے میں کوئی گاڑی سامنے نہ آئے۔

رفتار تیزی سے بڑھائی گئی تھی۔ ایک موٹر سائیکل سوار فوری طور پر راستے سے نہیں ہٹ سکا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ سی ایس کی گاڑی کی زد پر آیا اور اچھل کر دور جا گرا۔ اس کا اور موٹر سائیکل کا کیا حشر ہوا؟ یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

گاڑی اپنی رفتار سے آگے بڑھتی رہی۔

یہ پہلا واقعہ تھا جس سے سی ایس نے لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کا آغاز کیا تھا۔

☆☆☆
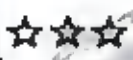
دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن ریسیور نہیں اٹھایا گیا۔

''کہاں چلی گئی؟'' ڈیبرا پریشانی میں بڑبڑائی۔

''شاید باتھ روم میں ہو نہا رہی ہو۔ ذرا دیر بعد فون کر لینا۔'' پشمینہ نے کہا۔

ڈیبرا موبائل بند کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، رات کو سونے سے پہلے اسے غسل کرنے کی عادت تو ہے۔''

گریٹا پر جو کچھ گزری تھی، وہ اس وقت ان دونوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔

''میں آئندہ چند دن میں اپنی پارٹی کے نام کا اعلان کرنے والی ہوں۔'' پشمینہ نے ڈیبرا کو بتایا۔ ''چند ایسے لوگ جو موجودہ سیاست سے دل برداشتہ ہو کر خاموشی سے زندگی گزارنے لگے تھے، انہوں نے آج مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ کل میٹنگ طے ہے۔ شاید پرسوں ہی پارٹی کا اعلان کر دوں۔''

''اوہ! فنڈز کے سلسلے میں کیا ہوگا؟ میں نے شاہ صاحب سے بات کی تھی۔ تم جتنا کہو گی، اتنا فنڈ زل جائے گا۔''

''شکریہ اُن کا۔ فنڈز کا بندوبست تو پارٹی کے اعلان کے دوسرے ہی دن ہو جائے گا۔ تاہم میں بھی فون کر کے شاہ صاحب کا شکریہ ادا کر دوں گی۔ شاید کسی موقع پر ان کی

"ضرورت پڑ ہی جائے۔"

ڈیبرا نے سیٹلائٹ فون کے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے یہ ایکٹیویٹ کردیا ہے اور ان کا فون نمبر بھی فیڈ کردیا ہے۔"

"گڈ۔" پشمینہ نے سیٹلائٹ فون نکال کر دیکھا۔ "خوب صورت ہے۔"

"میں گریٹا کے سلسلے میں پریشان ہوں پشمینہ!"

"وہ تمہاری مس کال دیکھ کر خود ہی فون کرلے گی۔ اتنا وقت لگنے کا مطلب یہی ہے کہ وہ باتھ روم میں ہوگی۔ ذرا اور انتظار کرلو۔ اتنی دیر میں اپنا حلیہ بھی تبدیل کرلو۔ میں نے وارڈ روب میں اپنے کپڑوں کے ساتھ تمہاری دو جینز، ایک چست پتلون اور بنیان وغیرہ بھی رکھ دی ہیں۔ چلو، میں وہ تمہیں دکھا دیتی ہوں۔"

ڈیبرا کو ساتھ لے کر پشمینہ خواب گاہ کی طرف بڑھی۔

ڈیبرا نے پوچھا۔ "باڈی گارڈز دانش یزدانی ہی کے ہیں؟"

"نہیں، وہ واپس چلے گئے ہیں۔ اب ایک ایجنسی کے یہ گارڈز میرے ہی ہیں۔ بندوبست دانش نے ہی کروایا ہے۔ میرے لیے ایک بلٹ پروف جیکٹ کا بندوبست بھی کردیا ہے۔ تمہارے لیے بھی ایک اور منگوا لوں گی۔ ابھی اسے فون کیے دیتی ہوں۔ تمہارے لیے بھی کل تک آجائے گی۔"

"شاہ صاحب کے کہنے پر دبئی کے ایک تاجر آپ کے لیے ایک بلٹ پروف کار بجوا رہے ہیں۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں خواب گاہ میں داخل ہو چکی تھیں اور پشمینہ نے وارڈ روب کھول دی تھی۔

"یہ ہیں تمہارے کپڑے۔" پشمینہ نے بتایا۔ "تم تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آجاؤ۔"

وہ ڈیبرا کو چھوڑ کر ڈرائنگ روم میں آئی اور ٹی وی کھول کر موبائل پر دانش یزدانی سے رابطہ کیا۔ اس سے ایک اور بلٹ پروف جیکٹ کے لیے کہا، پھر رابطہ منقطع کر کے ٹی وی کی طرف توجہ دی جس پر اشتہار ختم ہونے کے بعد خبریں نشر ہونے لگیں۔

ایک خبر یہ بھی آئی کہ سی ایس کی ایک تیز رفتار گاڑی کے دھکے سے ایک موٹر سائیکل سوار شدید زخمی ہوا ہے جسے اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ پولیس نے اس واقعے کی ایف آئی آر درج نہیں کی، صاف انکار کردیا گیا۔

"دہشت گردی شروع۔" پشمینہ زیرلب بڑبڑائی۔

اسی وقت بریکنگ نیوز کی سلائڈ میں یہ خبر آئی کہ سی ایس نے پشمینہ حیات کی دوست باڈی گارڈ ڈیبرا کے گھر پر ریڈ کیا تھا۔ ڈیبرا ان کو نہیں ملی تو وہ لوگ ڈیبرا کی ملازمہ کو زبردستی اٹھا لے گئے۔ اسے بڑی بے دردی سے گھسیٹ کر گاڑی میں ڈالا گیا تھا۔ گریٹا کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ غالباً اسے زدوکوب بھی کیا گیا تھا۔ اپارٹمنٹ سیل کردیا گیا۔

پشمینہ کا جسم سنسنا گیا اور چہرے پر غصے کی سرخی پھیل گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ ڈیبرا پر اس خبر سے قیامت گزر جائے گی۔ اس نے بھی گریٹا کو ملازم نہیں سمجھا تھا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتی تھیں۔

خبر سنانے کے بعد اینکر پرسن نے اسی خبر پر تجزیہ کرنے کے لیے ایک جرنلسٹ کو لائن پر لیا۔ ان کی گفتگو شروع ہوئی ہی تھی کہ پشمینہ نے ڈیبرا کے قدموں کی آہٹ سنی۔ اس نے فوراً ٹی وی بند کردیا۔ وہ ڈیبرا کو سمجھا بجھا کر یہ خبر اسے خود دینا چاہتی تھی۔

ڈیبرا چست پتلون اور بنیان میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں موبائل تھا۔ چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

"میں ابھی پھر فون کرچکی ہوں گریٹا کو۔" وہ بولی۔ "اب بھی ادھر سے کال ریسیو نہیں کی گئی۔"

"بیٹھو!" پشمینہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں فوراً وہاں جانا چاہتی ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ ابھی خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ سی ایس والے اسے پوچھ گچھ کرنے کے لیے لے گئے ہیں۔ غالباً اپنے ہیڈکوارٹر ہی گئے ہوں گے۔"

ڈیبرا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ صوفے پر گر سی پڑی۔

"میں ابھی چنگیزی سے بات کرتی ہوں۔" پشمینہ نے کہا اور موبائل پر چنگیزی سے رابطہ قائم کرنے لگی۔

ڈیبرا بڑے غصے سے بولی۔ "اگر گریٹا کو کچھ ہوگیا تو میں موقع ملنے پر چنگیزی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ گولیاں اتاردوں گی اس کے سینے میں۔"

"اس سے [illegible] ختم نہیں ہوجائے گی۔ اس کی جگہ کوئی ہلاکو آجائے گا۔" پشمینہ نے کہا۔ "جذبات میں نہ بہو۔ ان حالات میں ہمیں بڑے تحمل سے کام کرنا ہوگا ورنہ......"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ چنگیزی سے رابطہ ہوگیا تھا۔

"فرمایئے میڈم!" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے خادم کو یاد کیا۔"

"گریٹا کہاں ہے؟" پشمینہ نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

"جو بھی ایس سے غلط بیانی کرے گا، اسے سزا تو ملے گی میڈم!" چنگیزی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "وہ پہلے بھی میرے آدمیوں سے غلط بیانی کر چکی تھی۔ آج بھی وہ اس بات پر اڑی رہی کہ جو اپارٹمنٹ میں آئی تھی، وہ ڈیبرا کی کوئی دوست تھی۔ اس طرح اس نے پھر جھوٹ بولا۔ یہ نہیں بتایا کہ وہ خود ڈیبرا تھی۔ ایک غلط بیانی بھی برداشت نہیں کی جاسکتی۔ اس نے تو دوسری مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔ سزا تو ملے گی اُسے۔"

"کس قسم کی سزا؟" پشمینہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"دو گھنٹے بعد وہ آپ کو اسپتال میں مل جائے گی۔" اس نے جواب دیا، پھر اسپتال کا نام بھی بتا دیا۔

پشمینہ نے دانت پیستے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

ڈیبرا پریشانی کی حالت میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

پشمینہ نے اسے پوری بات بتائے بغیر کہا۔ "پوچھ گچھ کرنے کے بعد وہ دو گھنٹے بعد اسے چھوڑ دیں گے۔"

"سزا کا لفظ آیا تھا تمہاری زبان پر، وہ کیا سزا دینا چاہتے ہیں اسے؟" ڈیبرا ہذیانی انداز میں بولی۔

"یہ دو گھنٹے بعد ہی معلوم ہوسکے گا۔ صبر سے انتظار کرو۔ ابھی کہہ چکی ہوں کہ جذبات پر قابو رکھو۔ بہت سوچ سمجھ کر استقامت سے حالات کے مطابق اقدامات کرنے ہوں گے۔ سی ایس کو بہت عجلت میں فعال کیا گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ابھی اس میں کچھ وقت لگے گا۔ گریٹا کا معاملہ تو سمجھو کہ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں مستقبل قریب میں بڑے خوفناک حالات کی توقع رکھتی ہوں۔"

"تو پھر تم کو بھی......"

پشمینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔ نہیں ڈیبرا! اب وہ میرے معاملے میں شاید کوئی خطرناک قدم نہ اٹھائیں۔ ممی نے مجھے فون پر بتایا تھا۔ انہوں نے ڈیڈی سے کہہ دیا ہے کہ اگر پشمینہ کو کچھ ہوا تو وہ اپنے آپ کو شوٹ کرلیں گی۔"

ڈیبرا کچھ نہیں بولی اور صوفے سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

"دو گھنٹے آرام کرلو۔" پشمینہ نے کہا۔ "میرے بیڈ روم میں جاکر بستر پر لیٹ جاؤ۔"

"مجھے اس وقت آرام نہیں مل سکتا۔"

"لیٹو گی تو کم از کم جسم کو آرام مل جائے گا۔ جسم کو آرام ملتا ہے تو ذہن کو بھی خود بخود کچھ سکون مل جاتا ہے۔"

"مجھے آرام نہیں ملے گا۔"

"میں جو کہہ رہی ہوں، وہ کرو۔" پشمینہ نے کچھ بگڑ کر کہا۔

ڈیبرا نے فوری طور پر اسے گھور کر دیکھا، پھر تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

پشمینہ نے موبائل پر دانش یزدانی سے رابطہ کیا۔

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "مجھے گریٹا کے بارے میں معلوم ہوچکا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ تم نے اپنی پارٹی کا میڈیا سیل بہت مضبوط بنایا ہے۔ تم ٹی وی نہیں بھی دیکھ رہے ہو گے تو بھی اہم خبر تم تک فوراً پہنچائی جاتی ہے۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ابھی میں نے چنگیزی کو فون کیا تھا۔" اس نے وہ باتیں دہرا دیں جو چنگیزی سے معلوم ہوئی تھیں پھر کہا۔ "ضروری نہیں ہے کہ گریٹا کو دو گھنٹے بعد ہی وہاں پہنچایا جائے۔ پہلے بھی پہنچایا جاسکتا ہے اور چنگیزی سے میں یہ توقع نہیں کرسکتی کہ وہ مجھے اس بارے میں اطلاع دینے کے لیے فون کرے گا۔ تم اپنے کسی معتمد کو فوری طور پر وہاں بھیج دو تاکہ مجھے بروقت اطلاع مل سکے۔"

"میں اپنے اعتماد کے ایک جرنلسٹ کو وہاں بھیج دوں گا۔" دانش نے جواب دیا۔ "اس سے یہ کہنا ہی کافی ہوگا کہ دو گھنٹے کے اندر اندر اسے وہاں سے ایک اہم خبر مل سکتی ہے۔ یہ ہدایت بھی کردوں گا کہ مجھے وہ فوراً اطلاع دے۔"

"جیسا مناسب سمجھو، وہ کرو۔ دوسری بات کہ ڈیبرا کے لیے بھی میں ایک بلٹ پروف جیکٹ چاہتی ہوں۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کل صبح دس بجے سے پہلے پہنچوا دوں گا، کیا تم ٹی وی کھولے ہوئے ہو؟"

"ذرا دیر کے لیے کھولا تھا تو یہ خبر ملی۔ مجھے بہت کچھ سوچنا پڑ رہا ہے اس لیے مستقل ٹی وی نہیں دیکھ رہی ہوں، کیوں؟"

"حالات بہت تیزی سے بگڑ رہے ہیں۔ غالباً سی ایس کا جال سارے ملک میں پھیلا دیا گیا ہے۔ دوسرے شہروں سے بھی سی ایس کی جارحیت کی خبریں آرہی ہیں۔ لوگوں کو گھروں سے اٹھایا جارہا ہے۔ خصوصاً اُن بڑے لوگوں کو جو شاہ صاحب کے پیروکار ہیں۔"

"یہ سب ہونے کا اندازہ تھا مجھے۔" پشمینہ نے کہا۔

"بس میری توقع سے پہلے ہوگیا یہ سب کچھ۔"

"دوسری خبر سنو! شہر کے اہم مقامات پر صدر حیات

کے مجسمے لگائے جارہے ہیں۔''

''اوہ، اس کا علم نہیں ہو سکا تھا مجھے۔ یقیناً وہ مجسمے بہت پہلے ہی تیار کروا لیے گئے ہوں گے۔ انہیں نصب کرنے کا کام اب شروع ہوا ہے۔''

''ٹی وی چینلز پر ان حالات کے بارے میں حکومت کے خلاف بہت سخت باتیں کی جارہی ہیں۔''

''کسی وقت بھی میڈیا کو زنجیروں سے جکڑا جا سکتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے ایک ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ میڈیا چارٹر کے نام سے ایک آرڈی نینس جاری کیا جائے گا۔ آرڈی نینس جاری کرنے میں تاخیر جان بوجھ کر کی جارہی ہے۔ صدر حیات کی خواہش ہے کہ وہ تین روز تک ٹی وی اور اخبارات میں یہ خبریں چلتی رہیں تاکہ سی ایس کے حوالے سے ملک بھر میں خوف کی فضا پیدا ہوجائے۔''

''ہوں۔'' پشمینہ نے ہونٹ بھینچ لیے، پھر کہا۔ ''اس طرح دراصل صدر صاحب اپنی شامت کو خود دعوت دے رہے ہیں۔''

''لیکن اس سے پہلے ہمیں بھی بڑے جاں گسل حالات سے گزرنا ہوگا۔''

''مجھے خوشی ہوئی کہ تم ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو۔ اچھا اب میں فون بند کررہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ جیسے ہی مجھے گریٹا کے بارے میں اطلاع ملے گی، میں تمہیں فون کردوں گا۔''

پشمینہ نے رابطہ منقطع کیا اور ڈیبرا کی حالت دیکھنے کے لیے اپنی خواب گاہ کا رخ کیا۔ یہ دیکھ کر اس نے ایک طویل سانس لی کہ ڈیبرا بستر پر لیٹنے کے بجائے وحشیانہ انداز میں ٹہل رہی تھی۔

پشمینہ اس سے مخاطب ہوئے بغیر بستر پر جا کر لیٹ گئی۔

دو گھنٹے سے پہلے ہی دانش یزدانی کا فون آگیا۔

''گریٹا وہاں بہت بری حالت میں پہنچی ہے۔ غالباً بے ہوش ہے۔ ابھی اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہوا۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' پشمینہ نے کہہ کر فوراً رابطہ منقطع کردیا۔

وہ ڈیبرا کے سامنے اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ڈیبرا سے کہا۔ ''میں جارہی ہوں۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔ ''امکان ہے کہ میں گریٹا کے بارے میں کچھ معلوم کرکے ہی لوٹوں گی۔ تم اب.....''

ڈیبرا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تمہیں فون پر بتایا گیا تھا کہ اسے دو گھنٹے بعد چھوڑ دیا جائے گا۔''

''ابھی نہیں چھوڑا گیا۔'' پشمینہ نے جواب دیا۔ ''میں اسی بارے میں معلومات حاصل کرنے جارہی ہوں۔ پانچ باڈی گارڈ لیے ہیں میں نے، تین کو میں اپنے ساتھ لے جارہی ہوں۔ دو یہاں تمہاری حفاظت کے لیے رہیں گے۔''

''میں اپنی حفاظت خود کرسکتی ہوں۔ کبھی وقت آئے تو دیکھنا کہ میں کتنوں پر اکیلی ہی بھاری پڑوں گی لیکن اس وقت تم جہاں بھی جارہی ہو، مجھے بھی ساتھ لے کر چلو۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہی ہو۔''

حقیقت یہی تھی۔ پشمینہ پہلے خود جاننا چاہتی تھی کہ گریٹا کو کس حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ اس نے ڈیبرا کی طرف دیکھتے ہوئے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''اچھا چلو۔''

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھا۔ پشمینہ کی کار بہت تیز رفتاری سے اسپتال کی طرف رواں دواں تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر خود پشمینہ تھی۔ ڈیبرا اس کے برابر کی سیٹ پر تھی۔ دو باڈی گارڈ پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ دو باڈی گارڈ کار کے آگے پیچھے موٹر سائیکلوں پر تھے۔ ایک باڈی گارڈ کو پشمینہ نے ہوٹل ہی میں چھوڑ دیا تھا۔

''تم بتا نہیں رہی ہو کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔'' ڈیبرا نے تیسری بار کہا۔

''اسپتال۔'' اب پشمینہ نے بتا ہی دیا۔ اس نے سوچا تھا کہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی بتا دینا مناسب ہوگا۔ اس نے وہ جملہ بھی دہرا دیا جو اس سے دانش نے کہا تھا۔

ڈیبرا کے منہ سے بے معنی سی آواز نکلی اور پھر وہ دانت پیسنے لگی۔ کچھ لمحوں کے توقف سے بولی۔ ''اس کا مطلب ہے گریٹا پر تشدد کیا گیا ہے۔''

پشمینہ کے ذہن میں بھی یہ بات آچکی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

گریٹا پر ایسا تشدد کیا گیا تھا کہ اس کے چہرے پر کوئی نشان نہیں آیا تھا لیکن جسم جگہ جگہ بلیڈ سے کاٹا گیا تھا، جلتے ہوئے سگریٹ بجھائے گئے تھے۔ اس کی وہ حالت دیکھ کر ڈیبرا کا جسم غصے سے کانپنے لگا اور چہرے پر ایسی سرخی چھا

گئی تھی جیسے کسی وقت بھی جلد پھٹ گئی اور چہرے پر خون ہی خون پھیل جائے گا۔

دوسرے دن جب وہ کسی حد تک بولنے کے قابل ہوئی تو اس نے بتایا کہ وہ لوگ اس سے یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ڈیبرا کس جگہ روپوش رہی تھی لیکن وہ اس کی زبان کھلوانے میں ناکام رہے تھے۔

ڈیبرا مستقل طور پر گریٹا کے پاس ہی رہنا چاہتی تھی لیکن پشمینہ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ اس دن سیاست سے کنارہ کش ہو جانے والے کچھ لوگوں کے ساتھ اس کی میٹنگ تھی۔ اس نے گریٹا کے سامنے ہی ڈیبرا کو سمجھایا۔

"میں تمہارے ساتھ وہ باڈی گارڈ چھوڑ کر چلی جاؤں تو بھی تمہاری طرف سے پریشان ہی رہوں گی۔ میری عدم موجودگی میں سی ایس کے اہلکار تمہیں ضرور اٹھا لے جانے کی کوشش کریں گے۔"

"میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔"

"دو ور جن افراد بھی یلغار کر سکتے ہیں۔"

"ان میں سے چھ سات کو تو میں موت کی نیند سلا دوں گی۔"

"پکڑی پھر بھی جاؤ گی۔"

"میں انہیں مار کر یہاں سے بچ کے نکل بھی جاؤں گی۔"

"اس کے بعد پھر روپوش ہونا پڑے گا اور مجھے تمہاری رفاقت حاصل نہیں رہے گی۔ کم از کم میرا ہی کچھ خیال کرو۔"

اس بات کے جواب میں ڈیبرا چپ رہ گئی۔ اس کے چہرے پر بے بسی کا تاثر ابھر آیا تھا۔

"چلی جاؤ ڈیبو!" گریٹا کی آواز میں نقاہت تھی۔ "تمہارے یہاں رہنے سے میں جلدی ٹھیک نہیں ہو جاؤں گی۔"

ڈیبرا بے بسی کے عالم میں پشمینہ کے ساتھ واپس لوٹی۔

شام پانچ بجے ہوٹل ہی میں میٹنگ تھی۔ اس میٹنگ میں پانچ افراد آئے تھے۔ ڈیبرا کو اس میٹنگ میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔

میٹنگ رات گئے تک جاری رہی۔

ٹی وی چینلز سے برابر یہ خبر نشر کی جا رہی تھی کہ پشمینہ حیات کی اس میٹنگ میں یقینی طور پر ایک نئی سیاسی پارٹی وجود میں آ جائے گی پھر جیسے جیسے رات بھیگتی گئی، خبریں بھی آنے لگیں کہ اس میٹنگ میں پارٹی کے سارے ہی امور طے کیے جا رہے ہیں۔

صحافیوں کی خاصی تعداد اور ٹی وی کیمرے ہوٹل کی لابی میں موجود تھے کیونکہ میٹنگ کے بعد پشمینہ کو پریس سے بات کرنی تھی۔

صحافی چھ بجے ہی سے جمع ہونے لگے تھے۔ انہیں ایک تھکا دینے والا انتظار کرنا پڑا۔ لابی ہی میں وہ ڈائس بنایا گیا تھا جہاں بیٹھ کر پشمینہ پریس کانفرنس کرتی۔ وہاں سات کرسیاں لگائی گئی تھیں۔

ٹی وی چینلز پر یہ خبر بھی آ چکی تھی کہ میٹنگ میں پانچ افراد ہیں۔ ان کے نام بھی دے دیے گئے تھے لیکن ڈائس پر سات کرسیاں تھیں اس لیے کہا جا رہا تھا کہ اس پریس کانفرنس میں بھی ڈیبرا، پشمینہ کے ساتھ ہو گی۔

تمام چینلز پر تجزیے بھی جاری تھے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کو بھی اس پریس کانفرنس سے دلچسپی تھی۔ وہ بھی اس پریس کانفرنس کی خبر نشر کر چکے تھے۔ ایک مغربی چینل یہ پریس کانفرنس براہ راست بھی دکھانا چاہتا تھا چنانچہ اس کے تین کیمرے لابی میں موجود تھے۔

چینلز پر سی ایس کی بتدریج بڑھتی ہوئی زیادتیوں کی خبریں تو آ ہی رہی تھیں اور تشدد زدہ گریٹا کی تصویر بھی آ چکی تھی جو خود سی ایس نے جاری کی تھی۔ تصویر پر یہ بھی لکھا تھا۔

"سی ایس سے غلط بیانی کرنے والوں کا انجام۔"

ان سب باتوں کی وجہ سے چینلز پر یہ سوال بھی اٹھایا جا رہا تھا کہ اس پریس کانفرنس کے سلسلے میں سی ایس کا کوئی ردعمل آ سکتا ہے یا نہیں؟ یہ سوال اٹھنے کا سبب تھا پشمینہ پر ہونے والا قاتلانہ حملہ جو ڈیبرا کی چلائی ہوئی گولی کی وجہ سے ناکام ہوا تھا۔

اب جو پریس کانفرنس ہونے والی تھی اس میں ڈائس پر بلٹ پروف شفاف شیشہ بھی لگایا گیا تھا۔

جو ٹی وی چینلز اس پریس کانفرنس کو مسلسل نہیں دکھا رہے تھے، ان پر ایک بجنے میں دس منٹ پر بریکنگ نیوز چلی کہ اب پشمینہ پریس کانفرنس سے خطاب کرنے کے لیے ڈائس پر پہنچ چکی ہے۔

صحافیوں سے مخاطب ہو کر اس نے کہا کہ اس میٹنگ کی طوالت کا سبب بنیادی امور کا فوری طور پر طے ہونا تھا۔ اس میں یہ طے پایا کہ پارٹی کا نام آر ایف، یعنی ری پبلکن فورم ہو گا۔ اس کی صدارت اسد گیلانی کو اتفاق رائے سے سونپی گئی تھی۔ پارٹی فلیگ سیاہ رنگ کا ہو گا جس پر سفید

لکیروں سے فاختہ کی تصویر ہوگی جو "امن" کی علامت ہے۔ منشور کا اعلان چند روز میں کیا جائے گا جس کے بارے میں ابھی میٹنگز جاری رہیں گی۔ چند اور ثانوی باتوں کے بعد آخری اہم بات یہ کہی گئی کہ اگلے ہی دن ایک اور اہم کانفرنس ہوگی۔

پشمینہ کے خاموش ہونے کے بعد صحافیوں کے سوالات شروع ہوئے۔ ان میں ایک خطرناک سوال یہ تھا کہ کیا ری پبلکن فورم موجودہ حکومت یعنی جمہوریت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے گا؟

سوال میں لفظ "جمہوریت" کا اضافہ صحافی کی شرارت تھی۔

پشمینہ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کہ "ری پبلکن" کا مطلب ہی "جمہوریت پسند" ہے اس لیے جمہوریت کے خلاف یہ فورم کیسے کام کر سکتا ہے اور کیونکہ اس وقت ملک میں "جمہوریت" کے بجائے تیزی سے "جبریت" کا نظام نافذ ہوتا جا رہا ہے لہٰذا یہ فورم اس جبر کے خلاف کام کر کے ملک میں جمہور کا نظام بحال کرنے کے لیے سرگرم ہوگا۔

پشمینہ اپنی کرسی سے اٹھی، پھر ذرا ایک رک کر بولی۔ "آج صدر اسد گیلانی خاموش رہے ہیں لیکن کل یہ بھی آپ لوگوں سے باتیں کریں گے اور پارٹی کے جنرل سیکریٹری بھی۔"

اس کے بعد صحافی پوچھتے رہ گئے کہ جنرل سیکریٹری کون ہوگا لیکن پشمینہ جواب دیے بغیر لابی سے چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ پانچوں افراد اور ڈیبرا بھی۔

سوئٹ کے ڈرائنگ روم میں مزید نصف گھنٹے ان کی میٹنگ ہوئی۔ پھر پشمینہ نے انہیں رخصت کرتے ہوئے کہا۔ "خیال رکھیے گا۔ میرا ساتھ دے کر آپ لوگوں نے اپنے لیے خطرات کو دعوت دی ہے۔"

"ہم پانچوں اس سلسلے میں پہلے ہی میٹنگ کر چکے ہیں میڈم!" اسد گیلانی نے کہا۔ "ہم سینے پر لگنے والی گولیوں کا خیر مقدم کریں گے۔"

جواب میں پشمینہ نے کہا۔ "اس سوچ کے بغیر تو یہ جبریت ختم ہو بھی نہیں سکتی۔"

ان پانچوں کے جانے کے بعد پشمینہ نے ٹی وی کھولا۔ بار بار چینل بھی تبدیل کیے۔ تقریباً ہر چینل پر اس کی پریس کانفرنس زیرِ بحث تھی۔ یہ بھی سوچا جا رہا تھا کہ اس پارٹی کا جنرل سیکریٹری کون ہوگا؟

پشمینہ نے مسکرا کر ڈیبرا کی طرف دیکھا جو کسی سوچ میں گم تھی۔ وہ ابھی تک گریٹا کے صدمے سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔

پشمینہ نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "چلو اب سویا جائے۔ پونے تین بج گئے۔"

خاموشی کے ساتھ ڈیبرا بھی اس کے ساتھ اٹھ گئی۔

اس دن دانش یزدانی نے پشمینہ کے لیے بلٹ پروف جیکٹ فراہم کر دی تھی اور شام کو بلٹ پروف کار بھی آ چکی تھی۔

دوسری صبح پشمینہ اور ڈیبرا ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ پشمینہ کے لیے پے درپے کالز آنی شروع ہو گئیں۔ وہ مختلف پارٹیوں کے ایم این اے اور ایم پی اے تھے جنہوں نے اسی دن اسمبلیوں اور اپنی اپنی پارٹیوں کو استعفے بھجوا دیے تھے۔ اب وہ ری پبلکن فورم میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی پارٹیوں کے سارے کارکن تو نہیں لیکن ان کی خاصی بڑی تعداد ری پبلکن میں آنے کی خواہش مند تھی۔

"پہلے ہی دن بہت بڑی تعداد ہمارے ساتھ آ رہی ہے ڈیبرا۔" پشمینہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"مجھے تو اس کی توقع تھی۔" ڈیبرا نے کہا۔ "تم خود نہیں کہہ رہی ہو لیکن یہ توقع تمہیں بھی ہوگی اور ٹی وی چینلز کے تجزیوں میں بھی یہ بات کہی جاتی رہی ہے۔"

پشمینہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا۔

اسی دن "ری پبلکن فورم" کو رجسٹر بھی کرا لیا گیا۔ پارٹی کا ایک بڑا سا فلیگ بھی بن کر آ گیا جو اس شام کی پریس کانفرنس میں ڈائس پر لگایا جانا تھا۔ عام سائز کے چھوٹے پرچموں کی ایک کثیر تعداد تیار کرنے کا آرڈر بھی دیا جا چکا تھا۔ دوپہر تک لیٹر ہیڈ بھی چھپ کر آ گئے۔

مصروفیت کے باوجود پشمینہ نے کچھ وقت ڈیبرا کے لیے بھی نکالا تھا اور اس کے ساتھ گریٹا کو دیکھنے اسپتال بھی گئی تھی۔ گریٹا کو انہوں نے گزشتہ روز کی بہ نسبت بہتر پایا تھا۔

اس دوران میں بزنس مین حاجی اشفاق کی کال بھی آ چکی تھی۔ وہ پشمینہ سے جلد از جلد ملنا چاہتا تھا لیکن مصروفیت کے باعث پشمینہ اسے چار بجے کا وقت دے سکی۔

وہ ٹھیک چار بجے آ گیا کیونکہ پانچ بجے پشمینہ کی پریس کانفرنس شروع ہونی تھی۔ اس نے آتے ہی سب سے

پہلے تو "ری پبلکن فورم" کے قیام کی مبارک باد دی، پھر وہ بلینک چیک مانگا جو اس کی خواہش پر پشمینہ نے رکھ لیا تھا۔ چیک لے کر اس نے اس پر ری پبلکن فورم کا نام اور ایک کثیر رقم لکھی۔ پھر اپنی جیب سے دو چیک اور نکالے جو اس کے ساتھیوں نے دیے تھے۔ تینوں چیک اس نے بڑے احترام سے پشمینہ کی خدمت میں پیش کر دیے۔

وہ مجموعی رقم اتنی تھی کہ پشمینہ چند لمحوں کے لیے دم بخود رہ گئی۔ پھر اس نے وہ چیک ڈیبرا کو دیے اور کہا۔ "ان کی رسید بنا دو۔"

ڈیبرا نے تین رسیدیں بنا دیں۔ پشمینہ نے اس پر دستخط کیے اور تینوں رسیدیں حاجی اشفاق کی طرف بڑھا دیں۔ "آپ لوگوں کا بے حد شکریہ حاجی صاحب!"

"شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں پشمینہ صاحبہ!" حاجی اشفاق نے کہا۔ "یہ رقم آپ کو تو نہیں دی گئی۔ یہ تو جمہوریت کے نام ہے جس کا ہم پر بہت بڑا احسان ہوگا۔"

"آپ لوگوں کے جذبات قابلِ قدر ہیں۔"

"بس ایک درخواست ہے آپ سے۔ یہ بات تو خیر خبروں میں آ چکی ہے کہ میں نے آپ سے ملاقات کی تھی لیکن یہ بات سامنے نہ لائیے گا کہ فنڈ آپ کو کہاں سے مہیا ہوا ہے۔"

"کل صبح یہ چیک پارٹی کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیے جائیں گے۔ بات راز میں تو نہیں رہ سکے گی، اور پھر کسی بھی وقت انکم ٹیکس کے محکمے کا سوال بھی کھڑا ہوگا۔"

حاجی اشفاق خفیف سا مسکرایا۔ "جوش اور جذبات میں ہمارا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں۔ خیر، دیکھا جائے گا۔" حاجی اشفاق کھڑا ہو گیا۔ "آپ کی پریس کانفرنس کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں اب اجازت چاہوں گا۔"

پشمینہ نے اسے رخصت کرنے کے بعد ڈیبرا سے کہا۔ "قدرت بھی ہماری مدد پر آمادہ ہو چکی ہے۔"

"میں تمہیں مبارک باد پیش کرتی ہوں۔" ڈیبرا دو دن میں پہلی مرتبہ مسکرائی۔

☆☆☆

اس دن کی پریس کانفرنس بھی لابی ہی میں کیا جانا طے پایا تھا اور اس موقع پر زیادہ لوگوں کے لیے بڑے ڈائس کی ضرورت تھی۔ لابی کی چوڑائی کیونکہ زیادہ نہیں تھی اس لیے ڈائس لمبائی میں بنایا گیا تھا۔

اس پریس کانفرنس اور بڑے اسٹیج کے لیے ہوٹل کی انتظامیہ سے خصوصی طور پر اجازت لی گئی تھی جو انہیں خوشی سے دی دے گئی تھی لیکن انتظامیہ کے لوگ پریشان بہرحال تھے۔ اس ہوٹل میں پشمینہ حیات کا قیام ہوٹل کے لیے اعزاز کی بات سہی لیکن سی ایس کی وجہ سے ان کا پریشان ہونا بھی فطری امر تھا۔

پریس کانفرنس کو سیکیورٹی فراہم کرنے کے لیے سرکاری انتظامیہ سے اس دن بھی کوئی درخواست نہیں کی گئی تھی۔ پارٹی کی طرف سے صرف ایک دن کے لیے پچاس پرائیویٹ گارڈز کا انتظام کیا گیا تھا۔

صحافیوں کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ ساری لابی بھر جاتی لیکن ہوٹل میں مقیم بہت سے لوگ بھی یہ کانفرنس سننے کے لیے لابی میں جمع ہونے لگے تھے۔

اس طرح تین چوتھائی لابی بھر سکتی تھی لیکن ہوا یہ کہ عوام نے بھی وہاں پہنچنا شروع کر دیا تھا۔ پونے پانچ بجے تک ساری لابی بھر چکی تھی اور ہوٹل کے باہر بھی لوگوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ وہ سب بھی ہوٹل کی لابی میں گھسنا چاہتے تھے۔ پرائیویٹ گارڈز اور ہوٹل کی انتظامیہ انہیں روکنے کی کوششوں میں ناکام ہونے لگی تو ہوٹل کے منیجر اور سیکیورٹی کے چیف نے گھبرا کر پشمینہ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"یہ تمہاری مقبولیت ہے۔" ڈیبرا نے خوشی سے لرزیدہ آواز میں پشمینہ سے کہا۔ "تم کامیابی حاصل کر چکی ہو پشمینہ!"

خوشی پشمینہ کو بھی تھی لیکن ہجوم کو قابو کرنا بھی ضروری تھا جس کی ایک ہی تدبیر پشمینہ کی سمجھ میں آ سکی۔ اس تدبیر کے مطابق بڑی عجلت میں ہوٹل کے صدر دروازے پر ایک لاؤڈ اسپیکر لگایا گیا جس کا رابطہ اس مائیکروفون سے کیا گیا جو ثمینہ حیات کے سوئٹ کے ڈرائنگ روم میں لگایا گیا تھا اور جہاں اس وقت وہ ایم پی اے اور ایم این اے بھی جمع تھے جن کی ری پبلکن میں شمولیت کا اعلان اسی پریس کانفرنس میں کیا جانا تھا۔

پشمینہ نے مائیکروفون کے ذریعے ہوٹل کے باہر لگے ہوئے ہجوم سے ایک مختصر خطاب کیا۔ "میرے دوستو! میں پشمینہ حیات آپ سے مخاطب ہوں اور آپ سے درخواست گزار ہوں کہ ہوٹل میں داخل ہونے کی کوشش مت کیجیے...... پلیز!...... میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ لابی بھر چکی ہے۔ مزید لوگوں کے داخلے سے ہڑبونگ مچ جائے گی اور میں پریس کانفرنس نہیں کر سکوں گی۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ آپ کی، آپ سب کی پشمینہ حیات آج کچھ اہم اعلانات نہ کر سکے؟ یقیناً آپ یہ نہیں چاہیں گے۔ میں

آپ لوگوں سے یہ وعدہ کرسکتی ہوں کہ آپ باہر رہ کر بھی پریس کانفرنس کی کارروائی سن سکیں۔ اس لاؤڈ اسپیکر کو پریس کانفرنس کے ڈائس سے منسلک کردیا جائے گا۔ میں آپ لوگوں سے دوبارہ التجا کرتی ہوں کہ اندر داخل ہونے کی کوشش نہ کریں۔ میں آئندہ چند دن میں ہی ایک جلسہ کر کے آپ لوگوں سے براہِ راست مخاطب ہوں گی۔"

ہوٹل کی انتظامیہ نے اس مختصر خطاب کو ریکارڈ کرلیا تا کہ یہ وقفے وقفے سے لوگوں کو سنایا جاسکے کیونکہ مزید لوگوں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہ پشمینہ حیات کی پریس کانفرنس نہیں، کوئی عوامی جلسہ تھا۔

یہ سارے حالات ٹی وی چینلز سے بھی نشر کیے جارہے تھے۔ ایک ٹاک شو میں کوئی مبصر یہ بھی کہہ بیٹھا کہ اس وقت یہ سب کچھ دیکھ کر صدارتی محل میں غصے کی آگ بھڑک رہی ہوگی۔

اس بات پر کسی نے خدشہ ظاہر کیا کہ اس آگ کا اثر کہیں پریس کانفرنس پر نہ پڑجائے۔

ٹی وی پر یہ خبر دوپہر کو ہی آچکی تھی کہ سترہ ایم این اے اور ایم پی اے اپنی پارٹیوں اور اسمبلیوں سے مستعفی ہوچکے تھے۔ اس خبر کے بعد تمام تجزیہ نگاروں میں اتفاق پایا جارہا تھا کہ یہ ری پبلکن فورم میں شامل ہوجائیں گے۔

جو پریس کانفرنس پانچ بجے شروع ہونی تھی، وہ اب چھ بجے ہی شروع ہوسکی تھی اور اس کا سبب عوام کا ہجوم ہی تھا۔

پونے چھ بجے پارٹی کے لوگوں نے ڈائس پر آنا شروع کیا تو ٹی وی چینلز پر تجزیہ کاروں کے چہرے کھل اٹھے۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا، وہ ہوتا نظر آرہا تھا۔ ڈائس پر آکر بیٹھنے والے وہی ایم این اے اور ایم پی اے ہی تھے۔

چھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے جب سامنے کی قطار کی چار کرسیوں پر وہ لوگ آبیٹھے جو ری پبلکن فورم کے ابتدائی پانچ افراد میں سے تھے۔ پھر پشمینہ حیات اور ڈیبرا آئیں۔ اب ڈیبرا کے برابر کی ایک کرسی خالی تھی۔ وہ خالی ہی تھی جب پشمینہ حیات نے بولنا شروع کیا۔

"صحافی حضرات! لابی اور ہوٹل کے باہر جمع ہونے والے میرے دوست، ٹی چینلز سے وابستہ تمام لوگ اور ساری قوم کو پشمینہ حیات کا سلام پہنچے۔"

اس بات پر وعلیکم السلام کی آوازوں کے ساتھ تالیاں بھی بجیں۔ ملک بھر میں جہاں جہاں ٹی وی دیکھا جارہا تھا، وہاں بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں جذبات اس طرح امنڈ رہے کہ آنکھیں جھلملا گئیں۔

کسی ٹی وی نے ایک بزرگ کو دکھایا جنہوں نے ٹی وی دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی تھی۔ "یا اللہ! پشمینہ حیات کی حفاظت کرنا۔"

لابی میں بھی خاصے لوگ جذباتی نظر آئے۔

پشمینہ حیات نے ان لوگوں کے نام لینا شروع کیے جو اسی دن پارٹی میں شامل ہوئے تھے اور انہوں نے رکنیت کے فارم بھر دیے تھے۔

رکنیت کے فارم بھی اسی دن چھپے تھے۔

اس کے بعد پشمینہ نے کہا۔ "اس معاملے میں بہت قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں کہ ری پبلکن فورم کا جنرل سیکریٹری کون ہوگا۔ میں نے بھی شرارتاً سوچا کہ اس بات کو آخری لمحے تک راز ہی رکھا جائے۔ میں اب اس نام کا اعلان کرنے والی ہوں۔ آپ لوگ یقیناً حیران رہ جائیں گے کیونکہ وہ نام ہے......" وہ ذرا سا رک کر بولی۔ "دانش یزدانی۔"

صحافیوں کے علاوہ سبھی نے تالیاں بجانی شروع کردیں۔ صحافی حیرت زدگی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور باتیں کررہے تھے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ پہلے

ہنسنا منع ہے

ایک شہری ایک گاؤں گیا اور کسی بوڑھے شخص سے پوچھا۔ "کیا اس گاؤں نے کوئی بڑا آدمی پیدا کیا ہے؟"

"جی نہیں۔" بوڑھے شخص نے کہا۔ "یہاں تو سب بچے پیدا کرتے ہیں شہروں میں شاید بڑا پیدا ہوتا ہوگا؟"

☆☆☆

عورت (بھکاری سے): "تمہیں شرم نہیں آتی راستے میں کھڑے ہوکر بھیک مانگتے ہوئے۔"

بھکاری: "تو کیا کہیں دفتر کھول کر بھیک مانگوں؟"

☆☆☆

ایک آدمی سائیکل کی باسکٹ میں بچے کو بٹھا کر لے جارہا تھا۔ بچہ چلا چلا کر رو رہا تھا۔ ایک آدمی نے کہا۔ "بچہ رو رہا ہے اور آپ پروا کیے بغیر ہی چلے جارہے ہیں۔"

اس آدمی نے کہا۔ "بچے کو رلایا جارہا ہے کیونکہ سائیکل میں گھنٹی نہیں ہے۔"

سجاد علی شگری کی گلگت بلتستان سے شوخی

سے موجود ایک سیاسی پارٹی کا سربراہ ری پبلکن فورم کا سیکریٹری جنرل بن جائے۔

اس وقت دانش یزدانی مسکراتا ہوا ڈائس پر آیا تھا اور ڈیرا کے برابر کی خالی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"صحافی حضرات! پشمینہ کہہ رہی تھی۔ "میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں کہ میں پریس کانفرنس چند منٹ بعد شروع کروں گی۔ پہلے آپ چند باتیں ری پبلکن کے سیکریٹری جنرل دانش یزدانی سے سن لیجیے۔"

کیونکہ یہ کوئی جلسہ نہیں تھا اس لیے وہاں روسٹرم نہیں لگایا گیا تھا۔ جو مائیکروفون پشمینہ کے سامنے رکھے تھے، وہ دانش یزدانی کے سامنے رکھ دیے گئے۔

ہوٹل کے باہر کھڑے عوام میں خاصا جوش وخروش پایا جا رہا تھا اور ٹی وی چینلز پر ہلچل مچی ہوئی تھی کہ ایک سیاسی پارٹی کا سربراہ ری پبلکن فورم کا سیکریٹری جنرل کیسے بن سکتا ہے؟

دانش یزدانی نے بولنا شروع کیا۔ ابتدائی رسمی کلمات کے بعد اس نے کہا۔ "غالباً یہ ایک تاریخ ساز واقعہ ہے کہ میں نے چند گھنٹے قبل اپنی سیاسی پارٹی ڈزالو کر دی ہے اور ری پبلکن فورم میں آ گیا ہوں۔ اس کا بنیادی سبب میری سابقہ پارٹی کا منشور ہے۔ اس میں چند باتیں ایسی تھیں جو میں دل سے نہیں چاہتا تھا لیکن پارٹی کے لوگوں کی اکثریت کیونکہ اس پر مجی ہوئی تھی اس لیے جمہوریت کا تقاضا یہی تھا کہ میں ان باتوں کو مانوں لیکن ان نکات کے نقصان دہ ہونے کا احساس مجھے پشمینہ حیات صاحب کی وجہ سے ہوتا رہا اور اس موقع پر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے وہ پارٹی ختم کر کے ری پبلکن فورم پر آ جانا چاہیے۔ میں نے کل اپنے فیصلے سے انہیں آگاہ بھی کر دیا تھا لیکن اس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ یہ مجھے سیکریٹری جنرل کی ذمے داریاں سونپ دیں گی۔ میں جب اپنی پارٹی ڈزالو کر چکا تب مجھے معلوم ہوا کہ مجھے یہ بھاری ذمے داری سونپ دی گئی ہے۔"

تالیاں بجنا شروع ہو گئیں اور جب یہ شور تھما تو دانش یزدانی نے پھر بولنا شروع کیا۔ "اب مجھے بس ایک بات اور کہنا ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک بہت خوب صورت بنگلا بنوایا ہے۔ دو دن ہوئے اسے ڈیکوریٹ بھی کیا جا چکا ہے۔ میں وہاں ایک آدھ دن میں .... منتقل ہونے والا تھا لیکن ابھی...... یقین کیجیے، صرف بیس منٹ قبل میں نے کچھ فیصلہ کیا ہے۔ میں وہ بنگلا اپنی اس پارٹی کی چیئرپرسن پشمینہ حیات صاحبہ کو تحفتاً پیش کرتا ہوں۔"

پشمینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، کچھ کہنا بھی چاہا لیکن تالیوں کے بے پناہ شور کی وجہ سے فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکی اور تالیوں کا شور تھمنے کے بعد وہ جو کچھ کہتی، کہہ نہ سکی کیونکہ دو زوردار دھماکے ہوئے تھے۔

☆☆☆

ہوٹل کے باہر ڈھائی تین ہزار لوگوں کا مجمع تھا جس کی وجہ سے سڑک کی دونوں جانب کا ٹریفک جام ہو گیا تھا۔

وہ دھماکے اسی ہجوم میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ہوئے تھے اور بھگدڑ مچ گئی تھی۔

ٹی وی چینلز کے کیمرے پریس کانفرنس کی وجہ سے وہاں موجود ہی تھے اس لیے فوراً ہی وہاں کا آنکھوں دیکھا حال نشر کیا جانے لگا اور رپورٹرز اپنے اپنے چینل کو بتانے لگے کہ فوری طور پر وضاحت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بس اندازہ کیا گیا ہے کہ وہ دھماکے دستی بموں کے تھے۔ یقینی امر ہے کہ لوگ زخمی ہوئے ہوں گے اور خدانخواستہ کچھ ہلاکتیں بھی ہو سکتی ہیں۔

جلد ہی کیمرے ان مقامات پر بھی پہنچ گئے جہاں دستی بم پھٹے تھے۔ وہاں لوگوں کے خون آلود جسم پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور کوئی بالکل ساکت پڑا تھا۔

جائے واردات پر موجود رپورٹرز نے ہانپتی ہوئی آوازوں میں بولنا شروع کیا۔ "ہلاکتیں یقینی طور پر ہوئی ہوں گی۔ اپنی مدد آپ کے تحت لوگوں نے زخمیوں کو وہاں سے اٹھا کر لے جانا شروع کر دیا ہے۔"

ایک ٹی وی چینل پر ایک مبصر کہہ رہا تھا۔ "آخر وہی ہوا۔ صدارتی محل کے غصے کی آگ وہاں پہنچ ہی گئی۔"

اکثریت کو یقین تھا کہ وہ دھماکے سی ایس والوں نے کیے ہوں گے۔ انہیں اشارہ صدارتی محل سے بھی مل سکتا تھا اور یہ اقدام خود چنگیزی بھی کر سکتا تھا کیونکہ اسے بے پناہ اختیارات دیے جا چکے تھے۔

پشمینہ اپنے سوئٹ کے ڈرائنگ روم میں جا چکی تھی۔ پارٹی کے سرکردہ لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ سبھی برہم نظر آ رہے تھے۔ پشمینہ تو شدید غصے کے عالم میں تھی۔

سب لوگ ٹی وی بھی دیکھ رہے تھے اور آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ سبھی کا خیال تھا کہ یہ "سرکاری حرکت" ہے۔ پشمینہ حیات کی اس چھوٹی سی مقبولیت کو بھی برداشت نہیں کیا گیا تو آگے چل کر کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

"حکومت سے کسی بڑے سے بات تو کرنی چاہیے۔"

کسی نے پشمینہ سے کہا۔
"کوئی فائدہ نہیں ہوگا، کہیں شنوائی نہیں ہوگی۔"
پشمینہ نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا اور پھر بلند آواز میں بولنا شروع کیا تاکہ اس کی آواز وہاں موجود سب لوگ آسانی سے سن لیں۔ "یقین کر لیجیے کہ ملک اس وقت آمریت کے شکنجے میں جکڑا جا چکا ہے۔ میں سب سے کہتی ہوں کسی اقدام میں عجلت نہ کریں، انتظار کریں۔ حالات میں جتنی تیزی سے منفی تبدیلی آئی ہے، اتنی ہی تیزی سے کوئی مثبت تبدیلی بھی آسکتی ہے۔ کیا آپ لوگ خبریں نہیں سن رہے ہیں کہ گاؤں وغیرہ میں تو اب سی ایس کے چھوٹے اہلکاروں نے لوٹ مار بھی شروع کر دی ہے اور انہیں اپنے بڑوں کی آشیرباد حاصل ہے۔ ان لوٹ مار کرنے والوں کے خلاف پولیس بھی کوئی قدم نہیں اٹھا رہی ہے۔"

"میڈم!" ایک شخص بولا۔ "ان حالات میں سیاسی پارٹیاں کیا کچھ کر سکیں گی؟"

"حوصلہ رکھیے، حوصلہ رکھیے! میں ایک لڑکی ہو کر علم بغاوت بلند کر چکی ہوں۔ کیا مردوں کو ہمت ہار جانا چاہیے...... اگر آپ لوگوں میں سے کوئی بھی ہمت ہار رہا ہے تو اسے ری پبلکن فورم چھوڑ دینا چاہیے۔ مجھے صرف بہادر ساتھیوں کی ضرورت ہے۔"

تمام لوگ ایک ساتھ بول اٹھے کہ وہ پشمینہ حیات کے ساتھ ہیں۔

پشمینہ نے ان سب کو مزید جوش دلانے کے لیے کہا۔ "میں مستقبل قریب میں صدارتی محل کو شعلوں میں گھرا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ ظلم جب حد سے بڑھنے لگتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ صدر حیات کو اس کا وہ خمیازہ بھگتنا پڑے گا جو اُن کے تصور میں بھی شاید نہ ہو۔"

کسی نے دبے دبے سے لہجے میں کہا۔ "وہ آپ کے والد بھی ہیں میڈم!"

"اور یہ میری زندگی کا سب سے شرمناک پہلو ہے۔" پشمینہ نے کہا۔

اس وقت تک دو ایک اداروں کی ایمبولینس بھی جائے واردات پر پہنچ چکی تھیں جن میں کوئی سرکاری ایمبولینس نہیں تھی۔ زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا کر لے جایا جا رہا تھا۔ مرنے والوں کی مجموعی تعداد اب پندرہ بتائی جا رہی تھی۔ زخمی اس سے زیادہ تھے جن میں آٹھ کی حالت بہت خراب بتائی جا رہی تھی۔

گیارہ بجے کی خبروں میں بتایا گیا کہ چند افراد نے اس معاملے کی ایف آئی آر درج کرانی چاہی تھی لیکن انہیں مار پیٹ کر پولیس اسٹیشن سے بھگا دیا گیا۔

بارہ بجے تک شہر میں ہُو کا عالم طاری ہو گیا۔ صرف ان علاقوں میں کچھ شور اور آہ و زاری تھی جہاں رہنے والے پندرہ افراد ہلاک ہو چکے تھے یا ان اسپتالوں پر لوگوں کا ہجوم تھا جہاں زخمیوں کو لے جایا گیا تھا۔

بارہ بج کر دس منٹ پر چنگیزی نے خود ایک ٹی وی چینل سے رابطہ کر کے اعتراف کیا کہ جو کچھ ہوا ہے، وہ سی ایس ایف نے مجبوراً کیا ہے کیونکہ پولیس ہجوم کو منتشر کرنے میں ناکام رہی تھی اور اس سڑک کا ٹریفک جام ہونے کے باعث کئی اور سڑکوں پر بھی ٹریفک جام ہو گیا تھا۔

"شہری نظام کو اس طرح برباد کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دی جا سکتی۔ ایسا کرنے والے اپنی موت کے خود ذمے دار ہوں گے۔" چنگیزی نے رعونت سے کہا تھا اور پھر خود ہی لائن ڈس کنکٹ کر دی تھی۔

ٹی وی بارہ بجے کے بعد بھی خبریں نشر کرتے رہے۔ زیادہ زخمی ہونے والے آٹھ افراد میں سے بھی چھ افراد دم توڑ چکے تھے۔ مرنے والوں کی تعداد اب اکیس ہو چکی تھی۔ دو دستی بموں کے دھماکوں سے اتنا زیادہ جانی نقصان اس لیے ہوا کہ ہجوم کے لوگوں کے شانے سے شانہ ملا ہوا تھا۔

وہ رات ایسی نہیں تھی کہ باشعور لوگوں کو نیند آسکتی۔ ٹی وی چینلز کی خبروں میں بتایا جا رہا تھا کہ ملک بھر کے اسی فیصد ٹی وی بند نہیں ہوئے تھے اور لوگ ایک ایک پل کی خبر سننا چاہتے تھے۔

پشمینہ نے اپنا دس منٹ کا ریکارڈڈ پروگرام ٹی وی چینلز سے نشر کروا دیا۔ اس میں عوام سے کہا گیا تھا کہ وہ ان حالات سے دل برداشتہ نہ ہوں اور خوف اپنے دلوں سے نکال لیں۔

اس پیغام میں اس نے بہت جوشیلے فقرے ادا کیے تھے اور یہ اعلان بھی کیا تھا کہ ہلاک ہونے والوں کے سوم کے دن وہ احتجاجی ریلی لے کر قصرِ صدارت جائے گی۔ اس نے عوام سے درخواست کی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں، دل سے خوف نکال کر اس جذبے کے ساتھ ریلی میں شرکت کریں کہ وہ اپنی آئندہ نسلوں کے لیے قربانی بھی دے سکتے ہیں۔

"ریلی کی قیادت میں خود کروں گی اور سب سے آگے رہوں گی۔"

پشمینہ کا پیغام اس جملے پر ختم ہوا تھا۔

ری پبلکن فورم کے ارکان نے ایک ایک کر کے ہوٹل سے رخصت ہونا شروع کیا کیونکہ ان کی وجہ سے ان کے گھر والے پریشان تھے۔ دوسرے یہ بھی تھا کہ پشمینہ کے سوئٹ میں اتنے لوگوں کے رہنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔

دوسرے دن دس بجے کی خبروں میں بتایا گیا کہ پشمینہ حیات ہوٹل سے اس بنگلے میں منتقل ہو گئی ہے جو دانش یزدانی نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ خبر بھی آئی کہ دوپہر کے بعد اسی بنگلے میں ری پبلکن فورم کے لوگوں کا ایک اجلاس ہو گا جس میں ریلی سے متعلق لائحہ عمل مرتب کیا جائے گا۔

اس کے ذرا ہی دیر بعد یہ خبر بھی آئی کہ مشہور بزنس مین حاجی اشفاق دفتر جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلے ہی تھے کہ دو موٹر سائیکل سوار ان کی کار پر گولیوں کی برسات کرتے ہوئے نکل گئے۔ حاجی اشفاق کو گیارہ گولیاں لگی تھیں اور انہوں نے کار میں ہی دم توڑ دیا تھا۔

''یہ حاجی اشفاق کے کسی کاروباری رقیب کی حرکت ہو سکتی ہے۔'' سی ایس کے ترجمان کا بیان ٹی وی چینلز پر آیا۔ ''اس کی مکمل چھان بین کی جائے گی اور قاتل زیادہ دیر تک قانون کے شکنجے سے نہیں بچ سکیں گے۔''

''جھوٹ، سراسر جھوٹ۔'' خبر سن کر پشمینہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''یہ قتل سی ایس ہی نے کروایا ہے۔ حاجی اشفاق کو اس کی سزا دی گئی ہے کہ اس نے ری پبلکن فورم کو فنڈ مہیا کیا تھا۔''

اس وقت پشمینہ کے ساتھ ڈیبرا کے علاوہ دانش یزدانی بھی تھا۔

اسی وقت ایک ٹی وی چینل سے پشمینہ کے لیے کال آ گئی۔

''حاجی اشفاق کے قتل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' اینکر نے پشمینہ سے سوال کیا۔

''سی ایس کا ترجمان جھوٹ بول رہا ہے۔'' پشمینہ نے غصے سے جواب دیا۔ سامنے ٹی وی کھلا ہوا تھا۔ ڈیبرا نے جلدی سے ریموٹ اٹھا کر وہ چینل لگایا جس نے پشمینہ سے رابطہ کیا۔

اسکرین کے نصف حصے پر حاجی اشفاق کی گولیوں سے چھلنی کار دکھائی جا رہی تھی جس کے اندر سے خون بہہ کر باہر تک آ رہا تھا۔ اسکرین کے باقی نصف حصے میں اینکر پرسن دکھائی دے رہا تھا اور ایک گوشے میں پشمینہ حیات کی تصویر تھی۔

پشمینہ کہہ رہی تھی۔ ''تین کاروباری حضرات نے ری پبلکن فورم کے لیے فنڈ زدیے تھے۔ انہی میں حاجی اشفاق بھی تھے۔ سی ایس نے انہیں اسی کی سزا دی ہے۔'' شمینہ نے باقی دو افراد کے نام بھی لیے اور کہا۔ ''اب ان کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ملک اس وقت مکمل طور پر ڈکٹیٹر شپ کے قبضے میں ہے، لیکن میرے قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ میں آخری سانس تک لڑوں گی۔''

''کیا آپ کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ آپ ریلی نکالیں گی؟'' سوال کیا گیا۔

''میں تذبذب کا شکار ہو گئی ہوں۔ شام تک میں قطعی فیصلہ سنا دوں گی۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر عوام بھرپور انداز سے اس ریلی میں شریک ہوئے تو شاید ڈائریکٹ فائر کھول دیا جائے۔ سیکڑوں ہلاکتیں ہو سکتی ہیں۔ میں اتنے لوگوں کی زندگیوں کے زیاں کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ امکان ہے کہ مجھے کوئی دوسرا لائحہ عمل بنانا پڑے گا۔ بس! فی الحال میں اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔''

پشمینہ نے رابطہ منقطع کر کے پارٹی کے باقی دونوں ڈونرز کو فون کیا اور انہیں تاکید کی کہ وہ بہت احتیاط برتیں اور اپنے تحفظ کا زیادہ سے زیادہ بندوبست کریں۔

جواب میں ان دونوں ہی نے بڑی حوصلہ مندی کا اظہار کیا تھا۔

پشمینہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔

''واقعی اس پر سوچنے کی ضرورت ہے۔'' دانش یزدانی بولا۔ ''حکومت جب اتنی جارحیت پر اتر آئی ہے تو ریلی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اجلاس میں اس پر سب کی رائے لینا ضروری ہے۔ اعلان کے بعد اس سے پسپائی کے کیا کیا ردعمل ہو سکتے ہیں، کیا کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔''

''اعلان جب کیا گیا تھا تو صورتِ حال وہ نہیں تھی جو اب ہے۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''اس وقت ہماری پسپائی فوجی حکمت عملی جیسی ہو گی۔''

جواب میں دانش نے کچھ نہیں کہا۔

دو بجے پارٹی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ اس وقت ڈیبرا نے پشمینہ سے کہا۔ ''اجلاس میں میری شرکت تو ضروری نہیں ہے۔ میں اس دوران میں بنگلے کا جائزہ لے ڈالوں۔ کوئی ایسا گوشہ نہیں ہونا چاہیے جو تحفظ کے اعتبار سے کمزور ہو۔''

''میں نے اس کی تعمیر میں ہر بات کا خیال

رکھا ہے۔" دانش بولا۔ "تاہم تم بھی دیکھ لو۔ اس میں حرج تو کوئی نہیں ہے۔"

پشمینہ نے کچھ نہیں کہا۔ ڈیبرا نے اس پر ایک نظر ڈالی اور بنگلے کے اس ہال سے باہر نکل گئی جہاں اجلاس ہونا تھا۔

بنگلا خاصا بڑا تھا۔ اس کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لینے میں دو گھنٹے لگ گئے۔ اس کے بعد ڈیبرا نے اوپر کی منزل کا رخ کیا جہاں نصف حصے میں بہت بڑا ٹیرس تھا۔ باقی نصف حصے کا جائزہ لینے میں ایک گھنٹا اور لگا۔ اس کے بعد ڈیبرا اس حصے کی چھت پر گئی اور چاروں طرف کا ایک چکر لگا کر واپس اس ہال میں پہنچی جہاں اس کے خیال کے مطابق اجلاس ابھی جاری ہی رہنا چاہیے تھا لیکن وہاں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اجلاس کے تمام شرکا بڑے اسکرین کے ٹی وی کی طرف متوجہ تھے جس پر شہر کے حالات کا آنکھوں دیکھا حال نشر کیا جا رہا تھا۔

ایکس جنازے چار جگہ سے اٹھے تھے اور ان کی تدفین بھی چار مختلف قبرستانوں میں ہوئی تھی۔ ہر جنازے کے ساتھ سات سات، آٹھ آٹھ ہزار افراد تھے جو تدفین کے بعد غصے کی حالت میں سرکاری املاک پر حملہ آور ہوئے تھے۔ دو پولیس اسٹیشنوں میں آگ لگائی جا چکی تھی۔ ایک گروہ سی ایس کے ہیڈ کوارٹر کی طرف بڑھا تھا جہاں اس وقت گولیاں چل رہی تھیں۔ گولیاں چلانے والے سی ایس کے اہلکار تھے۔

"دوسرے مقامات پر گولیاں نہیں چلائی گئیں۔" دانش نے ڈیبرا کو بتایا۔ "وہاں لاٹھی چارج، واٹر کین اور آنسو گیس کے ذریعے لوگوں کو منتشر کیا گیا تھا۔"

"سی ایس کا ہیڈ کوارٹر تو کوئی مقدس مقام ہے۔" پشمینہ نے دانت بھینچ کر کہا۔ "اسے بچانے کے لیے تو وہ بمباری بھی کر سکتے ہیں۔" اس کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا سا تھا۔

سبھی ٹی وی چینلز پر اس وقت شور سا مچا ہوا تھا۔ خبریں کچھ اسی انداز میں دی جا رہی تھیں جیسے قیامت برپا ہونے کی اطلاعات دی جا رہی ہوں۔

مختلف مقامات سے منتشر ہونے والے لوگ شہر میں پھیل گئے تھے۔ توڑ پھوڑ کے ساتھ لوٹ مار کا بازار بھی گرم ہو گیا تھا۔

"ایسے موقعوں پر شرپسند عناصر اور جرائم پیشہ افراد بھی شامل ہو جاتے ہیں۔" پارٹی کا صدر اسد گیلانی بڑبڑایا۔

ٹی وی چینلز پر مختلف سیاسی لوگوں اور ہیومن رائٹس کے افراد سے بھی رابطے کیے جا رہے تھے۔ ہر شخص حکومت کی مذمت کر رہا تھا۔

کئی ٹی وی چینلز پشمینہ سے بھی رابطہ کر چکے تھے۔ پشمینہ نے عوام سے اپیل کی تھی کہ اس قسم کے اقدامات سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، صرف جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ لوگ جذبات قابو میں رکھیں اور اپنے گھر لوٹ جائیں۔ انہیں جلد ہی ری پبلکن فورم کے آئندہ کا لائحہ عمل بتایا جائے گا۔"

لیکن ایسے موقعوں پر اس قسم کی اپیلیں موثر ثابت نہیں ہوتیں۔ صرف گھروں میں بیٹھے ہوئے لوگ وہ اپیلیں سنتے ہیں۔ ان اپیلوں کا ایک لفظ بھی ان لوگوں تک نہیں پہنچتا جو شہر میں ہنگامہ کرتے پھر رہے ہوں۔

"جو کچھ ہو رہا ہے، بہت برا ہو رہا ہے۔ بہت لوگ مرے ہوں گے۔" ڈیبرا نے پشمینہ سے کہا۔ "لیکن یہ صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ تمہاری مقبولیت یک لخت بڑھی ہے۔ کثیر تعداد ایسی ہے جو ہماری پارٹی کا پرچم اٹھائے ہوئے ہے اور لوگ تمہارے نام کے نعرے بھی لگا رہے ہیں۔"

"اس کا ایک منفی پہلو بھی ہے۔" پشمینہ نے متفکر لہجے میں کہا۔ "شہر کے نظم و ضبط کی خرابی کا ذمے دار بھی ہماری پارٹی کو قرار دے کر اس کا رجسٹریشن منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ بہت سی پابندیاں لگائی جا سکتی ہیں۔ ڈیبرا! مجھے تعجب ہے کہ ابھی تک میڈیا چارٹرز کا آرڈی ننس جاری نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد کوئی چینل، کوئی اخبار ان حالات کی خبریں نہیں دے سکے گا اور جو دے گا، اسے آرڈی ننس کے تحت بند کر دیا جائے گا۔ اخبارات کے ڈیکلریشن اور ٹی وی چینلز کے لائسنس منسوخ کر دیے جائیں گے۔"

ڈیبرا نے اثبات میں سر ہلایا، پھر پوچھا۔ "اجلاس میں کیا طے پایا؟"

"اجلاس ابھی شروع ہی نہیں ہو سکا۔" پشمینہ نے جواب دیا۔ "تمہارے جاتے ہی یہ ساری خبریں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ اس وقت ہم سبھی کے ذہن منتشر ہو گئے ہیں۔ ایسے میں اجلاس کیا خاک ہوتا۔"

"تم فوراً مجھے بلوا لیتیں۔"

"مناسب نہیں سمجھا میں نے! اب تم جو کچھ دیکھ رہی ہو، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ بڑے دردناک مناظر سامنے آ چکے ہیں۔ ان جنازوں میں اسٹوڈنٹس لڑکوں اور لڑکیوں نے بھی شرکت کی تھی۔ پولیس والوں نے ان کے ساتھ بہت

بدسلوکی کی ہے۔

ڈیرا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

جو ہنگامے شہر میں برپا تھے، وہ اندھیرا پھیلنے کے بعد بڑی حد تک ختم ہو گئے۔ چند علاقے ایسے تھے جہاں چھوٹے چھوٹے گروہوں اور پولیس میں اب بھی جھڑپیں ہو رہی تھیں۔

ایک ٹی وی چینل سے پشمینہ کے لیے سوال آیا کہ ریلی نکالنے کے سلسلے میں انہوں نے کیا حتمی فیصلہ کیا۔

رضوانہ اختر نے جواب دیا کہ جو ہنگامے شروع ہو گئے تھے، ان کی وجہ سے اجلاس ابھی شروع ہی نہیں ہو سکا۔

جو لوگ ری پبلکن فورم میں شامل ہوئے تھے، رضوانہ اختر انہی میں سے ایک تھی۔ اس نے ایم پی اے کی حیثیت سے استعفا دیا تھا۔ سیاست میں آنے سے پہلے اس نے جرنلزم میں ایم اے کیا تھا اس لیے پشمینہ نے اسے اپنی پریس سیکریٹری مقرر کر لیا تھا۔ اس نے بہت خوشی سے یہ ذمے داری قبول کر لی تھی۔ پشمینہ نے اپنے موبائل کا وہ نمبر بھی بند کر دیا تھا جو اس نے صحافیوں کے لیے مخصوص کیا تھا۔

وہ اس بات سے پریشان ہو گئی تھی کہ چوتھے پانچویں منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی چینل اس سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اپنا موبائل نمبر بند کرنے سے پہلے اس نے ایک ٹی وی چینل کے ذریعے رضوانہ اختر کا موبائل نمبر نشر کروا دیا تھا اس لیے اب چوتھے پانچویں منٹ پر وہی ٹی وی چینلز کو جواب دے رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ اب اجلاس شروع کیا جائے۔'' صدر اسد گیلانی نے پشمینہ سے کہا۔

پشمینہ نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ٹی وی سے نشر ہونے والی یہ خبر سننے لگی تھی کہ اکیس افراد کا سوئم کل کے بجائے پرسوں کیا جائے گا اور اس کے ساتھ ان لوگوں کا سوئم بھی جو اسی دن ہلاک ہوئے تھے۔

خبروں کے مطابق سی ایس کی فائرنگ سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد چوبیس تھی لیکن غیر مصدقہ ذرائع کے مطابق چالیس کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔

''ریلی تو نہیں نکالی جا سکتی۔'' پشمینہ نے اجلاس سے پہلے ہی فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''ابھی جو لوگوں کا جوش و خروش دیکھا ہے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ سی ایس کے اقدامات سے دہشت زدہ ہونے کے بجائے آگ بگولا ہو چکے ہیں۔ ریلی نکالی گئی تو بہت کثیر تعداد ہو گی لوگوں کی اور حکومت کا جارحانہ انداز بتا رہا ہے کہ ریلی پر گولیوں کی برسات اگر دی جائے گی۔ کئی سو افراد ہلاک ہو سکتے ہیں۔ میں اتنی زندگیاں داؤ پر نہیں لگا سکتی۔''

''پھر کیا قدم اٹھایا جا سکتا ہے؟'' دانش بولا۔

''اجلاس شروع کیا جائے۔ طے کرتے ہیں کہ اب کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ ابھی میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ سے صدر حیات کے خلاف لکھا اور بولا تو جا رہا ہے لیکن کسی بڑے فورم سے ابھی تک کوئی اعلان سامنے نہیں آیا۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سلسلے میں یو این او کا ہنگامی اجلاس طلب کروایا جائے۔ امریکا میں کچھ لوگوں سے میرے اچھے خاصے تعلقات ہیں۔ ان کے ذریعے سے یو این او کی اہم شخصیات کو جھنجوڑا جا سکتا ہے۔ میں ان لوگوں سے ملنے کے لیے کل جلد از جلد ملنے والی کسی فلائٹ سے امریکا روانہ ہو جاؤں۔ یو این او کے علاوہ عالمی ہیومن رائٹس کمیشن کو بھی حرکت میں لانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ایشیائی ملکوں میں ہونے والے ایسے واقعات کی طرف مغرب بہت دیر سے توجہ دیتا ہے یا پھر اس وقت جب انہیں باقاعدہ جھنجوڑا نہ جائے۔''

دانش اس سلسلے میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کسی نے سب کی توجہ ٹی وی کی طرف مبذول کرائی جس سے شاہ صاحب کا وڈیو پیغام نشر کیا جا رہا تھا۔

پینسٹھ سالہ شاہ صاحب کہہ رہے تھے۔ ''میرے وطن میں بربریت کا جو طوفان اچانک اور بڑی تیزی سے اٹھا ہے، اس پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ میرے لیے اب ناممکن ہے کہ لوگوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹتے رہیں اور میں یہاں پُرامن ماحول میں سانس لیتا رہوں۔ میں آج ہی ایک گھنٹے بعد پرواز کرنے والی فلائٹ سے روانہ ہو رہا ہوں۔ وہاں کے صبح دس بجے میری فلائٹ اپنے وطن میں لینڈ کرے گی۔ میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ اس ظلم و بربریت کا نشانہ بننے کے لیے تیار ہو چکا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ نصرت ایزدی مظلوموں کے ساتھ ہے۔'' شاہ صاحب کا پیغام اس آیت پر ختم ہوا۔

''نصرٌ من اللہ و فتحٌ قریب''

یہ پیغام ختم ہوتے ہی ری پبلکن فورم کے اجلاس میں اصل ایجنڈے کے بجائے اس پر گفتگو شروع ہو گئی کہ شاہ صاحب کی پرتگال سے وطن آمد ایک بہت بڑا طوفان ہو سکتی ہے۔''

بساطِ سیاست پر جمے مہروں کی اکھاڑ پچھاڑ کا سنسنی خیز کھیل مزید واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

سیزینا راض

لو بجھنے سے پہلے بھڑکتی ضرور ہے۔ اُس کی شمعِ زندگی بھی ڈوبنے سے قریب ترتھی... مگر وہ رخصت سے پہلے اپنے پیچھے رہ جانے والوں کے لیے جینے کا سامان کرنا چاہتا تھا... مغرب سے موصول شدہ ایک نئے اور انوکھے منصوبے کی چونکا دینے والی تفصیل...

قانونی موشگافیوں میں ملوث ایک چالاک مجرم کے غیرقانونی حربے

شدید بھوک میں کچن سے اٹھنے والی مہک ناک سے ٹکرائی تو فاکس نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں، اندر کچھ بھونا جارہا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی اور گردن اٹھا کر دیکھا۔ ایلن کی پشت اس کی طرف تھی اور توجہ چولھے پر رکھے فرائی پین پر۔ مہک سے وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ بیوی کیا بنارہی ہوگی۔ انڈے تو ہو نہیں سکتے، فریج تو کئی دن سے خالی پڑا تھا۔ فاکس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔ ضرور پیاز ہوگی جو کچن میں کئی دن سے رکھے کدو کو ڈھانپ رہی

میں تبدیل کرنے کے لیے بھونی جارہی ہے۔ ویسے فاکس کو کدو کچھ خاص پسند نہیں تھا لیکن جس شدت کی بھوک لگ رہی تھی، ایسے میں کدو پکنے کی مہک بھی اسے پیزا سے کم لذیذ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

ایلن کی پشت بیڈ روم کی طرف تھی۔ اس وقت وہ یونیفارم میں تھی۔ کمر سے لٹکتے ہولسٹر سے پستول کا دستہ صاف نظر آرہا تھا۔ فاکس نے نگاہیں گھما کر سائڈ ٹیبل پر رکھی گھڑی کو دیکھا۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ایلن کو نو بجے ڈیوٹی پر آرٹیز پولیس اسٹیشن پہنچنا ہوگا۔ ان دنوں وہ رات کی شفٹ میں تھی۔

نیند کا خمار اب بھی اس پر چھایا ہوا تھا۔ ایلن کا کھانا بنانا ہمیشہ سے اس کے لیے ایک خوشگوار حیرت کا سبب رہا تھا مگر اس کی ملازمت ہی ایسی تھی کہ گھر پر رہنے کا زیادہ وقت نہیں مل پاتا تھا۔ اکثر فاکس کو ہوٹل پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ اس نے اپنے بازو پر ہلکی سی چٹکی بھری کہ کہیں اب تک نیند میں تو نہیں مگر وہ جاگ چکا تھا۔ کچن سے آنے والی مہک اس کی اشتہا کو مزید بڑھا رہی تھی۔

وہ باتھ روم جانے کے لیے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ چار بار گھنٹی بجی لیکن ہاتھ بڑھا کر فون اٹھانے کی ہمت اس میں نہ تھی۔ وہ اب تک نیند کے خمار میں تھا۔

''فاکس اٹھو۔'' ایلن نے اونچی آواز سے پکارا۔ ''اتنی دیر سے گھنٹی بج رہی ہے، ذرا فون سن لو۔''

''اوکے ڈارلنگ......'' فاکس نے جماہی لے کر جواب دیا اور بیڈ سے اتر کر مرے مرے قدموں سے لیونگ روم کی طرف بڑھا۔ اس نے اسکرین پر فون کرنے والے کا نمبر دیکھا اور ریسیور اٹھالیا۔

''کیا مسٹر فاکس بول رہے ہیں۔'' ہیلو سنتے ہی فون کرنے والے نے ہچکچاتے ہوئے تصدیق چاہی۔

''جی بول رہا ہوں۔'' فاکس نے جواب دیا۔ ''کیا آپ جج کینڈن ہیں۔'' اس کے لہجے سے بے یقینی ظاہر ہو رہی تھی۔

''ہاں، میں ہی ہوں اور تم سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔''

''آج رات۔'' فاکس کا لہجہ سوالیہ تھا۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ کینڈن اس سے کیوں ملنا چاہتا ہے اور وہ بھی اتنی عجلت میں۔

''آج رات نہیں بلکہ ابھی، اسی وقت...... جتنا جلد ممکن ہو سکے۔'' کینڈن نے بے تاب لہجے میں وضاحت کی۔

یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اسے امید تھی کہ آج ڈنر باہر کرنے کا سوال ہی نہیں تو پھر گھر سے کیوں نکلے لیکن کینڈن جس بے تابی سے ملنے پر اصرار کر رہا تھا، اس سے لگتا تھا کہ شام گھر پر نہیں گزرے گی۔ ''اوکے......'' چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے ملنے کی ہامی بھرلی۔ ''سنو! اس وقت گھر پر ہوں۔ نو بجے تک تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔'' اس نے دل ہی دل میں وقت کا حساب کتاب طے کیا۔ ''یہ ٹھیک رہے گا؟'' فاکس نے اس کی مرضی جاننی چاہی۔

''دیکھو بھولنا مت، آجانا۔'' کینڈن نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

''ضرور، سوا نو بجے تک تمہارے پاس ہوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

کینڈن کی بات سن کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر ایسا کیا ہوا جو طویل عرصے بعد کینڈن نے اسے یاد کیا اور بنا رسمی حال احوال کے، فوری ملنے پر اصرار کرنے لگا۔ اسے لگا کہ ضرور کوئی خاص بات ہوگی ورنہ وہ اس طرح ملنے پر زور نہ دیتا لیکن کیا بات ہو سکتی ہے۔ کینڈن نہایت سنجیدہ شخص تھا، ضرور کوئی پریشان کن بات ہوگی ورنہ وہ اتنی عجلت کا اظہار نہ کرتا۔

اس دوران میں ایک بار پھر کچن سے چھن چھن کی آواز آئی۔ وہ کینڈن کا خیال سر سے جھٹک کر کچن کی طرف بڑھا۔ ایک بار پھر اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ ایلن انڈے توڑ کر فرائی پین میں ڈال رہی تھی۔ اس نے ریک پر نظر ڈالی۔ ''اوہ تو تم خریداری کر آئیں ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ کدو کے لیے پیاز بھونی جارہی ہے۔''

''تمہاری طرح بے وقت نہیں سوتی، وہ بھی گھوڑے بیچ کر۔'' اس نے فرائی پین میں چمچ چلاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تم کہیں جانے والے ہو؟'' اس نے گردن گھما کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''تمہیں کیسے پتا؟''

''تمہارے خیال میں فون پر باتوں کی آواز مجھ تک نہیں آرہی تھی کیا۔''

''ہاں...... ایک پرانا تعلق ہے، بس اسی کی خاطر تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا ہوگا۔'' فاکس نے گول مول جواب دیا۔

''کون ہے؟'' ایلن نے سوال کیا۔

”ایک پرانا دوست ہے۔“ فاکس نے گول مول جواب دیا۔ اس وقت وہ ایلن کے سوالوں کی بوچھاڑ سے بچنا چاہ رہا تھا۔

”کب جانا ہے؟“

”بس! تمہارے جاتے ہی نکل جاؤں گا۔“ فاکس نے کہا۔

”ٹھیک ہے، ہاتھ منہ دھولو، ڈنر تیار ہے۔“ ایلن نے آملیٹ فرائی پین سے پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کے کندھے سے لٹکتے وائرلیس پر مستقل پولیس کنٹرول روم سے نشر ہونے والے پیغامات چل رہے تھے مگر اسے پروا نہیں تھی۔ اس کی ڈیوٹی شروع ہونے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔

ڈنر کے فوراً بعد ایلن ڈیوٹی پر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی فاکس بھی کینڈن سے ملنے کے لیے گھر سے نکل گیا۔

کینڈن اور فاکس کئی برس پہلے آخری بار ملے تھے۔ اس کے بعد سے دونوں کے درمیان کوئی خاص رابطہ نہیں رہا تھا۔ اُس وقت کینڈن بروکس سپریم کورٹ میں جج کی حیثیت سے بیٹھتا تھا۔ وہ وقت فاکس کی زندگی کا بھی اہم دور تھا۔ اُسی زمانے سے دونوں کے درمیان بااعتماد شناسائی کا رشتہ قائم ہوا تھا۔ برسوں تک ایک دوسرے کے ساتھ نے عمر کے فرق کے باوجود دونوں کے درمیان دوستی قائم کر دی تھی لیکن فاکس اب بھی اس تعلق کو احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ طویل عرصے کی رفاقت کے باوجود اس نے کینڈن سے کبھی بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ خود کینڈن بھی اُسے احترام اور اعتماد کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

اگرچہ وہ طویل عرصے سے نہیں ملے تھے اس کے باوجود کینڈن کو یقین تھا گزرے ماہ و سال کی لاتعلقی ان کے پرانے رشتے کے درمیان حائل نہیں ہوئی ہوگی، تبھی تو اُس نے اس طرح بے تکلفی سے اُسے یاد کیا تھا۔ اس کا خیال بالکل درست تھا۔

وہ سارا دن گھر پر ہی رہا تھا۔ رات ہونے پر جب فاکس باہر نکلا تب بھی اسے موسم کی شدت کا ذرا بھی اندازہ نہ تھا۔ موسم ابر آلود ضرور تھا لیکن اُن دنوں ایسا موسم اکثر رہتا تھا۔ اسے یقین نہ تھا کہ اگر بادل چھائے ہیں تو بارش بھی ضرور ہوگی۔ ابھی وہ چند میل دور ہی گیا ہوگا کہ بوندا باندی شروع ہوگئی۔ جب فاکس نے کینڈن کے گھر کے سامنے گاڑی روکی تو اس وقت تک بوندا باندی طوفانی بارش میں بدل چکی تھی۔ سرد ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ زرد اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں سنسان سڑک پر برستی بارش اور طوفانی ہوا سے اُڑتے میپل کے خزاں رسیدہ پتوں کا نظارہ ہی کچھ اور تھا۔

وہ کچھ دیر تک اندر بیٹھ کر بارش ہلکی ہونے کا انتظار کرتا رہا لیکن جب دس پندرہ منٹ تک بارش کی شدت میں کمی نہ آئی تو اس نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔ نو بج کر دس منٹ ہونے والے تھے۔ اسے دیر ہو رہی تھی اور کینڈن وقت کا بہت پابند تھا۔

اس نے سامنے نظر ڈالی۔ وہ سرخ اینٹوں سے بنا ایک چھوٹا اور سادہ سا گھر تھا جو باہر سے کسی طور بھی ایک سابق جج کا گھر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ویسے اگر یہ سادگی قصور ہے تو اس میں قصور خود کینڈن کا اپنا تھا۔ سپریم کورٹ کا جج ہونے کے باوجود وہ خود کو کسی عام شہری سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اگر کوئی اپنے رویے سے اسے 'اہم شخصیت' باور کرانے کی کوشش کرتا تو وہ ناراض ہو جاتا تھا۔

اچانک بارش کی تیز بوچھاڑ ونڈ شیلڈ سے ٹکرائی تو زوردار آواز سے فاکس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے چھتری یا برساتی کی تلاش میں گاڑی کے اندر نظریں دوڑائیں، سیٹ کے نیچے جھانکا مگر کچھ نہ ملا۔ اس نے گہری سانس لی اور گاڑی میں بیٹھ کر بارش رکنے کے انتظار میں مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے جھٹکے سے کار کا دروازہ کھولا اور کینڈن کے گھر کی طرف بھاگا۔ داخلی گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ سیدھا پورچ کی طرف گیا۔ اگرچہ گاڑی سے پورچ تک کا فاصلہ تیس چالیس قدم سے زیادہ کا نہ تھا مگر اس کے باوجود تیز بارش کی بوچھاڑ اسے اچھا خاصا بھگو چکی تھی۔ اس نے پورچ میں کھڑے ہو کر سر کو جھٹکا اور پھر جینز سے ہاتھ رگڑ رگڑ کر انہیں پونچھتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔

اگرچہ موسم سرما پوری شدت سے شروع نہیں ہوا تھا لیکن بارش کے باعث اچانک ٹھنڈ بہت بڑھ گئی تھی۔ بھیگنے سے اس پر کپکپی طاری تھی۔ اس وقت پورچ کی چھت تلے کھڑا وہ بارش سے بالکل محفوظ تھا لیکن بھیگی جیکٹ اور طوفانی ہوا کے جھونکے اسے قدموں پر کھڑا نہیں رہنے دے رہے تھے۔ اس نے جلدی سے دوسری بار ڈور بیل بجائی۔

''آ رہا ہوں۔'' اندر سے ایک کپکپاتی مردانہ آواز نے اسے تسلی دی۔ اس کے ساتھ ہی لکڑی کے فرش پر ربڑ کے ٹائروں کے رگڑ کھانے کی آواز سنائی دی۔ فاکس سمجھا کہ کینڈن شاید وہیل چیئر پر ہے۔ لمحہ بھر بعد دروازہ کھلا۔ براؤن پاجامہ اور باتھ گاؤن میں ملبوس کینڈن اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے پیچھے لگے آکسیجن سلنڈر کا ہینڈل تھام رکھا تھا۔ پلاسٹک کی ایک نلکی سلنڈر سے نکل کر اس کی ناک میں جارہی تھی۔

''اوہ......'' یہ دیکھتے ہی فاکس کے منہ سے نکلا۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ پچھلے چند برسوں میں اُس کی صحت اس حد تک گر چکی ہوگی۔ اسے کینڈن کو اس حالت میں دیکھ کر بہت دکھ پہنچا تھا۔

''اندر آجاؤ......'' کینڈن نے ایک طرف ہوتے ہوئے کہا۔

وہ جلدی سے آگے بڑھا۔ اندر کا ماحول خاصا گرم تھا۔ اس نے جیکٹ اتار کر جھاڑی اور کھونٹی پر لٹکا دیا۔ ''بارش نے لمحہ بھر میں مجھے نہلا دیا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''معذرت چاہتا ہوں، تمہیں میری وجہ سے بے وقت کی یہ زحمت اٹھانا پڑی۔'' کینڈن نے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جس پر فاکس کی نم جیکٹ سے پانی کی ننھی ننھی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ ''اچھا خاصا بھیگ گئے ہو تم۔'' اس کا لہجہ دوستانہ تھا۔

''ڈرائیر ہوگا تمہارے پاس؟'' فاکس نے پوچھا۔

''فکر نہ کرو، کمرا گرم ہے۔ جب تک تم جاؤ گے یہ خشک ہو چکی ہوگی۔''

فاکس ہنس دیا۔ ''تو چلو آگے......'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

''آؤ......'' یہ کہتے ہوئے کینڈن سلنڈر گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھا۔ فاکس نے بھی اس کے پیچھے پیچھے قدم بڑھا دیے۔

لیونگ روم اگرچہ بڑا نہیں لیکن سادہ اور پُروقار ضرور تھا۔ ایک طرف کتابوں کا شیلف تھا۔ سامنے ٹی وی چل رہا تھا۔ درمیان میں آمنے سامنے دو کرسیاں رکھی تھیں۔ ان کے بیچ ایک چھوٹی میز تھی، جس پر چند کتابیں دھری تھیں۔ ساتھ ہی آتش دان میں الاؤ روشن تھا۔ کمرے کی خوش گوار حدت میں فاکس نے اطمینان بھری گہری سانس لی۔

''تم بھی بیٹھو......'' کینڈن نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''شکریہ......'' یہ کہہ کر اس نے ایک طائرانہ نظر کمرے پر ڈالی اور مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔ ''اب جان میں جان آگئی ہے۔''

اسی دوران میں ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ سنہرے بالوں، بیضوی چہرے اور لمبے قد کی نوجوان عورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ اس نے ایک میز قریب کی۔ ''یہ رہا آپ کا ڈنر۔'' وہ کینڈن سے مخاطب تھی۔ پلیٹ رکھ کر وہ واپس چلی گئی۔

''یقیناً یہ نرس ہوگی۔'' فاکس نے اُس پر اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ صاف ظاہر تھا کہ صحت کے پیش نظر کینڈن کو ہاؤس میڈ سے زیادہ نرس کی ضرورت پڑتی ہوگی۔

نرس نے باہر نکلتے ہوئے کمرے کا سلائڈنگ دروازہ بند کر دیا تھا۔ اب وہ دونوں تنہا تھے۔

چند لمحوں تک کینڈن بند دروازے کو بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ باہر، بند دروازے سے لگ کر کھڑا کوئی شخص ان کی گفتگو سننے کی تو کوشش نہیں کر رہا۔ فاکس کو اس کا یہ انداز پریشان کر گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو وہ اپنے گھر کے اندر بھی خود کو غیر محفوظ سمجھ رہا ہے۔

چند لمحوں کے بعد کینڈن کی توجہ بند دروازے سے ہٹی، اس نے میز پر رکھا ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی کی آواز اونچی کر دی۔ اس وقت باسکٹ بال کا میچ چل رہا تھا اور شائقین کے پُرجوش نعرے اسٹیڈیم میں گونج رہے تھے۔

فاکس یہ تو جانتا تھا کہ کینڈن کو کھیلوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے شک ہے کہ کوئی ان کی گفتگو سن سکتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں پریشان ہو رہا تھا کہ آخر ایسا کیا ہے جو وہ اس حد تک احتیاط برت رہا ہے۔ ''خیریت تو ہے۔'' فاکس نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔

''ششش......'' یہ سنتے ہی اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اس کی طرف کھسکتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''تم نے ابھی ابھی جس عورت کو دیکھا تھا، اسے مجھے قتل کرنے کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی تو وہ میری قاتل ہو سکتی ہے۔''

''کیا......'' فاکس نے حیرت سے کہا۔ اسے یہ سن کر دھچکا لگا تھا۔ لاشعوری طور پر اس کی اونچی آواز ہوگئی تھی۔

اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی اس جیسے نحیف و نزار اور لمحہ بہ لمحہ موت سے قریب تر ہوتے بوڑھے کی جان کے اس قدر درپے ہوسکتا ہے کہ موت کے فرشتے پر انحصار کرنے کے بجائے اُس نے خود یہ کام سرانجام دینے کا فیصلہ کرلیا ہو۔

''مجھے سمجھ نہیں آرہا، کیا کہہ رہے ہو؟''

''آہستہ بولو......'' کینڈن کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا، وہ بدستور بند تھا۔

''سوری......'' فاکس نے آہستگی سے کہا اور سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر کوئی دروازے کے باہر کھڑا ہو، تب بھی ٹی وی کی اتنی تیز آواز میں ان کی بات نہیں سن سکتا تھا۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''اوکے......'' یہ کہتے ہوئے کینڈن ذرا سا پیچھے کھسکا اور کرسی کی پشت سے سر لگا کر گہری سانس لی۔ فاکس سوچ رہا تھا کہ اس نے جو کچھ سنا، کیا وہ درست ہے۔ اسے کینڈن سے کسی قسم کی غیر سنجیدگی کی توقع ہرگز نہ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کیا ہوا ہے کہ ایک بیمار اور ریٹائرڈ جج کو اپنی زندگی اتنی غیر محفوظ محسوس ہو رہی ہے۔ اس کا جواب صرف کینڈن ہی جانتا تھا مگر اس وقت وہ دونوں ہی خاموش تھے۔ کمرے میں صرف ٹی وی پر باسکٹ بال میچ کے شائقین کی پُرشور آواز گونج رہی تھی۔

فاکس کو ایک بار پھر ماضی یاد آگیا۔ اس کا باپ ہارٹ آئی لینڈ میں بچوں کی اصلاحی جیل کا باورچی تھا۔ وہ ہر روز صبح سویرے اپنے کاٹیج کے عین سامنے سے گزرنے والے، نیم شکستہ راستے پر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ساحل تک پہنچتا، جہاں سے ایک کشتی اسے لے کر جیل تک پہنچاتی تھی۔ ہارٹ آئی لینڈ کئی چھوٹے چھوٹے جزیروں کا مجموعہ تھا، انہی میں سے ایک پر بچوں کی اصلاحی جیل قائم تھی۔ جون، جولائی کی شدید گرمیاں ہوں، نومبر کی ٹھٹھراتی سردی یا پھر دسمبر، جنوری کی طوفانی برف باری...... اُس کے معمول میں کبھی کوئی فرق نہیں آتا تھا۔

جہاں تک فاکس کے بچپن کی یادوں کا تعلق ہے تو اسے یاد نہیں پڑتا کہ اس کے باپ نے کبھی اپنے کام سے کوئی چھٹی کی ہو۔ اسے یاد تھا کہ ایک بار موسم شدید سرد تھا۔ نہ جانے کس طرح صبح سویرے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ماں کچن میں تھی۔ اسے بھوک محسوس ہوئی اور وہ بھی باپ کے ساتھ ناشتا کرنے کے لیے کچن میں پہنچ گیا۔ برف کا طوفان کئی گھنٹوں سے جاری تھا اور کچن کی کھڑکی سے باہر کی نمایاں فضا میں گرتی برف اور زمین پر بچھی اس کی موٹی پرت صاف نظر آرہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کو جانے سے روکنا چاہ رہی تھی لیکن وہ کچھ کہنے کے بجائے صرف مسکرا رہا تھا۔ بار بار اصرار کے باوجود جب اس نے چھٹی کرنے کی ہامی نہ بھری تو ماں بگڑ گئی۔ جس پر باپ نے بڑے پیار سے جواب دیا تھا: ''دیکھو سیلینا...... اگر میں نہ گیا تو وہ بے چارے لڑکے کیا کھائیں گے؟ آخر وہ بھی کسی ماں کے بچے ہیں، بالکل ہمارے فاکس کی طرح۔''

فاکس کو آج بھی یاد ہے کہ یہ جملہ کہتے ہوئے باپ نے اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں نوالہ دیا تھا۔ اسے یہ بھی اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے باپ نے اصلاحی جیل میں سزا کاٹنے والے اُن مجرموں کو عام لوگوں کے برعکس کبھی قیدی، جرائم پیشہ یا اس طرح کے دوسرے تحقیر آمیز القابات سے یاد نہیں کیا، وہ ہمیشہ انہیں ''لڑکے'' کہا کرتا تھا۔

قانونی طور پر ملازمت کے لیے مقررہ حد کو پہنچ جانے کے بعد اسے ریٹائر ہونا پڑا۔ چار دہائیوں کے بعد پہلی بار اس کے معمولاتِ زندگی میں فرق آیا تھا۔ ملازمت سے فراغت کے ایک ہفتے بعد اسے پیٹ میں اینٹھن محسوس ہوئی۔ پہلے تو اُس نے اسے غلط خوراک اور کام کاج کے معمولات میں فرق کا نتیجہ قرار دیا۔ جب کئی روز تک یہ اینٹھن ختم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی گئی تو اُس نے تکلیف کا ذمے دار السر کو ٹھہرایا۔ جب تکلیف اس حد تک بڑھی کہ کھانا پینا دوبھر ہونے لگا تو وہ ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔

ڈاکٹر نے ابتدائی طور پر مرض کو بطور السر تشخیص کیا لیکن چند روز بعد جب میڈیکل ٹیسٹ کی تفصیلی رپورٹ سامنے آئی، تب پتا چلا کہ مرض کافی خطرناک صورت اختیار کرچکا ہے۔ اب اسے اتفاق کہیں کہ جس برس فاکس کو بروکلس سپریم کورٹ میں جج کے پیش کار کی ملازمت ملی تھی، اُسی برس اس کا باپ بھی مرض الموت میں مبتلا ہوگیا۔ نئی ملازمت کے ساتھ ساتھ بیمار باپ کا علاج اور اُس سے جڑے مسائل سے نمٹنا بھی اب فاکس کی ذمے داریوں میں شامل تھا۔

فاکس، ذمے داریاں نبھانے میں بالکل اپنے باپ پر گیا تھا۔ وقت سے پہلے دفتر پہنچتا اور جب تک دفتری کام مکمل نہ کرلیتا، کبھی اپنی سیٹ سے نہ اٹھتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ شدید بخار تھا لیکن اس کے باوجود اپنے فرائض ادا کرتا رہا۔ اس کا پورا دن نہایت مصروف گزرتا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب موبائل فون کا تصور تک نہ تھا۔ دفتری کام نمٹا کر وہ طویل وعریض عدالتی عمارت میں کسی ایسے خالی کمرے کو ڈھونڈتا جہاں سے نہ کوئی گزرتا ہو اور وہاں فون بھی موجود ہو۔ اکثر اسے کسی کلرک کا خالی کمرا مل جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ فون پر ذاتی مسائل کا حل ڈھونڈنا شروع کر دیتا تھا۔

پہلے پہل تو مسائل کی فہرست میں ڈاکٹر، فارماسسٹ اور علاج ومعالجہ کے اخراجات کے حوالے سے سہولیات فراہم کرنے والی بیمہ کمپنیاں شامل ہوتی تھیں لیکن جوں جوں باپ کی بیماری بڑھتی گئی، اس فہرست میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ فہرست میں نرس، بیماروں کی دیکھ بھال کے فلاحی رضاکاروں اور اسی طرح کے اور لوگوں کے نام و پتے اور فون نمبروں کا اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ایک دن فاکس دفتری کام نمٹا کر کسی کلرک کے خالی کمرے کی تلاش میں نکلا مگر اسے ایسا کوئی کمرا نہ مل سکا جہاں ٹیلی فون بھی موجود ہو۔ آخر کار وہ ججوں کے چیمبر کی طرف چلا گیا۔ اسے عدالت نمبر تین میں مقدمے کی سماعت ہوتی نظر آئی۔ وہ اندر داخل ہوا۔ وکیل بحث میں الجھے ہوئے تھے، وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا چیمبر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ چیمبر میں داخل ہو کر اس نے چاروں طرف دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے جج کی کرسی کھینچی اور فون اٹھا کر میڈیکل انسٹرومنٹ سپلائر کا نمبر ملانے لگا۔ اسے کچھ سامان درکار تھا۔ کافی بحث ومباحثے کے بعد آخر کار جب قیمت طے ہو گئی تو اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخا اور سر میز پر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ "دماغ پکا کر رکھ دیا کمبخت نے۔"

"بالکل ٹھیک کہا۔"

یہ سنتے ہی اس نے سر اٹھایا اور پھر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ سامنے جج کینڈن کھڑا تھا۔ وہ جج کو سامنے دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں اپنی موجودگی کا کیا جواز پیش کرے۔

"میرے خیال میں یہی تمہاری اصل نوکری ہے، دن بھر تو تم بس سرکار کو برداشت کرتے ہو۔" کینڈن نے اسے گھورتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں......" یہ کہتے ہوئے فاکس نے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی۔

"ہلنا مت، وہیں بیٹھے رہو۔" اسے اٹھتا دیکھ کر کینڈن نے پاٹ دار آواز میں حکم دیا۔ وہ دم سے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا منہ بولتوں کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ معذرت کرنا چاہتا لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اپنی گلوخلاصی کرائے۔

"ہمیں اب اس معاملے پر کھل کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔" یہ کہتے ہوئے کینڈن میز کی دوسری طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کس بارے میں......" فاکس نے گھگیاتے ہوئے پوچھا۔ وہ نچلے درجے کا چھوٹا سا ملازم تھا۔ وہ سخت خوفزدہ تھا۔ سوچ رہا تھا کہ جو غلطی اس سے ہوئی، اُسے جواز بنا کر ملازمت سے برطرف بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ وہ منہ کھولے کینڈن کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"جو کچھ تم کرتے پھر رہے ہو، مجھے ہی نہیں بہت ساروں کو اس کی خبر ہے۔" کینڈن نے غیر جذباتی لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "پہلے سب سنی سنائی تھی مگر اب اپنے کانوں سے سب کچھ سن اور آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ اب مجھے تمہارے خلاف مزید کسی گواہ یا ثبوت کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

فاکس خاموش تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

کینڈن کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اس کو گھورتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہارا کام کوئی معمولی نہیں۔ یہ تمہاری ملازمت ہے کوئی مذاق نہیں۔ تمہارا کام یہ نہیں ہے کہ کرسی میز پر بیٹھ کر فون گھماؤ۔ کبھی ڈاکٹر سے بات کرو اور کبھی کسی اور سے... حکم دیتے پھرو کہ کیا کرنا ہے، ایسا نہیں کرنا، ویسا کرنا ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے اردگرد بے مصرف نگاہیں ڈالیں اور پھر فاکس کی طرف رخ کیا۔ "تم اپنے باپ کی بیماری سے پریشان ہو۔ یہ اچھی بات ہے مگر یہ تمہارا دفتر ہے۔ یہاں تمہاری کچھ ذمے داریاں ہیں، انہیں پورا کرو اور اپنے وقت پر گھر کے لیے نکل جاؤ۔ اس کے بعد جو دل چاہے کرتے پھرو مگر یہاں نہیں۔" اس نے یہ کہہ کر کچھ توقف کیا۔ "لیکن کہاں جناب...... تمہاری ذمے داری تو صرف ایک ہے۔ تنخواہ یہاں سے لینا اور دن بھر سرکاری وسائل استعمال کرتے ہوئے اپنے بیمار باپ کی دیکھ بھال اور علاج کے لیے اِدھر اُدھر فون کرتے رہنا۔" اس کا لہجہ کاٹ دار اور طنزیہ تھا۔

فاکس کو وہ سہ پہر آج تک اچھی طرح یاد تھی۔ کینڈن نے اسے زندگی کا سبق سکھا دیا تھا۔ وہ اس کی ڈانٹ پھٹکار

نہیں بلکہ بڑے داریوں کو خانوں میں بانٹ کر انہیں سمجھانے کیا۔ کا ورس دے رہا تھا۔ فاکس جانتا تھا کہ کینڈن چاہے تو کھڑے کھڑے اسے نوکری سے نکال دیتا مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ فاکس کو اس کا یہ سبق اور برطرف نہ کرنے کا احسان آج تک یاد تھا۔ اس واقعے کے بعد سے دونوں میں اعتماد کا باہمی رشتہ ہمیشہ کے لیے قائم ہو گیا۔

''کہاں کھو گئے؟'' کینڈن کی لرزتی آواز سنائی دی۔

''کیا ہوا۔'' فاکس چونکا۔ وہ ماضی کے دریچوں سے نکل آیا تھا۔

''یہ عورت مجھے قتل کرنے والی ہے۔'' اس نے انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رازداری سے کہا۔

''یہ سب کچھ کہنے سے آپ کا مطلب کیا ہے۔'' فاکس نے کینڈن کو مخاطب کیا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ آخر وہ ایسا سوچ رہا ہے۔

''کیا مطلب...... '' کینڈن نے خفگی سے کہا۔ ''آخر اس لفظ کے کتنے معنی ہو سکتے ہیں کہ تمہیں سمجھ نہیں آیا۔'' یہ کہہ کر اس نے تین چار گہری سانسیں لیں اور پھر سر اس کی طرف کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''یہ عورت آج رات مجھے قتل کرنے جارہی ہے۔ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب رہی تو شاید میں کل کا سورج اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ پاؤں گا۔'' اپنی ہی موت کا خدشہ ظاہر کرنے کے باوجود اس کے لہجے میں خوف کا نام ونشان تک نہ تھا۔

فاکس نے میز پر رکھی اسٹیک کی پلیٹ اٹھائی اور اس میں سے کچھ کھایا اور چند لمحوں بعد پلیٹ کینڈن کی طرف بڑھائی۔ ''اگر تم سوچ رہے ہو کہ اس نے کھانے میں زہر ملا دیا ہے تو ایسا کچھ نہیں۔ یہ صرف وہم ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔

''تم غلط سمجھے۔'' اس کی بات سن کر کینڈن مسکرایا اور آکسیجن کی نلکی ٹھیک کرنے لگا۔

فاکس پریشان تھا کہ اگر وہ کھانے میں زہر نہیں ملا سکتی تو پھر اسے شک کیوں ہے کہ وہ عورت اسے قتل کرنے والی ہے۔ سوال اب بھی وہیں کھڑا تھا کہ آخر وہ ایسا کیوں کرے گی؟

کینڈن نے گہری سانس لی اور اسٹیکس کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔ آلو کا ایک کباب لے کر کھانا شروع

کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ آخر فاکس نے ہی خاموشی کو توڑا۔ ''میں اب تک آپ کی بات سمجھ نہیں پایا۔ زیادہ بہتر ہوگا کہ کھل کر وضاحت کریں کہ آخر یہ عورت کیوں ایسا کرنے والی ہے اور آپ کس بنیاد پر یہ سوچ رہے ہو کہ وہ آج رات ہی ایسا کرے گی۔''

کینڈن نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک اور کباب اٹھایا اور آہستہ آہستہ کھانے لگا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔ اسے جو کہنا تھا اس کے تانے بانے بُن رہا ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے نیپکن سے ہونٹ صاف کیے۔ ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی کی آواز مزید اونچی کردی۔ ''اپنی کرسی میرے قریب لے آؤ۔'' اس نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے، اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

فاکس اٹھا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب ہو گیا۔

''میں تمہیں پوری بات بتاتا ہوں۔ یہ معمولی بات ہرگز نہیں۔ جب تک پوری بات توجہ سے نہیں سنو گے تب تک کچھ سمجھ نہیں سکو گے۔'' یہ کہہ کر کینڈن نے دو چار گہری سانسیں لیں اور اپنا چہرہ فاکس کے قریب کر کے بولنا شروع کر دیا۔ اگرچہ ٹی وی کی اونچی آواز کے باعث فاکس کا دھیان بار بار بھٹک رہا تھا لیکن اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ ساری توجہ کینڈن کی باتوں پر مرکوز رکھے۔

کینڈن کافی دیر تک بولتا رہا اور جب وہ خاموش ہوا تو فاکس نے گہری سانس لے کر گردن سیدھی کی۔ ''یہ تو بہت برا سودا تھا۔'' اس کا لہجہ افسردہ تھا۔

''جوا کھیلا اور سب کچھ گنوا دیا۔'' کینڈن نے تاسف بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب کیا کرنا ہوگا۔''

''نہیں...... ماضی کو اس طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تمہیں سننا ہوگا۔'' یہ کہہ کر کینڈن نے اس کی طرف بغور دیکھا اور کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔ ''میرا تو سب کچھ ہی داؤ پر لگا تھا اُس وقت۔'' کینڈن نے افسوس سے گردن ہلائی۔ ''دولت اور زندگی کبھی ایک دوسرے کی برابری نہیں کرسکتے لیکن پھر بھی زندگی بچانے کے لیے دولت کی ضرورت پڑتی ہے اور میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ چاہتا تو میں خود کو ایسا کرنے سے روک سکتا تھا لیکن ایسا نہ کرسکا۔ سچ کہوں تو میں چاہنے کے باوجود بھی خود کو اس کام سے روک نہیں سکتا تھا۔ حالات ہی کچھ ایسے موڑ پر آگئے تھے کہ مجھے یہ سب کرنا پڑا۔''

"تو تم مرنا چاہتے ہو؟" فاکس نے بے یقینی سے کہا۔

"اگر کہوں ہاں تو یہ غلط نہ ہوگا۔" یہ کہہ کر کینڈن کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور فاکس کی طرف دیکھا۔ "ملازمت کے بعد مجھے کافی مسائل کا سامنا رہا لیکن میں نے ہر بات بخوبی نبھائی مگر اب......" یہ کہہ کر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور کچھ دیر بعد افسوس بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ "میں بہت جیا ہوں، اتنا زیادہ کہ میری فیملی، میرے ہم عمر دوست، رشتے دار...... ہر کوئی اگلے سفر پر جاچکا، کوئی باقی نہ رہا میرے لیے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

فاکس نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے کندھے پر رکھا۔

کچھ دیر دونوں یونہی بیٹھے رہے۔ آخر کینڈن نے زبان کھولی۔ "میری حالت تو دیکھو، چل پھر نہیں سکتا۔ اپنے وزن سے زیادہ کا سلنڈر بڑی مصیبت سے گھسیٹ پاتا ہوں۔ بستر پر چڑھنے اترنے کی بھی ہمت نہیں ہے۔ رات رات بھر یونہی بیٹھا رہتا ہوں۔ آنکھ کھلتی ہے تو ذرا سا کچھ کھا پی لیتا ہوں۔ ذرا سا ٹی وی دیکھ لیا، اس کے بعد پھر نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فاکس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "یہ ہے میری زندگی اور یہ ہے پوری بات۔ امید ہے اب تمہیں کسی قسم کی وضاحت کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" یہ کہہ کر وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر گہری سانسیں لینے لگا۔ لگتا تھا کہ وہ بول بول کر تھک چکا ہے۔

"کب تک، ڈاکٹر کچھ کہتے ہیں؟" فاکس نے اداسی سے کہا۔

"ہاں......" کینڈن نے کہنا شروع کیا۔ "وہ کہہ رہے ہیں ایک سال لیکن جو میری تکلیف ہے، اس میں ایک سال کاٹ لینا کچھ خوشگوار نہ ہوگا۔"

"مایوس نہ ہوں، ایک سال میں بھی کچھ نہ کچھ ہوسکتا ہے۔" فاکس جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے لیکن پھر بھی اس نے اُسے تسلی دی۔

یہ سن کر کینڈن مسکرا دیا۔ "تمہیں معجزوں پر یقین ہے اور میں حقیقت پسند ہوں۔" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ایک بار پھر اس پر اداسی کا دورہ پڑ گیا۔ "میں نے جو کچھ کیا، اس پر ذرا بھی پشیمانی نہیں۔ میری بیٹی بے روزگار تھی۔ اسے نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کے پاس علاج کے لیے پیسے نہیں تھے۔ میں نے جو کچھ کیا، مجھے وہی کرنا چاہیے تھا لیکن وقت آگے بڑھ چکا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ لوگ کیا کہیں گے، اس سے قطع نظر کہ بطور جج میں نے اپنے الفاظ کا پاس نہیں کیا لیکن اب وہ وقت آچکا۔"

"کیا یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ دوسروں کے طے کردہ پروگرام کے مطابق اس دنیا سے رخصت ہوجاؤ۔" فاکس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

کینڈن نے کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم اب مجھ سے کیا چاہتے ہو، تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"سب سے پہلے میں اپنا ڈنر ختم کروں گا۔" کینڈن نے اسٹیک کی پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "اس کے بعد ہم میٹھا کھائیں گے، کافی پئیں گے۔ پھر تم یہاں سے چلے جانا۔ اس کے بعد وہ عورت مجھے بستر پر لٹا کر کمبل اوڑھا دے گی۔ تم خاموشی سے کار میں بیٹھے رہنا۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد تمہارا کام شروع ہوگا۔ یہاں کیا ہو رہا ہے، وہ تمہیں خودبخود پتا چلتا رہے گا۔"

فاکس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن ایک بات ہے۔" کینڈن نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ "طریقہ جو بھی ہو لیکن تکلیف نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے کچھ پتا چلے۔" یہ کہہ کر وہ تکلیف دہ تاثر کے ساتھ مسکرایا اور پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ "خیر...... تکلیف کی بات ایسی کچھ خاص نہیں بس طریقہ ایسا ہو جو پکڑا نہ جائے۔ ویسے بھی آج تک کسی نے پلٹ کر یہ بتایا ہے کہ کس قسم کی موت میں کتنی زیادہ یا کتنی کم تکلیف ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر کینڈن نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن اسے کھانسی کا ٹھسکا لگ گیا۔

کچھ دیر بعد جب اس کی سانسیں بحال ہوئیں تو فاکس نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ "تو آپ یہ سب کچھ مجھ سے چاہتے ہیں۔"

"نہیں، سب کچھ تو نہیں۔ کچھ تو اسے کرنا ہے۔ تم نے تو کچھ اور خدمات سرانجام دینی ہیں۔" کینڈن نے جلدی سے گول مول انداز میں وضاحت پیش کرکے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

طوفانی بارش برف باری میں بدل چکی تھی۔ برف کے گالے ونڈ شیلڈ پر پڑتے اور پھسلتے ہوئے نیچے گرتے جارہے تھے۔ فاکس کار کے اندر ڈرائیونگ سیٹ پر دونوں

بازو بیٹھنے سے بازرہے بیٹھا تھا۔ وہ بیک ویو مرر میں ڈرائیو وے پر امدادی گاڑیوں کو آتا دیکھ سکتا تھا۔ وہ یہاں سے صاف دیکھ سکتا تھا کہ کینڈن کے کمرے میں ٹی وی چل رہا ہے۔ ٹی وی کی کم تیز ہوتی روشنی شیشے کی کھڑکی سے صاف دیکھی جاسکتی تھی۔ موٹے پردے بھی روشنی چھپانے میں ناکام تھے۔ گھر کا داخلی گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اس کے کمرے کی لائٹ اب تک روشن تھی۔ سڑک پر بھی کوئی نہ تھا۔ اردگرد کے تمام مکانوں کی کھڑکیاں تاریک تھیں۔ کچھ دیر بعد کینڈن کے کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والی روشنیاں بھی تاریکی میں بدل گئیں۔ فاکس نے کلائی پہ بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی اسے اگلی منزل سٹی آئی لینڈ پہنچنا تھا۔ ایلن کو گھر سے نکلے کافی دیر ہوچکی تھی۔ جب سے وہ گھر سے کینڈن کے پاس پہنچا تھا، پہلی بار اسے اپنی بیوی کا خیال آیا تھا۔ اگرچہ کام لمبا تھا لیکن وہ رات ہی رات میں سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک کرکے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔

فاکس کو اچانک وہ وقت یاد آگیا جب جج کینڈن پہلی بار اس کے والد کی عیادت کے لیے گھر آیا تھا۔ وہ آج کے کینڈن سے یکسر مختلف تھا۔ لمبا چوڑا، خوش باش، ہنسنے ہنسانے والا...... ایک مکمل آدمی۔ اس نے مریض کو اتنے لطیفے سنائے کہ کچھ دیر کے لیے وہ بھی بیماری بھول بیٹھا۔ واپسی پر فاکس نے اس سے کہا تھا۔ ”آپ ٹھیک کہتے تھے، مجھے اپنے کام اور دیگر ذمے داریوں کو تناسب کے ساتھ مختلف خانوں میں بانٹ کر نبھانا چاہیے۔“

یہ سن کر کینڈن نے نوجوان فاکس کے شانے پر تعریفی انداز میں ہاتھ رکھا تھا۔

”آپ نے میری زندگی کا رخ متعین کردیا۔ اس کے لیے میں بس یہی کہہ سکتا ہوں...... آپ کا شکریہ۔ اس سے زیادہ کچھ کہنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔“

کئی برس بیت چکے لیکن فاکس کو اُس وقت کینڈن سے کی گئی بات چیت پوری طرح یاد تھی۔ ”اگر آپ کو کبھی میری مدد کی ضرورت پڑے تو ضرور یاد کیجیے گا، مجھے خوشی ہوگی۔“ فاکس کو اپنا وعدہ اچھی طرح یاد تھا۔ وہ اب برسوں پہلے کا وعدہ وفا کرنے کے لیے، اپنے گرم بیڈروم کے بجائے اس برفانی رات میں، سڑک کنارے کھڑی یخ بستہ کار میں بیٹھا ہوا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد سائرن کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ کچھ دیر بعد سرخ روشنی کی پرچھائیاں اردگرد کے درختوں پر پڑنے لگیں۔ اگلے ہی لمحے ایمبولینس کینڈن کے گھر میں داخل ہورہی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک اور ویگن گھر کے سامنے پہنچی۔ نارنجی لباس میں ملبوس دو تین لوگ گاڑی سے اترے۔ ان کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بڑا سوٹ کیس تھا۔ چند لمحوں بعد وہ گھر کے اندر داخل ہوچکے تھے۔

ایمبولینس کی آمد کے تقریباً بیس منٹ بعد نارنجی لباس میں ملبوس وہ لوگ باہر نکلے۔ وہ صاف دیکھ سکتا تھا کہ سلنڈر گاڑی میں رکھا جارہا تھا۔ یہ لوگ آکسیجن سلنڈر فراہم کرنے والی کمپنی کی طرف سے آئے تھے۔ فاکس نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے لگ رہا تھا کہ سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہورہا ہے۔

ایمبولینس گھر سے باہر نکلنے لگی تو فاکس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ہیٹر کی حدت محسوس ہوتے ہی جیسے اُس کے جسم میں زندگی کی حرارت لوٹ آئی ہو۔ اس نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے رگڑ کر جمتے خون کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ جیسے ہی ایمبولینس آگے بڑھی، اس نے کچھ فاصلہ رکھ کر تعاقب شروع کردیا۔ سڑک کے اختتام سے پہلے اس نے یوٹرن لیا اور ایمبولینس کی مخالف سمت میں گاڑی دوڑانے لگا۔ ایمبولینس میڈیکل سینٹر میں داخل ہوچکی تھی۔ اس کا رخ مردہ خانے کی سمت تھا۔

کافی دیر بعد اس کی کار نہایت خوبصورت تعمیر کردہ گھروں کے سامنے سڑک پر رکی۔ اس نے ایک عمارت پر نظر ڈالی..... وہ یہاں رہنے والے وکیلوں کے دھندوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ زیادہ تر فلیٹ اور گھر کرائے داروں کے تھے۔ یہاں رہنے اور دفتر رکھنے والے زیادہ تر وکیل ایسے تھے جو شاید ہی عدالتی امور میں مہارت کے ذریعے کامیاب بننے کی کوشش کرتے ہوں گے۔ وہ شاید ہی کسی مقدمے کی پیروی کے لیے کبھی کسی عدالت میں پیش ہوتے ہوں گے۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے جو دولت کے لیے قانون کے نام پر سب کچھ کرگزرتے تھے۔

اس نے کار پارک کی اور بلند دفتری عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ استقبالیہ پر کوئی نہ تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ لابی میں دیوار پر چسپاں ڈائریکٹری میں اسے مطلوبہ نام...... اور دفتر کا نمبر نظر آگیا۔ دفتر ساتویں منزل پر تھا۔ اس نے لفٹ کا رخ کیا۔ رات کے اس پہر وہاں کسی کی موجودگی کے آثار نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ لفٹ میں داخل ہوا اور ساتویں منزل کا بٹن دبادیا۔ لفٹ بہت سست تھی۔ بٹن دبانے کے باوجود دروازہ کھلا رہا۔ اسے شدید غصہ آرہا تھا۔ دروازہ بند ہونے ہی والا تھا کہ ایک شخص تیزی سے آگے بڑھا اور لفٹ میں داخل ہوگیا۔ فاکس

چونک گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اجنبی کون ہے۔ اسے ڈر تھا کہیں وہ اس کے کام میں رکاوٹ نہ بنے۔ وہ شخص موبائل فون پر بات کررہا تھا۔ ''میں لفٹ میں آ گیا ہوں، دفتر میں جارہا ہوں۔ بعد میں بات کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور ایک نظر پینل پر ڈالی۔ ساتویں منزل کا بٹن دبا ہوا تھا۔ اس نے نظر بھر کر فاکس کی طرف دیکھا اور بریف کیس نیچے رکھا۔ وہ ایک خوش لباس ڈھلتی عمر کا مرد تھا۔ اس کا سر بیچ سے گنجا تھا البتہ سائڈ کے بال بڑے اور سفید تھے۔

لفٹ بہت سست چل رہی تھی۔ اُس شخص نے ایک نظر کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالی۔ ''رات کافی ہوگئی ہے۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور پھر فاکس کی طرف دیکھا۔ ''اس طوفانی موسم میں گھر سے باہر نکلنا عذاب سے کم نہیں۔''

فاکس اس کی بات سن کر مسکرایا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ گومگو کی کیفیت میں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ شخص کون ہوسکتا ہے۔

وہ ساتویں منزل پر پہنچے۔ لفٹ جھٹکے سے رکی۔ وہ جتنی سست چل رہی تھی، اتنی ہی سستی اس کے دروازے نے کھلنے میں دکھائی۔ اس شخص نے شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فاکس کو پہلے باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی نکل آیا۔

فاکس آگے بڑھا اور ایک دروازے پر پہنچ کر رکا۔ اس پر لگی نام کی تختی پر لکھا تھا: ولیم، پک وک اسکوائر۔

''تو تم مجھے ہی تلاش کررہے تھے۔'' اس شخص نے عقب سے فاکس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تصدیقی لہجے میں پوچھا۔

فاکس چونک گیا اور جلدی سے کہا۔ ''جی ہاں...... شاید میں آپ سے ہی ملنا چاہتا تھا۔''

''عجیب اتفاق......''

''لیکن غیر متوقع نہیں۔ ہم اس بارے میں فون پر بات کرچکے تھے۔'' فاکس نے جلدی سے وضاحت کی۔

''ہاں، ہاں...... لیکن ٹائمنگ دیکھو۔'' ولیم نے خوشگوار حیرت سے کہا اور تالا کھولنے لگا۔ ''لگتا ہے تم بھی وقت ضائع نہ کرنے کے عادی ہو۔''

فاکس مسکرایا۔ ''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ اس کا لہجہ ذو معنی تھا۔

ولیم نے اندر داخل ہوکر لائٹ جلائی اور پھر فاکس کو آنے کا اشارہ کیا۔ ''تو کہیے میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں مسٹر......!'' اس نے رین کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ لگتا تھا کہ وہ رسمی گفتگو میں وقت ضائع کرنے کا قائل نہ تھا اور وہ بھی رات کے اس پہر، جب دونوں کو اپنے اپنے کمروں میں ہونا چاہیے تھا۔

''فاکس، میرا نام فاکس ہے اور جیسا کہ فون پر پہلے ہی بتا چکا تھا، میں ایک کنٹریکٹ کے سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''کھل کر بات کریں مسٹر فاکس......'' ولیم نے میز پر بریف کیس رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں مختلف اقسام کے معاہدات کے لیے خدمات فراہم کرتا ہوں۔ صاف صاف بتائیے کہ آپ کیا چاہتے ہیں، کوئی نیا معاہدہ یا پہلے سے موجود کسی معاہدے کو نئی شکل دینا چاہتے ہیں۔''

''ایسا معاہدہ، جس میں آپ پہلے سے ہی شامل رہے ہیں۔'' فاکس نے گول مول جواب دیا۔

ولیم کچھ سمجھ نہ سکا۔ ''تمہارا مطلب کوئی لائف انشورنس پالیسی؟''

''بالکل ٹھیک سمجھے۔'' فاکس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اس میں شرمانے کی کوئی ضرورت نہیں مسٹر فاکس......'' ولیم کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''یہ بتائیے کہ کیا آپ اپنی لائف انشورنس کی بات کررہے ہیں۔''

فاکس نے کچھ کہنے کے بجائے اس طرح سر ہلایا کہ ولیم سمجھ نہ سکا کہ وہ انکار کررہا ہے یا اقرار۔

''ویسے تو تم کافی صحت مند لگ رہے ہو۔'' ولیم نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری انشورنس پالیسی کی بات مذاق سے کچھ کم نہ ہوگی۔''

''کوئی اگر مجھے قتل کرنا چاہے تو بہتر صحت موت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔'' فاکس کا لہجہ مشکوک تھا۔

''تمہاری بات میں وزن ہے۔'' ولیم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ ہم بیٹھ کر تفصیل سے بات کریں۔'' ولیم نے کہا۔ ''ویسے بھی میں جو کچھ سمجھ سکا ہوں، اس کی روشنی میں پورا کام نمٹانے میں کم از کم ڈیڑھ گھنٹے لگ سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا اور پھر پوچھا۔ ''ویسے تمہاری پالیسی کی مالیت کیا ہوگی۔''

''پانچ لاکھ ڈالر۔''

''واقعی......'' ولیم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیرانی سے کہا۔ ''یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں انشورنس کے حوالے سے، صرف لائف انشورنس میں ہی ڈیل کرتا ہوں۔''

"جی ہاں..... اسی لیے تو مجھے یہاں بھیجا گیا ہے ورنہ کئی اور وکیل بھی ہوں گے یہ کام کرنے والے۔" فاکس نے جواب دیا۔

"میری ڈیل بالکل صاف ستھری ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے فاکس کی طرف دیکھا۔ "تم کس قسم کی پالیسی کے سلسلے میں آئے ہو؟"

"میں سیداوی پالیسی کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے سوا کچھ اور مجھے نہیں چاہیے۔" فاکس نے کہا۔

اس وقت وہ سوئٹ کے لاؤنج میں کھڑے تھے۔

"تو چلو، دفتر میں بیٹھ کر یہ کام کرتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے ولیم آگے بڑھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے چل دیا۔

دفتر کو شاندار بنانے کی عمدہ کوشش کی گئی تھی۔ مہاگنی کی میز کے پیچھے بڑی سی چرمی کرسی تھی۔ اس کے سامنے تین کرسیاں رکھی تھیں۔ دیوار پر ساحلی غروب آفتاب کی منظر کشی کرتی تصویر لگی تھی۔ اس کے ساتھ لوہے کی بنی تین فائل کیبنٹ ایک قطار میں تھیں۔ ولیم نے چابی نکال کر ایک الماری کھولی اور دراز کھینچ کر باہر نکالی۔ کچھ دیر تک وہ کاغذات الٹ پلٹ کرتا رہا۔ اس کی پشت فاکس کی طرف تھی۔ وہ پلٹا تو اس کے ہاتھ میں اسٹامپ پیپر اور چند دیگر کاغذات تھے۔ "لو..... تمہارا کام شروع کرتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس نے دستاویزات اور پین اس کی طرف بڑھا دیا۔ اسٹامپ پیپر ٹائپ شدہ تھا، جس کے اوپری حصے میں ضروری تفصیلات کی جگہیں خالی تھیں۔ "ان خالی جگہوں کو پُر کرو۔ سب سے پہلے وائٹر کا نام لکھو۔"

فاکس نے ہاتھ بڑھا کر دستاویزات اٹھالیں۔

"جانتے ہو وائٹر کیا ہوتا ہے؟" ولیم نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

فاکس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"امریکی انشورنس کی دنیا میں یہ ایک اصطلاح ہے، جو ایسے شخص کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو کسی دوسرے لائف انشورنس پالیسی کا حامل ہو۔"

"اوکے....." فاکس نے آہستہ سے کہا۔ اس کی نگاہیں دستاویزات پر تھیں۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اوپر اٹھایا۔

"بطور پالیسی خریدار کے یہاں میرا نام کہاں لکھا جائے گا۔ کچھ سمجھ نہیں پا رہا، یہ کیسے پُر ہوں گے۔" فاکس نے کاغذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"بتاتا ہوں۔" ولیم نے یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا۔ "پہلے تو یہ سمجھ لو کہ یہ پالیسی کس طرح موثر اور کارگر ہوگی۔"

فاکس نے اپنی نگاہیں اس پر لگا دیں۔

"جیسا کہ میں نہایت کم قیمت پر ایک وائٹر لائف انشورنس پالیسی خرید رہا ہوں۔ اس کے نتیجے میں، پالیسی کے حامل شخص کو خریدار کی طرف سے رقم ادا کرنے کے بعد، نہ تو وہ پریمیم ادائیگی کا ذمے دار ہوتا ہے اور نہ ہی پالیسی یا اس کی رقم پر اس کا کوئی اختیار باقی رہتا ہے۔ ایسے میں وائٹر پالیسی کا خریدار جو رقم ادا کرتا ہے، وہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہ آپ کسی سے کوئی چیز خریدنے کے لیے رقم ادا کرتے ہیں۔ ادائیگی کے بعد اصل مالک اُس شے پر سے اپنا حق ملکیت کھو بیٹھتا ہے۔ اس کے نتیجے میں پالیسی جس شخص کے نام پر لی جاتی ہے، اُس کی موت کی صورت میں، انشورنس کمپنی سے طے شدہ تمام تر فوائد اس شخص کو ملتے ہیں جو اصل پالیسی ہولڈر سے پالیسی خرید چکا ہوتا ہے۔"

"ایسے میں وائٹر پالیسی کے حامل شخص کو کتنی رقم ادا کی جاتی ہے۔" فاکس نے سوال کیا۔

"اس کا انحصار کئی باتوں پر ہے۔" ولیم نے بتانا شروع کیا۔ وہ بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ "اس حوالے سے دو باتیں نہایت اہم ہیں: پالیسی کی مالیت اور ادا کیے جانے والا ماہانہ پریمیم۔ یہ دونوں چیزیں اس پالیسی کی قیمت طے کرتی ہیں۔"

"بس....."

"نہیں..... کچھ اور بھی باتیں مدِنظر رکھنا پڑتی ہیں جیسے پالیسی والے شخص کی صحت، عمر اور کوئی مرض ہو تو اس صورت میں اس مرض کی کیفیت، شدت وغیرہ بھی۔"

"آپ یہ سب کچھ کیسے طے کرتے ہیں۔" فاکس نے سوال کیا۔

"یہ سب کچھ جاننے کے لیے پالیسی بیچنے والے کو ایک فارم پُر کرنا پڑتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے ولیم نے چند کاغذات اس کی طرف بڑھائے۔ "اس کے ذریعے مجھے خریدار کے تمام میڈیکل ریکارڈ تک قانونی طور پر مکمل رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔"

یہ سن کر فاکس نے بھویں چڑھائیں۔

"ایک منٹ مسٹر....." ولیم نے چونک کر کہا۔ "تم نے تو خود کو وائٹر پالیسی بیچنے والے کے طور پر خود کو متعارف

کرایا تھا لیکن تمہارے سوالات وائٹر پالیسی کے خریدار میں زیادہ دلچسپی ظاہر کر رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور اس پر گہری نظر ڈالی۔ ''صاف صاف بتاؤ، تم خود پالیسی بیچ رہے ہو یا کسی اور کے لیے یہ خدمت سرانجام دے رہے ہو۔'' اس کے لہجے سے تشویش صاف عیاں تھی۔

''نہیں، نہیں...... ایسا نہیں ہے۔ یہ پالیسی میں خود بیچ رہا ہوں۔'' ولیم نے نرم لہجے میں اس کی تشویش دور کرنے کی کوشش کی۔ ''میں نے جو کچھ پوچھا، وہ صرف اپنی معلومات بڑھانے کے لیے تھا۔''

''اوکے......'' ولیم کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ اس کی بات سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ ''ویسے میں نے بھی جو کچھ بتایا وہ اس لیے کہ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ جانے.... بغیر تم دستاویزات ٹھیک طرح سے نہیں بھر سکو گے۔''

''ویسے میں نے محسوس کیا کہ تم خاصے محتاط ہو۔ اتنی احتیاط کس لیے۔'' فاکس نے پوچھا۔

''فراڈ سے بچنے کے لیے۔'' ولیم نے شاطرانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''ایسا اکثر تو نہیں ہوتا لیکن پھر بھی کبھی کبھار پالیسی بیچنے والے کافی کچھ غلط بیانی کر جاتے ہیں۔ ایسے میں بطور خریدار مجھے نفع سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔''

''مطلب کہ وہ لوگ توقع سے زیادہ دیر تک زندہ رہتے ہیں۔''

''کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔'' ولیم نے گہری سانس لی۔ ''ایسا ہو تو پھر مجھے پریمیم کی زیادہ اقساط ادا کرنی پڑتی ہیں۔ بعض دفعہ تو مجھو اصل لاگت بھی وصول نہیں ہوتی۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے لیکن ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا۔ ''خیر یہ کاروبار ہے کوئی خیرات نہیں۔ کاروبار میں تو نفع نقصان ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہی رہتے ہیں۔''

''اگر کوئی وائٹر پالیسی والا زیادہ دنوں تک زندہ رہے تو پھر کیا ہوتا ہے۔'' فاکس کے لہجے سے تجسس عیاں تھا۔

''میں اپنی رقم گنوا سکتا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔ ''خاص طور پر نقصان ہونے کا خطرہ کینسر کے مریضوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں ان کی زندگی توقع سے زیادہ لمبی ہو جاتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے فاکس کی طرف خباثت بھری نگاہوں سے گھورا۔ ''ایسے میں دل کا دورہ... بہت خوب چیز ہے۔'' یہ کہہ کر وہ منہ پھاڑ کر ہنسا۔ ''مرتا ہے تو جلدی مرو۔ انتظار کس کے لیے۔''

فاکس بھی مسکرایا۔ ''ایسے میں وائٹر پالیسی والے کو زہریلا انجکشن دینے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔''

''سوری...... میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔'' ولیم نے ہنسی کو بریک لگاتے ہوئے چونک کر، اُسے سوالیہ نگاہوں گھورا۔

''میں ایسے وائٹر پالیسی والے کے بارے میں بات کر رہا ہوں جو توقع سے زیادہ جی رہا ہے اور گھر پر اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی شخص تمہارے نقصان کو زیادہ تیزی سے نفع اور خالص کیش میں بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو......'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ''ایسی صورت میں کیا کہو گے؟''

''واقعی......'' وہ چونکا۔ ''میں اب تک کچھ نہیں سمجھ سکا کہ تم کس کے بارے میں بات کر رہے ہو۔'' ولیم کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔

''میں اُس بارے میں بات کر رہا ہوں جو آج رات بوڑھے ریٹائرڈ جج کینڈن کے ساتھ ہونے والا ہے۔''

یہ سنتے ہی ولیم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے جلدی سے میز پر بکھرے کاغذات سمیٹنا شروع کیے اور اس کی طرف دیکھے بنا کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں مسٹر فاکس کہ آپ کے جانے کا وقت ہو چکا، اب آپ کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔''

''لیکن وائٹر پالیسی......''

''بھاڑ میں گئی پالیسی۔'' ولیم چلّایا۔

''ایسے کیسے گئی بھاڑ میں۔'' یہ کہتے ہوئے فاکس تیزی سے اٹھا، ولیم کی کلائی پکڑ کر موڑی اور جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر ہتھکڑی باہر نکالی۔ اس نے نہایت پھرتی سے ہتھکڑی ولیم کی کلائی میں پہنا کر لاک کی اور دوسرا حصہ کرسی کے ہتھے سے باندھ دیا۔ چند لمحوں کے اندر ہی فاکس کا کام ختم ہو چکا تھا۔

کرسی بہت بھاری تھی۔ اب ولیم اس کے ساتھ حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ وہ کرسی میں دھنسا بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ ''کون ہو تم......'' اس نے گھگیاتے ہوئے پوچھا۔

''پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں فاکس ہوں۔'' یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''جج کینڈن کا پرانا دوست۔''

''مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہا کہ تم کس شخص کے بارے میں بات کر رہے ہو۔'' اس کی آواز خوف سے کپکپا رہی تھی۔ ''میں ایک ایماندار وکیل ہوں اور اپنا کام پوری

دیانت داری سے کرتا ہوں۔ یہ میرا دھندا ہے اور اس میں بے ایمانی بالکل نہیں۔ میرے وائٹر پالیسی معاہدوں کی کئی بار عدالتوں نے توثیق کی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے خشک گلے کو تھوک نگل کر تر کیا اور پھر بولا۔ ''تم میرے کام کو چاہے ناپسند کرو مگر یہ میرا کام ہے۔ میں ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہوں اور بدلے میں تھوڑا بہت کما لیتا ہوں۔'' اپنی صفائی پیش کر کے اس نے گہری سانس لی۔ وہ کرسی میں ڈھیلا بیٹھا تھا۔

''ہاں......'' فاکس نے ذومعنی لہجے میں کہا۔ ''تم بڑے ایمان دار ہو۔ جسے اوپر جانے میں دیر لگے تو تم نقصان سے بچنے کے لیے اسے بہت جلدی اوپر بھی بھجوا دیتے ہو۔'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو، میں وائٹر پالیسی والے کسی شخص سے ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' وہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہر گناہ گار مجرم کی طرح خود کو معصوم ثابت کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' فاکس نے اس کی کہانی کو بکواس سے زیادہ اہمیت نہ دی۔

دفتر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اسی دوران میں کسی عورت نے باہر سے پکارا۔ ''بل۔۔۔ کہاں ہو تم؟''

''بھاگو نینسی۔۔۔ جلدی سے باہر بھاگو۔'' یہ سنتے ہی ولیم ہذیانی انداز میں چلایا۔

لیکن فاکس زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اس سے پہلے کہ نینسی بھاگتی، وہ اسے اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ نینسی اب تک نرسنگ ڈریس میں تھی۔ فاکس پہچان گیا۔ وہ اسے چند گھنٹے پہلے کینڈن کے گھر پر دیکھ چکا تھا۔

وہ اسے بھی پکڑ کر اندر لے آیا اور دفتر کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ وہ دبلی پتلی نازک اندام مگر قاتل حسینہ تھی۔ مگر سخت خوفزدہ تھی۔ فاکس کے پاس دوسری ہتھکڑی نہیں تھی۔ اس نے نینسی کو اپنے سامنے والی کرسی پر اس طرح بٹھایا کہ اگر وہ اٹھ کر بھاگنے کی کوئی کوشش کرے تو فاکس اسے روک سکے۔

اب فاکس کے ہاتھوں میں پستول بھی نظر آ رہا تھا۔

''کمینہ بڈھا۔۔۔'' اچانک ولیم چلانے لگا۔ ''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ڈاکٹر کہتے ہیں بس! وہ صرف چار آٹھ مہینوں کا مہمان ہے۔ اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔'' ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر دورہ پڑ چکا ہو۔ ''اس نے مجھے غلط میڈیکل رپورٹس دی تھیں۔'' وہ شدید غصے کی حالت میں تھا۔

فاکس مسکرایا۔ ''اس نے تمہارے فراڈ کا توڑ نکال لیا تھا مسٹر ولیم۔''

''ہاں۔۔۔ اس نے ایسا ہی کیا ہے۔'' وہ بدستور غصے میں تھا۔

''تو تم اس پر عدالت میں مقدمہ دائر کر دیتے۔'' فاکس نے طنزیہ لہجے میں اسے مشورہ دیا۔

''ہاں۔۔۔ اس پر تو مقدمہ ہی دائر کرنا چاہیے تھا۔''

''ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ عدالتوں نے متعدد بار تمہارے دعووں کو درست تسلیم کیا ہے۔''

ولیم نے طنزیہ انداز میں زوردار قہقہہ لگایا۔ ''مقدمہ اور وہ بھی سپریم کورٹ کے سابق جج پر۔'' وہ رکا اور فاکس کی طرف دیکھا۔ ''کون سنتا یہ دعویٰ، کون سماعت کرتا مقدمے کی، اس کا ہی کوئی جونیئر، کوئی تابعدار شاگرد...... پھر کیا ملتا مجھے فیصلے سے؟''

''اس رات کے بعد تو مقدمہ کرنے کا کوئی چانس ہی باقی نہیں رہنے گا۔'' یہ کہتے ہوئے فاکس نے نینسی کو بازو سے پکڑ کر کرسی سے اٹھایا۔ اس کا پورا وجود پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اسے تو گمان بھی نہ تھا کہ ولیم کے دفتر میں ایسی صورت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

فاکس نے ولیم کے عقب میں رکھی الماریوں کی قطار کے ساتھ نینسی کو کھڑا کیا۔ ''اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش مت کرنا۔'' اس کا لہجہ دھمکانے والا تھا۔

''تم کیا کرنے جا رہے ہو؟'' پہلی بار نینسی نے زبان کھولی اور اٹکتے ہوئے کہا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

''تمہیں محفوظ کر رہا ہوں۔'' فاکس نے پُراسرار انداز میں جواب دیا۔ یہ کہہ کر مڑا اور کرسی سے بندھی ہتھکڑی کھول کر اسے دستے کے نیچے سے گزار کر نینسی کی کلائی میں پہنا کر لاک کر دیا۔

''اب تم جج کینڈن کی وائٹر پالیسی میرے نام کر دو۔'' اس نے ولیم کی کنپٹی پر پستول کی نال رکھی۔

''کیا۔۔۔'' ولیم چلایا۔

''وہی کرو جو کچھ کہا گیا ہے۔'' فاکس کے لہجے میں سفاکی اُمڈ آئی تھی۔

''یہ غلط ہے۔۔۔''

''دو نفی کی جمع ایک مثبت ہوتی ہے۔'' فاکس نے کاٹ دار نگاہوں سے ولیم کو دیکھا۔ ''ایک کینڈن کا غلط

کام۔ دوہرا تمہارا غلط کام اور دو غلط کام کا اچھا نتیجہ نکلے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے آہستہ سے پستول کی نال اس کی گردن میں چبھوئی۔ ''جلدی کرو۔''

''او کے......'' ولیم بے بس نظر آرہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے کینڈن کی وائٹر لائف انشورنس پالیسی اپنی شرٹ کے اندر ڈالی اور جیکٹ کی جیب سے ایک بڑا سا پلاسٹک کا تھیلا نکالا اور 'وائٹر کیسز' کے لیبل والی الماری کھول کر ساری فائلیں اس میں بھرنے لگا۔

''یہ میری ملکیت ہے۔'' ولیم چلّایا۔ ''تم ان معاہدوں کو چرا نہیں سکتے۔ یہ قانونی طور پر غلط ہے۔ تم چوری کررہے ہو۔''

اس کی چیخ و پکار پر دھیان دینے کے بجائے فاکس اطمینان سے ساری فائلیں تھیلے میں بھرتا رہا۔

''قانونی طور پر یہ غلط ہے۔'' ولیم نے پھر دہائی دی۔

''اگر کوئی غلط کام ایک وکیل خود کررہا ہو تو اس کا کوئی بھی قانونی جواز نکال سکتا ہے۔ اس لیے مجھے تمہاری بکواس کی کوئی فکر نہیں، کرتے رہو بک بک۔'' فاکس نے اطمینان سے جواب دیا۔ تھیلا اٹھا کر کندھے سے لٹکایا اور لات مار کر کرسی کو اپنے راستے سے دور کیا۔ دروازہ کھولا اور باہر سے بند کر کے لفٹ کی طرف چل دیا۔ سست رو لفٹ کو آنے میں کافی دیر لگی اور نہایت سست روی سے اس نے فاکس کو نیچے پہنچایا۔ تھیلا کافی وزنی تھا، جس کی وجہ سے پلاسٹک کے تھیلے سے فائلوں کے کنارے جھانکنے لگے تھے۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اسے یہاں سے نکلتا کسی نے دیکھا اور کچھ پوچھا کہ تھیلے میں کیا ہے تو کہہ دے گا: ''ولیم پک وک پیپرز۔''

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ جج رابرٹ کے گھر کے سامنے رکا۔ اس نے گاڑی سے تھیلا نکالا اور وائٹر انشورنس پالیسی سے بھرا تھیلا گیٹ کے اندر پھینک دیا۔ تھیلے کے ساتھ ایک خط بھی تھا، جس میں درخواست کی گئی تھی کہ عدالت ان تمام پالیسی واروں کو طلب کرے اور ان وائٹر پالیسیوں کی فروخت کے معاہدات کو کینسل کر کے، پالیسیاں ان کے اصل مالکان کو لوٹادی جائیں۔

فاکس خوش تھا۔ اس نے جج کینڈن کا کام کردیا تھا۔ کینڈن خود دنیا چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ وہ سوتا بن کر خوشی خوشی نینسی کے ہاتھوں زہر کا انجکشن لگوا چکا تھا۔ فاکس سوچ رہا تھا کہ کینڈن تو اب مر وہ جانے میں آرام کررہا ہوگا لیکن اسے یقین تھا کہ اب ولیم کسی اور وائٹر پالیسی والے کو اس کی مرضی کے خلاف اوپر والے کے پاس نہیں بھیج سکے گا۔

اچانک اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''مسٹر کینڈن...... میں نے آپ کا کام کردیا۔ بس! پروگرام میں ایک چھوٹی سی تبدیلی کی ہے۔ امید ہے معاف کردو گے۔ آپ کی پالیسی کا حقدار میں نے خود کو بنالیا۔ مجھے اس رقم کی ضرورت بھی تھی۔ اب جنرل اسٹور کھول کر اپنی بے روزگاری دور کرسکوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے کار کا دروازہ کھولا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

رات کافی ہوچکی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے آنے سے پہلے پہلے گھر پہنچنا چاہتا تھا ورنہ اُس پولیس والی کے درجنوں سوالوں کے جواب دینا پڑجاتے۔ رات بھر کی خواری کے بعد اب اس میں گرما گرم کافی پی کر بستر میں دبکنے کے سوا کسی اور بات کی ہمت نہ تھی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

ولیم کا غصے سے برا حال تھا۔ وہ اور نینسی دونوں خود کو ہتھکڑی سے چھڑانے کے لیے اُلٹی سیدھی کوششیں کررہے تھے۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجی۔ ولیم نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔

''کیا مسٹر ولیم پک وک بول رہے ہیں۔'' دوسری طرف سے نسوانی آواز نے پوچھا۔

''بول رہا ہوں۔'' اس نے جھنجلا کر جواب دیا۔

''میں کینیڈی میڈیکل سینٹر سے میڈیکل ایگزامنر بات کررہی ہوں۔''

''بولیے......'' ولیم نے بیزاری سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''مسٹر کینڈن انتقال کر گئے ہیں۔ ریکارڈ کے مطابق ان کی موت کی اطلاع سب سے پہلے آپ کو دی جانی چاہیے تھی۔''

''بکواس بند کرو...... کینڈن ہو یا لینڈن...... مجھے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ولیم نے جھلا کر فون پٹخ دیا۔ غصے کے مارے اس کا چہرہ تپ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوا تھا۔ اسے دھندے میں صرف نقصان ہی نہیں ہوا، پورے کا پورا دھندا چوپٹ ہوچکا تھا۔

کاشف زبیر

انسان کا کُل اثاثہ اس کا کُنبہ اور مسکن ہوتا ہے... مسکن اور کنبے کے بغیر زندگی، زندگی نہیں رہتی... بے گھر ہو کے جائے پناہ ڈھونڈنا... خوب صورت گھروں اور بستی کو حسرت سے دیکھ دیکھ کے ماتم کرنا... امیدیں یاس... خوشیاں... غم و الم سب لمحوں میں بدل کے ذات کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں... ایسے ہی ایک دل شکستہ... بے مسکن کا دکھ جو غم... اذیت اور مایوسیوں کے آہنی چنگل میں گرفتار تھا۔

زمین پر تعمیر طاقتور انسانوں کے ناقابل تسخیر قلعوں کی نشانیاں

میرا کوئی گھر نہیں لیکن یہ جگہ میرا گھر ہے اور میرا گھر بہت خوب صورت ہے۔ یہ اب سے نہیں شروع سے خوب صورت تھا۔ جب یہاں صرف میں بستا تھا۔ اس وقت یہاں درخت تھے۔ چند ایک نالے تھے اور چھوٹی سی پہاڑی کی ڈھلان تھی۔ جہاں درخت نہیں تھے وہاں جھاڑیاں اور پودے تھے یا پھر گھاس تھی۔ کوئی جگہ سبزے سے خالی نہیں تھی۔ شمال کی طرف جانے والی پانی [illegible] یہاں سے کچھ ناصلے سے گزرتی تھی۔ پہاڑی پر چڑھ کر دیکھتا تو دور تک پھیلے

دارالحکومت کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ یہ جگہ کسی قدر اونچائی پر تھی۔

میں نے درختوں کے درمیان ایک جھونپڑی بنائی ہوئی تھی، اس کی دیواریں کچی مٹی سے اور چھت لکڑی کی بنی تھی جس پر مٹی کا لیپ کیا ہوا تھا۔ ہر بارش کے بعد مجھے نئے سرے سے جھونپڑی کی مرمت کرنا پڑتی تھی مگر یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میرے پاس اور کوئی مصروفیت ہی نہیں تھی۔ اس لیے یہی واحد مصروفیت تھی۔ پیشے کے لحاظ سے بھکاری ہوں مگر فطرتاً بھکاری نہیں ہوں۔ صبح مانگنے جاتا اور جب اتنا مل جاتا کہ ایک دن کا گزارا ہو جائے تو واپس آجاتا۔ اگر اتنا مل جاتا جس سے دو دن گزر جائیں تو اگلے دن نہیں جاتا تھا۔

مجھے نہیں یاد کہ میں اس جنگل میں کب آیا۔ بس اتنا یاد ہے کہ دارالحکومت نیا نیا آباد ہو رہا تھا اور اس وقت تو اس پہاڑی سے بہت دور تھا۔ میرا ایک گھر تھا۔ اس میں ایک عورت تھی اور ایک آدمی تھا۔ وہ شاید میرے ماں باپ تھے۔ میں نے ان کے سوا کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ آدمی صبح گھر سے نکل جاتا اور شام کو واپس آتا تو گھر میں چولھا جلتا تھا۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ ان کی یاد بھی دھندلی سی میرے ذہن میں ہے۔ میں شاید سات یا آٹھ سال کا ہوں گا۔ ایک رات کچھ لوگ ہمارے گھر میں داخل ہوئے انہوں نے آدمی کو فوراً مار دیا مگر عورت کو بہت دیر تک دوسرے طریقے سے قتل کرتے رہے۔ انہوں نے اس کا پورا جسم آزاد کر دیا تھا بس منہ بند کر دیا تھا ورنہ وہ بہت چلاتی۔ وہ جس طرح تڑپ رہی تھی اس سے تو یہی لگ رہا تھا کہ چیخیں اس کے اندر گھٹ رہی ہیں۔ میں ایک کونے میں دبکا ہوا تھر تھر کانپتے ہوئے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

بالآخر انہوں نے عورت کو بھی مار دیا اور میری طرف توجہ دیے بغیر گھر سے نکل گئے۔ ان کے خیال میں نہ تو میں ان کے لیے خطرہ تھا اور نہ اس قابل تھا کہ وہ مجھے قتل کرتے۔ ان کے جانے کے بعد میں بھی گھر سے نکل گیا اور جدھر منہ اٹھا چلتا رہا۔ چل چل کر میرے حواس جواب دے گئے تو میں ڈھیر ہو گیا اور جب میری آنکھ کھلی تو میں اسی جنگل میں تھا۔ عجیب بات ہے مجھے خوف کے بجائے یوں لگا جیسے میں اپنے گھر میں آگیا ہوں اور بالکل محفوظ ہوں۔ شاید میں نے انسانوں کا جو روپ دیکھا تھا اس کے بعد یہ جنگل مجھے محفوظ لگنے لگا تھا۔ مگر یہاں پیٹ بھرنے کا سامان نہیں تھا اس کے لیے انسانوں کے درمیان ہی جانا تھا اور شہر جاتے ہوئے مجھے خوف آرہا تھا۔ کئی دن تک میں جنگل میں دبکا رہا مگر جب بھوک سے پیٹ میں بل پڑنے لگے تو شہر جانا پڑا۔ اس وقت تک معاملہ بھی دب گیا تھا اور اگر پولیس کو میری گمشدگی کا علم تھا تو اب میری تلاش بھی ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔

خوش قسمتی سے مجھے ایک بنگلے سے نہ صرف کھانا مل گیا بلکہ وہاں موجود مہربان عورت نے مجھے کچھ پرانے کپڑے اور پہننے کے لیے جوتے اور چپل بھی دیے۔ اس وقت مجھے ان چیزوں کی اشد ضرورت تھی۔ ساتھ ہی اس نے کہا کہ جب بھوک لگے وہاں آجانا۔ میں نے یہی کیا مجھے جب بھوک لگتی میں اس بنگلے تک چلا جاتا اور نہ صرف اس وقت پیٹ بھر کر کھاتا بلکہ دو تین وقت کا کھانا بھی مل جاتا۔ کئی سال تک میری روزی کا سلسلہ اسی مہربان عورت سے بندھا رہا۔ وہ مجھے رکھنے پر بھی آمادہ تھی مگر انسانوں سے میرا خوف ختم نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے انکار کر دیا۔ پانچ یا چھ سال بعد وہ عورت اچانک وہاں سے چلی گئی اور جب میں پیٹ بھرنے کے لیے بنگلے آیا تو گیٹ پر موجود چوکیدار نے بتایا کہ یہاں دوسرے مالک آگئے ہیں اور وہ ایسے تھے کہ اپنے چوکیدار کو ایک کپ چائے نہیں دیتے تھے۔ مجھے کہاں سے کھانا دیتے۔

اس گھر کے چھوٹنے سے مجھے خاص فرق نہیں پڑا کیونکہ اب وہاں اور بھی بنگلے بن گئے تھے۔ جب میں کسی بنگلے کے سامنے صدا لگاتا تو کہیں نہ کہیں سے پیٹ بھرنے کا سامان ہو جاتا تھا۔ عمر کے لحاظ سے ابھی بچہ تھا مگر تجربات کے لحاظ سے کسی جوان سے کم نہیں تھا۔ مجھے اپنی حفاظت کرنا آگئی تھی۔ ایک بار ایک شیطان صفت آدمی نے جنگل میں مجھے اکیلا پا کر قابو کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ کئی سردیاں گرمیاں جھیلنے کے بعد میں نے یہاں جھونپڑی بنائی تھی۔ یہاں میں موسم سے محفوظ رہتا تھا۔ جو لوگ کھانے کو دیتے تھے وہ بھی کبھی پیسے اور ضرورت کا دوسرا سامان بھی دیتے تھے جس سے میری ضروریات پوری ہوتی رہتی تھیں۔ میری ضروریات بھی بس اتنی ہی تھیں۔ میں نے کبھی نارمل زندگی گزارنے کا نہیں سوچا۔ میں اس زندگی سے خوش تھا۔ میں اسی جنگل میں جوان ہوا اور پھر ادھیڑ عمری آئی اور جب میرے بالوں میں سفیدی غالب آنے لگی تو ایک دن اچانک ہی سڑک کی طرف سے بھاری مشینوں کا ایک کانوائے جنگل میں داخل ہوا۔

مشینوں میں بلڈوزر تھے، کھدائی کرنے والی مشینیں اور درخت کاٹنے والے آرے تھے۔ ان کے ساتھ بہت سے خوش پوش اور صورت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ نظر آنے والے لوگ تھے۔ پہلے انہوں نے بہت احتیاط سے اس پورے علاقے کی زمین کی پیمائش کی اور پھر نشانات لگانے لگے۔ اگلے دن سے ان کے لگائے نشانات کے مطابق کہیں درخت کاٹے

جانے لگے کہیں بلڈوزر زمین ہموار کرنے لگے اور کہیں زمین میں کھدائی کی جانے لگی۔ اتفاق سے ان درختوں کی طرف کوئی نہیں آیا جہاں میری جھونپڑی تھی۔ مگر مجھے فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اگر یہاں کچھ بننے والا تھا تو مجھے یہاں سے لازمی جانا پڑتا۔ میں منتظر تھا کہ ابھی کوئی افسر، کوئی سپروائزر یا کوئی چوکیدار آئے گا اور مجھے حکم دے گا کہ میں اپنا سامان اٹھا کر یہاں سے دفع ہو جاؤں۔

لیکن عجیب بات ہے کسی نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ میری جھونپڑی بھی دیکھ لی گئی تھی۔ اس کے باوجود کسی نے اعتراض نہیں کیا بلکہ ان سے سہولت ہو گئی۔ وہاں مزدوروں کے لیے کینٹین کھل گئی تھی جس میں مزدور مفت میں کھاتے تھے۔ میں وہاں جا نہیں سکتا تھا کیونکہ میرا لباس ہی الگ تھا۔ ایک دن میں بھوکا تھا کیونکہ طبیعت خرابی کی وجہ سے جا نہیں سکا تھا۔ ایسا کئی بار ہوا تھا کہ میں بہت وقت بھوکا رہا اس لیے مجھے عادت سی تھی۔ میں کینٹین کے باہر بیٹھا ہوا مزدوروں کو کھاتے دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے ایک مزدور اٹھا اور میرے لیے پلیٹ میں سالن اور روٹی لے آیا۔ وہ اس نے میرے سامنے رکھ دی۔ ''بابا یہ کھالو۔''

میں نے شکرگزاری سے اسے دیکھا اور کھانے لگا۔ اس کے بعد جب تک کام ہوتا رہا کوئی نہ کوئی مزدور مجھے کینٹین سے کھانے کو لا دیتا تھا۔ کینٹین والا بھی اعتراض نہیں کرتا تھا کیونکہ کھانا باہر سے بن کر آتا تھا اور اسے صرف تقسیم کرنا ہوتا تھا۔ اس دوران میں مجھے یہ علم ہو گیا تھا کہ یہاں ایک پرائیویٹ بلڈر کالونی بسا رہا ہے اور یہ کالونی پوش طبقے کے لیے ہو گی۔ ظاہر ہے اس میں میرے جیسے شخص کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ شاید ابھی یہاں کام چل رہا تھا اور کالونی کی تعمیر میں وقت تھا اس لیے مجھے برداشت کیا جا رہا تھا۔ مگر جب یہاں لوگ آکر بستے تو ان کے درمیان میرا وجود ایسا ہی ہوتا جیسے صاف ستھرے جسم پر کوئی گندہ زخم۔ مجھے یہاں سے نکال دیا جاتا۔ میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھا اور میں نے متبادل جگہ بھی دیکھ لی تھی۔ یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ایسا ہی ایک پہاڑی جنگل تھا۔

رفتہ رفتہ کالونی کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ اس کے گرد پتھروں اور اینٹوں سے بنی چار دیواری بنائی گئی تھی۔ مگر زمین کی ساخت کو نہیں چھیڑا گیا تھا۔ اس دیوار کی وجہ سے کالونی محفوظ ہو گئی تھی۔ کالونی کی پلاننگ یقیناً بڑے پیمانے پر ہوئی تھی۔ اس میں ایک پارک تھا اور قدرتی جنگل بھی چھوڑا گیا تھا۔ اس کے بعد یہاں تعمیراتی کام شروع ہوا۔ چھوٹے دو منزلہ کاٹیج تھے۔ پھر چھوٹے بنگلے، ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ اور درمیانے درجے کے بنگلوز کے ساتھ یہاں کمرشل ایریا بھی بنایا جا رہا تھا۔ کام بہت تیزی سے شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے ہی بنیادوں سے تعمیر بلند ہونے لگی۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ایک دن انچارج میری جھونپڑی تک آیا اور اس نے مجھے باہر بلا کر نرمی سے کہا۔

''بابا تمہیں اپنی جھونپڑی یہاں سے ہٹانا ہو گی۔ یہ پورا علاقہ کمپنی کی ملکیت ہے اور یہاں کمپنی کی مرضی کے بغیر کوئی بھی جھونپڑی بنا کر نہیں رہ سکتا۔''

میں پہلے ہی یہاں سے جانے کا سوچ چکا تھا۔ اس لیے مزاحمت نہیں کی اور انچارج سے وعدہ کیا کہ چند دن میں اپنی جھونپڑی یہاں سے ہٹا دوں گا۔ میں اس جنگل میں پہنچا جسے میں نے نئے گھر کے طور پر چنا تھا۔ مگر جب میں وہاں گیا تو مجھے وحشت سی ہوئی۔ حالانکہ یہ ویسا ہی جنگل تھا، ویسی ہی پہاڑی، ویسے ہی درخت، نالے اور جھاڑیاں تھیں جو ختم ہو جانے والے جنگل میں تھیں۔ اس کے باوجود مجھے لگا جیسے میں گھر سے کسی ویرانے میں آ گیا ہوں۔ حالانکہ میں تو ہمیشہ سے ویرانے میں رہا تھا۔ اس کے باوجود میرا اس جگہ دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں جھونپڑی بنانے کے ارادے سے آیا تھا مگر گھبرا کر بنا کچھ کیے واپس آ گیا۔ دوسرے دن پھر گیا اور پھر وہی کیفیت ہوئی اور میں کچھ کیے بغیر ہی آ گیا۔ اب میرے پاس وقت نہیں تھا اس لیے میں نے اپنی جھونپڑی اپنے ہاتھوں سے مسمار کرنا شروع کر دی۔ میں نے اسے برسوں بنایا اور سنوارا تھا مگر جب گرانے پر آیا تو صرف ایک دن لگا تھا۔ سامان میرے پاس معمولی سا تھا جو سارے کا سارا ایک بورے میں آ گیا۔ میں وہ بورا لے کر وہاں سے نکل رہا تھا کہ انچارج نے مجھے دیکھ لیا۔ اس نے آواز دے کر روکا اور پھر بولا۔

''بابا کہاں جا رہے ہو؟''

میں نے ادب سے کہا۔ ''صاحب آپ نے ہی تو کہا تھا کہ جھونپڑا گرا دوں۔''

''بابا جھونپڑا گرانے کو کہا تھا۔ یہاں سے جانے کو نہیں۔ تم بے شک یہاں رہو۔ کہیں بھی سو جایا کرو۔ کھانا تم کو کینٹین سے ملتا رہے گا جب تک کینٹین ہے۔''

میں خوش ہو گیا۔ ''شکریہ صاحب۔''

''مجھے افسوس ہے مگر اوپر والوں کا حکم ہے اس لیے جھونپڑی ختم کرنا پڑی۔ اگر بارش ہو تو تم ہمارے کیمپ میں آ جایا کرو۔''

وہاں مزدوروں کے لیے کیمپ لگا ہوا تھا۔ یہ ٹینٹ اور کینوس کا بنا ہوا کیمپ تھا۔ یہاں مزدور اور کام کرنے والا دوسرا عملہ رہتا تھا۔ بہت سارے آتے اور کام کر کے چلے جاتے تھے مگر کچھ عملہ مستقل یہیں رہتا تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ جھونپڑی نہیں رہی تھی مگر درختوں تلے آرام کر لیتا تھا۔ بارش ہوتی تو میں کیمپ میں چلا جاتا۔ اب وہاں کے لوگ مجھ سے مانوس ہو گئے تھے۔ مکانوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ پارک بھی بن رہا تھا اور اس کی بنچیں بنیں تو مجھے سونے کے لیے جگہ مل گئی۔ درمیان میں کچھ بنچیں شیڈ تلے بنائی گئی تھیں وہاں میں بارش سے بھی محفوظ رہتا تھا۔ دو سال میں کالونی مکمل ہو گئی اور بکنگ کرانے والوں کو قبضہ دیا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کمرشل ایریا بھی کھل گیا۔ ہائی وے پاس تھی اور ہر طرح کی ٹرانسپورٹ چلتی تھی۔ پانی، بجلی اور گیس کی سہولت تعمیر کے دوران ہی آ گئی تھی۔ اس لیے کالونی آباد ہونے میں زیادہ دیر بھی نہیں لگی۔

تعمیر مکمل ہونے کے بعد کالونی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ صاف شفاف چمکتی سڑکیں اور اعلیٰ درجے کے رنگین پتھر سے بنے ہوئے فٹ پاتھ تھے۔ بہترین قسم کی اسٹریٹ لائٹس اور پارک لائٹس کی وجہ سے وہاں رات میں بھی دن کا سماں ہونے لگا تھا۔

کالونی کی تکمیل کے بعد کمپنی کی طرف سے اس کے لیے سیکیورٹی گارڈ رکھے گئے تھے۔ وہ سب مجھ سے مانوس تھے اور میرا خیال رکھتے تھے۔ انہیں ضرورت ہوتی تو میں دوڑ کر ان کے کام کرتا تھا۔ بعض دفعہ ان کی جگہ ڈیوٹی بھی دیتا تھا۔ مگر ایسا کم ہوتا تھا۔ پھر لوگ آنا شروع ہوئے۔ یہاں آنے والی ساری کی فیملیاں تھیں۔ میری کوشش ہوتی کہ ان لوگوں کی نظروں میں کم سے کم آؤں تاکہ کوئی مجھ پر اعتراض نہ کر سکے۔ میرا وجود کسی کو کھٹکے نہیں۔ خوش قسمتی سے میں کامیاب رہا اور رفتہ رفتہ پوری کالونی آباد ہو گئی مگر کسی نے میری موجودگی پر اعتراض نہیں کیا یا اگر کیا تو خود تک محدود رکھا اسے کالونی کا مسئلہ نہیں بنایا۔ میری دبی ہوئی موجودگی بھی میرے کام آئی۔ میں ان جگہوں پر جانے سے گریز کرتا جہاں لوگ اور خاص طور سے عورتیں اور بچے ہوتے تھے۔ کالونی بسنے کے بعد میں رات بارہ بجے سے پہلے پارک نہیں جاتا تھا۔ اس طرح کمرشل ایریا سے دور رہتا تھا۔ بھوک لگنے کی صورت میں بھی کسی کے گھر جانے سے گریز کرتا تھا۔ میرا کھانا پینا کالونی کے سیکیورٹی گارڈ اور دوسرے کاموں کے لیے مخصوص عملے کے ساتھ تھا۔

اس کے باوجود رفتہ رفتہ کچھ لوگوں سے میری واقفیت ہو گئی اور وہ میرا خیال رکھنے لگے تھے۔ ان میں ایک رافعہ صبیح تھیں۔ ان کے شوہر صبیح الدین ایک اعلیٰ درجے کے سرکاری افسر تھے۔ دونوں میاں بیوی اکیلے تھے کیونکہ کوئی بچہ نہیں تھا۔ رافعہ تقریباً چالیس برس کی خوب صورت اور باوقار عورت تھیں۔ پھر مدثر علی شاہ تھے۔ مدثر صاحب تقریباً پچاس برس کے سوبر آدمی تھے۔ انہوں نے دو بار شادی کی اور دونوں بار انہیں ناکامی ہوئی۔ ان کے دو بیٹے تھے جو اپنی ماؤں کے پاس ہوتے تھے۔ وہ بھی اکیلے آدمی تھے۔ جب میں صبح پارک سے اپنا بستر اٹھا کر رخصت ہو رہا ہوتا تو ان سے سامنا ہوتا تھا اور وہ میری حیثیت سے قطع نظر مجھ سے سلام دعا کرتے تھے۔ پھر ایان اسماعیل تھا۔ ایان نوجوان تھا اور اس کے سارے شوق نوجوانوں والے تھے۔ میوزک، ہلا گلا، لڑکیاں اور تیز رفتار ڈرائیونگ۔ بہ ظاہر اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن وہ مجھ سے اچھی طرح پیش آتا تھا اور میرا خیال رکھتا تھا۔

سبحان احمد جن کا کمرشل ایریا میں ریسٹوران تھا۔ شبیر عثمان جو کسی قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اعلیٰ افسر تھے۔ بوتیک چلانے والی مسز ناہید اصغر اور اسکول پرنسپل تہمینہ حیات۔ یہ سب مجھ سے واقف ہو گئے تھے اور میرا خیال رکھتے تھے۔ سب سے بڑھ کر وہ مجھ سے عزت سے پیش آتے تھے۔ میری غربت کے باوجود مجھے انسان سمجھتے تھے۔ کالونی کو آباد ہونے میں بھی مختصر وقت لگا تھا۔ دو سال میں یہاں تقریباً سارے رہائشی یونٹ آباد ہو چکے تھے۔ آبادی ہوتی تو یہاں صبح سے شام تک چہل پہل ہونے لگی تھی مگر یہ چہل پہل ایک خاص حد تک تھی۔ یہاں بھی آبادی کا ہجوم یا گھٹا ہوا ماحول محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس بہت پُرسکون اور پُرامن ماحول ہوتا تھا۔ یہاں آنے والے سارے ہی لوگ بہت مہذب اور دوسروں کا خیال کرنے والے تھے۔ وہ خود بھی سکون سے رہتے تھے اور دوسروں کو بھی سکون سے رہنے دیتے تھے۔

☆☆☆

میں نے لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے نالے میں ایک جگہ اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ یہ قدرتی غار تھا جسے میں نے اپنے لحاظ سے مزید بہتر کر لیا تھا۔ یہاں عام لوگ نہیں آتے تھے۔ نالے میں اترنا ویسے بھی آسان کام نہیں تھا۔ دن میں عام طور سے میں صرف کھانے کے لیے باہر نکلتا تھا۔ ورنہ سارا وقت غار میں رہتا تھا۔ ہاں شام ہوتے ہی میں نکل کر جنگل میں آ جاتا

اور یہاں سے آس پاس کی رونقیں اور لوگوں کی سرگرمیاں دیکھتا تھا۔ جنگل کسی قدر اونچی جگہ پر تھا اور یہاں سے تقریباً پوری کالونی کا منظر بہت صاف دکھائی دیتا تھا۔ نالے کی جگہ بھی میں نے اونچائی پر چنی تھی کیونکہ تیز ترین بارش میں بھی اس جگہ زیادہ پانی نہیں آتا تھا جبکہ نچلے حصوں میں پانی بعض اوقات ریلنگ سے باہر فٹ پاتھ تک آجاتا تھا۔ میرے ٹھکانے کے ساتھ جنگل تھا اور اونچائی کی وجہ سے یہاں بھی کم ہی لوگ آتے تھے۔ اس کے بعد بنگلوز تھے اور پھر پارک تھا۔ اتفاق سے میں جتنے افراد سے قریب تھا وہ سب ان بنگلوز میں رہتے تھے۔

انسان جب اکیلا ہو اور اس کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہو اور اسے اپنا ذہن اور جسم کہیں استعمال نہ کرنا ہو تو اس کے اندر کچھ حسیں بیدار ہو جاتی ہیں اور اس کے ذہن کے اندر کچھ کھڑکیاں سی کھل جاتی ہیں۔ عام لوگوں میں یہ حسیں خوابیدہ اور کھڑکیاں بند ہوتی ہیں کیونکہ وہ زندگی کی مصروفیات میں ان کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے ہیں۔ جب تک میں جنگل میں تھا، مجھے پتا نہیں تھا کہ میری کچھ حسیں بیدار ہو گئی ہیں اور ذہن کی کچھ کھڑکیاں کھل گئی ہیں۔ پھر جب اس ویرانے میں لوگ آکر آباد ہوئے تو مجھے ان چیزوں کا احساس ہونے لگا۔ میں جس کے پاس جاتا اور جس سے بات کرتا مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو جاتا۔ یہ بہت کچھ اس کی ظاہری شخصیت سے متضاد ہوتا تھا۔ یا کم سے کم مختلف ضرور ہوتا تھا۔ اس کے باوجود یہ اس کی زندگی کا بہت چھوٹا سا حصہ ہوتا تھا۔ ایسا حصہ جسے ہم بہت آسانی سے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ مگر لوگوں کو اس کا علم ہو جائے تو وہ اسے نظر انداز نہیں کرتے ہیں بلکہ اس شخص کی پوری زندگی پر محیط کر دیتے ہیں۔

یہ خالقِ کائنات کا احسان ہے کہ اس نے مجھے اس معاشرے سے الگ رکھا جس کے لوگوں سے رویے بہ ظاہر انسانوں والے ہیں لیکن ان میں انسانیت کی شدید کمی ہو چکی ہے۔ یہ کمی اتنی زیادہ ہے کہ انہیں اپنے روزمرہ کے معمولات کو اچھے طریقے سے نمٹانے کے لیے ایک قسم کی اجتماعی منافقت اور اداکاری کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ شاید اس لیے میں نے لوگوں کے بارے میں "کچھ" جان لیا تو بھی میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میرے نزدیک ان کے ظاہری رویے کی اہمیت تھی جو وہ میرے ساتھ برتتے تھے۔ میں ان کی معمولی سی عطا پر بھی ان کا احسان مند ہوتا تھا اور ہمیشہ ان کے آگے جھکا رہتا تھا۔ میری پوری کوشش ہوتی تھی کہ میری ذات سے انہیں کوئی تکلیف یا ناگواری نہ ہو۔

اس کے لیے میں خود کو صاف ستھرا رکھنے لگا تھا۔ میں باقاعدگی سے ہر دوسرے تیسرے دن نہاتا، اپنے کپڑے صاف رکھتا اور اپنے سر و داڑھی کے بال سنوار کر رکھتا۔ مجھے کوئی غلط چیز کھانے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے میرے تمام دانت سلامت تھے اور میں انہیں بھی صاف رکھتا۔ میں جہاں ہوتا اس جگہ کو بھی صاف رکھنے کی کوشش کرتا۔ اگر مجھے کہیں کچرا نظر آتا تو میں اسے اٹھا کر آس پاس موجود ڈسٹ بن میں ڈال دیتا تھا۔ شاید میری یہی کاوشیں تھیں جس کی وجہ سے میں اس پوش کالونی میں رہنے میں کامیاب رہا۔ اس کے باوجود میں یہاں کے لوگوں کا احسان مند تھا کہ انہوں نے مجھے یہاں سے نکالنے کی مہم نہیں چلائی۔ بہت کم ایسا ہوا کہ کسی نے مجھے جھڑکا یا اپنے انداز سے ناگواری کا احساس دلایا۔ زیادہ تر مجھ سے اچھی طرح ملتے تھے۔ البتہ بچے شروع میں مجھ سے ڈرتے تھے اور اگر کسی بچے سے سامنا ہوتا تو وہ چوکنا ہو جاتا تھا۔ اس لیے میں خود بھی بچوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا اور اگر مجھے کہیں کوئی بچہ یا بچے نظر آجاتے تو میں پلٹ جاتا۔ رفتہ رفتہ بچے بھی مجھ سے مانوس ہو گئے مگر میں نے ان کے بارے میں اپنی روش برقرار رکھی تھی۔

شام سے رات تک میں اسی جنگل میں رہتا اور لوگوں کو دیکھتا رہتا۔ شاید جنگل میں رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں بہت تیز تھیں اور مجھے دور تک بالکل صاف دکھائی دیتا تھا۔ میں ہلکی سی روشنی میں بھی دیکھ لیتا تھا۔ اوپر سے مجھے گلیاں اور مکانات پوری جزئیات کے ساتھ نظر آتے تھے۔ بہت سے گھر اس ساخت کے تھے کہ میں اندر تک دیکھ سکتا تھا اور مجھے علم ہوتا رہتا کہ گھروں میں کیا ہو رہا ہے۔ میں سب دیکھتا اور پھر اسے ذہن سے جھٹک دیتا تھا۔

دس بجے میں گلیوں میں نکل آتا مگر مرکزی سڑکوں پر جانے سے گریز کرتا۔ کیونکہ ٹریفک رات بارہ بجے تک ہوتا تھا۔ بارہ بجے کے قریب میں سبحان احمد کے ریستوران جاتا تھا۔ وہ بارہ بجے بند کر دیتا تھا اور اس وقت کچن میں بچ جانے والے کھانے میں سے مجھے میرا حصہ مل جاتا۔ یہی میرا ڈنر ہوتا اور جو بچ جاتا وہ صبح ناشتے کے کام آتا۔ دوپہر میں کھانا مجھے کسی بنگلے سے مل جاتا تھا۔ اگر رافعہ کھانا دیتی تو ساتھ میں کاغذی مگ میں چائے بھی دیتی تھی۔ کسی دوسرے بنگلے سے یہ عنایت نہیں ہوتی تھی۔ میں سبحان احمد کے ریستوران کے باہر ہی ڈنر کرتا اور پھر کچھ دیر کمرشل ایریا میں سرگشت کرکے پارک چلا جاتا۔ میں سوتا کم تھا بس لیٹا رہتا تھا۔ اس دن جب میں سبحان احمد کے ریستوران پہنچا تو اس کے اوپر والے فلور پر جہاں مختلف قسم کے دفاتر تھے۔ ان میں زیادہ تر ڈاکٹر تھے اور اسٹیٹ ایجنٹس تھے۔ وہاں مجھے ایک نیا بورڈ دکھائی دیا۔ میں نے سبحان احمد سے پوچھا۔

"یہاں کون آیا ہے۔"

اس نے بورڈ دیکھا۔ "ڈاکٹر شایان لودھی، لیکن یہ نفسیات کا ڈاکٹر ہے۔"

پڑھے لکھے لوگوں میں رہ کر میں بہت سی انگریزی اور اردو زبان کی اصطلاحات سمجھنے لگا تھا۔ "وہ جو دماغ کا علاج کرتا ہے؟"

"ہاں، ابھی اس نے کلینک کھولا ہے۔"

مجھے ڈاکٹر شایان سے دلچسپی نہیں تھی۔ بس تجسس تھا کہ نیا آنے والا کون ہے۔ میں نے کھانا کھایا۔ بچا ہوا پیک کیا اور سبحان احمد کا شکریہ ادا کر کے پارک کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سے اوپر موجود بنگلے بڑے تھے اور ان میں کارپورچ تھے اس لیے وہاں کوئی گاڑی باہر نہیں رکھتا تھا سوائے ان لوگوں کے جن کے پاس ایک سے زیادہ گاڑیاں تھیں اور وہ تمام گاڑیاں اندر نہیں رکھ سکتے تھے۔ ایک دو سے زیادہ انہیں باہر پارک کرنا پڑتی تھیں۔ ان تمام گاڑیوں کو میں پہچانتا تھا جو رات کے وقت باہر کھڑی ہوتی تھیں۔ اس لیے جب ایک سیاہ بڑی گاڑی رافعہ، صبیح اور مدثر صاحب والی گلی میں نظر آئی تو میں چونکا تھا۔ اس سے پہلے کبھی اس گاڑی کو نہیں دیکھا تھا۔ گاڑی رافعہ کے گھر سے کچھ ہی دور پارک تھی۔ شاید کوئی کسی کے ہاں مہمان آیا تھا۔

مگر چند دن بعد میں نے وہی گاڑی سبحان احمد کے ریستوران کے سامنے سڑک کے دوسری طرف پارک دیکھی۔ سبحان احمد کے ریستوران میں مال لانے والے کارٹن جمع ہو گئے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ انہیں کھول کر ان کے بنڈل بنا لیے جائیں۔ تاکہ انہیں آسانی سے ڈسٹ بن میں ڈالا جا سکے۔ کھلی صورت میں یہ ڈسٹ بن میں نہیں سماتے اور باہر رکھنے پڑتے۔ یہاں کوئی کباڑیا نہیں آتا اور یہ سارا کچرا میونسپلٹی والے لے کر جاتے تھے۔ یہاں کچرا چننے والوں اور کباڑیوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی کہ وہ کالونی کو گندہ کرتے تھے۔ سبحان احمد نے مجھ سے کہا۔ "بابا آ کر ان ڈبوں کو کھول کر بنڈل بنا دو تاکہ میں آسانی سے ٹھکانے لگا دوں۔"

میں اسی کام کے لیے دن میں آیا تھا۔ تب میں نے گاڑی دیکھی اور جب میں اپنا کام کر کے واپس جا رہا تھا تو میں نے طویل قامت اور خوش پوش آدمی کو اس سیاہ گاڑی میں بیٹھتے دیکھا۔ اس نے عینک لگائی ہوئی تھی اور وہ چہرے

سے بہت پڑھا لکھا اور مہذب آدمی لگ رہا تھا۔ اس نے ایک بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بنگلوز کی طرف جائے گا مگر سیاہ گاڑی گھوم کر کالونی کے خارجی راستے کی طرف چلی گئی۔ یعنی وہ آدمی کہیں باہر سے آیا تھا۔ اس وقت بھی میں نے توجہ نہیں دی تھی۔ کئی دن بعد میں جب پارک میں لیٹا ہوا تھا تو کوئی گاڑی باہر سے آئی اور پارک کے ساتھ سے ہوتی ہوئی بنگلوز کی طرف جانے لگی۔ میں نے ایسے ہی دیکھا اور سیاہ گاڑی دیکھ کر چونکا۔ وہ اسی گلی میں داخل ہوئی تھی جہاں میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا۔

میں اٹھ کر تیزی سے پارک کے اوپری سرے کی طرف بڑھا۔ گیٹ سے نکل کر میں گلی کے سرے تک آیا تو میں نے سیاہ گاڑی کو اسی جگہ رکتے دیکھا جہاں وہ کئی دن پہلے کھڑی تھی۔ اس سے اتر کر وہی طویل قامت آدمی صبیح الدین کے گھر کی طرف بڑھا۔ اس وقت وہ خالی ہاتھ تھا۔ اس نے کال بیل بجانے کے بجائے گیٹ کے پاس رک کر آس پاس دیکھا اور پھر چھوٹا دروازہ دھکیل کر اندر چلا گیا۔ میں حیران ہوا کہ رات کے ایک بجے گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میں دبے قدموں گیٹ تک آیا تو اندر پورچ میں تاریکی تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ اندر صبیح الدین صاحب کی سرکاری گاڑی موجود نہیں تھی۔ وہ اسی پر دفتر یا کہیں اور آتے جاتے تھے۔ ہاں رافعہ صبیح کی چھوٹی کار کھڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کم سے کم صبیح الدین گھر پر نہیں تھے اور امکان تھا کہ شاید رافعہ بھی وہاں نہیں تھی۔ تب یہ شخص یہاں کیا کرنے آیا تھا اور اس کے لیے گیٹ کس نے کھلا چھوڑا تھا۔

میں پیچھے آیا اور پھر کچھ سوچ کر اوپر والے جنگل کی طرف بڑھا۔ یہاں سے صبیح الدین کا بنگلا صاف دکھائی دیتا تھا خاص طور سے اس کا اوپر والا فلور جس کے دونوں بیڈ رومز کی کھڑکیاں اسی طرف کھلتی تھیں۔ میں نے نزدیک ترین جگہ رک کر دیکھا تو ایک بیڈ روم کی کھڑکی تاریک تھی مگر دوسری میں روشنی تھی۔ کھڑکی کھلی تھی اور سفید رنگ کا پردہ اس پر موجود تھا۔ اچانک پردے پر ایک نسوانی سایہ آیا۔ اس کے پیچھے ایک مردانہ سایہ نمودار ہوا۔ اس کی طویل قامت اور عینک سے میں نے اسے پہچان لیا، وہ وہی سیاہ گاڑی والا تھا۔ عورت یقیناً رافعہ تھی۔ اگرچہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا مگر اس کے سوا یہاں اور کون عورت ہو سکتی تھی۔ مرد نے عورت کا بازو پکڑا اور اسے تقریباً کھینچ کر کھڑکی کے سامنے سے لے گیا۔ میں دم بخود سا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ مگر میں صرف سوچ سکتا تھا، کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ میں کیا کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ میرے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ بہت سی چیزیں دیکھتے ہیں مگر وہ خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ میں بھی خاموش ہو کر واپس آ گیا۔ اگلی صبح روشنی ہونے سے پہلے سیاہ گاڑی گلی سے نکلی اور کالونی سے باہر چلی گئی۔ اس دن میں نالے میں واقع اپنی پناہ گاہ میں جانے کے بجائے سارا دن جنگل میں ایسی جگہ رہا جہاں سے مجھے کالونی کا گیٹ نظر آ رہا تھا۔

میری نگرانی رائگاں نہیں گئی۔ چار بجے کے قریب سیاہ گاڑی کالونی میں داخل ہوئی اور کمرشل ایریا کی طرف جانے لگی۔ میں نے جہاں تک ممکن ہوا اسے اوپر سے دیکھا مگر ایک جگہ پہنچ کر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ درمیان میں اونچی جگہوں پر مکانات اور بلند درخت تھے۔ میں تیزی سے نیچے روانہ ہوا۔ مختصر راستہ اختیار کرتے ہوئے میں کمرشل ایریا پہنچا تو سیاہ گاڑی ٹھیک اسی جگہ موجود تھی۔ طویل قامت آدمی کہیں نظر نہیں آیا۔ میں کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے ایک مناسب جگہ سے سیاہ گاڑی کی نگرانی کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ طویل قامت آس پاس کہیں سے برآمد ہو گا۔ تب میں نے ایان کو ریستوران کے اوپر والے فلور کی سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ وہ اتنا پریشان تھا اور اس کی پریشانی صورت سے ہی نظر آ رہی تھی۔

اس نے بے دھیانی میں سڑک کراس کی اور ایک طرف سے آتے ڈرائیور نے خود بریک مار کر اسے بچایا۔ مگر اس نے گاڑی کو دیکھا ہی نہیں اور اپنی نئے ماڈل کی اسپورٹس کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا، پھر جس طرح سے کار کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھایا صاف لگ رہا تھا کہ اس کا ذہن بہت زیادہ دباؤ میں تھا۔ ورنہ میں نے اسے کالونی میں کبھی اس طرح سے گاڑی چلاتے نہیں دیکھا تھا۔ تیز رفتاری کا سارا شوق وہ ہائی وے پر پورا کرتا تھا۔ اس نے کار کو کالونی سے باہر کی طرف موڑ دیا اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ باہر جا چکا تھا۔ بھوک رفتہ رفتہ میری برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ میرے پاس کچھ رقم تھی اور میں بیکری سے کچھ لے کر کھا سکتا تھا مگر میں اس جگہ سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ سیاہ گاڑی والا کہیں چلا نہ جائے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں سے آتا ہے۔

ٹھیک چھ بجے وہ ریستوران کے اوپری فلور سے نمودار ہوا۔ آج بھی اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا اور وہ چابیاں گھماتا ہوا سیاہ گاڑی تک آیا۔ اس میں بیٹھا اور کالونی سے باہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ریستوران کے اوپر جتنے بھی آفس

والے تھے میں ان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ پورے دو گھنٹے اوپر رہا تھا۔ اب بھوک برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ میں نے بیکری سے سموسے لے کر پیٹ کی آگ کو عارضی طور پر بجھایا۔ اس بار بھی میں نے کسی سے پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ میرا تجربہ ہے کہ جو بات صبر سے کام لے کر علم میں آتی ہے وہ زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ میں واپس اوپر آیا۔ مسلسل نگرانی اور اوپر نیچے ہونے سے میرا بوڑھا جسم تھک گیا تھا۔ اس لیے میں شام تک آرام کرتا رہا۔

پھر سائرن کی آواز نے مجھے چونکایا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو ایک ایمبولینس کالونی میں داخل ہو رہی تھی۔ پارک کے نزدیک آ کر وہ بنگلوز کی طرف مڑی اور پھر گلی نمبر تین میں داخل ہوئی۔ ایمبولینس ایان اسماعیل کے گھر کے سامنے رکی۔ وہاں لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ میرا دل دھڑکا۔ ضرور کچھ ہوا تھا۔ میں نیچے آیا اور گلی میں داخل ہوا تو ایمبولینس سے کفن میں پیک ایک لاش اتاری جا رہی تھی۔ گھر کے اندر سے عورتوں کے رونے کی آواز آ رہی تھی اور باہر ایان کا باپ اسماعیل پچھاڑیں کھا رہا تھا۔ لوگ اسے سنبھال رہے تھے اور دلاسا دے رہے تھے۔ لاش ایان کی تھی۔ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اس کی کار بہت تیز رفتاری سے ایک ٹرک سے جا ٹکرائی جب وہ ایک گاڑی کو اوورٹیک کر رہی تھی اور ٹرک سامنے سے آ رہا تھا۔ تصادم اتنا شدید تھا کہ وہ موقع پر ہی ختم ہو گیا۔

ایان مقبول لڑکا تھا اور سب ہی اس کی ناگہانی موت پر افسردہ تھے۔ خود مجھے بہت دکھ تھا۔ مگر خدا کی مرضی کے آگے کیا کیا جا سکتا تھا۔ ایان کا ایک بڑا بھائی ملک سے باہر تھا۔ اس کی دو بہنیں دوسرے شہروں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ ان کے آنے میں وقت لگا اس لیے ایان کی تدفین دوسرے دن شام کے بعد ہوئی تھی۔ اسے کالونی کے نزدیک ہی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ میں بھی اس کی تدفین میں شریک تھا۔ اس وجہ سے میں سیاہ گاڑی والے پر نظر نہیں رکھ سکا۔ ایان کی تدفین کے دوسرے دن میں شام چار سے پہلے نیچے کمرشل ایریا میں پہنچ گیا۔ سیاہ گاڑی ٹھیک چار بجے وہاں پہنچی اور طویل قامت عینک والا شخص اس سے اتر کر ریستوران کے اوپر والے فلور کی طرف بڑھا۔ میں اس کے پیچھے تھا اور میں چونکا جب وہ اس آفس میں گیا جس پر ڈاکٹر شایان کے کلینک کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ میں نے ایک اسٹیٹ ایجنسی کے لڑکے سے تصدیق کی، وہ ڈاکٹر شایان ہی تھا۔

اب ڈاکٹر شایان کا رافعہ یا اس کے گھر میں موجود کسی اور عورت سے کیا تعلق تھا جو وہ اتنی رات گئے وہاں موجود تھا۔ میں اس بات پر غور کرتا ہوا نیچے آیا۔ ڈاکٹر شایان بہ ظاہر نرم مزاج اور خوبرو شخص تھا۔ مگر میں نے اس کا باطن بھانپ لیا تھا۔ وہ نہایت مفاد پرست اور سفاک شخص تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو دوسروں کو اذیت دے کر خوش ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کا رافعہ (اس کا بہت امکان تھا کہ پردے پر نظر آنے والی عورت رافعہ ہی تھی) سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ رافعہ میں بھی انسانی کمزوریاں تھیں مگر بہ حیثیت انسان وہ بہت اچھی تھی۔ ہمدرد اور دوسروں کا خیال کرنے والی۔ وہ کسی صورت ڈاکٹر شایان جیسے شخص کو پسند نہیں کر سکتی تھی۔ جب میں نیچے اتر رہا تھا تو میں نے اسماعیل صاحب کو اوپری فلور پر جاتے دیکھا۔

اس وقت میں نے توجہ نہیں دی تھی۔ میں نیچے آ کر اسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے میں پہلے بھی سیاہ گاڑی کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسماعیل صاحب اوپر سے اترے تو ان کی تقریباً وہی حالت تھی جو دو دن پہلے ایان کی وہاں سے اترتے ہوئے تھی۔ تب میں چونکا۔ کیا ایان اور اسماعیل صاحب کا بھی ڈاکٹر شایان سے کوئی تعلق تھا۔ اسماعیل صاحب اپنی گاڑی میں بیٹھے اور جب انہوں نے گاڑی چلائی تو وہ ان سے ٹھیک سے چلائی نہیں جا رہی تھی۔ اگر سڑک پر ذرا بھی ٹریفک ہوتا تو وہ کہیں نہ کہیں حادثہ کر بیٹھتے۔ میرا خیال تھا کہ اسماعیل صاحب بنگلوز کی طرف جائیں گے جہاں ان کا گھر تھا۔ مگر وہ کمرشل اسٹریٹ پر ہی تھوڑا آگے گئے اور کالونی کے واحد بینک کے سامنے رکے۔ بینک کا وقت ظاہر ہے ختم ہو چکا تھا مگر اے ٹی ایم چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ اسماعیل صاحب اے ٹی ایم میں گئے۔

وہ دس منٹ بعد اندر سے نکلے اور گاڑی میں بیٹھ کر اسی طرف واپس آئے۔ جب وہ گاڑی سے اتر کر ریستوران کے اوپری فلور کی طرف بڑھے تو میں ان کے پیچھے تھا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ ڈاکٹر شایان کے آفس میں گئے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اتفاق سے وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے خاموشی ہینڈل گھما کر ذرا سا دروازہ کھول لیا۔ آفس دو حصوں پر مشتمل تھا ایک آنے والوں کے لیے تھا اور اس سے آگے والا حصہ جو لکڑی سے پارٹیشن کیا گیا تھا ڈاکٹر شایان کا تھا اور اسماعیل صاحب اسی میں گئے تھے۔ میں اندر جا نہیں سکتا تھا۔ اگر کوئی مجھے دیکھ لیتا تو میرے پاس یہاں اپنی موجودگی کا کوئی جواز نہیں تھا اس لیے واپس آ گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا ایان بھی ڈاکٹر شایان کے پاس آیا تھا۔ کیا اسے کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا؟ ایسا ہو سکتا تھا کہ آج کل ہر انسان کے ساتھ نفسیاتی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

برائی

شیخ سعدیؒ کے پاس ایک شخص غصے میں بھرا ہوا آیا اور کہنے لگا۔
''چوراہے پہ کھڑا ہوا ایک آدمی آپ کو گالیاں دے رہا ہے۔''
اس پر شیخ سعدی نے جواب دیا۔ ''اس نے فضا میں تیر چلایا اور تم نے لا کر میرے سینے میں مار دیا۔''
کسی کی برائی سن کر اس تک پہنچانا اس سے بڑی برائی ہے۔

مسائل ہوتے ہیں۔ بہ ظاہر ایان لاابالی نوجوان تھا مگر میں جانتا تھا کہ اندر سے ایک حساس لڑکا تھا۔

مسئلہ وہی تھا کہ میں کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔ میری کوئی حیثیت ہی نہیں تھی کہ میں کسی سے کوئی سوال کرتا یا اس کے کسی معاملے میں دخل دیتا۔ کچھ دیر بعد اسماعیل صاحب اوپر سے نیچے آئے۔ وہ گاڑی میں بیٹھے اور کچھ دیر اسٹیئرنگ پر ٹکا کر بیٹھے رہے جیسے اندر سے ٹوٹ گئے ہوں اور خود کو جمع کر رہے ہوں۔ خاصی دیر بعد انہوں نے کار اسٹارٹ کی اور روانہ ہوئے، اس بار ان کا رخ گھر کی طرف تھا۔ وہ ڈاکٹر شایان کے پاس کیوں آئے تھے اور اتنے ٹوٹے ہوئے کیوں لگ رہے تھے؟ بہرحال جو بھی تھا اس میں ڈاکٹر شایان کہیں نہ کہیں ملوث تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس کی نگرانی جاری رکھوں گا۔ یہ کام میرے لیے مشکل نہیں تھا کیونکہ ڈاکٹر دن میں اپنے آفس آتا تھا یا پھر رات میں صبیح الدین کے گھر آتا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اس وقت آیا تھا جب صبیح الدین گھر پر نہیں تھے۔ وہ سرکاری افسر تھے اور انہیں اکثر سرکاری کاموں سے دوسرے شہروں میں جانا پڑتا تھا اور وہ ایک دو یا زیادہ دن بھی گھر سے غیر حاضر ہوتے تھے۔

رات کے وقت میں پارک میں ہوتا تھا اور آنے والی کوئی گاڑی میری نظروں سے بچ کر بنگلوز کی طرف نہیں جا سکتی تھی۔ اگر ڈاکٹر شایان صبیح الدین کے گھر آتا تو مجھے معلوم ہو جاتا۔ وہ اگلی رات بھی صبیح الدین کے گھر پہنچا۔ وقت وہی تھا یعنی رات کے ایک بجے اور اس بار بھی گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر شایان خاموشی سے اندر چلا گیا۔ وہ پہلے آیا تب بھی پورچ اور گیٹ کی روشنیاں بند تھیں اور آج بھی روشنیاں بند تھیں۔ ایسا بندوبست اندر کا کوئی فرد کر سکتا تھا۔ کھڑکیوں کی روشنی دیکھنے کے لیے مجھے اوپر جنگل میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ رافعہ کے بیڈ روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر شایان وہیں تھا۔ اگرچہ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے ڈاکٹر شایان پر غصہ آنے لگا۔ جب آدمی کو کسی پر غصہ آتا ہے تو وہ اسے نکالنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ دریافت کر لیتا ہے۔ میں واپس پارک آیا تو تقریباً تین گھنٹے بعد ایک وائٹ کیب کالونی میں آئی اور پارک کے پاس رکی تھی۔ اس کی آمد کے چند منٹ بعد ڈاکٹر شایان بنگلوز کی طرف سے نمودار ہوا اور کیب میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہوا۔

جب روشنی ہوئی تو ایک آٹو ورکشاپ کی گاڑی وہاں آئی اور اس نے بنگلوز والی گلی میں کھڑی ڈاکٹر شایان کی گاڑی کے چاروں تباہ ہونے والے ٹائر بدل دیے اور اسے وہاں سے لے گئے۔ کسی نے چاقو سے گاڑی کے چاروں ٹائروں اور اس کے عقب میں لگے اسپیئر ٹائر کو بھی کاٹ کر ناکارہ کر دیا تھا۔ مکینکوں نے یہ کام بہت تیزی اور خاموشی سے کیا تھا۔ بہت کم لوگوں نے انہیں دیکھا تھا۔ جب گاڑی گئی تو میں بھی مسکراتا ہوا اوپر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس صبح میں بہت دن بعد گہری نیند سویا تھا۔ میری آنکھ دوپہر میں کھلی تو میں باہر آیا اور رافعہ کے پاس پہنچا۔ کال بیل کے جواب میں اس نے دروازہ کھولا تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ رات بھر سوئی نہ ہو اور روتی رہی ہو۔ اس نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بابا، آج میں نے تازہ کچھ نہیں بنایا ہے البتہ کل کا سالن بچا ہوا ہے۔''

''بی بی، میرے لیے تو کل کا بھی تازہ ہی ہوگا۔''

رافعہ نے مجھے سالن اور روٹی لا دی۔ البتہ چائے کا مگ اس نے تازہ بنا کر دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''بی بی، میرے لائق کوئی خدمت؟''

''بابا، دعا کرو کہ اللہ میری مشکلیں آسان کرے۔''

''بی بی، بندہ اپنی مشکلیں خود پیدا کرتا ہے ورنہ وہ تو انسان کو آسانیاں ہی دیتا ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا مگر میں چیزیں تھام کر پلٹ گیا۔ کھانا کھا کر اور چائے پی کر میں نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر ڈاکٹر شایان کی نگرانی کے لیے نیچے آیا۔ وہ حسب معمول چار بجے آ گیا تھا۔ اس کا لباس اور اس کی گاڑی بتاتی تھی کہ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ شاید وہ اور جگہوں پر بھی بیٹھتا تھا اور خوب کماتا تھا۔ پانچ بجے کے قریب مدثر صاحب ڈاکٹر شایان کے کلینک آئے۔ انہیں دیکھتے ہی میں پیچھے لگ گیا اور کلینک تک پیچھے آیا۔ مدثر صاحب کچھ دیر وہاں رہے اور پھر باہر آ گئے۔ میں

نے ان کے چہرے پر ایک طرح کی مایوسی اور پریشانی دیکھی تھی۔ آگے پیچھے دو گلیوں میں رہنے والے تین گھرانوں کے لوگوں سے ڈاکٹر شایان کا تعلق سامنے آیا تھا۔ یہ تعلق نارمل نہیں تھا۔

وہ ڈاکٹر تھا اور آدمی اس کے پاس اپنے مسائل کے حل کے لیے جاسکتا تھا۔ لیکن خاص بات یہ تھی کہ اس کے پاس جو جاتا تھا وہ پریشان اور مایوس ہی ہوتا تھا۔ میں نے رافعہ کی جو حالت دیکھی تھی اس کے بعد مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر شایان کی اس کے گھر آمد میں اس کی خوشی شامل تھی۔ وہ اسماعیل صاحب اور مدثر صاحب سے زیادہ پریشان نظر آئی تھی۔ چھ بجے ڈاکٹر شایان اپنا کلینک بند کر کے چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ رات کو آئے گا کیونکہ آج بھی صبیح الدین اپنے گھر پر نہیں تھے۔ وہ صبح دفتر ضرور گئے تھے مگر شام کو ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ مگر خلاف توقع ڈاکٹر شایان رافعہ کے گھر نہیں آیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر وہ آج آیا تو آج بھی اس کی گاڑی کے ساتھ وہی کروں گا جو اس رات کیا تھا۔ اس نے کسی سے شکایت نہیں کی تھی اور خاموشی سے اپنی گاڑی ورکشاپ والوں کی مدد سے منگوالی تھی۔ وہ شکایت کر بھی نہیں سکتا تھا ورنہ اس بات کی کیا وضاحت پیش کرتا کہ اس رات اس کی گاڑی بنگلوز کی لائن میں کیوں موجود تھی؟

میں ڈاکٹر شایان کا انتظار کر رہا تھا کہ آدھی رات کو ایمبولینس کے سائرن نے مجھے چونکا دیا تھا۔ ایمبولینس کالونی میں داخل ہوئی تھی اور تیزی سے سائرن بجاتی بنگلوز کی طرف آئی۔ میں بھی پارک سے نکل آیا اور جب رافعہ کے گھر والی گلی میں داخل ہوا تو وہاں ایمبولینس مدثر صاحب کے بنگلے کے سامنے رکی تھی۔ ان کے بنگلے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایمبولینس کا عملہ اسٹریچر اندر لے کر گیا اور پھر اس پر مدثر صاحب کو لٹا کر باہر لایا گیا۔ بہ ظاہر وہ بے ہوش لگ رہے تھے۔ ایمبولینس میں ان کو ڈالتے ہی وہ اسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔ مدثر صاحب کے ساتھ ایک ملازم ہوتا تھا اور وہی پیش پیش تھا۔ البتہ وہ ایمبولینس کے ساتھ نہیں گیا۔ جب مدثر صاحب کو ایمبولینس میں ڈالا جا رہا تھا تو مجھے گیٹ کے اندر کسی کی جھلک دکھائی۔ وہ عورت تھی اور اس نے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے مگر میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں دیکھ سکا۔ ایمبولینس کے جانے کے بعد وہاں سناٹا چھا گیا۔ مدثر صاحب کا ملازم گیٹ بند کر رہا تھا کہ میں نے اس سے پوچھا۔

"صاحب کو کیا ہوا ہے؟"

"ان کی طبیعت خراب ہے۔" اس نے یوں رک کر کہا جیسے اصل بتانے یا نہ بتانے کا فیصلہ کر رہا ہو۔ ساتھ ہی اس نے اندر کی طرف بھی دیکھا تھا۔ مدثر صاحب کے ہاں کوئی عورت نہیں ہوتی تھی تب وہ سفید لباس والی کون تھی؟ میں واپس پارک میں آ گیا۔ اگلی صبح روشنی ہوتے ہی مدثر صاحب ایک ٹیکسی میں گھر واپس آ گئے۔ میں نے ان کو بنگلے کے سامنے اترتے دیکھا۔ وہ کمزور لگ رہے تھے مگر بہ ظاہر ان کی حالت ٹھیک تھی۔ اندر جانے سے پہلے انہوں نے رافعہ کے بنگلے کی طرف دیکھا تھا اور پھر اندر چلے گئے۔ حالات کی پُراسراریت اور میرے اندر موجود الجھن بڑھ گئی تھی کیونکہ اس سارے معاملے کو جس طرح میں دیکھ رہا تھا اس طرح کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ان سب کے پیچھے ڈاکٹر شایان ہی ہے۔ اس کے پاس جو جاتا وہ پریشان واپس آتا تھا اور پھر اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوتا تھا۔

اس دن میں رافعہ کے بنگلے پر کھانا لینے گیا تو میں نے اسے سفید لباس میں پایا۔ یہ ملگجا ہوا اور گزشتہ روز کا پہنا ہوا لگ رہا تھا۔ تو کیا رات میں رافعہ مدثر صاحب کے بنگلے پر تھی۔ ایان کا مجھے افسوس تھا۔ اس کی زندگی نہیں لوٹائی جاسکتی تھی لیکن رافعہ اور مدثر صاحب کو بچایا جاسکتا تھا مگر کیسے؟ یہی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں رافعہ یا مدثر صاحب سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کرتا تو ان کا ردعمل یقیناً اچھا نہیں ہوتا۔ دو دن بعد مدثر صاحب صبح کی واک کے لیے پارک آئے تو میرا سامنا ہوا۔ میں وہاں سے نکل رہا تھا۔ میرے سلام کے جواب میں انہوں نے حال احوال پوچھا اور موقع غنیمت جان کر میں نے ان سے پوچھ لیا۔ "صاحب، اس رات کیا ہوا تھا؟ آپ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی؟"

مدثر صاحب چونکے اور پھر انہوں نے سر ہلایا۔ "ہاں ہلکا سا انجائنا کا اٹیک تھا مگر فوری ٹریٹ منٹ سے بہتر ہو گیا۔ ڈاکٹر آنے نہیں دے رہے تھے مگر میں اصرار کر کے واپس آ گیا۔ اسپتال میں دل گھبرا رہا تھا۔"

"صاحب، دل کا معاملہ ہے، آپ کو کچھ دن احتیاط کرنی چاہیے۔"

"کر رہا ہوں یار۔" وہ بے خیالی میں بولے۔ "مگر کیا کریں زندگی میں مشکلیں اتنی ہیں کہ دل اثر لے ہی لیتا ہے۔"

"صاحب، میرے لائق کوئی خدمت؟"

مدثر صاحب نے میری طرف دیکھا۔ "یار تم اچھے آدمی ہو اور اوپر والا اچھے آدمیوں کی سنتا ہے، ہمارے لیے دعا کرنا۔"

وہ بے خیالی میں ہی ہمارے کہہ گئے تھے ورنہ انہیں

میرے کہنا چاہیے تھا۔ مگر میں نے نشان دہی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے بجائے میں نے موضوع بدل دیا۔

''صاحب، یہ جو کالونی میں نیا ڈاکٹر آیا ہے، کیا یہ بیماری کا علاج بھی کرتا ہے۔''

مدثر صاحب سنجیدہ ہوگئے۔ ''نہیں وہ کسی مرض کا علاج نہیں کرتا ہے۔''

میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ''تب کیا کرتا ہے؟''

''وہ خود ایک مرض ہے جو دوسروں کو لگ جاتا ہے۔''

کہتے ہوئے مدثر صاحب کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ ''مگر اب اس کا علاج ضروری ہوگیا ہے۔''

''اسے علاج کی ضرورت ہے؟''

میری بات پر مدثر صاحب چونکے اور پھر شاید انہیں احساس ہوا کہ وہ اپنے اندر کی باتیں کسی کے سامنے کر رہے تھے۔ انہوں نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''بابا ایسے ہی بول رہا تھا۔''

وہ آگے بڑھ گئے۔ میں ان کی باتوں پر غور کر رہا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر صرف دو ہی باتیں میری سمجھ میں آئیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ڈاکٹر شایان کو پسند نہیں کرتے تھے اور دوسرے وہ اس کے خلاف کچھ کرنا چاہتے تھے۔ میں فکرمند ہوگیا، اگر وہ کچھ کرگزرتے اور معاملہ پولیس تک جاتا تو زیادہ خرابی ہوتی۔ ڈاکٹر شایان ایسا آدمی نہیں تھا جس کی خاطر کوئی شخص سزا بھگتے اور جیل جائے۔ کم سے کم مدثر صاحب کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے محدود ذہن پر زور دینا شروع کیا کہ اس مسئلے کا کوئی سرا سمجھ میں آئے۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ رافعہ، مدثر صاحب اور اسماعیل صاحب ڈاکٹر شایان سے پریشان تھے۔ وہ انہیں تنگ کر رہا تھا اور کم سے کم مدثر صاحب اس کے خلاف ہوگئے تھے۔ رافعہ اور اسماعیل صاحب کا مجھے علم نہیں تھا۔ مگر وہ اسی شام مجھے پھر ڈاکٹر شایان کے دفتر میں جاتے دکھائی دیے۔

اسماعیل صاحب صورت سے ہی بہت پریشان لگ رہے تھے اور انہوں نے ایک چھوٹا سا پیکٹ اٹھا رکھا تھا۔ دس منٹ بعد وہ واپس آئے تو ان کا ہاتھ خالی تھا اور انہوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے جتنی قوت سے دروازہ بند کیا تھا اس سے ان کی اعصابی کشیدگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد ڈاکٹر شایان اوپر سے نمودار ہوا اور وہ بہت مسرور لگ رہا تھا۔ اس کی خوشی کا تعلق یقیناً اسماعیل صاحب کی پریشانی سے تھا۔ اس نے سیٹی بجاتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور بریف کیس اندر رکھا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا اور وہ سر پر ہاتھ مارتے ہوئے واپس آفس کی طرف گیا۔ وہ یقیناً کوئی چیز بھول گیا تھا اور اب لینے اوپر گیا تھا۔ اتفاق سے اس کی گاڑی اس طرح کھڑی تھی کہ ڈرائیونگ سیٹ فٹ پاتھ کی طرف آ رہی تھی۔ میں اس جگہ سے کچھ ہی دور تھا۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی میں اٹھ کر گاڑی تک آیا، گاڑی لاک نہیں تھی، اوپر جاتے ہوئے عجلت میں ڈاکٹر اسے ایسے ہی چھوڑ گیا تھا۔ اس کا لاک ریموٹ سے کھلتا اور بند ہوتا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا اور اندر جھکتے ہوئے بریف کیس کھولنے کی کوشش کی اور ایسا کرتے ہوئے میں نے اپنی ساری ساکھ داؤ پر لگا دی تھی کیونکہ میں نے آج تک کہیں سے کوئی معمولی سی چیز بھی نہیں چرائی تھی اور یہ بات کالونی والے بھی اچھی طرح جانتے تھے بلکہ میں لوگوں کی گم ہونے والی چیزیں تلاش کر کے دیتا تھا۔ خاص طور سے گھر سے بھاگ جانے والی پالتو بلیاں تلاش کرنے کا ماہر تھا۔ اگر میں ڈاکٹر کی گاڑی میں گھسا ہوا پکڑا جاتا تو میری مٹی پلید ہو جاتی۔ چوری کا الزام لگتا یا نہیں لگتا میں یہاں سے ضرور نکالا جاتا۔ اس کے باوجود میں نے یہ خطرہ مول لیا تھا۔ بریف کیس بھی لاک نہیں تھا آسانی سے کھل گیا اور میری توقع کے عین مطابق اس میں وہی پیکٹ تھا جو اسماعیل صاحب لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔ پیکٹ کھولنے کی ضرورت نہیں تھی اس کی ساخت بتا رہی تھی کہ اس میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔

ڈاکٹر شایان، اسماعیل صاحب سے بہت بڑی رقمیں لے رہا تھا۔ اس روز اے ٹی ایم سے بھی انہوں نے رقم نکلوا کر یقیناً ڈاکٹر کو دی تھی۔ وہ ڈاکٹر کو اتنی رقم کیوں ادا کر رہے تھے۔ اس سوال کا جواب میں بعد میں بھی تلاش کر سکتا تھا۔ میں نے بریف کیس بند کیا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ اسی لمحے اوپر سے ڈاکٹر نمودار ہوا اور اس سے پہلے وہ سڑک کے پار آتا، میں گاڑی سے دور جا چکا تھا۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں سگریٹ کیس تھا جو وہ اوپر بھول آیا تھا۔ اس سگریٹ کیس کی وجہ سے میری معلومات میں بیش قیمت اضافہ ہوا تھا اور اب میں اس سارے معاملے کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر شایان کا کردار سامنے آ گیا تھا۔ وہ کسی طرح سے ان لوگوں کو بلیک میل کر رہا تھا اور ان سے رقمیں اور دوسرے فائدے حاصل کر رہا تھا۔ دیگر فوائد اسے رافعہ سے حاصل ہو رہے تھے جو ایک خوب صورت عورت تھی اور ڈاکٹر کی کئی راتیں اس کے بیڈ روم میں گزر چکی تھیں۔

اب واضح ہو رہا تھا کہ ایان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ ڈاکٹر کے آفس سے نکلنے کے بعد وہ اتنا پریشان کیوں تھا کہ ذہنی

وباؤ کے عالم میں خوفناک حادثہ کر بیٹھا جس میں اس کی جان بھی چلی گئی۔ ایان کے مرنے کے بعد اس کے والد اسماعیل صاحب دو بار ڈاکٹر کے پاس آئے اور ان کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ مدثر صاحب میرے سامنے تھے، وہ ڈاکٹر شایان سے ملے اور اسی رات ان کو ہلکا سا دل کا دورہ پڑا۔ رافعہ بھی بہت پریشان تھی۔ یہ سب انسان تھے۔ ان میں انسانوں والی کمزوریاں اور خوبیاں تھیں، مگر ڈاکٹر شایان مجھے شیطان لگا جو اس خوب صورت جنت میں گھس آیا تھا۔ وہ انسانوں کو اپنی شیطانیت کی بھینٹ چڑھا رہا تھا۔ اگر یہاں رہنے والوں کی کچھ کمزوریاں تھیں تو ڈاکٹر کو ان سے حساب لینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ یہ حق صرف خالق کا تھا۔ اسے لوگوں کو تنگ کرنے سے روکنا تھا اور اب لگ رہا تھا کہ یہ کام مجھے ہی کرنا ہوگا۔

جس رات میں نے ڈاکٹر کی گاڑی کے ٹائرز ناکارہ کیے تھے اس رات کے بعد سے وہ رافعہ کے گھر کی طرف پھٹکا بھی نہیں تھا۔ شاید اسے خطرہ محسوس ہوا تھا کہ کوئی اس کے خلاف کارروائی کر رہا ہے، جو چاقو سے ٹائرز کاٹ سکتا ہے وہ چاقو سے اسے بھی کاٹ سکتا ہے۔ وہ بزدل بھی تھا اس لیے پھر رافعہ کے پاس نہیں آیا۔ مگر مجھے معلوم تھا وہ زیادہ دن اپنی شیطانیت سے باز نہیں رہے گا اور میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ کب آتا ہے؟ اور مجھے زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس رات بارش ہو رہی تھی اور موسم خوشگوار تھا مگر بارش کی وجہ سے کالونی میں سرِشام ہی سناٹا چھا گیا تھا۔ سڑکیں، گلیاں ویران تھیں۔ یہ اتوار کا دن تھا اس لیے لوگ اگلے روز معمولات کے آغاز کی وجہ سے جلدی سونے کے لیے جا چکے تھے۔ ہر اتوار کو ایسا ہی ہوتا تھا۔ جیسے ہر جمعے اور ہفتے کے دن رات تک رونق لگی رہتی تھی۔

بارہ بجے کے قریب کالونی کے گیٹ کی طرف سے تیز بارش میں کسی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس لہرائیں اور میں چوکنا ہو کر بنگلوز کے ساتھ والی سڑک پر نکل آیا۔ کوئی بھی گاڑی یہاں سے گزرے بغیر آگے نہیں جا سکتی تھی۔ ایک منٹ بعد ڈاکٹر کی گاڑی اس طرف مڑی اور میں نے اسٹریٹ لائٹ میں اسے شناخت کر لیا۔ گاڑی ذرا آگے آئی تو میں نے سڑک پر آتے ہوئے دونوں ہاتھ لہرائے جیسے اسے رکنے کا اشارہ کر رہا ہوں۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی اور مجھے لگا کہ وہ رکے گی نہیں مگر میرے پاس آتے ہوئے اس کی رفتار کم ہوئی اور وہ رک گئی۔ جیسے ہی گاڑی رکی میں ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھا۔ ڈاکٹر نے شیشہ نیچے کر دیا تھا اور اس کا موڈ خراب تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ”بڈھے کیا مرنا چاہتا ہے؟“

”صاحب ادھر ایک آدمی زخمی پڑا ہوا ہے۔“ میں نے اس کی بات نظرانداز کر کے سامنے کی طرف اشارہ کیا اور اس نے فطری طور پر سامنے کی طرف دیکھا۔ میرا دوسرا ہاتھ حرکت میں آیا جس میں چھوٹی سی لیکن وزنی ہتھوڑی دبی تھی، وہ اس کی کنپٹی سے لگی تو وہ کراہ کر آگے جھکا اور دوسری ضرب میں وہ بے ہوش ہو گیا۔ میں نے پھرتی سے اسے گھسیٹ کر نیچے اتارا اور ہاتھ بڑھا کر پہلے ہینڈ بریک کھینچا اور پھر سوئچ آف کر کے چابی نکالی اور گاڑی کا دروازہ لاک کر دیا۔ اب اسے کھینچ کر لے جانا تھا اور مجھ بوڑھے کے لیے یہ کام آسان نہیں تھا۔ ایک تو یہاں ہر طرف اسٹریٹ لائٹس آن تھیں۔ دوسرے سیکیورٹی والے بھی وقفے وقفے سے گشت کرتے تھے۔ ان سب کے ہوتے ہوئے ڈاکٹر کو کھینچ کر اوپر کے جنگل تک لے جانا میرے لیے ہمالیہ سر کرنے سے کم نہیں تھا۔ مگر مجھے یہ کام کرنا ہی تھا۔ اپنے لیے نہیں اس کالونی کے لوگوں کے لیے۔ میں نے اپنا کام شروع کیا۔

اس نے گاڑی بھی کنارے روکی تھی اس لیے اب گاڑی وہاں کھڑی تھی اور کسی کو شک نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر میری توقع سے زیادہ وزنی ثابت ہوا تھا اور اسے کھینچنا کسی بھاری بھرکم بوری کو کھینچنے سے کم نہیں تھا۔ مجھے ہر چند قدم کے بعد رک کر اپنا سانس درست کرنا پڑتا۔ اگرچہ بارش کی وجہ سے سڑکیں چکنی ہو رہی تھیں اس کے باوجود یہ کام میری توقع سے زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ بنگلوز کی دو گلیاں میں نے کیسے عبور کیں یہ میں ہی جانتا ہوں۔ جب میں اوپر والے حصے میں پہنچا تو سانس درست کرنے کے دوران میں نے دیکھا کہ رافعہ کے کمرے میں روشنی تھی اور کھڑکی میں اس کا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ اب آخری مرحلہ تھا میں ڈاکٹر کو کھینچ کر درختوں کے درمیان لے گیا۔ اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں پاگلوں کی طرح ہانپ رہا تھا اور بارش کے پانی سے زیادہ پسینا میرے جسم پر بہہ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر رافعہ کے گھر کی طرف دیکھا تو اس بار کھڑکی میں دو سائے نظر آئے۔ دوسرا مردانہ تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر شایان میری کھوہ میں دیوار سے اس طرح بندھا بیٹھا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے گلے میں ایک رسی اس طرح بندھی ہوئی تھی کہ وہ کسی قدر دقت سے سانس لے سکتا تھا اور دھیمی آواز میں بول سکتا تھا۔ اگر وہ زور سے سانس لینے کی کوشش کرتا یا چلاتا تو گلے کے مسل پھولنے کی صورت میں رسی کا پھندا خود بہ خود سخت ہو جاتا۔

دلکش موضوعات پر رنگارنگ تحریریں لیے نومبر 2016 کا دل خوش کن پاکیزہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
رفعت سراج اور انجم انصار ..... کے ماہرانہ قلم کے شاہکار ناولوں کی نئی اقساط
حیران کن حقیقتوں کا آئینہ..... سحر ساجد کا دل پذیر ناولٹ..... من جانبازم
زیست کے تلخ و شیریں رنگ لیے..... سیما رضا ردا کی انوکھی تحریر
شیریں حیدر، ام طیفور اور ثمینہ عظمت علی کی خصوصی تحریریں
پاکیزہ کے اولین دنوں کی ساتھی
معروف و ہر دلعزیز مصنفہ
نگہت سیما سے بھرپور گفتگو
نسرین جمیل سیال کے قلم سے ایک انوکھے عشق کی داستان..... مکمل ناول کی صورت
اس کے علاوہ
قانتہ رابعہ، هما بیگ، تسنیم منیر علوی، فاطمہ چوہدری، ہاجرہ ریحان،
کائنات غزل، ماوش طالب، مریم جہانگیر و دیگر ممتاز لکھاریوں کے پرلطف افسانے

اسے ہوش آ گیا تھا مگر ابھی اس کی نظر یہاں کی تاریکی سے ہم آہنگ نہیں ہوئی تھی۔ جب اسے نظر آنا شروع ہوا تو وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ ''تم...... مجھے تم نے قید کیا ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے اعتراف کیا۔

وہ کسمسایا۔ ''مگر کیوں؟''

''کیونکہ تم اسی لائق ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا تم یہاں سے رہا ہونا چاہتے ہو یا ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن ہونا چاہتے ہو۔''

اس کے چہرے پر خوف نمودار ہوا۔ ''تم مجھے ڈرا رہے ہو، تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''تم جانتے ہو تم کہاں ہو اور اس جگہ سے کتنی دور ہو جہاں میں نے تمہیں گاڑی میں بے ہوش کیا تھا۔ ذرا اپنے کپڑوں کا جائزہ لو یہ تقریباً پھٹ چکے ہیں۔ زمین پر گھسٹنے سے تمہارا جسم زخمی ہے۔ اتنا طویل فاصلہ طے کروا کے میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔ جب میں یہ مشکل ترین کام کر سکتا ہوں تو تمہیں قتل کر کے دفن کر دینا تو بہت آسان ہے۔ میں پہلے بھی یہ کام کر چکا ہوں۔''

اس کے چہرے پر خوف بڑھ گیا تھا۔ میرا اندازہ درست تھا کہ وہ ایک بزدل آدمی ہے۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''تم ایان، رافعہ اور مدثر صاحب کو بلیک میل کر رہے ہو؟''

اس نے گہری سانس لی۔ ''میں بلیک میل نہیں کر رہا، انہیں ان کے کیے کی سزا دے رہا ہوں۔''

''غلط، تم ان سے اپنا مفاد حاصل کر رہے ہو۔ تم نے ایان سے رقم وصول کی اور اب اس کے باپ سے وصول کر رہے ہو۔ یہ درست ہے؟''

''درست ہے۔'' اس نے تسلیم کیا۔

''تم رافعہ صبیح کے ساتھ راتیں گزارتے رہے ہو؟''

''یہ بھی درست ہے۔''

''تم نے مدثر صاحب کو بلیک میل کیا؟''

''تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

جواب میں، میں نے ہتھوڑی سے اس کے گھٹنے پر ضرب لگائی تو وہ گھٹے انداز میں چیخ اٹھا تھا۔ ''میری بات کا جواب دو۔''

''ہاں کیا؟'' وہ سسکتے ہوئے بولا۔

''ایان کو کیوں بلیک میل کیا؟''

''اس نے ہائی وے پر ایک مزدور لڑکے کو ٹکر مار دی تھی۔ وہ مر گیا اور ایان موقع سے فرار ہو گیا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''اس کے ضمیر پر بوجھ تھا اور اسے راتوں کو ڈراؤنے خواب آتے تھے، وہ علاج کے لیے میرے پاس آیا تھا۔''

''اور تم نے اسے بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔ رافعہ صبیح نے کیا کیا؟''

''وہ اپنے شوہر سے بے وفائی کر رہی تھی۔ اس سے چھپ کر مدثر سے جسمانی تعلقات رکھے تھے۔ اس کے ذہن پر بھی بوجھ تھا اور وہ میرے پاس علاج کے لیے آئی۔''

''مدثر تمہارے پاس علاج کے لیے نہیں آیا مگر تم نے اسے بھی بلیک میل کیا۔''

''ہاں کیونکہ یہ لوگ اسی قابل ہیں۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''اب تم کو پتا چلا کہ یہ اندر سے کیا ہیں۔''

''میں جانتا ہوں تمہارے بتانے کی ضرورت نہیں ہے، میں سب جانتا ہوں۔''

''تب تم مجھ سے اتفاق کرو گے کہ یہ اسی قابل ہیں۔''

''یہ عام لوگ ہیں جو گناہ کرتے ہیں اور اس پر ضمیر کا بوجھ محسوس کرتے ہیں۔ انسان اور شیطان میں یہی فرق ہے، انسان گناہ پر ندامت کرتا ہے اور شیطان اس پر غرور کرتا ہے۔ اپنے گناہ کی تاویل پیش کرتا ہے۔ تم نے اپنے عمل سے خود کو شیطان ثابت کر دیا ہے۔''

''سنو میرے ساتھ مل جاؤ، میں تمہیں بہت دولت دوں گا۔''

میں نے ہتھوڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے دولت کی نہیں، اپنے گھر کے سکون کی ضرورت ہے۔''

اگلے دن کالونی پھر پہلے جیسی ہو گئی تھی کیونکہ یہاں آنے والا شیطان اب باقی نہیں رہا تھا۔ اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کا کلینک تھا۔ پولیس اس کی گمشدگی کی تفتیش کرنے آئی مگر کوئی نہیں جان سکا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ صرف میں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ اسی کالونی کے جنگل میں دفن تھا۔ اس جگہ میں نے ایک شیطان کو اور دفنایا تھا جس نے میری کم عمری کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے غلط نہیں کہا تھا، اسے ٹھکانے لگانا میرے لیے ذرا بھی مسئلہ ثابت نہیں ہوا تھا۔ کہانی شاید ختم ہو گئی، ہاں ایک بات اور بتانے والی ہے۔ ایک مہینے بعد رافعہ نے صبیح الدین سے طلاق لے لی اور عدت پوری ہونے پر مدثر صاحب سے نکاح پڑھوا لیا تھا۔ اب وہ دونوں بنا گناہ کے ساتھ رہتے ہیں۔

سراغ رساں گریشیا اکیڈین اسٹائل گھر کے روشن بیرونی پورچ پر پہنچ کر منظر کا جائزہ لینے لگی۔ دروازے کی چوکھٹ اکھڑی ہوئی تھی اور دروازہ اپنی چول پر خطرناک حد تک جھول رہا تھا۔

سراغ رساں برینڈن ہال وے میں تھا۔ جب اس کی نظر گریشیا پر پڑی تو وہ اس کے پاس چلا آیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”خوشی ہے کہ تمہیں یہاں آنے کا وقت مل گیا۔“

”تم تو جانتے ہی ہو، میری اپنی ذاتی زندگی بھی ہے۔“ گریشیا نے کہا اور تباہ حال دروازے اور اطراف کی تصویریں بنانے لگی۔ پھر اس نے گولی کے اس واحد سوراخ کا کلوز اپ لیا جو لکڑی کے دروازے میں سینے تک کی اونچائی پر درمیان میں بنا ہوا تھا۔ ”اب تک ہماری معلومات کیا ہیں؟“ اس نے اپنے پارٹنر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”صاف صاف قتل باجواز کا کیس ہے۔“ برینڈن نے بتایا۔

گریشیا مکان میں داخل ہوگئی۔ وہ محتاط قدم اٹھا رہی تھی تاکہ کسی ثبوت پر قدم نہ پڑنے پائے۔ ہال وے داخلی دروازے سے لے کر لیونگ روم تک چلا گیا تھا جہاں ایک علامتی مخروط نشاندہی کے لیے رکھا ہوا تھا۔

سراغ رساں برینڈن نے اس مخروط کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ ”یہ وہ مقام ہے جہاں بیورلی شا کا بوائے فرینڈ اس وقت کھڑا ہوا تھا جب اس نے فائر کیا تھا۔“

”کیا یہ درست ہے کہ مرنے والا بیورلی شا کا سابقہ شوہر ہے؟“

”مرنے والا مشتبہ تھا۔“ برینڈن نے کہا۔ ”وہ یہاں زبردستی گھسنے اور ان پر حملہ کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔ لیکن ہاں، وہ بیورلی شا کا سابقہ شوہر تھا۔ اس کا نام جیری کلائن ہے۔ اسے اسپتال لے جایا جارہا تھا تو اس نے پانچ منٹ بعد ہی راستے میں ایمبولینس میں دم توڑ دیا۔“

”میں بیورلی شا کے بوائے فرینڈ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ برینڈن نے جواب دیا اور اسے اپنے ہمراہ لے کر پڑوس کے ایک مکان میں چلا گیا۔ وہاں بیورلی شا اپنے بوائے فرینڈ ٹرینٹ اسٹیل کے ساتھ کچن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔

جب سراغ رساں گریشیا نے اپنا تعارف کرایا تو بیورلی شا کا چہرہ پھیکا پڑ گیا اور اس کی آواز کانپنے لگی۔

”میں اس سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔“ گریشیا نے ٹرینٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اسے اپنے ہمراہ لیونگ روم میں لے گئی۔

سراغرسی کے اسرار رموز سے آراستہ ایک دلچسپ تحریر۔

صبر سے اور ٹھنڈا کر کے کھانے میں ہی عافیت اور غذائیت ہوتی ہے... لیکن کچھ عجلت پسند اپنے بے صبرے پن پر قابو نہیں رکھتے اور کھیل کی بازی پھسل کے دوسرے کے حق میں چلی جاتی ہے... اپنی دانست میں ایک شاندار کارروائی کا منصوبہ بنانے والوں کی کارکردگی...

اس نے ٹرینٹ کو ایک صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور اس کے بیٹھنے کے بعد گویا ہوئی۔ ''اب مجھے بتاؤ کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

ٹرینٹ سر ہلانے لگا۔ ''جو کچھ ہوا بے حد ڈراؤنا تھا۔ میں رات گزارنے کے لیے بیورلی کے پاس آیا تھا کیونکہ وہ ڈر رہی تھی کہ اس کا سابقہ شوہر آ کر اس کے لیے مشکلات کھڑی کردے گا۔ اس شخص نے بیورلی کو تکالیف اور مشکلات کے سوا کچھ نہیں دیا تھا اور یہ سلسلہ ان کی علیٰحدگی تک چلتا رہا تھا۔''

''لگتا ہے کہ بیورلی کا خوف جائز تھا۔''

''ہاں، جب ہم نے دروازے پر دستک سنی تو بیورلی خوف زدہ ہوگئی۔ اس نے اپنی گن مجھے دے دی اور میں نے کمرے سے نکل کر ہال وے میں قدم رکھا ہی تھا کہ عین اسی وقت اس نے زوردار لات رسید کر کے دروازہ توڑ دیا۔'' ٹرینٹ نے ایک بار پھر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے چیخ کر اسے رکنے کو کہا لیکن وہ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ مسلح ہے یا نہیں۔ سو میں نے اپنی اور بیورلی کی زندگی بچانے کے لیے خوف کے مارے فائر کردیا۔''

''تم نے کتنے فائر کیے تھے؟''

''صرف ایک۔''

گریشیا نے اسے واپس کچن میں جانے اور بیورلی کو لیونگ روم میں بھیجنے کا حکم دیا۔

بیورلی کے آنے پر گریشیا اس کا انٹرویو لینے لگی۔

''خدا کا شکر ہے کہ اس وقت ٹرینٹ میرے پاس موجود تھا۔'' بیورلی نے بتایا۔ اس کی آنکھیں آبدیدہ تھیں۔ ''ورنہ میں مرچکی ہوتی۔''

''تمہیں طلاق ہوئے کتنا عرصہ ہوچکا ہے؟''

''اوہ، ہمارے درمیان ابھی طلاق نہیں ہوئی ہے۔ البتہ ہمیں ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہوئے تین ماہ ہوچکے ہیں۔ طلاق کا کیس فائنل ہونے کے لیے مجھے مزید سات ماہ انتظار کرنا تھا۔''

''کیا شوٹنگ تمہارے سامنے ہوئی تھی؟''

بیورلی نے جھرجھری لیتے ہوئے نفی میں سر ہلادیا۔ ''مجھے فائر کی آواز سنائی دی تھی۔ اور یہ بہت بُرا ہوا تھا۔ یہ میری زندگی کا ایک بدترین تجربہ تھا۔ میں نے ٹرینٹ کو چیختے ہوئے سنا جو جیری کو چلے جانے کا کہہ رہا تھا اور پھر مجھے ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ میں بیڈ روم سے نکل کر باہر آئی تو دیکھا کہ جیری ہال وے کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ وہ...... لیونگ روم تک تقریباً پہنچ ہی گیا تھا۔''

گریشیا نے تیوریاں چڑھالیں۔ ''تمہارے خیال میں جیری یہاں کس لیے آیا ہوگا؟''

بیورلی نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''غالباً میری منت سماجت کرنے کے لیے کہ میں اسے واپس لے لوں۔ وہ ہر دو ہفتے بعد یہی کیا کرتا تھا اور جب میں اس سے کہتی تھی کہ بھلائی اسی میں ہے کہ معاملہ ختم سمجھا جائے۔ تب وہ پاگل ہوجاتا تھا۔ پچھلی مرتبہ اس نے مجھے دھمکی دی تھی۔ تب ہی میں نے اپنی حفاظت کے لیے گن خریدی تھی۔''

☆☆☆

''یہ قتل باجواز کا ایک سیدھا اور صاف ستھرا کیس ہے۔'' برنیڈن نے گریشیا سے اس وقت کہا جب وہ دونوں جائے واردات کی جانب واپس جارہے تھے۔ ''اوپن اینڈ شٹ کیس۔''

''اتنی جلد بازی ٹھیک نہیں۔'' گریشیا نے پورچ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس جگہ پر فاسفری محلول اسپرے کردو۔''

برنیڈن اپنا سر کھجانے لگا۔ ''لیکن اسے گولی گھر کے اندر ماری گئی ہے۔''

''جو میں کہہ رہی ہوں، وہ کرو۔''

جب سراغ رساں برنیڈن نے محلول کا اسپرے کیا تو پورچ کے فرش پر نیلاہٹ چمکنے لگی اور ساتھ ہی خون کی ایک لکیر نمایاں ہوگئی جو پورچ سے لے کر ہال میں اس مقام تک چلی گئی تھی جہاں پر جیری کی لاش پائی گئی تھی۔

برنیڈن کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''اس لیے کہ ٹوٹے ہوئے دروازے میں گولی کا ایک نشان موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب فائر کیا گیا تو اس وقت دروازہ بند تھا اور اسے فائر کرنے کے بعد لات مار کر توڑا گیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جیری جب باہر پورچ میں کھڑا ہوا تھا تو اس پر دروازے کے پیچھے سے فائر کیا گیا تھا اور وہ کسی خطرناک ارادے سے وہاں نہیں آیا تھا۔''

برنیڈن ستائشی انداز میں سر ہلانے لگا۔

بعد میں بیورلی نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ جیری کو خود اس نے بلایا تھا اور اس کے زبردستی گھر میں گھس آنے کا ڈراما رچایا تھا تاکہ اسے اور ٹرینٹ کو اپنی شادی رچانے کے لیے مزید سات ماہ تک انتظار نہ کرنا پڑے۔

اور یوں شادی میں عجلت کا ارادہ ان کے گلے کا پھندا بن گیا۔

مقفل لاش

اسفند یار

کمرا چاروں طرف سے بند تھا۔۔ داخل ہونے کا واحد راستہ کمرے کا دروازہ تھا۔۔ اور وہ مقفل تھا۔۔ واردات کیسے ہوئی اور مجرم کس طرح اپنا کارنامہ دے پایا۔۔ معما بن جانے والے کیس کی روداد۔

ایک سراغرساں کی دردسری...... جو مجرم تک پہنچنا چاہتا تھا

ہوریس مونٹیگ کے گھر میں اس کی بہن کیرولین اور بھانجا فلپ بھی ساتھ رہتے تھے۔ ان کے علاوہ تین ملازمین بھی اس گھر کے مکینوں میں شامل تھے...... شوفر اینڈریو، ملازمہ مائرا اور بٹلر میلونی۔

مونٹیگ کی بہن کیرولین پیٹھ تانے کاؤچ کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنی گود میں رکھے ہوئے تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ میں سفید رنگ کا ایک رومال تھا جس سے بار بار اپنی آنکھوں کو پونچھ رہی تھی۔ فلپ کمرے کی جانب پشت کیے خالی نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ ملازمہ مائرا آتشدان کے پاس ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ شوفر اینڈریو اس کے برابر میں کھڑا تھا۔

البتہ بٹلر میلونی وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ سراغ رساں سے اس بات کی یقین دہانی کرانے کے بعد کہ پوچھ گچھ کے لیے جب بھی اسے طلب کیا جائے گا، وہ حاضر ہو جائے گا، وہاں سے اجازت لے کر چلا گیا تھا۔

''لاش کہاں ہے؟'' سراغ رساں اولسن نے پوچھا۔
''وہ چھوٹے کمرے میں ہے جہاں انکل مونٹیگ خلوت میں رہتے تھے۔'' قلب نے جواب دیا۔
پھر سراغ رساں کے اشارے پر وہ اسے اپنی رہبری میں مونٹیگ کی خلوت گاہ کی جانب لے کر چل پڑا۔
خلوت گاہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس کے فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ ایک قبضے پر لٹکا ہوا تھا۔ مونٹیگ کا بقیہ کمرا بالکل ترتیب میں دکھائی دے رہا تھا۔
سراغ رساں اولسن نے ایک پولیس مین کی نگاہ سے کمرے کا طائرانہ جائزہ لینا شروع کر دیا۔ بالآخر اس کی نگاہ ان ٹانگوں پر جم گئی جو شاہ بلوط کی ایک بڑی سی میز کے پیچھے نمایاں دکھائی دے رہی تھیں۔ بقیہ دھڑ نظر نہیں آرہا تھا۔
سراغ رساں اولسن گھوم کر میز کی دوسری جانب چلا گیا۔ وہاں خاکستری بالوں والے ایک شخص کی لاش پیٹ کے بل فرش پر پڑی ہوئی تھی اور اس کے سینے میں لفافہ کھولنے والا ایک چاقو گڑا ہوا تھا۔ لاش کے برابر فرش پر برانڈی کا ایک گلاس الٹا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں کسی قسم کی جدوجہد کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔
سراغ رساں اولسن نے اپنی توجہ کمرے کے دروازے کی جانب مبذول کر دی۔ ''اسے کیا ہوا تھا؟'' اس نے پوچھا۔
''ہمیں کمرے میں داخل ہونے کے لیے اسے توڑنا پڑا تھا۔'' قلب نے کہا۔ ''یہ دروازہ اندر سے لاک تھا۔''
''لاک تھا؟'' سراغ رساں اولسن نے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا پھر محتاط نظروں سے کمرے کا معائنہ کرنے لگا۔
کمرے میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کا واحد راستہ یہی ایک دروازہ تھا۔ میز کے عقب میں ایک کھڑکی تھی لیکن اس میں تالا لگا ہوا تھا اور سلاخیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اولسن کے حلق سے ایک غرہٹ سی بلند ہوئی۔ اس نے کمرے کی دیواروں کو تھپتھپا کر دیکھا کہ کہیں ان میں کوئی خفیہ داخلی راستہ تو نہیں۔ لیکن اسے ایسا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ وہ واپس لائبریری میں آگیا۔ ''مسٹر مونٹیگ کی لاش کو کس نے تلاش کیا تھا؟'' اس نے پوچھا۔
قلب نے اپنا ہاتھ اٹھا دیا۔ ''میں نے۔''
''مجھے اس بارے میں بتاؤ۔'' ولسن نے کہا۔
''بالکل وہی کچھ تھا جیسا آپ دیکھ چکے ہیں۔''
''میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ ایک شخص کی لاش ایک ایسے کمرے میں پڑی ہوئی ہے جس میں اندر سے تالا لگا ہوا تھا اور اس شخص کے سینے میں خط کھولنے والا ایک چاقو گڑا ہوا ہے۔ میرے خیال میں، میں نے جو کچھ دیکھا ہے، معاملہ اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔ آج شب اس کمرے میں تمہارے انکل کے ساتھ اور کون موجود رہا تھا؟''
''کوئی بھی نہیں۔'' قلب نے بتایا۔
''کیا مطلب؟''
''انکل مونٹیگ ایک عادی ٹائپ کی مخلوق تھے۔ وہ ہر شب ٹھیک سات بجے برانڈی کا گلاس لے کر اپنے اس چھوٹے سے کمرے میں چلے جاتے تھے اور دروازہ لاک کر لیتے تھے اور صبح ٹھیک آٹھ بجے کمرے سے باہر نکل کر ہمارے ساتھ یہاں لائبریری میں آن بیٹھتے تھے اور پھر رات کو وقتِ مقررہ پر اپنے کمرے میں واپس چلے جاتے تھے۔''
''اور گزشتہ شب بھی ان کا یہی معمول رہا تھا؟'' سراغ رساں اولسن نے پوچھا۔
قلب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''ماسوائے اس کے کہ وہ صبح آٹھ بجے معمول کے مطابق کمرے سے باہر نہیں آئے۔''
اولسن سوچ میں پڑ گیا اور اس کی تیوریوں پر بل نمودار ہو گئے۔ ''تو پھر تم نے کیا کیا؟''
''میں نے دروازے کے باہر سے انہیں آوازیں دیں۔'' قلب نے کہا۔ ''لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔'' وہ اپنی باریک مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ ''مجھے فکر لاحق ہو گئی۔ وہ دل کے مریض تھے۔ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں ان پر دل کا دورہ نہ پڑ گیا ہو۔ میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ جب مجھ سے دروازہ نہیں کھل سکا تو میں نے اینڈریو کو پکارا اور اسے ایک کلہاڑی لانے کو کہا تاکہ دروازہ توڑا جا سکے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی آستین کو چھوا جہاں اس کا داہنا ہاتھ ہونا چاہیے تھا۔ داہنا ہاتھ غائب تھا۔ ''جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں میں کلہاڑی چلانے کے قابل نہیں ہوں۔''
''کیا کمرے کے تالے کی اضافی چابی نہیں تھی؟''
اس بات پر قلب نے ایک کھوکھلا قہقہہ بلند کیا۔ ''آپ میرے انکل کو نہیں جانتے۔ وہ اپنی خلوت کے معاملے میں بے حد جذباتی تھے۔ انہیں کسی صورت یہ گوارا نہیں تھا کہ کمرے کے تالے کی چابی ان کے علاوہ کسی اور کے پاس ہو۔''
سراغ رساں نے اپنی توجہ شوفر اینڈریو کی جانب

مینڈول کرلی جو کسی جناتی کے مانند اٹینشن کھڑا تھا اور اس کا سنجیدہ چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری دکھائی دے رہا تھا۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ جب تم سے مسٹر مونٹیگ کی خلوت گاہ کا دروازہ توڑنے کو کہا گیا تو تم نے کیا، کیا؟''

''میں نے گیراج میں سے ایک کلہاڑی اٹھائی اور دوڑتا ہوا گھر میں آگیا۔'' اینڈریو نے کہا۔ ''مسٹر فلپ دروازہ توڑنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے تالا توڑنے کا حکم دیا۔ اس کوشش میں دروازے کا ایک قبضہ بھی ڈھیلا ہو گیا تھا۔''

''مجھے دروازہ کھلتے ہی انکل مونٹیگ کے پیر دکھائی دیے جو میز کے پیچھے سے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔'' فلپ نے بتایا۔

''اور تم؟'' اولسن نے شوفر اینڈریو سے پوچھا۔

''میں مسٹر فلپ کے عین عقب میں تھا۔'' اینڈریو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے بھی یہی دیکھا کہ مسٹر مونٹیگ میز کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے مدد کے لیے آگے بڑھنا چاہا تو مسٹر فلپ نے مجھ سے کہا کہ میں بٹلر میلوئی سے جا کر کہوں، وہ 911 پر فون کر کے ایمبولینس طلب کر لے۔''

''ایمبولینس کیوں طلب کی جا رہی تھی جب یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ مر چکے ہیں؟'' سراغ رساں اولسن نے پوچھا۔

''دروازے کی دہلیز سے مسٹر مونٹیگ کی ٹانگوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔'' فلپ نے کہا۔ ''لیکن جونہی میں نے کمرے کے اندر جا کر دیکھا کہ وہ مر چکے ہیں تو میں نے اینڈریو کو آواز دے کر کہا کہ وہ ایمبولینس کو بھول جائے اور پولیس کو فون کر دے۔''

''تمہارے خلوت گاہ میں داخل ہونے کے بعد کیا کسی بھی وقت دروازے کو تنہا چھوڑا گیا تھا کہ اس پر نظر رکھنے والا کوئی نہ رہا ہو؟'' سراغ رساں نے سوال کیا۔

مسز مونٹیگ کی بہن کیرولین بول پڑی۔ ''نہیں۔ میں تمام وقت یہاں موجود رہی تھی۔ اگر کوئی کمرے میں داخل ہوتا یا باہر نکلتا تو میں لازمی اسے دیکھ لیتی۔''

''کمرے کا کوئی خفیہ راستہ ہے؟''

''نہیں۔''

''کیا کمرے کی کھڑکی کی سلاخیں قابلِ علیحدگی ہیں؟''

''نہیں۔''

سراغ رساں اولسن نے ایک گہرا سانس لیا اور سوچ میں پڑ گیا۔ یہ مقفل کمرے میں قتل کا کیس تھا... یا بظاہر ایسا

> ## بغیر داڑھی کے
>
> مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ سے کسی نے پوچھا۔ ''مولانا صاحب انگریز کا کہنا ہے کہ داڑھی خلافِ فطرت چیز ہے کیونکہ انسان داڑھی کے بغیر پیدا ہوا ہے لہٰذا داڑھی رکھنا فضول ہے۔''
>
> مولانا صاحب مسکرائے اور فرمایا۔ ''پھر تو دانت رکھنا بھی خلافِ فطرت ہے کیونکہ انسان کی پیدائش کے وقت دانت بھی تو نہیں ہوتے اس لیے انگریز کو اپنے دانت بھی توڑ دینے چاہئیں۔''
>
> محفل میں ایک صاحب جلدی سے بولے۔ ''واہ مولانا صاحب کیا دندان شکن جواب دیا ہے۔''

دکھائی دے رہا تھا لیکن اولسن کو یقین تھا کہ وہ قاتل تک بہ آسانی پہنچ جائے گا۔

☆☆☆

سراغ رساں اولسن نے تمام کڑیاں ملانے کے بعد گتھی سلجھالی۔

قاتل نے مسٹر مونٹیگ کی برانڈی میں اس امید کے ساتھ ایک ناقابلِ شناخت زہر شامل کر دیا تھا کہ ان کی موت بظاہر ہارٹ اٹیک کا نتیجہ دکھائی دے گی۔ لیکن جب اس نے خلوت گاہ کا دروازہ ٹوٹنے کے بعد یہ دیکھا کہ مسٹر مونٹیگ مرے نہیں بلکہ صرف بے ہوش ہیں تو وہ ڈر گیا کہ مسٹر مونٹیگ سمجھ جائیں گے کہ کسی نے ان کی برانڈی میں زہر ملا دیا تھا۔

اسی لیے قاتل نے شوفر اینڈریو کو فون کرنے کے بہانے خلوت گاہ سے باہر بھیج دیا تھا اور اس کے جاتے ہی لفافہ کھولنے والا چاقو مسٹر مونٹیگ کے سینے میں گھونپ دیا تھا۔

جی ہاں، قاتل مسٹر مونٹیگ کا بھانجا فلپ تھا۔

چونکہ دوسروں کو باہر سے مسٹر مونٹیگ کے جسم کی صرف ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں تو کسی کو بھی یہ علم نہیں ہوا تھا کہ جس وقت خلوت گاہ کا دروازہ توڑا گیا تھا، اس وقت تک مسٹر مونٹیگ کے سینے میں چاقو گڑا ہوا نہیں تھا۔ چاقو بعد میں ان کے سینے میں گھونپا گیا تھا۔

ستر ھویں قسط

انگارے

طاہر جاوید مغل

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حنیف سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا۔ وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں نے اپنی چچی اور چچازاد بہن فائزہ کے قاتل لالہ نظام کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ انسپکٹر قیصر شدید زخمی ہو کر اسپتال نشین ہوا۔ شکیل داراب ایک شریف النفس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسی عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی ''غلطی'' کی تھی۔ میں نے شکیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر دباؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ میں یہاں بیزار ہو چکا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا خنڈہ صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنوا زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آ جائے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راستے کو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان نمبرداری کو کسی نے زخمی کر دیا تھا۔ اس کا الزام بھی تاجور کو دیا جا رہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے یہی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آ گئی۔ مولوی فدا ایک خدا ترس بندے کی حیثیت سے یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں وکرم اور رام پیاری کے کچھ مخالفین نے ان کے گھر پر ہلا بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ٹی بی کا شکار وکرم ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکرم اور رام پیاری کا دفاع کیا۔ لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے ہڈیوں سے بنا جانچے وکرم کو کندھے پر لادا اور رام پیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نمبرداری کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ یہ کام مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس ''بلیک میلنگ'' سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالمگیر، سجاول کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔ میں نے چھپ کر ان کی تصاویر کھینچ لیں۔ پھر میں اقبال کا تعاقب کرتا ہوا اس تک جا پہنچا اور چھپ کر ان کی باتیں سنیں۔ وہ بے بس و مظلوم شخص تھا اور چھپ کر ایک قبرستان میں اپنے دن گزار رہا تھا۔ ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر سائیں جی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کا کھوج لگانے کا بیڑا اٹھا بیٹھا اور ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش و سریلی آواز کے باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ درگاہ پر ہم سب قید تھے لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور حالات نے اس تیزی سے کروٹ لی کہ درگاہ کا سب نظام درہم برہم ہو گیا۔ میرے ہاتھوں پردے والی سرکار کا خون ہو گیا۔ آگ و خون کا دریا عبور کر کے ہم بالآخر پہاڑوں کے درمیان تک جا پہنچے۔ یہاں بھی ملنگ محافظوں سے ہمارا مقابلہ ہوا۔ اس دوران انیق وغیرہ ہم سے بچھڑ گئے۔ میں اور تاجور بھاگتے ہوئے ایک جنگل میں پہنچے۔ لیکن ہماری جان ابھی چھوٹی نہیں تھی۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق ہم سیالکوٹی سجاول ڈکیت کے ڈیرے پر جا پہنچے تھے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤ جی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی کہتی۔ جس کی پوتی ستارہ عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کر دیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کر دیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔

اس دوران ایک خط میرے ہاتھ آگیا جسے پڑھ کر جاندگری کے عالمگیر کا بکرہ وچہرہ سامنے آگیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعہ کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مکس مارشل آرٹ کی طرف ہو گیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکا مچاتا رہا اور دوسری طرف سکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِ پیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر میں نے ہار مان لی لیکن سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوالیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم وڈے صاحب کے محل نما بنگلے پار اہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ بروناکی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ بروناکی میں اس کی خاندانی دشمنی تھی۔ سب ٹھیک تھا کہ اچانک چند نقاب پوشوں نے پار اہاؤس پر حملہ کر دیا جن کا سرغنہ ثاقب تھا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ سجاول نے جان جوکھوں میں ڈال کر بڑی بیگم صاحبہ کی جان بچائی لیکن سرغنہ ثاقب نے اس کے بیٹے ابراہیم اور ایک مہمان کو یرغمال بنالیا۔ مہمان کا نام سن کر میں چونک گیا یعنی شکیل وارا۔ پھر میں نے اور سجاول نے چھوٹے صاحب کو اغوا کاروں کے چنگل سے نجات دلائی۔ اس معرکے میں کچھ اغوا کار مارے گئے اور کچھ پکڑے گئے۔ سجاول کو پار اہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پار اہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کرلیا گیا تھا۔ یہیں مجھ پر انکشاف ہوا کہ ڈاکٹر ارم پار اہاؤس کے ذاتی اسپتال میں موجود ہے اور اس نے دھوکے سے رضوان ٹی کو دوبارہ قابو کرلیا ہے۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں وہ پار اہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ اب مجھے زینب کے بارے میں پریشانی لاحق ہو رہی تھی۔ زینب، ابراہیم سے منسوب کی گئی تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ میں نے ابراہیم سے ملاقات کی اور اس سے معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ لیکن میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس کے خون کی میڈیکل رپورٹ درست نہیں ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پار اہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، اس نے سرغنہ ثاقب کے فرار کا ڈراما رچایا۔ ایک بار پھر پار اہاؤس میں دھماکے کو نج اٹھے۔ تابڑتوڑ گولیاں چلنے لگیں اور مقابلے میں سرغنہ ثاقب اور اس کا ساتھی عبرتناک موت مارے گئے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کے خون کو دوبارہ ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ پہلی رپورٹ ڈاکٹر ارم سے تیار کرائی گئی تھی۔ راز کھل جانے کے ڈر سے ڈاکٹر ارم کو بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ رضوان ٹی بھی غائب تھا۔ قتل کا الزام رضوان پر ڈالنا چاہتے تھے۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ سب کچھ آقا جان کرا رہا ہے۔ ثاقب کی موت کے بعد بروناکی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ... بروناکی جانے کے لیے ... تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

یہ داؤد بھاؤ کے اس خاص بندے کی تصویر تھی جسے جبار اپہلوان کہا جاتا تھا لیکن یہ نام کوئی اس کے منہ پر تو نہیں لے سکتا تھا کیونکہ وہ ایک دبلا پتلا لیکن نہایت کرخت شخص تھا۔ اس کا اصل نام مختار تھا اور وہ لاہور میں داؤد بھاؤ جیسے گینگسٹر کے اہم ترین کارندوں میں سے تھا۔ اس کی تصویر یہاں سیفی کی جیب میں رکھے بٹوے سے نکلی تھی اور اس کے استخوانی چہرے پر کراس لگایا گیا تھا۔

میں نے خاموشی سے تصویر واپس بٹوے میں رکھ دی۔ سیفی کسمسانے لگا پھر وہ جاگ گیا۔ اس نے لیٹے لیٹے ایک طویل انگڑائی لی اور مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

سر جھکا کر بولا۔ ”صبح صبح تمہاری شکل دیکھی ہے، لگتا ہے کہ آج کا دن مبارک ہے اور اچھا گزرے گا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے بالکل اُلٹ لگ رہا ہے۔“

اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اس کا اوپر والے ایک دانت کا کونا تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ شاید کبڈی کھیلتے ہوئے یا ویسے ہی مارا ماری کرتے ہوئے کوئی چوٹ لگی تھی۔ بہرحال یہ ٹوٹا ہوا کونا برا نہیں لگتا تھا۔ ہاتھ منہ دھو کر وہ میرے اور انیق کے ساتھ ہی ناشتے پر بیٹھ گیا۔ اس کی خوراک ٹھیک ٹھاک تھی۔ وہ بلاتردد ایک بڑا پراٹھا اور تین انڈے کھا گیا۔ بعد میں حلوہ کھایا اور دودھ پتی کے تین کپ بھی چڑھائے۔

انیق سے نہ رہا گیا اور بولا۔ ”کیا آپ کوئی ”علم“ وغیرہ بھی جانتے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”یعنی کالا علم، نوری علم یا اس طرح کی کوئی اور چیز۔ آپ ماشاء اللہ خوب ڈٹ کر کھاتے ہیں پھر بھی اسمارٹ ہیں۔“

”اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنا کھاتا ہوں، اس سے زیادہ

نکال دیتا ہوں!.....‘‘

’’کوئی پیٹ کا مسئلہ ہے؟‘‘ انیق نے ’’معصومیت‘‘ سے پوچھا۔

’’نہیں یار، ورزش..... کبڈی کا شوق بلکہ جنون ہے، دس میل روزانہ دوڑتا ہوں، صبح سویرے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’تو پھر آج کی دوڑ ابھی شروع کر دو۔ یہاں سے نکل کر دس میل جنوب کی طرف جاؤ گے تو بڑی سڑک آجائے گی۔ وہاں سے لالہ موسیٰ جانے والی گاڑی آسانی سے مل جائے گی۔‘‘

’’شاید آپ بھول رہے ہیں، یہ خادم اپنی مہران کار پر یہاں تک پہنچا ہے اور وہ کار اس وقت یہاں کے گارڈز نے گیراج میں بند کی ہوئی ہے۔ میں اگر جانا چاہوں تو اس پر بھی جا سکتا ہوں لیکن یہاں سے جانا کس کافر نے ہے؟ میں آپ جناب کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’اور میں آپ جناب کو ساتھ رکھنے کا خواہش مند نہیں ہوں۔‘‘ میرا لہجہ روکھا تھا۔

اس نے بے باکی سے میری آنکھوں میں دیکھا۔

’’ایک بات تم بھول رہے ہو شاہ زیب صاحب! میں کبڈی کا کھلاڑی ہوں..... جاپھی کا مطلب سمجھتے ہو نا تم؟ یعنی وہ کھلاڑی جو کبڈی ڈالنے والے کو پکڑتا ہے۔ ایسا شکنجہ لگاتا ہے کہ بھاگنے والا بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں بھی جاپھی ہوں۔ پنجاب میں جہاں جہاں کبڈی کھیلی جاتی ہے وہاں وہاں تمہارے اس خادم کا نام بھی جانا جاتا ہے۔‘‘

’’کیا سمجھانا چاہتے ہو؟‘‘

’’بس اپنی پکڑ کی بات بتا رہا ہوں۔ تمہیں استاد پکڑا ہے تو بس پکڑ لیا ہے..... اور اگر..... تم کہتے ہو تو بڑے ادب کے ساتھ تمہیں اس پکڑ کا مظاہرہ کر کے بھی دکھا سکتا ہوں۔‘‘

’’کس کو پکڑو گے؟‘‘

’’اپنے استاد کو اور کس کو۔ اگر استاد جیت گیا تو چیلا ہار جائے گا اور چپ چاپ سلام کر کے اور اپنی مہران میں بیٹھ کر یہاں سے نکل جائے گا۔ اگر استاد ہار گیا تو اسے اپنے چیلے کی درخواست ماننی ہوگی۔‘‘

میں نے اس کی کالی سیاہ آنکھوں میں دیکھا، وہاں بلا کا اعتماد تھا۔ مجھے سوچتے پا کر جلدی سے بولا۔ ’’لیکن استاد جی ایک گزارش ہے۔ تم مار ماری نہیں کرو گے۔ مار ماری میں، میں تمہاری ہوا کو بھی نہیں چھو سکتا اسی لیے تو استاد مان رہا ہوں تم کو۔‘‘

انیق کی آنکھوں میں اب ایک طرح کا تجسس نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے دلچسپ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’شاہ زیب بھائی! یہ کیا بندہ اپنے پیچھے لگا لائے ہیں آپ؟ بات تو بڑی کڑاکے دار کر رہا ہے۔ آزمانے میں کیا حرج ہے۔‘‘

’’گدھے کے ساتھ تم بھی گدھے مت بنو۔ اس کے بازوؤں کا زور میں نے کل دیکھ لیا ہے سکھیر اپنڈ میں......‘‘

’’نہیں استاد نہیں۔‘‘ اس نے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ’’وہ تو مار کٹائی تھی اور اس میں، میں نے تمہیں استاد مانا...... میری آنے والی نسل نے بھی مانا۔ میں یہاں کبڈی والی پکڑ کی بات کر رہا ہوں۔ اگر خود کو چھڑا لو گے تو چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا۔‘‘

میرے بجائے انیق بولا۔ ’’چلو منظور ہے لیکن اس کھینچا تانی میں اگر تمہارا کوئی ہاتھ پاؤں ٹوٹا تو تم خود ذمے دار ہو گے۔‘‘

’’استاد کی وجہ سے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی سجناں، بس ایک معافی مجھے اِن سے دلا دو۔ یہ مجھے کوئی چوٹ شوٹ نہیں ماریں گے۔‘‘

میں نے کچھ کہنا چاہا مگر انیق نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل بھی چاہنے لگا کہ اس بندے کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کو ذرا پرکھا جائے۔ میرے ذہن میں بار بار مختار جھارا کی تصویر بھی آ رہی تھی۔ جھارا، جیسے خطرناک شخص کی تصویر کسی ایرے غیرے کے بٹوے میں نہیں ہو سکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں اور انیق بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں مہمان خانے کے ہال نما کمرے میں کھڑے تھے۔ یہاں ایک ڈائننگ میز اور سات آٹھ کرسیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ اشیا انیق اور سیفی نے گھسیٹ کر ایک گوشے میں کر دیں۔ سیفی نے اپنی جیکٹ اور قمیص اتار دی۔ اب وہ صرف شلوار پہنے ہوئے تھا، بالائی دھڑ ننگا تھا۔ کسرتی جسم ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ اس نے چھاتی پر اَن مٹ روشنائی سے پنجابی کا ایک شعر لکھوا رکھا تھا۔ اس مختصر شعر کا مطلب کچھ یوں تھا۔ کوئی مرد میدان ہو یا سوہنی کڑی۔ میں نے جس کو بھی پکڑ لیا، اس کو ہاتھ سے چھوڑا نہیں۔

وہ شکل وصورت سے ایسا ہی لگتا تھا۔ تیز طرار پنجابی گبرو، اوپر سے دلیر بھی تھا۔ بہت سی لڑکیاں اس پر مرتی ہوں گی۔ سجاول پر ہر وقت ایک گمبھیر سی خاموشی اور سنجیدگی طاری رہتی تھی لیکن یہ تماشا دیکھنے کے لیے وہ بھی ہال کمرے

میں آگیا۔ ہم نے دونوں دروازے اندر سے بند کر دیے۔
کپڑے پھٹنے کا ڈر تھا اس لیے میں نے بھی بالائی لباس اتار دیا۔ اب میرے بدن پر نیلی جینز کی پینٹ تھی۔ لمبائی کے رخ پر ہال کمرے کی دیواروں کا درمیانی فاصلہ 25 فٹ کے قریب تھا، سیف کا دعویٰ تھا کہ وہ مجھے دیوار کے قریب دبوچے گا اور دوسری دیوار کی طرف بڑھنے سے روک دے گا۔ میرے خیال میں اس دعوے پر پورا اترنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے پنجاب کے بے مثال کبڈی کھیلنے والوں کا ذکر سن رکھا تھا۔ آج اتفاق سے ان میں سے ایک کو پرکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

اس بات کا خدشہ تو نہیں تھا کہ کوئی مہمان خانے کے اس حصے کی طرف آئے گا، پھر بھی انیق نے کھڑکیوں کے پردے اچھی طرح برابر کر دیے، سیف نے ایک بار پھر مجھ سے "درخواست" کی کہ میں اسے کوئی چوٹ نہیں لگاؤں گا..... آخر تماشا شروع ہوا۔ اس نے کبڈی کے کھلاڑیوں کے انداز میں میری ایک کلائی اپنے دونوں ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں لی پھر اچانک پھسل کر میری دونوں ٹانگوں کو اپنے پاؤں کی قینچی ڈال دی۔ یہ عمل اتنا اچانک تھا کہ میں اس کے ساتھ ہی پہلو کے بل ماربل کے فرش پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سیف کی گرفت کی بے انتہا سختی کا اندازہ ہوا۔

وہ بولا۔ "معافی استاد! اور اگلے ایک دو منٹ میں جو بھی ہوگا اس کے لیے بھی معافی۔"

میں نے اپنی ٹانگوں کو اس کی پنڈلیوں کی قینچی سے آزاد کرانے کے لیے زور لگایا۔ ایک سیکنڈ کے لیے یہ قینچی نرم پڑتی محسوس ہوئی مگر پھر اس نے ماہرانہ انداز میں اپنے جسم کو کروٹ کے انداز میں موڑا اور پنڈلیوں کی گرفت پہلے سے بھی بڑھ گئی۔ میں نے زور لگا کر دوسری دیوار کی طرف کھسکنا شروع کیا۔ فرش چکنا تھا اور مجھے کھسکنے میں مدد دے رہا تھا۔ تاہم جلد ہی پنجاب کے اس ماہر جابھی تے پینترا بدلا اور میرے دوسرے ہاتھ کو بھی اپنے بازوؤں کی بندش میں جکڑ لیا۔ میری ٹھوڑی فرش سے ٹکرائی۔ دماغ میں چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ میرا ادھا بازو بے ساختہ حرکت میں آیا۔ مجھے تھوڑی سی گنجائش ملی، اب میں اپنے سر کی طوفانی ضرب سیف کے چہرے پر رسید کر سکتا تھا مگر اچانک یاد آیا کہ ایسا نہیں کرنا۔

وہ کسی کیکڑے کی طرح میرے ساتھ چپک چکا تھا جیسے کسی آہنی شکنجے کے اسکرو کو بیدردی سے گھما دیا گیا تھا۔ "تیری تو....." میں نے پھنکار کر کہا اور خود کو طاقت سے پلٹ کر اسے اپنے نیچے کر لیا لیکن اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ اسی طرح آکٹوپس کے مانند مجھ سے چمٹا رہا۔ ہانپتی ہوئی آواز میں میرے کان میں پھنکارا۔ "مرد اوپر ہو یا نیچے، مرد ہی ہوتا ہے استاد۔"

"دیکھتا ہوں تیری مردانگی کو۔" میں نے اسے چوٹ لگائے بغیر فرش پر زوردار رگڑا دیتے ہوئے کہا۔

ننگا پنڈا تھا، یقیناً اس کی کھال چھل گئی ہوگی مگر اس کی گرفت میں معمولی سا فرق بھی نہیں پڑا۔ میں نے پھر دوسری دیوار کی طرف کھسکنے کے لیے زور لگایا مگر چند انچ سے زیادہ حرکت نہیں کر پایا، اس کی پکڑ نے جیسے میری مشکیں کس ڈالی تھیں۔ انیق میری حوصلہ افزائی کے لیے پکار رہا تھا۔ "شاباش شاہ زیب بھائی! آدھا راستہ طے ہو گیا، ہمت کریں، آگے بڑھیں۔"

سجاول نے بھی مجھے جوش دلانے کے لیے ایک دو لفظ بولے۔ اگر چوٹ نہ لگانے والی شرط نہ ہوتی تو اب تک سیف کا بھرکس نکل چکا ہوتا لیکن اس نے اپنی مرضی کا میدان منتخب کیا تھا۔ کھیل شروع کرنے سے پہلے ہم نے تین منٹ کا وقت مقرر کیا تھا۔ سیف نے کہا تھا کہ کبڈی میں اتنا زیادہ وقت نہیں ہوتا لیکن وہ مجھے پورے تین منٹ کا وقت دے رہا ہے کہ میں خود کو چھڑا کر دوسری دیوار کو ٹچ کر سکوں۔ میں نے بمشکل گردن گھما کر وال کلاک کی طرف دیکھا، مگر سیف کی گرفت میں ایسی سختی تھی کہ میں گردن پوری نہیں گھما پایا۔ کلاک میری نظر سے اوجھل ہی رہا۔

انیق نے میرا مقصد سمجھ لیا اور پکار کر کہا۔ "55 سیکنڈ باقی ہیں شاہی بھائی! کوشش کریں۔"

میں نے ایک بار پھر سیف سمیت دیوار کی طرف کھسکنا شروع کیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ مجھے مکمل طور پر روک نہیں پا رہا تو اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور کچھ نعرے بھی بلند کیے لیکن اس کا واسطہ کسی عام بندے سے نہیں پڑا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا دیوار تک پہنچ گیا۔ تین منٹ پورے ہونے میں اب بھی بیس سیکنڈ باقی تھے۔ سیف نے اپنی آکٹوپس جیسی گرفت ڈھیلی کر دی اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ہارے ہوئے انداز میں فرش پر ہی لیٹا رہا اور لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ انیق نے کسی ریفری کے انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کر فضا میں بلند کیا اور بولا۔ "..... اور ونر ہیں شاہی بھائی، ون اینڈ اونلی....."

میرا زوردار رگڑا لگنے سے سیف کا ایک کندھا جگری

طرح چھلنی ہو گیا تھا اور خون رس رہا تھا۔ اشفاق مرہم پٹی کا سامان لینے کے لیے باہر لپک گیا۔ سجاول عجیب معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''تم گاہے بگاہے اس تصویر والی بات کو درست ثابت کرتے رہتے ہو۔''

''کون سی تصویر؟''

''ایسٹرن کنگ والی۔'' اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

(میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ اسی واقعے کی طرف ہے جب ڈیرے پر سجاول کے باقر نامی کارندے کو مجھ پر شبہ ہو گیا تھا اور وہ کسی نیٹ کیفے سے میری ایسٹرن کنگ والی تصویر اپنے موبائل فون پر منتقل کرا کے لے آیا تھا۔ اس نے سجاول کو بڑے سنسنی خیز انداز میں اطلاع دی تھی کہ میری اصل پہچان کچھ اور ہے)

میں نے سجاول کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور سیف کو فرش سے اٹھنے میں مدد دی۔ کچھ ہی دیر بعد میں اور سیف علیحدہ کمرے میں بیٹھے بات کر رہے تھے۔ اس کے کندھے کی بینڈیج ہو چکی تھی۔ وہ ہار گیا تھا اور اب اپنے وعدے کے مطابق بلاچون وچرا یہاں سے جانے کو تیار تھا لیکن میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اس کے بٹوے میں موجود وہ تصویر دیکھی ہے جس کے چہرے پر کراس کا نشان لگا ہوا ہے۔

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''استاد جی! ہر بندے کی زندگی میں کوئی نہ کوئی پھڈا تو ہوتا ہی ہے۔ ہماری زندگی میں اس بندے کا پھڈا ہے۔''

''یہ ہے کون؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''لاہور میں کسی بہت بڑے بدمعاش کا چمچہ ہے مگر یہاں ہمارے علاقے میں تو یہ خود بہت بڑا بدمعاش ہے اور اس نے کئی چمچے کڑچھے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ہمارے ہی علاقے کا جم پل ہے۔ سکھیرا کے پاس والے گاؤں سلطان پور کا رہنے والا ہے۔ علاقے کے لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے اس نے۔ اس کا ایک ساتھی لودھی بھی ہے جو بہت بڑا باکسر بھی ہے۔ ہمارے علاقے میں ایک بہت بڑا میلہ ہوتا ہے۔ کوئی دو ڈھائی سال پہلے اس میلے میں لودھی باکسر نے ماچھیوں کی ایک لڑکی سے چھیڑ خانی کی اور پھر ایسا اس کے پیچھے پڑا کہ ایک دن اسے اٹھا کر ہی لے گیا۔ لڑکی کے گھر والے اتنے تگڑے نہیں تھے، وہ رو دھو کر چپ ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے لودھی اور جھارے وغیرہ کے ساتھ صلح کر لی اور لڑکی کا نکاح لودھی کے ساتھ کر دیا۔ انہوں نے تو یہ بات ہضم کر لی مگر سکھیرا گاؤں کے بہت سے لوگوں کو یہ ہضم نہیں ہوئی اور ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔''

سیف کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ انکشاف بھی ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے گاؤں میں رہتے ہوئے ایک خطرناک بندے سے متھا لگا رکھا ہے۔ وہ آگ سے کھیل رہا تھا اور شاید ابھی اسے اس آگ کی تپش کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''تم نے اس تصویر پر کاٹے کا نشان کیوں لگا رکھا ہے؟''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''یہ نشان اس تصویر پر نہیں میرے دل پر لگا ہوا ہے استاد جی۔ وہ لڑکی ثمینہ گاؤں کی عزت تھی اور وہ اس لودھی نے زبردستی اپنے گھر میں ڈالی ہوئی ہے۔ جھارا اس کی پوری پوری سپورٹ کر رہا ہے۔ میری طرح گاؤں کے اور بھی چار چھ لڑکے ہیں جنہوں نے اس بات پر جھارے سے ٹکر لی ہوئی ہے۔ تین چار بار ہم میں جھڑپ بھی ہوئی ہے۔ ایک بار گولی بھی چلی تھی جس میں ہمارے پنڈ کے نمبردار کا پتر زخمی ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک بیساکھی کے سہارے چل رہا ہے۔''

''یہ تو بڑے خطرناک راستے پر چل رہے ہو تم لوگ۔''

''جو کچھ بھی استاد جی، اس لڑکی ثمینہ والی بات تو اب آئی گئی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے حال پر راضی ہے۔ ایک بچے کی ماں بھی بن گئی ہے۔ پر جھارے سے ہماری دشمنی پکی ہو چکی ہے۔ کہتے ہیں کہ ڈائن بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے اور اس نے اپنے پڑوسی گاؤں کی لڑکی کے ساتھ یہ سب کچھ کرایا۔ ہم چند لڑکوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ جھارے سے بدلہ ضرور لینا ہے...... اور یہ بھی کہ آئندہ کوئی ایسا واقعہ ہونے نہیں دینا...... کل جب بشارت وغیرہ نے آپ کو اپنے اسکوٹر کے پاس مشکوک انداز میں کھڑے دیکھا تو وہ چوکنے ہو گئے۔ انہیں شبہ ہوا کہ شاید آپ باغ میں لڑکیوں کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے لیے مجھے افسوس ہے اور شرمندگی بھی۔''

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ کل رات میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ بندہ جی دار ہے اور اسلحہ شناس بھی۔ اگر ضد کر رہا ہے تو کیوں نا اسے واقعی ساتھ رکھ لیا جائے لیکن پھر ساتھ ہی یہ خیال بھی آ گیا کہ گبرو جوان ہے۔ کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ اس کے شب و روز کو خطرے

میں کیوں ڈالا جائے۔ اب یہ جاننے کے بعد کہ یہ تو پہلے سے ہی شدید خطرے میں گھرا ہوا ہے اور ہمارے جیسے بندے سے متھا لگا کر بیٹھا ہوا ہے، مجھے اپنی رائے بدلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ویسے بھی تھوڑی دیر پہلے ''پکڑا پکڑی'' کی جدوجہد کے دوران میں، میں نے اس کے اندر ''شدید مزاحمت'' کی جو صلاحیت دیکھی تھی، اس نے مجھے متاثر کیا تھا۔

اس کی رام کہانی سننے کے بعد میں نے اسے بتایا کہ اس نے جس بندے سے دشمنی پال رکھی ہے، اسے تھوڑا بہت میں بھی جانتا ہوں۔ وہ لاہور شہر کے ایک بڑے گینگسٹر داؤد بھاؤ کا کارندہ ہے۔

وہ بولا۔ ''جی ہاں...... داؤد بھاؤ...... یہی نام سنا ہوا ہے ہم نے۔ سنا ہے بہت بڑی بلا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے...... اس ہمارے سے ہم نے کہیں نہ کہیں حساب چکانا ضرور ہے۔ آج نہ سہی، کل سہی۔ کل نہ سہی پانچ سال بعد سہی......'' وہ دیر تک اس بارے میں بولتا رہا۔

یقیناً وہ ٹھیک سے نہیں جانتا تھا کہ جن لوگوں سے اس نے ٹکر لی ہوئی ہے، وہ اس سے بہت آگے کی چیز ہیں۔ بات کرتے ہوئے وہ گاہے بگاہے اپنا زخمی کندھا بھی دباتا تھا۔ اپنی ہار کی ندامت اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟''

''اب تو جو ارادہ ہونا ہے آپ کا ہی ہونا ہے۔'' اب وہ مجھے احترام سے مخاطب کر رہا تھا۔

''اپنا ارادہ تو میں نے تمہیں بتایا تھا۔''

وہ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ٹھیک ہے جی۔ گستاخیوں کی معافی۔ اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو چلا جاتا ہوں۔''

''لیکن اگر میں کہوں کہ میں ایسا نہیں چاہتا تو؟''

وہ ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی...... خوشی سے اس کے ہونٹ بے ساختہ لرز رہے تھے۔

☆☆☆
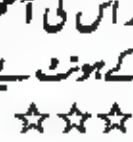
اور اب ہم برونائی کی طرف محو پرواز تھے۔ یہ ایک گلف اسٹریم 450 چارٹرڈ طیارہ تھا۔ بڑے صاحب ریان فردوس اور ان کی فیملی کے علاوہ آقا جان اور اس کی بیوی میڈم لورین بھی طیارے میں موجود تھے۔ یہ سب لوگ علیحدہ اپارٹمنٹ میں تھے۔ میں، ایش اور سجاول، چند دیگر افراد کے ساتھ طیارے کے پچھلے حصے میں تھے۔ ان افراد میں چند خواتین بھی شامل تھیں۔ خواتین میں سنبل نمایاں تھی جو آج کل بڑے صاحب کی منظورِ نظر بنی ہوئی تھی مگر اس وقت وہ بھی اداس بیٹھی تھی۔ بڑے صاحب کو بہت ''مرغوب'' ہونے کے باوجود وہ آج کل اس کی نگاہِ التفات سے محروم تھی۔ آتشزدگی والے واقعے کے بعد اس کے خوب صورت بال قینچ کر دیے گئے تھے اور انہیں ڈیانا کٹ والا اسٹائل دے دیا گیا تھا۔ یہ اسٹائل بھی اس پر جچتا تھا۔ وہ ایک دوشیزہ کی حیثیت سے تحفتاً بڑے صاحب کی خدمت میں پیش ہوئی تھی اور اس نے واقعی ادھیڑ عمر بڑے صاحب کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ بڑے صاحب کے لوٹ پوٹ ہونے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ اس نے اپنی دیرینہ روایت توڑی تھی اور ''تین چاند'' پورے ہونے سے پہلے ہی سنبل کو اپنی خدمت میں طلب کر لیا تھا...... اور روحی جو پہلے سے اس کی خدمت میں موجود تھی، رقابت کی زد میں آ گئی تھی۔ سنبل کے لبادے کو آگ لگانے کے جرم میں نہ صرف اس نے بید کھائے تھے بلکہ اب جنگن کی حیثیت سے پارا ہاؤس کے واش روم صاف کر رہی تھی۔

سنبل کی نشست مجھ سے تین چار فٹ کے فاصلے پر تھی۔ سنا تھا کہ اس نے اپنا سفید مینا بھی ساتھ لانے کی ضد کی تھی لیکن وہ اس پرواز میں نہیں آ سکا تھا، تاہم بڑے صاحب نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دو چار روز میں اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے، اپنے مینے کے لیے اداس ہو؟''

''ہوں۔'' اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''اس کا کیا بنا؟''

میں سمجھ گیا کہ وہ رضوان کی بات کر رہی ہے۔ ''وہ بالکل محفوظ ہے اور اپنے گھر پہنچ چکا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''سچ کہہ رہے ہیں؟'' اس نے سرگوشی میں تصدیق چاہی۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے نشست کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ میرا دھیان سکیسر اگاؤں میں گزاری ہوئی اس دوپہر کی طرف چلا گیا جس میں، میں نے اپنی محبوب ترین ہستی کی کچھ جھلکیاں دیکھی تھیں۔ اس ''خوش رنگ باغ'' کے سارے مناظر آنکھوں کے سامنے سے گزرتے چلے گئے اور وہ ساری دلکش آوازیں کانوں میں گونجیں جو میں نے

وہاں سی تھیں پھر میرا دھیان سیف کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی عجیب کردار تھا۔ پنجاب کے کھیتوں میں اُگنے والے اونچے لمبے درختوں کی طرح کڑیل۔۔۔۔۔۔ لیکن تھوڑا سا سنکی۔ سیف کو بھی ہمارے ساتھ آنا تھا لیکن ابھی اس کے سفری کاغذات تیار نہیں ہوئے تھے۔ امید تھی کہ وہ اگلی کھیپ کے ساتھ پہنچے گا۔

ہم نے لاہور سے پرواز کی تھی اور اب انڈیا اور خلیج بنگال کے اوپر سے ہوتے ہوئے ملائیشیا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ رات کا وقت تھا۔ نیچے بس کہیں کہیں روشنیوں کے جگنو جیسے ہی نظر آتے تھے۔ جیسے تاریکی کے سمندر میں روشن نقطوں کے جزیرے ہوں۔ ہماری منزل بھی ایک جزیرہ ہی تھی۔ پہلے ہمارا خیال یہی تھا کہ یہ برونائی کا کوئی ساحلی جزیرہ ہے لیکن ہمیں برونائی کے ساحل سے کم و بیش ایک ہزار کلومیٹر آگے جانا پڑا۔ جب جہاز میں لینڈنگ کا اعلان ہوا، رات کے تین بجے تھے۔ اوپر سے تو یہ جزیرہ خاصا مختصر نظر آیا لیکن جوں جوں ہم زمین کے قریب ہوتے گئے اس کی وسعت بڑھتی گئی۔ چوڑائی کم تھی لیکن لمبائی کے رخ پر یہ بیس پچیس میل سے کم نہیں تھا۔ یہ کافی آباد بھی نظر آتا تھا۔ پہاڑیوں کے آثار بھی تھے۔ ہم ایک چھوٹے ائرپورٹ پر اترے اور پھر جہاز سے باہر آگئے۔ پاکستان کی کڑاکے دار سردی کے بجائے یہاں موسم قدرے مرطوب تھا۔ رات پچھلے پہر، پانی سے بوجھل ہوا چل رہی تھی۔ ائرپورٹ سے باہر آئے تو حیرت زدہ رہ گئے۔ قیمتی گاڑیوں کی طویل قطار ہمارے استقبال کے لیے موجود تھی۔ باوردی مسلح گارڈز دو رویہ یوں کھڑے تھے جیسے کسی شاہی مہمان کا استقبال ہونے والا ہو۔ دور تک سرخ کارپٹ دکھائی دے رہا تھا۔ انیق سرگوشی میں بولا۔ ”لگتا ہے کہ یہ لوگ ہم تینوں سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگئے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہمارا تو پتا نہیں لیکن تم سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے، تمہاری شخصیت میں رعب داب بھی تو بہت ہے۔“

”آپ مذاق کرلیں لیکن اگر بات صرف قد کاٹھ اور جُثے کی ہوتی تو پھر دلیپ کمار اور ندیم جیسے لوگ فلم انڈسٹری پر راج نہ کرتے۔۔۔۔۔۔ اور جنگل میں شیر کے بجائے زرافے اور اونٹ وغیرہ کی بادشاہت ہوتی۔“

”اچھا شیر صاحب! سرگوشیاں نہ کیجیے۔ یہ نہ ہو کہ کوئی سیکورٹی والا آپ کی دم میں نمدہ فٹ کردے۔“

”کچھ شیر ٹوشل کے بغیر ہوتے ہیں جن کی دم ہی نہ ہو ان کو نمدہ کیسے فٹ کیا جاسکتا ہے؟“

عزت مآب دریان فردوس کو دو خوش رو لڑکیوں نے باقاعدہ گلدستے پیش کیے اور پھر انہیں اپنی بیگم، بیٹوں اور کچھ دیگر اہل خانہ کے ساتھ سیاہ رنگ کی شاندار لیموزین میں بٹھا دیا گیا۔ آگے پیچھے مسلح گارڈز کی گاڑیاں اور ہیوی بائیکس تھیں۔ پروٹوکول کے افسران لوگوں کو درجہ بدرجہ مختلف گاڑیوں میں سوار کراتے رہے۔ ہم بھی ایک مرسیڈیز میں سوار ہوئے۔ موٹر بائیکس کے ہوٹرز گونجے اور یہ قافلہ شہر کی تقریباً خالی سڑکوں پر فراٹے بھرتا ہوا، پندرہ بیس منٹ بعد ایک شاندار محل نما عمارت کے سامنے پہنچ گیا۔

اس عمارت کی شان و شوکت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ تقریباً ویسی ہی عمارت تھی جیسی یہ لوگ لیہ کے نزدیک پارا ہاؤس کے پاس تعمیر کررہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ عمارت ابھی زیر تعمیر تھی اور اسے تعمیر ہوئے غالباً چند سال گزر چکے تھے۔ یہاں ہمیں دراز قد باوردی دربان، گھوڑا گاڑیاں اور بگھیاں وغیرہ بھی دکھائی دیں۔ ہمیں کچھ دیگر افراد کے ساتھ اس عمارت کی وسیع انیکسی میں پہنچا دیا گیا۔ یہ انیکسی بھی کسی سیون اسٹار ہوٹل سے کم نہیں تھی۔ کم از کم جس پورشن میں ہمیں پہنچایا گیا، وہ تو بالکل وی آئی پی تھا۔ بلند دروازے، دیدہ زیب چھتیں، قیمتی قالین اور غالیچے، باتھ روم ایسے کشادہ و آرام دہ تھے کہ انیق نے دیکھتے ہی کہہ دیا کہ وہ تو سونا بھی یہیں پر پسند کرے گا۔

پارا ہاؤس کی طرح اس رہائش گاہ میں بھی زبردست سیکورٹی نظر آرہی تھی۔ جگہ جگہ سی سی ٹی وی کیمروں کی موجودگی بھی ثابت ہوتی تھی۔ ریڈ الرٹ والے سارے انتظامات دکھائی دیتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک طرح کا ہراس بھی یہاں نظر آرہا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ ابھی کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں کیا صورت حال درپیش ہے۔ میں نے لگژری باتھ روم میں نیم ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور سب کچھ صبح پر چھوڑ کر سو گیا۔

میری آنکھ ایک نامانوس شور سے کھلی تھی۔ کھڑکی کھول کر دیکھا تو کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بہرحال نعروں اور للکاروں کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ یہ جو کچھ بھی تھا، شاید اس عظیم الشان ولا کی چار دیواری سے باہر تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک بڑا جلوس ہے جو فصیل نما چار دیواری سے باہر جمع ہے۔ اتنے میں انیق بھی میرے کمرے میں پہنچ گیا۔

”یہ کیا ہورہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ”یہاں سے آپ کو کچھ نظر نہیں آئے گا۔ آپ

کو چھت پر چلنا ہوگا۔ بہت سے لوگ باہر میدان میں جمع ہیں۔ عزت مآب ریان فردوس کے حق میں نعرے بازی کررہے ہیں۔''

''لیکن یہ تو بہت غصے میں لگتے ہیں۔''

''یہ غصہ عزت مآب کے دشمنوں کے لیے ہے۔ وہ ان کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کررہے ہیں۔''

''یعنی وہی ریان فردوس کا سوتیلا بیٹا اور اس کی والدہ؟''

''نہیں، ابھی ٹھیک سے پتا نہیں چل رہا۔ یہ بار بار امریکن اور امریکن ایجنسی کے لفظ بھی استعمال کررہے ہیں۔ ابھی انہوں نے دو پُتلے جلائے ہیں۔ وہ بھی امریکیوں کے ہی لگتے تھے یا پھر برٹش ہوں گے۔''

سجاول ابھی تک سویا پڑا تھا۔ میں جلدی سے کپڑے بدل کر اتیق کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ہم ایک سبک لفٹ کے ذریعے تیسری منزل کی چھت پر پہنچے، یہاں سے اس محل نما عمارت کا صدر دروازہ صاف نظر آرہا تھا۔ دروازے کے بالکل قریب ہی بلندی پر ایک بہت بڑا جھروکا سا تھا۔ شاید یہاں کھڑے ہوکر ریان فردوس اپنے لوگوں کو اپنے درشن کراتا ہوگا۔ لوگ اس جھروکے کے سامنے جمع تھے۔ ان کی تعداد ایک ہزار سے کم نہیں ہوگی۔ وہ زیادہ تر ملائیشین اور برونائی طرز کے لباس میں تھے۔ اکثر کے پاس آتشیں ہتھیار یا لاٹھیاں وغیرہ نظر آرہی تھیں۔ ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے اور آنکھوں سے شعلے نکلتے محسوس ہوتے تھے۔

کچھ لوگوں کے پاس بڑے بڑے کتبے بھی تھے جن پر ملائی زبان میں نعرے وغیرہ لکھے تھے۔ چند کتبے انگلش میں بھی نظر آئے۔ ایک کتبے پر درج تھا۔ ''عزت مآب آپ حکم دیں۔ ہم کٹ مرنے کے لیے تیار ہیں۔'' ایک کتبے کی تحریر تھی۔ ''ظلم حد سے بڑھ چکا، اب خاموشی کا مطلب موت ہے۔''

اتیق نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ یہ لوگ ریان فردوس کو بالکونی میں دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کو اپنے مطالبات پیش کرنا چاہتے ہیں۔''

بالکونی میں کچھ باوردی آفیسرز موجود تھے اور وہ میگا فون کے ذریعے گاہے بگاہے لوگوں کو نظم و ضبط اور صبر کی تلقین کررہے تھے۔ ان کی وردیاں سبز رنگ کی تھیں۔

چند منٹ مزید گزر گئے۔ لوگوں کا جوش و خروش بڑھتا چلا گیا۔ اتیق نے کہا۔ ''زیادہ تر نعرے بازی کسی امریکن ایجنسی کے خلاف ہی ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ بہت سے امریکی بھی اس جزیرے کے باشندوں میں شامل ہیں۔''

ریان فردوس تو جھروکے میں نہیں آیا لیکن ایک لڑکی آگئی۔ ہم اسے کافی فاصلے سے دیکھ رہے تھے مگر اس کے خدوخال واضح تھے۔ وہ قبول صورت تھی۔ بڑی دبنگ چال چلتی ہوئی وہ جھروکے میں پہنچی۔ اس نے کوئی یونیفارم ٹائپ لباس پہن رکھا تھا۔ آستینیں اڑسی ہوئیں، کمر سیدھی، سینہ تنا ہوا۔ اس کے بال بوائے کٹ تھے اور اگر اس کے جسم پر دھیان نہ دیا جاتا تو وہ ایک خوش شکل لڑکا ہی دکھائی دیتی تھی۔ وہ جھروکے میں پہنچی تو پروٹوکول کا عملہ اٹینشن ہوگیا۔ ایک آفیسر نے جھک کر بڑے ادب سے مائیک کا کلپ لڑکی کی کالر سے لگا دیا۔ اسے دیکھ کر ہجوم نے ملے جلے نعرے لگائے۔ ان میں سے کچھ شاید اب بھی ریان فردوس کو ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ بولی تو اس کی آواز بھی چال ڈھال کی طرح رعب دار تھی۔ وہ لوگوں سے مخاطب ہوئی تو شور کم ہوگیا اور لوگ توجہ سے سننے لگے۔ وہ ملائی بول رہی تھی۔ اتیق میرے لیے ترجمہ کرنے لگا۔ لڑکی کی تقریر مختصر سی تھی۔

''میرے بھائیو! بہنو اور بزرگو! آپ کے جذبات کا عزت مآب کو بہت اچھی طرح علم ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ اس سلسلے میں آپ سے زیادہ فکرمند ہیں۔ وہ سفر سے تھکے ہوئے ہیں اور کچھ علیل بھی ہیں اس لیے انہیں سکتے۔ ان کی طرف سے میں آپ کو بتاتی ہوں کہ اب ہم انشاء اللہ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ میں جو کچھ سامنے آیا ہے، اس کے بعد اصل دشمن کی پہچان بہت اچھے طریقے سے ہوگئی ہے۔ یہ دشمن ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ ہمیں اس کو کچلنا ہوگا۔''

لوگوں نے فلک شگاف نعرے لگائے۔ لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور مٹھیاں بھینچ کر نعروں کا جواب دیا۔ جھروکے میں اس کے ساتھ کھڑے باوردی افسران نے بھی ایک ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر مکا لہرایا۔

لڑکی دوبارہ بلند آواز میں بولی۔ ''بس تھوڑا انتظار کیجیے...... بہت تھوڑا...... اپنی صفوں میں ڈسپلن برقرار رکھیے۔ عزت مآب اگلے چوبیس گھنٹوں میں بہت اہم فیصلے کرنے والے ہیں۔ ہم خون خرابے سے بچنے کے لیے آخری حد تک گئے ہیں اور اب بھی آخری کوششیں کررہے ہیں مگر جو کچھ ہونے والا ہے، وہ سامنے دیوار پر لکھا نظر آرہا ہے۔''

ایک بار پھر پُرجوش نعرے بلند کیے گئے اور ہجوم کے کسی گوشے میں سے ہوائی فائرنگ کی آواز بھی سنائی دی۔ صبر و تحمل کی تلقین کرنے کے بعد لڑکی نے لوگوں کو الوداع کہا اور گارڈز کے ساتھ بڑی مردانہ چال چلتی پُرشکوہ جھروکے میں اوجھل ہوگئی۔

''یہ کون ہے؟'' میں نے انیق سے پوچھا۔

''شک تو مجھے بھی ہو رہا ہے...... لیکن...... ہے یہ لڑکی ہی۔''

''ایک چیز ماروں گا۔ کچھ اندازہ ہوا کہ اس نے کس حیثیت سے تقریر کی ہے۔''

''اس کے لہجے میں بڑی آگ تھی اور دکھ بھی لہریں لے رہا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ بڑی بیگم کے مقتول بھائی کی کچھ لگتی ہوگی...... بیوی، بہن یا پھر بیٹی بھی ہو سکتی ہے۔''

چھت پر سے عمارت کے اردگرد کا علاقہ دور تک نظر آرہا تھا۔ یہ بڑی شاداب جگہ تھی۔ حدِ نگاہ تک جدید طرز کے مکان تھے۔ ٹی وی کے بے شمار اینٹینا بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کشادہ چمکیلی سڑکوں پر نئی نکیلی گاڑیاں پھسل رہی تھیں۔ پام کے بلند درخت تازہ ساحلی ہوا میں ہلکورے لیتے تھے اور فضا میں گلاب اور ٹیولپ کے ان بے شمار پھولوں کی مہک تھی جو اس محل میں اور رہائشی علاقے کی بالکونیوں سے جھانک رہے تھے۔ دور سمندر کا نیلا پانی اور اس میں تیرتی ہوئی خوش رنگ کشتیاں بھی جھلک رہی تھیں۔ بہرطور ان ساری خوب صورتیوں کو ایک خاص قسم کی کشیدگی اور تناؤ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جیسے کوئی تنا ہوا رسا ہو جو کسی بھی پل بے پناہ دباؤ کی وجہ سے ٹوٹ سکتا ہو۔

دوپہر کا کھانا ایسے ہی تھا جیسے ہم بکنگھم پیلس میں کھا رہے ہوں۔ دستانے پہنے ہوئے خوش پوش ویٹرز، انتہائی قیمتی کراکری اور بے حد نایاب ڈشز۔ انیق نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''کاش ہم پہلوان حشمت کو ساتھ لا سکتے۔''

سہ پہر تین بجے کے قریب محل کے اندرونی حصے میں کوئی ہنگامی میٹنگ شروع ہوئی جو شام پانچ بجے تک جاری رہی۔ میٹنگ برخاست ہونے کے بعد عزت مآب کی طرف سے مجھے اور سجاول کو اندر طلب کیا گیا۔ عمارت کا اندرونی حصہ آرائش و زیبائش کی قابلِ دید مثال تھا۔ یوں لگتا تھا کہ تیل کی دولت کا بڑا حصہ اس عمارت اور گردونواح کی عمارتوں کی شان و شوکت میں کھپا دیا گیا ہے۔ ہمیں نشست گاہ میں لے جانے کے بجائے براہِ راست ڈائننگ ہال میں لے جایا گیا۔ بڑا صاحب، ریان فردوس اور اس کے دونوں فرزند ابراہیم اور کمال بھی یہاں موجود تھے۔ آقا جان اور علی کے علاوہ کچھ اور باوردی افسران بھی یہاں دکھائی دے رہے تھے۔ ایک بڑی میز پر شام کی چائے کے لوازمات چنے گئے تھے۔ یہ ''ہائی ٹی'' طرز کی چائے تھی۔ باوردی ملازمین دیدہ زیب طشتریوں کے ساتھ چکرا رہے تھے۔ کہنے کو تو یہ روزمرہ کی چائے تھی لیکن کسی بڑی دعوت کی سج دھج لیے ہوئے تھی۔ زعفرانی کوفتے، چکن کے سیخ کباب، تلی ہوئی مچھلی کے کتلے، کاغذی سموسے جن میں ایرانی آلو اور مٹن کا آمیزہ بھرا گیا تھا۔ شاہی ٹکڑے، حلوہ، اسنیکس، ملائیشین طرز کی مٹھائیاں اور نجانے کیا کچھ چائے کے ساتھ موجود تھا۔ بڑے صاحب کی آن بان ہم نے لیہ کے پاراہاؤس میں بھی دیکھی تھی مگر یہاں آکر اس میں کئی گنا اضافہ نظر آیا تھا۔ سجاول چونکہ بڑی بیگم کے ''بھائی'' کی حیثیت اختیار کر گیا تھا اس لیے بڑے صاحب نے اسے اپنے قریب جگہ دی۔ بڑے صاحب کو عورت، شراب، سگار اور گلاب کے علاوہ کباب، یعنی کھانے سے بھی خاصی رغبت تھی اور اس کا ثبوت یہ بے انتہا سجی ہوئی میز بھی تھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ دونوں بھائی ابراہیم اور کمال ایک ساتھ بیٹھے ہیں اور ان کے لیے لوازمات کی اسپیشل دو تین طشتریاں ہیں۔

ہم چائے پی رہے تھے جب تیز قدموں کی چاپ ابھری۔ دروازے پر کھڑے باوردی گارڈز نے کھٹا کھٹ سیلیوٹ کیے اور وہی بجلی بانکی لڑکی و بنگ چال چلتی اندر آگئی جسے ہم نے صبح وسیع و عریض جھروکے میں دیکھا تھا۔ وہ اب بھی ایک یونیفارم نما لباس میں تھی۔ کمر سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔ بڑے صاحب نے اس کے لیے ملائی زبان میں، جو الفاظ کہے وہ کچھ اس طرح کے تھے۔ ''آؤ...... آؤ...... خوش آمدید...... بیٹھو میری بچی۔''

(ملائی زبان اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آنا شروع ہوگئی تھی۔ میں لیہ میں قیام کے دوران میں بھی اس کی مشق کرتا رہا تھا)

لڑکی نے انواع و اقسام کے کھانوں سے سجی ہوئی میز کو قدرے ناگواری سے دیکھا۔ ایک باوردی دربان نے اس کے لیے کرسی پیچھے ہٹائی اور وہ بیٹھ گئی۔ بڑے صاحب کی طرف سے اسے کچھ لینے کے لیے کہا گیا لیکن اس نے نفی میں سر ہلایا اور چائے کی چند چسکیاں لینے پر اکتفا کیا۔ اسی دوران میں بڑے صاحب کے حکم پر علی نے لڑکی سے ہمارا تعارف بھی کرایا۔

وہ سجاول سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہ جنابہ قسطینا ہیں۔ ... ایسا نہیں ہے۔''

ہم سب کے لیے قابلِ صد احترام...... اور عزت مآب کی بھتیجی...... یہ جناب آدم شہاب کی دختر ہیں جو پچھلے دنوں شہادت پا گئے ہیں۔''

اس کے بعد حلمی نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یور ہائی نس! اور یہ مسٹر سجاول ہیں...... یہ ان کے ساتھی مسٹر شاہ زیب ہیں۔ ان کا تھوڑا سا ذکر آپ سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ انہوں نے پارا ہاؤس پر ناقب وغیرہ کے شب خون کے وقت بڑی بے جگری سے پارا ہاؤس کے دفاع میں حصہ لیا۔ مسٹر سجاول قریباً آدھ گھنٹے تک ہز ہائی نس بڑی بیگم کے سامنے ڈھال بنے رہے۔ یہ تاریخی لمحات سی سی ٹی وی کیمروں میں محفوظ ہیں۔ بعد ازاں چھوٹے صاحب کو ناقب کے گینگ سے آزاد کرانے میں بھی مسٹر سجاول اور مسٹر شاہ زیب کا اہم کردار رہا۔''

ہم دونوں نے سر جھکا کر اس قسطینا نامی لڑکی کو سلام کیا۔ اس نے بھی سر کو خفیف انداز میں حرکت دی۔ وہ بڑے تناؤ میں لگ رہی تھی۔ چائے ختم ہوئی تو سب سامنے والی دیوار کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہاں ایک بڑی ایل سی ڈی آویزاں تھی۔ قسطینا کے حکم پر ایک دربان نے یو ایس بی ڈال کر ایل سی ڈی کو آن کیا۔ ایک چونکا دینے والا منظر دکھائی دینے لگا۔ یہ اس جزیرے کا ہی کوئی حصہ تھا۔ پام کے درخت، سرسبز ٹیلے اور شفاف سڑکیں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ ایک بارونق سڑک تھی۔ ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ ایک سیاہ کار جس کی کھڑکیوں کے شیشے ٹنڈڈ تھے، ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے آ کر رکی۔ اس میں سے دو افراد برآمد ہوئے۔ ان میں سے ایک دراز قامت سفید فام تھا۔ اس کا چہرہ کافی لمبا تھا۔ اس نے ایک رین کوٹ پہن رکھا تھا جس کی ٹوپی اس کے سر پر تھی۔ سیاہ شیشوں والی عینک کی وجہ سے اس کی شکل ٹھیک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک پادری ٹائپ شخص تھا۔ ہوٹل کے دروازے پر دو افراد استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان میں سے ایک بارعب مقامی شخص تھا۔ بہت تومند اور گول مٹول۔ اس نے فرنچ کٹ داڑھی رکھی ہوئی تھی اور برونائی کا ہی لگتا تھا۔ دونوں کے ہاتھ میں چھتریاں تھیں۔ وہ آنے والوں کو چھتریوں کے نیچے ہوٹل کے اندر لے گئے۔

یہ وڈیو کلپ یہاں ختم ہو گیا۔ قسطینا نے ٹھہری ہوئی آواز میں حاضرین کو مخاطب کیا۔ ''یہاں اس خبیث نے رین کوٹ پہنا ہوا ہے۔ شکل صاف نظر نہیں آ رہی لیکن آگے کلپ میں

اس نے دوبارہ وڈیو چلائی، اس مرتبہ وہی گرے کار، ایک نائٹ کلب کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک شخص کلب کے اندر سے برآمد ہوا۔ اس نے پی کیپ اور چشمہ پہن رکھا تھا۔ یہ وہی پہلے کلپ والا دراز قد شخص تھا۔ تب اس کے ساتھ پادری تھا، اب پادری کے بالکل برعکس ''چیز'' تھی۔ ایک خوبرو لڑکی جس کے جسم پر لباس کے نام پر آدھا میٹر کپڑا ہی ہوگا۔ لمبے چہرے والا وہ دراز قد شخص تیزی سے کار میں داخل ہو گیا۔ اس عمل کے دوران میں ایک دو سیکنڈ ایسے بھی آئے جب اس کا چہرہ کافی صاف دکھائی دیا۔ قسطینا نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے وڈیو کو یہاں ''پاز'' کر دیا۔ لمبے چہرے والا کوئی امریکن ہی لگتا تھا۔ اس کی ناک کی سائڈ پر ایک چھوٹا سا مسا بھی تھا۔ قسطینا نے تصویر کو انلارج کر کے اس مسے کو نمایاں کیا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اب شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں۔''

یہ الفاظ اس نے انگلش میں کہے تھے۔ وہ مقامی ہونے کے باوجود اپنی گفتگو میں کئی فقرے انگلش میں ادا کرتی تھی۔

ڈائننگ ہال میں موجود سبھی افراد کے چہروں پر سراسیمگی اور سنسنی نظر آ رہی تھی۔ حلمی اور آقا جان کے چہرے بھی تمتمائے ہوئے تھے۔ قسطینا نے شعلہ فشاں نگاہوں سے اسکرین کی طرف دیکھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں دکھ آمیز طیش کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہمیں بتایا گیا تھا کہ قسطینا کے والد محترم آدم کو مخالفین نے ایک بڑے حملے کے دوران میں شہید کیا ہے۔ قسطینا کی آنکھوں میں جو کچھ بھی نظر آ رہا تھا، وہ یقیناً اسی قتل اور خونریزی سے نسبت رکھتا تھا۔ اپنے باپ کی موت پر وہ سراپا انتقام تھی۔

اس کے سامنے بیٹھے ابراہیم نے دھیمی آواز میں اس سے کچھ کہا۔ وہ آگے کو جھک کر اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر جذباتی لہجے میں بولی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو میرے پیارے بھائی، لیکن اب ان لوگوں نے ہمارے سامنے کوئی دوسرا راستہ چھوڑا ہی نہیں ہے۔ ان بدبختوں نے ہمارے اندر رہتے ہوئے ہماری جڑیں کاٹی ہیں اور دن رات کاٹ رہے ہیں۔ اصل دشمن اب بے نقاب ہو چکے ہیں۔'' اس کی آواز میں پھنکار تھی۔

یہ ''اصل دشمن'' والا لفظ میں دوسری تیسری بار سن رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ امریکی باشندے جو ہر بین الاقوامی مسئلے میں اپنی ''ٹانگ شریف'' اڑانا پیدائشی حق سمجھتے ہیں یہاں

بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں اور ''اصل دشمن'' کا خطاب انہی کو دیا جا رہا ہے۔ ابھی وڈیو کلپ میں جو بندہ نظر آیا تھا، وہ بھی امریکی ہی لگتا تھا۔ کم از کم میرا تجربہ تو یہی کہتا تھا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہاں پر جو گفتگو ہوئی، وہ کافی جذباتی تھی۔ زیادہ تر گفتگو ملائی میں تھی لیکن کئی جگہوں پر انگلش جملے بھی بولے گئے جو کچھ میرے پلے پڑا اس سے یہی پتا چلا کہ یہاں بھی وہی تقسیم کرو، لڑاؤ...... اور فائدہ اٹھاؤ والا کلیہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ ابراہیم اور کمال کے سوتیلے بھائی نے تو بے شک دشمنی کا جھنڈا گاڑ رکھا تھا لیکن اس جھنڈے کو زور شور سے لہرانے اور پھڑپھڑانے کے لیے ہوا کچھ اور ذریعوں سے مہیا ہو رہی تھی۔ ذہین و فطین غیر ملکی گروہ یہاں کچھ گہری چالیں چل رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس خوب صورت آئی لینڈ پر اپنا تسلط مضبوط کر رہا تھا۔

قسطینا کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ بوائے کٹ بال ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ وہ بات کرتے کرتے گاہے بگاہے بے دھیانی میں میز پر مکا رسید کرتی تھی اور برتن جھنجھنا اٹھتے تھے۔ وہ زیادہ تر بڑے صاحب، آقا جان اور حلمی وغیرہ کو ہی مخاطب کر رہی تھی۔ دیگر افراد کی طرف اس کی توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ بڑے صاحب کا رویہ اب بھی دھیما اور شش و پنج والا تھا۔ بڑے صاحب کے الفاظ تو پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے تاہم پتا یہی چل رہا تھا کہ وہ اب بھی کوئی افہام و تفہیم کا راستہ نکالنا چاہتا ہے اور دشمن کی طاقت سے بری طرح خوف زدہ ہے۔ ابراہیم اور کمال کے بارے میں بھی یہی بات کچھ کم شدت کے ساتھ کہی جا سکتی تھی۔ وہ دونوں گم صم تھے۔ ان کی کزن (قسطینا) گاہے بگاہے انہیں بھی مخاطب کرتی تھی اور نسبتاً نرم لہجے میں کچھ پوچھتی تھی۔ اس کے جواب میں وہ دونوں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتے تھے۔ کسی وقت ابراہیم کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو جاتا تھا۔

اچانک ایک شور در و دیوار میں گونجنے لگا۔ شہر کے کسی حصے سے فائرنگ کی مدھم آوازیں بھی ابھریں۔ قسطینا نے گارڈز کی طرف دیکھا۔ اسی دوران میں دو باوردی آفیسرز لپکتے ہوئے اندر آئے۔ انہوں نے بڑے احترام سے جھک کر بڑے صاحب کے کان میں کچھ کہا۔ بڑے صاحب کا چہرہ زرد نظر آنے لگا۔ اس نے حاضرین اور خاص طور سے قسطینا کو مخاطب کر کے ملائی زبان میں نامعلوم اطلاع دی۔

محفل برخاست ہو گئی۔ سب افراتفری میں اٹھ کر

جھروکے کی طرف بڑھے جو لمبائی کے رخ پر قریباً پچاس فٹ اور گہرائی کے رخ پر قریباً تیس فٹ پھیلا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کی طرف جو نیم گول جنگلا تھا اس پر سونے کا پترا چڑھا ہوا تھا اور چاندی کی دلکش جھالریں لٹک رہی تھیں۔ میں اور سجاول بھی موقع غنیمت جان کر سب کے پیچھے ہو لیے۔ جھروکے سے باہر بیرونی چار دیواری کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اس فصیل نما چار دیواری کی دوسری جانب ایک وسیع میدان تھا اور یہاں بے شمار لوگ جمع تھے۔ اب ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور جوش و خروش بھی بے پناہ تھا۔ وہ دیوانہ وار نعرے لگا رہے تھے اور اچھل رہے تھے۔ شہر کی طرف سے گاہے بگاہے فائرنگ کی آوازیں بھی آنے لگتی تھیں۔ اس مرتبہ عزت مآب ریان فردوس کو جھروکے میں جانا پڑا۔

جھروکے میں سراسیمگی کی کیفیت تھی۔ سجاول نے حلمی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

حلمی بولا۔ ''شہر میں ہنگامے پھوٹ پڑے ہیں۔ لوگوں نے ایجنسی والوں پر حملے شروع کر دیے ہیں۔ ان کے ایک کیمپ کو آگ لگا دی ہے اور دو پولیس اسٹیشن گھیرے میں لے لیے ہیں۔ پندرہ بیس بندے ہلاک ہو گئے ہیں۔ زخمی ہونے والے پتا نہیں کتنے ہوں گے۔''

''یہ ایجنسی والے کون ہیں؟'' سجاول نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ حلمی جواب دیتا، آقا جان نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ تاہم اپنے سوال کا جواب ہمیں ایک اور ذریعے سے مل گیا۔ میری نظر کچھ کتبوں پر پڑی ان پر انگلش میں سرخ رنگ سے درج تھا۔ ''ایجنسی قاتل ہے''...... ''ایجنسی نامنظور''...... ایجنٹوں کو مارو، گلیوں میں گھسیٹو......''

اس دوران میں بہت سے مسلح افراد محل کے اندر گھس آئے...... وہ محل کے محافظوں کی روک ٹوک کی پروا کیے بغیر سنگ مرمر کی سیڑھیوں تک پہنچے اور پھر دندناتے ہوئے وسیع و عریض جھروکے میں آ گئے۔ ان سب کے چہرے جوش سے دہکے ہوئے تھے۔ موٹی گھنی مونچھوں اور رعب دار چہرے والا ایک شخص آگے بڑھا اور سب کی ترجمانی کرتے ہوئے بڑے صاحب سے مخاطب ہوا۔ اس نے کہا۔ ''عزت مآب! اللہ تعالیٰ کی ذات کے بعد ہمارے لیے سب سے زیادہ اختیار کے مالک آپ ہیں۔ آپ ہمارے مالک اور اَن داتا ہیں۔ اوپر والے کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نازک موقع پر آپ دوبارہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ آپ نے ہمارا [illegible] ہم آپ کو

دوبارہ اقتدار کی کرسی پر بٹھائیں گے۔ ان بدبخت ایجنٹوں کو "جانامی" سے نکال کر رہیں گے۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا جانامی یا پولاؤ جانامی اس جزیرے کا نام تھا اور کہا جا رہا تھا کہ یہ تین چار نسلوں سے بڑے صاحب کے خاندان کی ملکیت ہے۔ پہلے اس کی آبادی چند ہزار نفوس پر مشتمل تھی لیکن پھر بڑھتے بڑھتے کئی لاکھ تک پہنچ گئی۔

گھنی موچھوں والے شخص کے ساتھ لمبے تڑنگے پچاس کے قریب افراد تھے۔ یہ سب کے سب شکلوں سے ہی جنگجو لگتے تھے۔ ان کے پاس جدید آتشیں ہتھیار تھے۔ کئی ایک نے اپنی بیلٹس کے ساتھ دستی بم بھی لٹکا رکھے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ بڑھ کر ریان فردوس کے ہاتھ چومے۔ کئی نے ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر ریان فردوس اور اس کے بیٹوں کو تعظیم پیش کی۔

ریان فردوس شدید تذبذب میں نظر آ رہا تھا۔ وہ جیسے ان لوگوں کے جوش و خروش سے خوف زدہ تھا۔ شاید وہ اس سنگین معاملے کو مزید سنگین بنانا نہیں چاہتا تھا مگر جھروکے سے نیچے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی اور نعرے فلک شگاف ہوتے جا رہے تھے۔ لگتا تھا کہ یہ معاملہ ریان فردوس کے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔

دوسری طرف قسطینا اور آقا جان وغیرہ خوش دکھائی دیتے تھے۔ قسطینا کی آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ شاید وہ ریان فردوس کی وجہ سے چپ تھی ورنہ وہ آگے بڑھ کر ان جنگجو افراد کو شاباش دیتی اور ان کی پیٹھ ٹھونکتی۔

کچھ مزید مشتعل افراد محل میں داخل ہو چکے تھے۔ جیسا کہ اب معلوم ہوا تھا کہ اس جگہ کو ڈی پیلس کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ لوگ اب جگہ جگہ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے اور نعرہ بازی کر رہے تھے۔ ریان فردوس نے طویل گھنی موچھوں والے شخص کو افغانی کہہ کر مخاطب کیا اور اس سے کہا کہ وہ صبر و تحمل سے کام لے، سب اچھا ہوگا۔

پُرجوش لوگوں سے جان چھڑا کر ریان فردوس رہائشی حصے میں واپس آ گیا۔ ہم بھی اس کے ساتھ تھے۔ رہائشی حصے میں واپس پہنچتے ہی ریان فردوس اور قسطینا میں جھڑپ ہو گئی۔ ریان فردوس یعنی عزت مآب کو میں نے پہلی دفعہ غصے میں دیکھا۔ اس کے چہرے کے سرخ داغ مزید سرخ ہو گئے۔ جسم لرزنے لگا۔ وہ بڑے تلخ لہجے میں بول رہا تھا۔ قسطینا کا چہرہ بھی لال بھبوکا ہو گیا۔ وہ بھی تیز لہجے میں جوابات دے رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ قسطینا کو باور کرا رہا ہے کہ یہاں کا مختار وہ خود ہے اور جو فیصلے کرنے ہیں وہ خود کرے گا۔

قسطینا بھنائی ہوئی سی چلی گئی۔ آقا جان اور چند باوردی افراد بھی اس کے ساتھ ہی گئے۔ یہاں کچھ عجیب سی کھچڑی پکی ہوئی تھی۔ صورت حال واضح طور پر ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ صرف یہ پتا چل رہا تھا کہ کوئی امریکن ایجنسی یہاں موجود ہے۔ مقامی لوگ اس سے بے حد خفا ہیں اور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس ایجنسی کا ابراہیم کے سوتیلے بھائی اور اس کی ریشہ دوانیوں سے کیا تعلق ہے، یہ ابھی ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اگلے دن دوپہر کے وقت ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ شہر کے وسط میں چند زوردار دھماکے ہوئے۔ سجاول کو یقین تھا کہ یہ دستی بموں کے دھماکے ہیں۔ میرا اپنا خیال بھی یہی تھا۔ ابھی ان دھماکوں کی بازگشت باقی تھی کہ ڈھائی تین سو مشتعل افراد کچھ سفید فام لوگوں کو لے کر "ڈی پیلس" میں داخل ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ ان میں سے زیادہ تر امریکی ہیں۔ ان میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ مردوں میں سے اکثر کے لباس پھٹے ہوئے تھے اور ان کے جسموں پر چوٹیں دکھائی دیتی تھیں۔ انہیں کہیں سے پکڑ کر ڈی پیلس لایا گیا تھا۔

انہیں براہِ راست عزت مآب ریان فردوس کے سامنے پیش کیا گیا۔ گھنی طویل موچھوں والا وہ کرانڈیل شخص بھی مشتعل افراد کے ساتھ تھا جسے ریان فردوس نے افغانی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہاں ہونے والی تند و تیز گفتگو سے اندازہ ہوا کہ مشتعل افراد غیر ملکی قیدیوں کو فوراً قتل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ایجنسی والے اپنے جدید اسلحے سے شہر میں وحشیانہ کشت و خون کر رہے ہیں۔ اس کا انتقام لیا جانا چاہیے تاکہ ان کو عبرت ہو۔

بڑے صاحب ریان فردوس نے افغانی اور اس کے مشتعل ساتھیوں کو اس کارروائی سے منع کر دیا۔ اس نے سگار کا طویل کش لیتے ہوئے اپنے اضطراب کو کم کیا اور بولا۔ "جن لوگوں نے زیادتی کی ہے، ان کو سزا ضرور ملے گی۔ لیکن اس طرح عورتوں بچوں سمیت سب کو انتقام کا نشانہ بنانا ٹھیک نہیں۔ ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ ہم انصاف کے تقاضے پورے کریں گے۔"

افغانی ذرا بھڑک کر بولا۔ "عزت مآب! آپ یہاں ڈی پیلس میں ہیں۔ اپنی بلٹ پروف گاڑی پر ذرا شہر کا ایک راؤنڈ لگائیں۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ لوگ کیسی

درندگی کر رہے ہیں۔"

"جو کچھ بھی ہے افغانی، ہمیں ان کو مارنے سے پہلے مجرم اور بے قصور کی پہچان کرنی ہوگی۔ ان چھوٹے بچوں کا بھلا کیا قصور ہوسکتا ہے...... اور یہ عورتیں؟"

افغانی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر قریب کھڑے آغا جان نے اس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر اسے منع کر دیا۔ آغا جان جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا...... بحث کا فائدہ نہیں جو کچھ بھی ہے عزت مآب کی بات ماننا پڑے گی۔

ریان فردوس اور افغانی میں ساری گفتگو ملائی میں ہوئی تھی۔ انیق سرگوشیوں میں مجھے اس کا مفہوم بتاتا جا رہا تھا۔ غیر ملکی عورتیں انگلش میں فریاد کناں تھیں۔ بچے رو رہے تھے۔ ان لوگوں کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ تھی...... زیادہ تر عورتوں نے جینز اور شرٹس پہن رکھی تھیں۔ بچے فراکس اور نیکرز وغیرہ میں تھے۔ کچھ فیشن ایبل مرد بھی نیکرز پہنے اپنی تومند رانوں کی نمائش کر رہے تھے۔ ان سب کے چہرے ہراس اور اندیشوں کی آماجگاہ تھے۔

ریان فردوس کے حکم پر ڈی پیلس کے محافظوں نے قیدیوں کو اپنے حصار میں لے لیا اور انہیں ہانکتے ہوئے باہر لے گئے۔ مشتعل افراد مطمئن نہیں تھے۔ ان میں سے کئی کے چہروں پر ریان فردوس کے لیے بھی دبی دبی برہمی نظر آئی تھی۔ بہرحال تسلینا اور آغا جان وغیرہ کے کہنے پر افغانی سب لوگوں کو واپس لے گیا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ یہاں کے معاملات بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ شہر کے کئی حصوں سے گاہے بگاہے فائرنگ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ان میں لائٹ مشین گن اور کلاشنکوف وغیرہ کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ شہر کی سڑکوں پر وقفے وقفے سے ایمبولینسو اور سیکیورٹی کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیتے تھے۔ وہ رات تجسس اور سنسنی کے گھیرے میں گزری۔ میں، انیق اور سجاول مختلف اندازے لگاتے رہے۔ ہمیں کوئی بھی اصل صورت حال بتانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تھمی سے توقع کی جاسکتی تھی مگر اسے ابھی شاید سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ سیل فون مسلسل اس کے کانوں سے لگا ہوا تھا اور وہ ڈی پیلس کی طویل راہداریوں اور بلند و بالا چھتوں کے نیچے بگولے کی طرح چکراتا پھر رہا تھا۔

اگلی صبح سجاول نے سنبل سے ملاقات کی۔ اس کا سفید مینا اس کے پاس پہنچ چکا تھا اور وہ اسے گلے سے چمٹائے ہوئے تھی۔ پارلا ہاؤس میں اور اب یہاں ڈی پیلس میں نجانے کتنے بروملازمین ایسے ہوں گے جو سنبل کو دیکھ کر اس مینے کی قسمت پر رشک کرتے ہوں گے مگر سنبل کے گلے سے لگنے کا موقع ملتا تھا تو ایک ادھیڑ عمر بیمار شخص کو...... جو یہاں کا عزت مآب تھا۔ سنبل نہائی دھوئی اور نکھری نکھری نظر آتی تھی۔ آنکھوں میں ایک طرح کی طمانیت بھی تھی۔ جلد ہی اس کا راز کھل گیا۔ کل شب اسے بڑے صاحب کی "رفاقت" نصیب رہی تھی۔ بات تھوڑی سی حیرانی کی تھی۔ ان پریشان کن دنوں میں بھی بڑے صاحب نے عیش و عشرت سے مکمل طور پر ہاتھ نہیں کھینچا تھا یا شاید اپنا غم غلط کرنے کے لیے ہی اس نے کل شب نوخیز سنبل کو اپنی خلوت میں بلایا ہو۔ سجاول نے اس سے پوچھا۔ "بس موج میلے میں ہی لگی ہوئی ہو یا کچھ سن گن بھی لے رہی ہو؟ یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

وہ بولی۔ "جو تھوڑی بہت بات بڑے صاحب نے بتائی ہے اس سے تو بس یہ پتا چلتا ہے کہ دوسری بیوی سے بڑے صاحب کا بیٹا اپنے باپ کے خلاف لڑ رہا ہے۔ اس لڑائی میں مدد کے لیے بڑے صاحب اور ان کی فیملی نے باہر کے ملک سے کچھ ہتھیار اور ہتھیار چلانے والے منگوائے تھے۔ یہ ہتھیار چلانے والے آہستہ آہستہ اتنے بڑھ گئے ہیں کہ ایک چھوٹی موٹی فوج کی طرح ہو گئے ہیں۔ اب یہ لوگ بڑے صاحب کو ہی مصیبت میں ڈال رہے ہیں۔ بس کچھ اس طرح کا معاملہ ہے۔"

"یہ ایجنسی والے کس کو کہا جاتا ہے؟" سجاول نے پوچھا۔

"یہ تو...... مجھے پتا نہیں......" سنبل بولی۔

سجاول نے برا سا منہ بنایا۔ انیق بولا۔ "لگتا تو یہی ہے کہ ان ہتھیار والوں کو ہی ایجنسی والے کہا جاتا ہے۔"

"واہ! بڑی اونچی بات کی ہے۔" سجاول نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ہم سو سال بھی ٹکریں مارتے رہتے تو اس نتیجے تک نہ پہنچ سکتے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تمہارے اس نکو شہزادے کو تو "یو این او" میں ہونا چاہیے تھا۔ بڑے بڑے مسئلے چٹکی بجاتے حل کر سکتا تھا۔"

"سوری۔" انیق نے کہا اور معصوم بکرے کی طرح گردن جھکالی۔ سجاول کی شعلہ بیانی سے بچنے کا میں نے اسے یہی حل بتایا ہوا تھا۔

ڈی پیلس کے اردگرد اب لوگ مستقل طور پر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انہوں نے پیلس کے وسیع سبزہ زاروں میں جگہ جگہ کیمپ گاڑ لیے تھے اور محافظوں کے کہنے کے

باوجود رکے نہیں رہے تھے...... یہ سب کے سب مسلح تھے اور
اندازہ ہوتا تھا کہ شہر کے باہر سے بھی آرہے ہیں۔ یہ سب
ایجنسی کے لوگوں کو پولاؤ جاماجی سے نکال باہر کرنا چاہتے
تھے۔

سجاول، انیق سے چڑتا تھا لیکن انیق وقتاً فوقتاً اپنی
اہمیت ثابت کرتا رہتا تھا۔ شام کے وقت بھی یہی ہوا۔ انیق
کی زبان دانی ہمارے کام آئی۔ اس نے آکر مجھے بتایا۔
"کچھ امریکی عورتوں کے ساتھ برا سلوک ہونے والا ہے۔
میں ابھی آقا جان کے قریبی بندے آرب کی گفتگو سن کر آرہا
ہوں۔"

میرا دھیان ان پکڑے جانے والے امریکیوں کی
طرف گیا جن کی جان بخشی ریان فردوس نے بمشکل کرائی تھی
لیکن انیق نے میرے اس خیال کو رد کیا اور بولا۔ "میں نے
جو کچھ سنا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ عورتیں ڈی پیلس سے
باہر ہیں...... کسی واشنگٹن ہوٹل نامی جگہ پر۔"

میرے اور سجاول کے پوچھنے پر انیق نے جو تفصیل
بتائی۔ اس سے پتا چلا کہ ابھی باغیچے میں آقا جان کا قریبی
ساتھی آرب ایک دوست ...... کے ساتھ ناریل کا پانی پی رہا
تھا اور ملائی میں معنی خیز گفتگو کر رہا تھا۔ دونوں نشے میں بھی
تھے۔ آرب کہہ رہا تھا۔ "کبھی...... ولایتی مرغابی کھائی؟"

دوسرا بولا۔ "نہیں یار، آج تک تو حسرت ہی رہی۔
کون ویزا لگوائے اور ولایتی مرغابی کھانے امریکا یا یورپ
جائے۔"

"لیکن اب تو ویزے کے بغیر ولایتی مرغابی ملے گی
اور مل بھی رہی ہے۔ آج رات کو ہی پک رہی ہے ہوٹل
واشنگٹن میں۔ چلنا ہے تو چلو۔"

"یار! کہیں مروا نہ دینا۔ ابھی کچھ پتا نہیں کہ حالات
کس طرف جاتے ہیں۔ اگر ولایتی مرغابیاں اور مرغابے
پھر حاوی ہوگئے تو حشر خراب ہوجائے گا۔"

"اب کچھ ہونے والا نہیں۔" آرب نے شرابیوں کی
طرح ہاتھ لہرا کر جواب دیا۔ "اولڈ مین کا زور اب ٹوٹ گیا
ہے۔ اب جو کچھ کرنا ہے ہز ہائی نس قسطینا اور آقا جان جیسے
لوگوں نے ہی کرنا ہے۔ تخت یا تختہ اور امید یہی ہے کہ
تخت۔"

اس کے بعد وہ دونوں دوست ایک جیپ میں سوار ہو
کر ڈی پیلس سے باہر چلے گئے تھے...... ولایتی مرغابیاں
کھانے کے لیے۔

انیق کی اطلاع قابلِ غور تھی۔ میرے ساتھ ساتھ
سجاول کے اندر بھی تجسس ابھر آیا۔ ویسے بھی ہم شہر میں نکلنا
چاہ رہے تھے تاکہ صورتِ حال کو کچھ سمجھ سکیں۔ سجاول نے
اپنی مرضی کرنے کا اچھا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اس کو کہیں جانا
ہوتا تو براہِ راست بڑی بیگم سے اجازت طلب کر لیتا تھا اور
وہ اس پر بہت اعتماد کرتی تھیں۔ اجازت مل جاتی تھی۔ اس
مرتبہ بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ بڑی بیگم نے کچھ تحفظات اور
ہدایات کے ساتھ ہمیں جانے کا اجازت نامہ دے دیا لیکن
ہمیں دو گارڈز کے ساتھ جانا تھا۔ ان میں سے ایک
"ڈرائیور کم گارڈ" تھا۔ ہم یہاں آنے کے بعد پہلی بار ڈی
پیلس سے نکلے۔ اندھیرا پھیلتے ہی شہر میں اَن گنت روشنیاں
جگمگا اٹھی تھیں مگر چہل پہل نظر نہیں آئی تھی۔ عام لوگ جیسے
گھروں میں دبکے ہوئے تھے اور ایک طرح کے خوف و
ہراس نے در و دیوار پر اپنے سائے پھیلا رکھے تھے۔
سڑکوں پر صرف مسلح افراد کے جتھے تھے جو مسلسل عزت
ناب کے حق میں نعرہ بازی کر رہے تھے۔ ایک دو جگہ ہماری
گاڑی کو بھی روکا گیا اور کھڑکیوں میں سر گھسا کر ایجنسی مردہ
باد...... عزت ناب زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔ ایک دو
جگہ ہمیں مساجد کے بلند مینار بھی نظر آئے جس سے اس بات
کی تصدیق ہوئی کہ یہاں کی زیادہ تر آبادی مسلمان ہے۔
غالباً بڑی بیگم کے اثر و رسوخ اور کوششوں کی وجہ سے اکثر
لوگ اسلامی شعائر کی پابندی بھی کرتے تھے۔

مختلف کشادہ سڑکوں سے گزرنے کے بعد ہم جلد ہی
اس بڑی عمارت کے قریب پہنچ گئے جس کی پیشانی پر ہوٹل
واشنگٹن کے حروف جگمگا رہے تھے۔ یہ عمارت بھی ہنگاموں
سے متاثر ہوئی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور
کئی جگہ آتش زدگی اور ٹوٹ پھوٹ کے آثار تھے۔ پارکنگ
میں دو جلی ہوئی کاروں کے ڈھانچے پڑے تھے۔ ان میں
سے ایک ابھی تک سلگ رہا تھا۔

ہم کچھ آگے جاکر جیپ سے اتر گئے اور چہل قدمی
کے انداز میں کچھ آگے نکل گئے۔ ہمارے ساتھ آنے
والے مقامی گارڈز کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ ہمیں یوں
گھومنے پھرنے سے روکنا چاہتے ہیں، لیکن ان میں اتنی
ہمت نہیں تھی کہ ایسی روک ٹوک کرسکتے۔ ہم اردگرد کا جائزہ
لینے کے لیے ہوٹل کی عقبی سمت میں چلے گئے۔ یہاں بھی دو
تین عمارتیں ایسی نظر آئیں جن میں ایک روز پہلے توڑ پھوڑ کی
گئی تھی۔ ایک بلند درخت پر ایک موٹی سی چیز لٹکتی دکھائی
دی۔ یہ پھل تو ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ غور کرنے پر عقدہ کھلا کہ
یہ ایک کٹا ہوا انسانی سر ہے۔ سر ہولے ہولے گھوم رہا تھا۔

اس کا رخ روشنی کی جانب ہوا تو پتا چلا کہ وہ کوئی امریکی سفید فام ہے۔ اس ایک منظر سے یہاں کے حالات کی سنگینی کا اندازہ بخوبی ہوجاتا تھا۔ کچھ آگے بڑھے تو ایک چوراہے پر بہت سے ادھ جلے ٹائر پڑے دکھائی دیے۔ رات کے اس پہر یہاں مکمل خاموشی تھی۔ بس کسی وقت مسلح افراد کی کوئی گاڑی فراٹے کے ساتھ گزر جاتی تھی۔ اچانک ہم بے طرح ٹھٹک گئے۔ کچھ نسوانی آوازیں سنائی دیں۔ ان چلاتی ہوئی آوازوں میں کرب تھا اور فریاد تھی۔ یہ مدھم آوازیں ہوٹل واشنگٹن کی نیم تاریک عمارت کے اندر سے آرہی تھیں۔ کسی وقت کوئی عورت اونچی آواز میں کچھ کہتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔

میں نے اور سجاول نے ایک دوسرے کی صورت دیکھی۔ یقیناً وہ فقرہ سجاول کے کانوں میں بھی گونجنے لگا تھا جو انیق نے ہمارے گوش گزار کیا تھا۔ ''آج رات ہوٹل واشنگٹن میں کچھ غیر ملکی عورتوں سے بدسلوکی کی جائے گی۔''

دفعتاً ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ یہ کافی دھیمی رفتار سے گشت کرنے والے انداز میں ہماری طرف آرہی تھی۔ میں اور سجاول تیزی سے ایک ٹرک کی اوٹ میں ہو گئے جو ہوٹل کی عقبی دیوار کے ساتھ پارک کیا گیا تھا۔ ہمیں شبہ ہوا کہ شاید یہ وہی جیپ ہے جس پر ہم یہاں پہنچے ہیں لیکن جب گاڑی قریب آئی تو وہ مختلف تھی۔ کھلی چھت والی اس کارگو ٹائپ میں پانچ چھ مسلح گارڈز سوار تھے۔ یہ سب مقامی تھے۔ ان میں سے کچھ نے سیفٹی ہیلمٹ اور بلٹ پروف جیکٹس بھی پہن رکھی تھیں۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ ٹرک کے قریب رکے۔ یقیناً انہیں بھی ہوٹل کے اندر سے ابھرنے والی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ان میں سے ایک گارڈ نے ملائی زبان میں اور طنزیہ لہجے میں کچھ کہا۔ باقی ہنسنے لگے...... گاڑی پھر رینگتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ہوٹل کے کسی اندرونی کمرے سے کسی شخص کی کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ تب کوئی عورت بلند آواز میں رونے لگی۔ ایسے موقعوں پر میرے اندر ایک عجیب سی وحشت بھڑک اٹھتی تھی۔ پتا نہیں کیوں...... ہر بار مجھے وہی منظر یاد آجاتا تھا جب ایک عرصہ پہلے ڈنمارک میں میری ایک دوست کو بند گاڑی میں درندگی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ تب میں بے بس تھا اور شاید کمزور بھی لیکن آج اتنے برس گزر جانے کے بعد میں وہ شاہ زیب نہیں رہا تھا۔ اب میں کچھ اور ہو چکا تھا۔

''کیا خیال ہے سجاول، دیکھا جائے کہ کیا ہورہا ہے؟'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

سجاول نے جواب دینے کے بجائے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے پکڑ کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس کا مطلب سمجھتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ پر پاؤں رکھا اور اوپر اٹھ کر باؤنڈری وال کا بالائی کنارہ تھام لیا۔

چند ہی سیکنڈ بعد میں اور سجاول دونوں ہوٹل کے عقبی احاطے کے اندر تھے۔ شور نما آوازیں اب بلند ہوگئی تھیں۔ یقیناً عمارت کے کسی اندرونی حصے میں شیطانی کھیل کھیلا جارہا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ امریکی عورتیں تھیں یا کوئی اور...... لیکن جو بھی تھا عورتیں تھیں اور انسانیت کے ناتے ان کی مدد کرنا فرض بنتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فسادات اور جنگوں میں سب سے زیادہ استحصال عورتوں کا ہی ہوتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی نقشہ نظر آرہا تھا۔ درد میں ڈوبی، ایک چلاتی ہوئی آواز ابھری۔ کسی لڑکی نے انگلش میں کہا۔ ''مدد...... کوئی ہے...... کوئی ہے؟''

سجاول کے پاس کولٹ کا پستول موجود تھا جو اسے بڑی بیگم نے ہی فراہم کیا تھا۔ میں خالی ہاتھ تھا مگر بوقتِ ضرورت ہتھیار حاصل کرنا میرے لیے کوئی ایسا مشکل نہیں تھا۔ ہم ایک کوریڈور سے گزر کر، ہوٹل کی اجڑی لابی میں پہنچے اور وہاں سے ڈائننگ ہال کے سامنے آئے۔ ایک دیوار گیر کھڑکی کے شیشے پر کوئی پتھر لگا تھا اور وہاں ایک بڑا سوراخ تھا۔ میں نے اس سوراخ سے اندر جھانکا اور لرز گیا۔

اس اسٹیج پر مدھم نیلگوں روشنی میں شیطان ننگا ہو کر ناچ رہا تھا۔ یہ کوئی آٹھ غیر ملکی عورتیں تھیں جو ''نشے میں دھت مردوں'' کے رحم و کرم پر تھیں۔ ان میں سے دو درمیانی عمر کی باقی نوجوان یا جواں سال تھیں۔ انہیں ایک دوسرے کے سامنے ہی بے آبرو کیا جارہا تھا۔ فرش پر شراب کی بوتلیں لڑھکی ہوئی تھیں اور لباس بکھرے ہوئے تھے۔ اس گھناؤنے کھیل کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ ایک نسبتاً ''کوآپریٹو'' لڑکی کو رقص پر مجبور کیا گیا تھا اور وہ میڈونا کے کسی گانے پر الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔

میری نگاہ سب سے پہلے آقا جان کے دستِ راست آرب پر پڑی۔ وہ سنہری بالوں والی ایک لڑکی کے منہ میں زبردستی شراب انڈیل رہا تھا، اس عمل میں اس کا ایک ساتھی اس کی مدد کر رہا تھا۔

ہمارے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو ہم فوری طور پر براہِ راست کارروائی کرتے تو دوسرے۔ یہ کہ ریان فردوس یا بڑی بیگم تک سیل فون کے ذریعے اس دلدوز واقعے کی

اطلاع پہنچاتے۔ براہِ راست کارروائی کے لیے ہمارے پاس پوری معلومات نہیں تھیں اور نہ ہی یہ پتا تھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ابھی ہم اس شہر کے حالات سے تقریباً ناواقف تھے۔ ریان فردوس یا کسی اور ذمے دار تک اطلاع پہنچانے کی صورت میں تاخیر کا امکان تھا۔

یکایک میری چھٹی حس نے خطرے سے خبردار کیا۔ اس سے پہلے کہ میں مڑ کر دیکھتا، ایک کڑک دار آواز میرے کانوں میں پڑی۔ کسی نے ملائی میں کچھ کہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک درمیانے جسم کا شخص سرخ آنکھوں سے ہمیں گھور رہا تھا پھر اس نے اپنے ہولسٹر میں سے پستول برآمد کرنا چاہا۔ میری ٹانگ کی بروقت ضرب نے پستول اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ سجاول نے لپک کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور اس کا منہ اپنی چوڑی ہتھیلی سے بند کر دیا۔ مقصد یہی تھا کہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ لیکن اسی دوران میں ایک شخص نے پہلو سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے میرے سر پر تباہ کن چوٹ لگانا چاہی تھی مگر رائفل میرے کندھے سے ٹکرائی۔ میں نے پلٹ کر اس کی کنپٹی پر جچا تلا مکا رسید کیا۔ مارشل آرٹ کی زبان میں اسے راؤنڈ پنچ کہا جاتا ہے۔ اس انداز کی زوردار ضرب چہرے پر کہیں بھی لگے، بندے کو اتنا معطل کر سکتی ہے۔ میرے مدمقابل کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا اور وہ تاب نہ لا کر فرش پر گر گیا۔

اب اتنا شور پیدا ہو چکا تھا کہ اندر ہال میں شیطانی کھیل کھیلنے والے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ افراتفری کی آوازیں سنائی دیں۔ کسی کونے سے نکل کر تین اور گارڈز ہم پر پل پڑے لیکن وہ زیادہ بھی ہوتے تو میرے اور سجاول کے سامنے نہ ٹھہر سکتے۔ ہم نے انہیں مکوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ایک گرانڈیل شخص کو سجاول کے تباہ کن گھونسے نے لمبا لٹایا۔ ایک تنگڑے گارڈ کو سینے پر میری زوردار ٹھوکر سہنا پڑی۔ اسی اثنا میں آرب اور اس کے تین چار ننگ دھڑنگ ساتھی بھی موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک کے جسم پر تو انڈرویئر بھی نہیں تھا۔ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ فائرنگ اور خون خرابے سے بچنے کے لیے لمبے تڑنگے آرب پر قابو پانا ضروری ہے۔ میں نے خود سے لپٹے ہوئے گارڈ کو اٹھا کر ایک دوسرے گارڈ پر مارا اور جست لگا کر آرب کو چھاپ لیا۔ اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں آئی اور اس کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔ سجاول نے اپنا پستول میری طرف پھینکا۔ میں نے کرکٹ بال کی طرح اسے ایک ہاتھ سے دبوچا اور آرب کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپا لیکن میری گرفت سے نہیں نکل سکا۔ اس کی گھن گرج اس کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

"خبردار... گولی مار دوں گا۔" میں نے کہا اور آرب کو گھسیٹتا ہوا پیچھے لے گیا۔ اب میری پشت دیوار کے ساتھ تھی۔ میں نے جو اندازہ لگایا، وہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اپنے سرغنہ آرب کو میری گرفت میں دیکھ کر گارڈز جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے۔ اندر ہال میں اور کوریڈورز میں کہرام سا مچا ہوا تھا۔ لڑکیاں ہال کمرے سے نکل کر راہداریوں میں بھاگ رہی تھیں اور کونے کھدروں میں چھپ رہی تھیں۔ یقیناً باہر نکلنے کا راستہ مسدود تھا ورنہ وہ اپنی حالت کی پروا کیے بغیر نکل چکی ہوتیں۔

میں آرب کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا لابی میں پہنچا اور پھر مین گیٹ تک آ گیا۔ سجاول کے ہاتھ میں ایک کلاشنکوف نظر آ رہی تھی۔ یقیناً یہ اس نے کسی گارڈ سے ہی چھینی تھی۔ وہ پوری طرح میرا ساتھ دے رہا تھا۔ مین گیٹ اندر سے مقفل تھا۔ "گیٹ کھولو، ورنہ اڑا ڈالوں گا اس کو۔ ذمے دار تم ہو گے۔" میں نے کولٹ پسٹل آرب کی چربی دار گردن میں گھساتے ہوئے انگلش میں کہا۔

آرب کی حالت پتلی تھی۔ وہ خاصا زورآور تھا مگر میں نے اسے ایسا جکڑ رکھا تھا کہ وہ دو دفعہ مزید پیدا ہو جاتا تو بھی اس شکنجے سے نکل نہ سکتا۔ اس کی گردن پھنسی ہوئی تھی اور باقی کا جسم توری کی طرح لٹک رہا تھا۔ اس کے بدن پر فقط سفید انڈرویئر تھا جسے اس نے ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔

جب گیٹ کھولا نہیں گیا تو سجاول نے اس پر کلاشنکوف کا ایک میڈیم برسٹ مارا، لرزہ خیز آواز کے ساتھ شعلوں نے رقص کیا اور گیٹ کا تالے والا حصہ ٹوٹ کر باہر جا گرا۔ میں آرب کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ جس جیپ پر ہم یہاں پہنچے تھے وہ پاس ہی کھڑی تھی۔ دونوں گارڈز یہ تماشا دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ انہیں جیسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے "ڈرائیور کم گارڈ" سے انگلش میں کہا۔ "بڑے صاحب، بڑی بیگم، یا کسی دوسرے ذمے دار سے بات کراؤ۔"

چند ہی سیکنڈ بعد میں سجاول کی طرف سے بڑی بیگم سے فون پر بات کر رہا تھا اور انہیں یہاں کی نہایت کشیدہ صورت حال کے بارے میں بتا رہا تھا۔ بڑی بیگم نے کہا کہ وہ مدد بھیج رہی ہیں۔

کم از کم پانچ افراد نے ہماری طرف رائفلیں سیدھی

گر رکھی تھیں مگر آرب کی وجہ سے کوئی کارروائی نہیں کر پا رہے تھے۔ میرے کندھے سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ابھی بمشکل دو تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ''ہوٹرز'' سنائی دیے۔ سیکیورٹی فورس کی تین گشتی گاڑیاں فراٹے سے وہاں پہنچیں اور ان میں سے مسلح افراد چھلانگیں لگا کر اترے۔ یہ لوگ یقیناً کہیں آس پاس ہی موجود تھے اور بڑی بیگم کے ڈائریکٹ آرڈر پر یہاں پہنچے تھے۔ ان کے آتے ہی صورتِ حال نارمل ہو گئی اور ہمیں خونی نظروں سے دیکھنے والے گارڈز اپنے اسلحے سمیت پیچھے ہٹ گئے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم گشتی فورس کی گاڑیوں میں بیٹھ چکے تھے۔ نشے میں دھت آرب اور اس کے کئی ساتھیوں کو اہلکاروں نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ سجاول کے کہنے پر اہلکار ہوٹل کے اندر بھی چلے گئے تاکہ غیر ملکی عورتوں کو ڈھونڈا اور حفاظت میں لیا جا سکے۔

☆☆☆

ڈی پیلس پہنچنے کے بعد ہمیں بڑی بیگم نے طلب کیا۔ ہم ان کی خدمت میں پیش ہوئے۔ بڑی بیگم کے چہرے پر اپنے بھائی آدم کی موت کے بعد سے مستقل سوگواری نظر آتی تھی۔ حجاب کے گھیرے میں ان کا چہرہ متورم اور آنسوؤں سے نم رہتا تھا۔ وہ آرب اور اس کے ساتھیوں کی حرکت پر بہت زیادہ مشتعل تھیں۔ بڑی بیگم اپنے دونوں بیٹوں کی طرح کافی حد تک انگلش میں بات کر سکتی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''یہ لوگ ہمارے لیے مصیبتیں بڑھا رہے ہیں۔ میں ان کو کڑی سے کڑی سزا دینا چاہوں گی۔''

پھر وہ سجاول سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ''سجاول، ان عورتوں کی خوش قسمتی کہ تم وہاں جا پہنچے مگر یہ ہوا کیسے؟''

اس سوال کا جواب تو یہی تھا کہ انیق نے آرب اور اس کے ساتھی کی وہ رمزیہ گفتگو سنی (جس میں مرغابیوں وغیرہ کا ذکر تھا) مگر ہم بڑی بیگم کو بلکہ کسی کو بھی یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ انیق ملائی زبان جانتا ہے۔ لہٰذا سجاول نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق بڑی بیگم کو بتایا کہ ہم ہوٹل واشنگٹن کی خستہ حالی دیکھنے کے لیے وہاں رکے تھے کہ ہم نے عورتوں کی آوازیں سنیں اور ہم پر یہ سب کچھ آشکار ہوا۔ میں نے کہا ہم آپ کو یہ اطلاع دینا چاہ رہے تھے مگر اسی دوران میں آرب کے ایک ساتھی نے ہم پر حملہ کر دیا اور ہمیں اپنا دفاع کرنا پڑا۔''

''میں تم دونوں سے بہت خوش ہوں۔ جس طرح ایک انسان کی جان بچانا ساری انسانیت کی جان بچانا ہوتا ہے اسی طرح ایک عورت کی آبرو بچانا بھی پوری عورت ذات کی آبرو کی حفاظت کرنے کے برابر ہے۔''

سجاول نے اردو میں کہا۔ ''بڑی بہن، آپ آقا جان سے کہیں کہ وہ اپنے آدمیوں کو اپنے کنٹرول میں رکھیں۔ وہ اکثر اپنی حد پار کر جاتے ہیں۔ آپ جانتی ہیں انہوں نے وہاں پاکستان میں بھی دو مرتبہ ایسا کیا ہے اور ہم پر حملہ آور ہوئے ہیں۔''

میں نے اس کا ترجمہ انگلش میں بڑی بیگم تک پہنچایا۔ بہرحال بڑی بیگم نے مجھے اور سجاول کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی کہا کہ ہم بلا ضرورت ڈی پیلس سے باہر نہ نکلیں انہوں نے مختصر الفاظ میں ہمیں صرف اتنا بتایا کہ چند برس پہلے یو ایس اے کی ایک بڑی سیکیورٹی ایجنسی سے چند سو افراد سیکیورٹی کے مقاصد کے لیے یہاں لائے گئے تھے مگر پھر ان کی ضرورت بڑھتی چلی گئی اور ان کی تعداد اور اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہ لوگ پورے جزیرے پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور مقامی لوگوں کی باہمی لڑائی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

بڑی بیگم سے ملاقات کے بعد ہم انیکسی میں واپس آ گئے۔ میرے کندھے میں شدید درد ہو رہا تھا۔ جھڑپ کے شروع میں یہاں وزنی رائفل کی زوردار ضرب لگی تھی۔ دراصل یہ وہی کندھا تھا جہاں کچھ عرصہ پہلے ''بھتہ جوڑی'' کے دوران میں سجاول کا تباہ کن گھونسا لگا تھا اور مجھے اپنی ہڈیاں کڑکتی محسوس ہوئی تھیں۔ اب یہ ناقابلِ فراموش چوٹ پھر سے جاگ گئی تھی۔

میری تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے سجاول نے ایک بار پھر بڑی بیگم کو فون کیا۔ قریباً پندرہ منٹ بعد ایک ملائیشین لیڈی ڈاکٹر موقع پر پہنچ گئی۔ اس نے میرے کندھے کو ہلا جلا کر دیکھا۔ اس کے خیال میں ایکسرے وغیرہ کی ضرورت تھی مگر اس وقت شہر کے حالات ٹھیک نہیں تھے اور ڈی پیلس سے باہر نکلنا نامناسب تھا۔ اس نے درد روکنے کے لیے ایک انجکشن لگایا اور کھانے کے لیے دوا دی۔ ایک آرام دہ پٹی سے اس نے میرے کندھے کو پوری طرح جکڑ دیا اور آرام کی ہدایت کی۔

تنہائی ملتے ہی انیق نے مجھ سے کہا۔ ''جو کچھ بھی ہے شاہ زیب بھائی، سجاول انڈین ولن امریش پوری سے کم نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ آپ اپنا بھی بھگن بننے کی کوشش کریں گے تو یہ ضرور آپ کو کوئی گہری چوٹ لگا جائے گا۔''

''اگر اس نے سن لیا نا تو تم سے وہی سلوک کرے گا

جو امریش پوری اپنی فلم کی ہیروئن وغیرہ سے کرتا ہے۔"

"آپ مجھے اس سلسلے میں انڈر اسٹیمیٹ کرتے ہیں۔ میں بس آپ کی وجہ سے چپ رہتا ہوں ورنہ اس ڈیش ڈیش کو ٹھیک ٹھاک ٹف ٹائم دے سکتا ہوں۔"

"ڈیش ڈیش؟ یہ کیا ہے؟"

"یعنی یہ خالی جگہ ہے، یہاں آپ اپنی مرضی سے لفظ" بھر سکتے ہیں۔ کوئی بھی پلید جانور وغیرہ......"

رات کے اس پہر بھی ڈی پیلس کے باہر بہت سے افراد جمع تھے اور شور شرابا کر رہے تھے۔ پس منظر میں فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کسی وقت بارودی مواد کا دھماکا ہو جاتا تھا اور آواز دور تک گونجتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ ساری آوازیں شہر کے مختلف حصوں سے آرہی تھیں۔ میں نے انیق سے کہا۔ "جاؤ دیکھو یہ نعرے بازی کیوں ہو رہی ہے؟"

انیق دیکھنے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آکر اس نے بتایا کہ یہ وہی کل والا پھڈا ہے۔ ریان فردوس نے جن غیر ملکیوں کو قتل ہونے سے بچایا تھا وہ اب ڈی پیلس میں ہی ہیں۔ لوگ عزت مآب ریان فردوس سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان لوگوں میں سے مردوں کو ان کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ انہیں مار کر اپنے ساتھیوں کا بدلہ لے سکیں۔

"مطلب یہ ہے کہ فساد کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو پا رہی۔"

"جی ہاں...... اور آپ کے لیے ایک اور خبر بھی ہے۔ ہوٹل واشنگٹن میں آپ کی جن لوگوں سے مارا ماری ہوئی ہے، ان میں سے ایک بندہ بری طرح زخمی ہے۔ وہ پہلے ہی ایک ٹانگ سے معذور تھا۔"

میرے ذہن میں فوراً اس شخص کا خیال آیا جو لنگڑاتا ہوا مجھ پر جھپٹا تھا اور میرے جسم میں سنگین اتارنے کی کوشش کی تھی۔

"کیا ہوا ہے اُسے؟"

"یہ تو آپ اپنی ٹانگ شریف سے پوچھیں کہ اس نے کیا کیا ہے۔ آپ کی ٹھوکر سے بے چارے کی دو پسلیاں ٹوٹ کر پھیپھڑے میں جا گھسی ہیں۔ اسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔"

"لیکن وہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ تم نے نہیں ہم نے دیکھا ہے۔ بے بس عورتوں کو کھلونا بنایا جا رہا تھا اور یہ بندہ ان میں سے تھا جو اس کھیل کی نگرانی کر رہے تھے۔"

"بہر حال اس کی حالت نازک ہے۔ مجھے ایک سکھ گارڈ کرخت سنگھ نے بتایا ہے۔"

"کرخت سنگھ؟ یہ کیا نام ہے؟"

"ان لوگوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں جی۔ لگتا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو افراتفری میں جو چیز سامنے نظر آئے اسی پر نام رکھ دیتے ہیں۔ کرخت سنگھ، درخت سنگھ، دیوار سنگھ، دروازہ سنگھ، پرنالا سنگھ، ڈیش سنگھ......"

"پھر ڈیش دے رہے ہو۔"

"کوئی بھی گندہ سا نام رکھ لیں۔ سب کچھ ممکن ہے لیکن کرخت سنگھ ہے اچھا آدمی۔ پرارتھنا کر رہا تھا کہ وہ لنگڑا گارڈ بچ جائے تاکہ آپ کسی مشکل میں نہ پڑیں۔"

......اگلا دن بھی اسی کشمکش اور گوں مگوں میں گزرا۔ ڈی پیلس میں اور ڈی پیلس سے باہر صورت حال کشیدہ تھی۔ یہ بھی پتا چلا کہ ریان فردوس اپنی دوسری بیوی کے بیٹے رائے زل سے اپنے برادرِ نسبتی آدم کی ہلاکت کے.... خون کا بدلہ خون مانگ رہا ہے۔ اس روز اس کے سوا کوئی اہم واقعہ نہیں ہوا کہ مجھے ایک بکتر بند گاڑی کے ذریعے قریبی کلینک میں لے جایا گیا اور میرے کندھے کے دو تین ایکسرے ہوئے۔ پتا چلا کہ کندھے کی ہڈی INFRAGLENOLD میں ایک ہیئر لائن فریکچر موجود ہے۔ آرتھو پیڈک ڈاکٹر نے کچھ ضروری ادویات لکھ دیں اور ہدایت کی کہ اگلے دو ہفتے تک کندھے کو مکمل ریسٹ دوں۔ لیک وار پٹی بھی کر دی گئی۔

یہ اسی رات کوئی گیارہ بجے کا عمل تھا۔ سجاول ڈرنک کر کے سو چکا تھا۔ انیق "ڈی وی ڈی" پر ایک پرانی انڈین فلم دیکھ رہا تھا۔ میں کندھے کی تکلیف کے سبب کچھ بے چین سا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اگر گولی سے افاقہ نہیں ہوا تو انیق سے درد کش انجکشن لگوا لوں گا۔ اتنے میں انٹر کام کا بزر گونجا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز نے چونکا دیا۔ میں اس نسوانی لیکن قدرے بھاری آواز کو بخوبی پہچانتا تھا۔ یہ بڑی بیگم تسانورل کی بھتیجی قسطینا کی آواز تھی۔

"تم شاہ زیب بول رہے ہو؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"جی ہاں۔" میں نے بھی انگلش میں جواب دیا۔

"میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم ایجنسی کے میٹنگ روم میں آسکتے ہو؟"

میں نے ذرا توقف کر کے کہا۔ "اگر آپ کا حکم ہے تو حاضر ہو جاتا ہوں۔"

کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ساتھ لانے کی ضرورت ہے۔'' سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔

''ٹھیک ہے، جیسا آپ کہتی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''او کے، ویٹ کر رہی ہوں۔'' انٹرکام خاموش ہو گیا۔

انیق بھی یہ گفتگو سن رہا تھا۔ ''میٹنگ روم میں طلب کیا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''کوئی چکر شکر نہ ہو۔ سجاول سے مشورہ کر لیں۔'' انیق نے کہا۔

''نہیں، اسے کیوں بے آرام کریں۔'' میں نے کہا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ انیق نے پھر اعتراض کیا لیکن میں نے روک دیا۔

قریباً دس منٹ بعد میں ایکسی کے میٹنگ روم میں موجود تھا۔ یہ کمرا گول شکل میں تھا اور بہت زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دیدہ زیب فرش کے درمیان ایک بڑی گول میز تھی، جس کے اردگرد کم و بیش بیس آرام دہ کرسیاں موجود تھیں۔ ان میں ایک صدارتی کرسی بھی تھی۔ دیواروں پر ایل سی ڈیز لگی ہوئی تھیں اور اس جزیرے کا ایک تفصیلی نقشہ بھی ایک دیوار پر آویزاں تھا۔

صدارتی کرسی پر قسطینا بیٹھی تھی۔ میں اسے پہلی بار یونیفارم کے بغیر دیکھ رہا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا ایک ٹریک سوٹ پہنا ہوا تھا اور بال پونی ٹیل کی صورت بندھے تھے۔ پاؤں میں جوگرز نظر آ رہے تھے۔ تاہم اس لباس میں بھی اس کی اسمارٹ کمر سے ایک ہولسٹر منسلک تھا جس میں سے چھوٹے سے طاقتور بریٹا پسٹل کا دستہ جھلک دکھا رہا تھا۔ ایک نہایت تنومند ملائیشین گارڈ قسطینا کے عقب میں چوکس کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر پتھر توڑنے والے کسی طاقتور انجن کی شبیہ ذہن میں ابھرتی تھی۔ اس شخص کی سوچی سوچی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔

جونہی میں اندر داخل ہوا قسطینا نے مسلح گارڈ کو باہر جانے کا حکم دیا۔ وہ فوجی انداز میں سیلوٹ کر کے باہر نکل گیا اور اس کے عقب میں میٹنگ روم کا آٹومیٹک دروازہ بند ہو گیا۔ باہر سے آنے والی آوازیں مکمل طور پر ختم ہو گئیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ میٹنگ روم ساؤنڈ پروف ہے۔

میں نے قسطینا کو سلام کیا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ ہمیشہ کی طرح تمتمایا ہوا تھا۔ وہ تلخ لہجے اور شستہ انگلش میں بولی۔ ''مسٹر شاہ زاب! تم یقیناً کام کے بندے ہو، ورنہ عزت مآب تمہیں یہاں جاماجی میں کیوں لے کر آتے۔ لیکن تم نے آتے ساتھ ہی اپنی حد سے تجاوز کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''شاید یور ہائی نس کا اشارہ کل ہوٹل میں پیش آنے والے واقعے کی طرف ہے۔''

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''بالفرض محال وہاں کوئی غیر قانونی یا غیر اخلاقی کام ہو بھی رہا تھا تو تمہیں اس میں براہِ راست مداخلت کرنے کی اجازت کس نے دی۔ تم ذمے دار افراد کو اطلاع دے سکتے تھے۔ انکل آغا جان اور صلی تھے۔ عزت مآب اور بڑی بیگم تھیں......''

''ہم بالکل ایسا ہی چاہتے تھے یور ہائی نس! لیکن ہمیں اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ اچانک ہم پر حملہ کر دیا گیا اور ہمیں دفاع کرنا پڑا۔''

''تم نے دخل اندازی کی...... اپنی حد سے اور اوقات سے آگے بڑھے، اسی لیے یہ سب کچھ ہوا...... تمہیں پتا ہے، تمہاری وجہ سے جو گارڈ شدید زخمی ہوا ہے، وہ کون تھا؟''

''مجھے نہیں پتا جی...... لیکن وہ انہی لوگوں میں سے تھا جو وہاں سخت غیر اخلاقی کارروائی کی نگرانی کر رہے تھے۔''

''وہ وہاں نہیں تھا۔'' قسطینا اچانک گرج کر بولی۔

''وہ دنگا فساد کی آوازیں سن کر باہر سے آیا تھا...... اور تمہیں کیا پتا وہ کون تھا؟ اس نے کتنا دکھ سہا ہے ان گوری چمڑی والوں کی من مانیوں سے...... اور ان کے کرتوتوں سے۔''

آخری الفاظ کہتے کہتے قسطینا کے لہجے میں چھپی نفرت کی بجلی کوند گئی۔

''ایک عورت کی آبرو لوٹنے سے بڑا کرتوت اور کیا ہو سکتا ہے یور ہائی نس! اور یہ لوگ ڈنکے کی چوٹ پر قانون کو اپنے ہاتھ میں لے رہے تھے۔''

''تم ہمیں قانون بتاؤ گے؟'' وہ زور سے گرجی اور حسبِ عادت اپنا ہاتھ میز پر مارا۔ ایک کپ میں کچھ بچی کھچی کافی پڑی تھی۔ ہاتھ لگنے سے پلیٹ اور کپ بری طرح اچھلے۔ کچھ کافی میرے چہرے اور گردن پر گری۔ میں نے ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ میرا یوں دیکھنا ہی اس نازک مزاج کو اور بھڑکا گیا۔ ''او یو سن آف......'' اس نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ میرے منہ پر جڑا۔

ایک سیکنڈ کے لیے میں سناٹے میں رہ گیا۔ جب اس نے دوسری بار تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو میں نے اس کی خوب صورت کلائی تھام لی۔ یہ ایک طرح سے مزاحمت کا

اعلان تھا۔ وہ سر تا پا شعلہ بن گئی۔ اس نے چلاتے ہوئے مجھ پر باقاعدہ حملہ کیا۔ میں نے اس کے دونوں بازو تھام لیے۔ اسی دوران میں اس نے پاؤں سے گول میز کی ٹانگ پر لگا ہوا کوئی کھٹکا دبا دیا۔ ساؤنڈ پروف کمرے کا آٹومیٹک دروازہ کھلا اور وہی قوی جثہ گارڈ اندر لپکا جسے تھوڑی دیر پہلے قسطینا نے باہر بھیجا تھا۔ وہ آتے ساتھ ہی مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ وہ لڑائی بھڑائی میں ماہر لگتا تھا۔ خاص طور سے اس کے ہاتھ پتھر کوٹنے والے ہتھوڑوں جیسے ہی تھے۔ اس کی ایک سخت ضرب میرے پہلے سے زخمی کندھے پر لگی اور پورا بازو جھنجھنا اٹھا۔ قسطینا کی کلائی پر سے میری گرفت ختم ہو گئی۔ اس نے بازو گھما کر ایک ضرب میرے سینے کے نچلے حصے میں لگائی۔ مارشل آرٹ میں یہ بڑی کارگر ضرب سمجھی جاتی ہے۔ حریف کی سانس بند ہو سکتی ہے اور پھیپھڑا زخمی ہونے کے سبب وہ جان سے بھی جا سکتا ہے۔ چند سیکنڈ کے لیے میری آنکھوں تلے بھی اندھیرا چھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ جو لڑکی مجھ پر جھپٹی ہے کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ ان دونوں نے مجھے رگید کر رکھ دیا۔ ایک ماہر فائٹر کی طرح گرانڈیل گارڈ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا کندھا زخمی ہو گیا ہے یا پہلے سے زخمی ہے۔ اس نے ساری توجہ میرے کندھے پر مرکوز کر دی اور بیدردی سے اس پر اپنے مکوں کے ہتھوڑے برسائے۔ جس کندھے کو آرام اور نگہداشت کی ضرورت تھی وہ طوفان کی زد میں تھا۔ میں نے بھنا کر ٹانگ کی ایک سخت ضرب گارڈ کے سینے پر ماری۔ وہ اس بری طرح دیوار سے ٹکرایا کہ اوندھے منہ چت سے ٹوٹی ہوئی صدارتی کرسی پر گرا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے ایک اور چوٹ اس کی کنپٹی پر لگائی اور وہ اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے مکمل ریسٹ پر چلا گیا۔ تاہم اس کارروائی کے دوران میں قسطینا نے مجھ پر ایک زوردار حملہ کر دیا۔ وہ کسی جنگلی بلی کی طرح مجھ پر چڑھ دوڑی۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو مشینی انداز میں حرکت دے رہی تھی۔ ابھی تک اس نے اپنے ہولسٹر سے پستول نہیں نکالا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے اپنے آپ پر پورا اعتماد ہے اور یہ اعتماد کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ مجھے ایک بار تو اسے سنبھالتے ہوئے واقعی پسینے آ گئے۔ میرا مضروب کندھا بھی جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اب تک میں قسطینا کو کوئی خطرناک ضرب لگانے سے باز رہا تھا مگر جب ایک موقعے پر مجھے لگا کہ وہ سچ مچ کوئی مہلک وار کر جائے گی تو میں نے بھی اسے دو چار سخت چوٹیں لگائیں۔ وہ مارشل آرٹ کی سوجھ بوجھ کے علاوہ بے حد طرار بھی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ چوٹ سہنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ پورا میٹنگ روم اب کباڑ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اندرونی شیشے ٹوٹ گئے تھے، لاکھوں روپے آرائش کی چیزیں، بیکار ٹکڑوں کی طرح فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ کمرا ساؤنڈ پروف ہونے کے سبب باہر کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ اندر کیا چل رہا ہے۔

میں پیچھے ہٹتے ہوئے کسی چیز سے ٹکرا کر پشت کے بل گرا تو وہ میرے اوپر چڑھ بیٹھی۔ میں نے پلٹ کر اسے نیچے کر دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ میرے ایک فرشی داؤ کی زد میں تھی۔ اب اگر وہ چاہتی بھی تو اپنا ہاتھ پستول تک نہیں پہنچا سکتی تھی۔ میرا ایک گھٹنا اس کے پیٹ پر تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کلائیوں کے پاس سے میری مضبوط گرفت میں تھے۔ اس کے ٹریک سوٹ کا ''اپر'' پھٹ گیا تھا اور آنکھوں کو چندھیا دینے والا جسم جھانک رہا تھا مگر ان سنگین لمحوں میں نہ ہی اسے اپنی عریانی کی پروا تھی اور نہ میرا دھیان اس ''ہوش ربائی'' کی طرف تھا۔ میں نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ لیکن پھر اسے بے بس دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس کا چہرہ سرخ انگارا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ اپنے جسم کے نوے فیصد حصے کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھی۔

میں نے اپنے بائیں ہاتھ سے اس کے پھٹے ہوئے گریبان کو درست کیا اور سرسراتی آواز میں پوچھا۔ ''بس...... یا ابھی کچھ اور؟''

میرے فقرے سے وہ پھر بھڑک اٹھی۔ اس نے یک لخت مچھلی کی طرح تڑپ کر خود کو میرے شکنجے سے نکالنا چاہا۔ میں نے اس کی دونوں پنڈلیوں کو اپنی بائیں ٹانگ کی لپیٹ میں لے لیا اور گھٹنے کا دباؤ بڑھا دیا۔ وہ ناکام ہوئی اور ایک بار پھر بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ہر سانس کے ساتھ اس کی گردن میں سامنے کی طرف ایک گڑھا پڑتا تھا جو اس بات کا غماز تھا کہ وہ بے طرح ہانپ رہی ہے۔ اس کے تاثرات اب بھی یہی گواہی دے رہے تھے کہ وہ ہار ماننے کو تیار نہیں۔ اگر میں نے اسے چھوڑا تو پھر مجھ پر پل پڑے گی۔

''دور ہو جاؤ مجھ سے۔'' وہ زور لگاتے ہوئے پھنکاری۔

''میرے دور ہونے کا دارومدار اس بات پر ہے کہ یور ہائی نس کا آئندہ رویّہ کیا ہوتا ہے۔ کیا تم یہ وعدہ کرتی ہو کہ اب یہ دنگا نہیں مچاؤ گی؟''

منہ بند کرو... منہ بند کرو۔'' وہ انگلش میں دہاڑی

اور پھر مچلنے لگی۔

غالباً وہ ان لوگوں میں سے تھی جو کسی صورت ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ یعنی رسی جل بھی جائے تو بل برقرار رہتا ہے۔ میں نے کندھے کے شدید درد کے باوجود اسے اسی طرح جکڑے رکھا۔ قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں، ہم نے وہاں کوئی زیادتی نہیں کی۔ تم ہی جیسی کچھ بے بس لڑکیوں کو شرابی غنڈوں سے بچانا چاہا۔ ہم خود کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتے تھے مگر اس سے پہلے کہ ہم کسی سے رابطہ کرتے ہم پر اندھا دھند حملہ کر دیا گیا۔“

”لیکن تم نے اس سارے معاملے میں اپنی گندی ناک گھسائی ہی کیوں؟ چچا (آقا جان) بھی یہ بتاتے ہیں کہ تم وہاں پاکستان میں احمقانہ دخل اندازی کرتے رہے ہو۔ چلو وہ تو پاکستان تھا...... تمہیں یہاں ”تشریف“ لائے ہوئے وقت ہی کتنا ہوا ہے؟ اور تم یہاں کے ڈی آئی جی بن بیٹھے ہو۔ تمہیں کیا پتا یہاں کیا چل رہا ہے؟ اور کس کے ساتھ کیا بیت رہی ہے؟“

”اگر مجھے نہیں پتا تو تم بتادو۔“

وہ گرجی۔ ”یہ جس کریم نامی بندے کو تم نے زخمی کیا ہے، تمہیں پتا ہے اس کا قصور کیا تھا؟ تمہیں پتا ہے کہ یہ ایک ٹانگ سے اپاہج کیسے ہوا......“ پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے ایک امریکن لڑکی کو ہاتھ لگایا تھا، ٹچ کر کے اس کے جسم کو پلید کر دیا تھا۔ یہ ہمارے ٹچ کرنے سے پلید ہو جاتے ہیں۔ ہم ان کے لیے جانوروں بلکہ کیڑے مکوڑوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ناپاک، مکروہ کیڑے مکوڑے، عقل سمجھ سے خالی، گندی نالیوں اور گٹروں میں رینگنے والے، اور یہ آسمان سے اتری ہوئی مخلوق ہیں۔ قدرت نے ان کو اعلیٰ ارفع دماغ عطا کیے ہوئے ہیں۔ یہ اپنی ماں کے پیٹ سے نہیں بلکہ سائنس کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے ہی اونچی ہواؤں میں اُڑنے لگتے ہیں...... زمین پر رینگتے ہوئے کیڑے مکوڑوں کو دیکھنے کے لیے اور ان کو مارنے کے لیے......“ وہ ذرا رکی۔ شاید اسے احساس ہوا تھا کہ وہ موضوع سے ہٹ گئی ہے۔

ذرا توقف کے بعد بولی۔ ”کریم کی موٹر سائیکل کو ایک امریکن ایتھلیٹ مارگریٹ نے اپنی اسپورٹ کار سے ٹکر ماری۔ موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا کریم کا بچہ مر گیا، کریم زخمی ہوا۔ کریم کو بھی چوٹ آئی۔ معذرت کے بجائے مارگریٹ نے نکلنے کی کوشش کی۔ اتنی بڑی سپر پاور کی شہری...... وہ کریم جیسے کوڑے سے معذرت کیوں کرتی۔ کریم نے اسے گاڑی چلانے سے روکنا چاہا اور اس کو بازو سے پکڑا۔ یہی اس کے لیے قیامت بن گیا۔ ایجنسی کے اہلکاروں نے اسے تھانے میں بند کر کے اتنا تشدد کیا کہ اس کا پیشاب بند ہو گیا اور اسے اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ اسپتال میں بھی اسے ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں جیسے وہ کوئی بڑا دہشت گرد ہو اور نائن الیون بھی اسی نے ترتیب دیا ہو۔ کریم کا بھائی عظیم اس سے اسپتال میں ملنے گیا تو اسے وہاں سے بھگانے کی کوشش کی گئی۔ وہ ایجنسی کے دو اہلکاروں سے لڑ پڑا اور ایک اہلکار کی ناک کی ہڈی توڑ کر بھاگ نکلا۔ وہ دہشت گرد قرار پایا۔ اس کی پوری فیملی ”خطرناک ترین“ لوگوں کی لسٹ میں شامل ہو گئی۔ ان کے چھوٹے سے گھر میں جہاں شاید سبزی کاٹنے والی چھری بھی نہیں تھی، خطرناک ہتھیاروں اور کیمیکل بموں کا مرکز قرار پایا۔ ایسے ہی کرتے ہیں، ایسے ہی کرتے ہیں یہ لوگ۔“

وہ سانس لینے کے لیے رکی اور ایک بار پھر خود کو چھڑانے کی ادھوری سی کوشش کی۔ تب جنونی انداز میں بولی۔ ”وہاں کابل میں بھی تو یہی ہوا تھا...... بغداد میں بھی تو یہی ہوا تھا۔ وہاں بہت زہریلے قسم کے جراثیمی اور کیمیائی ہتھیار تھے جو اس ساری دنیا کو کئی بار برباد کر سکتے تھے لیکن...... لیکن وہاں سے نکلا کیا...... چند میزائل...... جس سے دس گنا تباہ کن مواد اس سپر پاور کے ایک جنگی بحری جہاز پر موجود ہوتا ہے...... ہاں یہ لوگ ایسے ہی کرتے ہیں۔“ اس کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ طیش کی بلند لہریں اب آنکھوں میں نمی کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔

میں نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ اٹھ بیٹھی لیکن اب اس نے کسی طرح کی ”ایگریشن“ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں نے پستول اس کے ہولسٹر میں ہی رہنا دیا تھا اور یہ ایک طرح کا رسک بھی تھا، مگر اس نے اپنے اس ہتھیار کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ بدستور دکھ آمیز کیفیت میں تھی۔ اس کی نگاہیں جیسے ماضی قریب کے واقعات میں پیوست تھیں۔ وہ بولی۔ ”ایک نئی گن لے کر آئے ہوئے ہیں یہ ایجنسی والے...... جو چار انچ موٹے کنکریٹ کی دوسری جانب بھی مار کر لیتی ہے۔ ایسی گنز اور ایسے میزائلوں کا عملی تجربہ کرنے کے لیے اور ان کی شاندار ویڈیوز وغیرہ بنانے کے لیے ان امریکیوں کو ہم جیسے لوگ ہی

چاہیے ہوتے ہیں۔ سو اس کیس میں عظیم اور اس کی فیملی ٹارگٹ بنی...... رئیل ٹارگٹ...... ان حبشیوں کا رئیل ٹارگٹ......“ وہ بڑی نفرت سے بولی۔ اس کا گارڈ ابھی تک فرش پر بے سدھ پڑا تھا...... گہری سانسیں لے رہا تھا۔

میں نے اٹھ کر اس کی نبض دیکھی۔ اس کے سر کے ڈبل گومڑ کا معائنہ کیا اور اطمینان بخش انداز میں سر ہلایا۔ ”یہ ایک گھنٹے کے اندر ہوش میں آجائے گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں لیکن اگر تم چاہتی ہو تو ڈاکٹر کو دکھا لو۔“

اس نے وہی بٹن دبایا جو گول میز کے زیریں حصے میں تھا اور پاؤں سے آپریٹ کرتا تھا۔ سلائڈنگ دروازہ حرکت میں آیا اور دو مسلح گارڈز اندر داخل ہوئے۔ میٹنگ روم کا ”شاندار نقشہ“ دیکھ کر ان کے اپنے چہروں کا نقشہ بگڑ گیا۔ انہوں نے وہ چند خراشیں بھی دیکھیں جو لڑائی بھڑائی میں قسطینا کے چہرے اور گردن پر آئی تھیں پھر انہوں نے فرش پر بے سدھ پڑے اپنے ساتھی کو ملاحظہ کیا۔ ان کے تیور بگڑے، مگر قسطینا کی طرف دیکھ کر وہ کسی بھی ردعمل سے باز رہے۔ قسطینا ان کے قریب چلی گئی اور کچھ کھسر پھسر کی۔ قسطینا سے ضروری ہدایات لینے کے بعد دونوں گارڈز نے بے ہوش گارڈ کو اٹھایا اور باہر لے گئے۔

قسطینا نے اپنی بات تھوڑے سے توقف کے بعد جاری رکھی۔ اس کی گفتگو سے پتا چلا کہ ایجنسی والوں نے اپنی نئی گن کا جو ”تجربہ“ کیا، اس میں بے گناہ عظیم، اس کی بیوی، تین سالہ بچہ اور نیز اور بستی موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ کریم بمشکل جان بچا کر بھاگا تھا، اس کی ٹانگ شدید زخمی ہو گئی تھی۔ اس کی ٹانگ میں گولی نہیں لگی تھی بلکہ اپنے ہی بھائی کی کھوپڑی کا ایک پرخچا لگا تھا۔ وہ گولیاں ایسے ہی ہڈیوں کے پرخچے اڑانے والی تھیں۔ اپنے ہی بھائی کی ہڈی کے ٹکڑے نے کریم کی ٹانگ کے کئی پٹھے کاٹ ڈالے تھے اور وہ مستقل طور پر لنگڑاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں امریکی ایجنسی کا بھلا کیا قصور تھا۔ مقتول کی ہڈی اڑ کر کسی بھی سمت میں جا سکتی تھی اور اس ”عظیم دہشت گرد“ کی ہڈی اڑ کر اس کے اپنے ہی بھائی کو جا لگی تھی۔

میں قسطینا کی باتیں سنتا رہا اور مجھے لگنے لگا کہ وہ اتنی غلط بھی نہیں ہے جتنا میں اسے سمجھ رہا ہوں۔ اس کا پیارا باپ اس غیر ملکی ایجنسی نے مار ڈالا تھا اور وہ اس کی یاد کو سینے سے لگائے، اس کے انتقام کی حتی الامکان کوشش کر رہی تھی۔ میرے ساتھ قسطینا کا رویہ کچھ بہتر ہو گیا تھا پھر بھی اسے دوستانہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ ایجنسی آخر ہے کیا اور یہ یہاں اتنے اختیار کی مالک کیسے بنی ہے؟ لیکن پتا نہیں لگا کہ میرے اس سوال سے اس کے موڈ پر کیا اثر پڑے گا۔ میرے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ جیسے میری سوچ کو بھانپ گئی۔ ذرا ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ”مجھے لگتا ہے کہ عزت مآب یا بڑی بیگم نے ابھی تم لوگوں کو ایجنسی والوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتایا ہے۔“

”نہیں، ابھی تو کچھ بھی نہیں بتایا گیا۔“

وہ بولی۔ ”اس بات کا تو تم لوگوں کو یقیناً پتا ہوگا کہ پہلی بیوی سے عزت مآب کا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس کا نام رائے زل ہے۔ رائے زل اور اس کی والدہ نے عزت مآب کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ وہ انہی لوگوں کی وجہ سے پاکستان شفٹ ہوئے تھے، مگر رائے زل کی دشمنی کہیں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ اس دشمنی نے ہمیں بہت دکھ دیے ہیں اور ان میں سے ہی ایک دکھ یہ ایجنسی بھی ہے۔ چھ سات سال پہلے عزت مآب سے غلطی ہوئی اور انہوں نے رائے زل کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لیے اس غیر ملکی سیکیورٹی ایجنسی سے چند سو تربیت یافتہ گارڈز یہاں منگوائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گارڈز کی نفری اور جدید ہتھیاروں کی ضرورت بڑھتی چلی گئی۔ سیکیورٹی ایجنسی کی موجودگی میں عزت مآب مطمئن ہوتے چلے گئے لیکن ایجنسی والے اندر ہی اندر اپنے ہاتھ پاؤں پھیلاتے رہے۔ وہی کھیل جو یہ لوگ ہمیشہ سے تیسری دنیا کے لوگوں کے ساتھ کھیلتے رہے ہیں اور اب بھی کئی اسلامی ممالک میں کھیل رہے ہیں۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ پچھلے چھ سات سالوں میں یہ لوگ ہماری باہمی لڑائی کی وجہ سے بتدریج مضبوط ہوتے گئے ہیں اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ان لوگوں نے ہمیں بالکل کارنر کر دیا ہے۔ اب پچھلے تقریباً ایک برس میں یہ بات بالکل ثابت ہو گئی ہے کہ یہ گوری چمڑی والے دہرا کھیل کھیل رہے ہیں۔ یہ ہماری باہمی دشمنی کی آگ کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں اور نتیجے میں یہاں اپنے پنجے گہرے گاڑتے جا رہے ہیں...... تم نے بھی وہ وڈیو دیکھی ہو گی جو میں نے پرسوں ڈائننگ ہال میں دکھائی تھی؟“

”جی ہاں۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔

”اس میں جو امریکن دکھائی دیا تھا رین کوٹ والا...... وہ اس سیکیورٹی ایجنسی کا چیف گیرٹ ہے جو اپنے سبز قدموں کے ساتھ یہاں موجود ہے۔ ہم لوگوں کی سادہ دلی ہے کہ ہم ایک عرصے تک یہی سمجھتے رہے کہ یہ لوگ رائے

زل کے ساتھ لڑنے میں ہماری مدد کررہے ہیں مگر آہستہ آہستہ پتا چلا کہ یہ اندر سے ہماری جڑیں بھی کاٹ رہے ہیں۔ یہ ہماری اور رائے زل کی دشمنی کو مسلسل ہوا دے رہے ہیں تاکہ جزیرے میں ان کی اور ان کے ہتھیاروں کی ضرورت روز بروز بڑھتی جائے اور یہ بتدریج یہاں کے مالک و مختار بن جائیں۔ اب اس وڈیو کے بعد تو کسی قسم کا کوئی شک وشبہ باقی ہی نہیں رہا۔ وہ وڈیو جزیرے کے اس حصے کی ہے جس پر رائے زل قابض ہے۔ چیف گیرٹ گول چہرے اور بھاری بھرکم جسم والے جس شخص سے اس گمنام ہوٹل کے دروازے پر مل رہا ہے، پتا ہے وہ کون ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولی۔ ''یہ ہے عزت مآب کی پہلی بیوی سے ان کا ناخلف بیٹا رائے زل۔ جاماجی کے عام لوگ ایک عرصے تک یہی سمجھتے رہے ہیں کہ چیف گیرٹ ہمارا نجات دہندہ ہے اور چیف اور رائے زل ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں مگر اس وڈیو نے اس تصور کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔ ثابت ہوگیا ہے کہ یہ لوگ اندر سے ملے ہوئے ہیں اور اس پورے جزیرے کو ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت معاملات کو بگاڑتے چلے جارہے ہیں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم پوری قوت کے ساتھ ان گوری چمڑی والوں کا مقابلہ کریں، مر جائیں یا ماردیں۔''

اس کے رخسار انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔

اسی دوران میں ایک فون کال نے قسطینا کو کرسی سے اٹھنے پر مجبور کردیا۔ چند سیکنڈ میں اس کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ وہ تیزی سے باہر جانے کے لیے اٹھی۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ وہ پلٹ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے پھٹے ہوئے گریبان کی طرف اشارہ کیا۔ ''کہیں بھی جانے سے پہلے تم یہ کپڑے بدل لو۔''

وہ جیسے چونک کر اپنے لباس کی طرف دیکھنے لگی پھر اس نے میری جانب دیکھا اور بولی۔ ''شکریہ۔''

میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے کیا خبر ملی ہے؟ مگر وہ اتنی تیزی میں تھی کہ مجھے اپنا سوال بے محل محسوس ہوا۔

میں اپنا زخمی کندھا دبائے واپس اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ وہاں انیق بیٹھا بے چینی سے میرا انتظار کررہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا کہ قسطینا سے ملاقات کے بعد کوئی ''معرکہ'' پیش آیا ہے۔ اس نے تابڑ توڑ سوال کیے۔ میں نے مختصر جواب دیے۔ اسی دوران میں ہم نے دیکھا کہ ڈی پیلس میں زبردست ہلچل ہے۔ گاڑیاں اسٹارٹ ہورہی ہیں۔ گارڈز بھاگ دوڑ کررہے ہیں۔ ملازمین بلند آوازوں میں ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے ہیں۔ اسی دوران میں ڈی پیلس کے عقبی حصے سے ایک ہیلی کاپٹر کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دینے لگی۔

میں نے سجاول کو جگایا اور اس سے کہا کہ وہ بڑے صاحب یا بڑی بیگم وغیرہ کو فون کرے اور پتا چلائے کہ کیا معاملہ پیش آیا ہے۔ سجاول نے کوشش کی مگر دونوں میں سے کسی کے ساتھ رابطہ نہیں ہوسکا۔ بہت سی گاڑیاں اور کئی سو مسلح افراد بڑی تیزی کے ساتھ کسی جانب روانہ ہوگئے۔

کافی کوشش کے بعد سجاول، سنبل سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس سے صرف اتنا پتا چلا کہ سمندر کے کنارے ایجنسی کے لوگ ائرپورٹ پر قبضہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ان کو روکنے کے لیے یہ لوگ جارہے ہیں۔

سنبل معلومات تو دیتی تھی مگر پوری نہیں۔ ایک جاسوسہ کے طور پر سجاول نے سنبل کا انتخاب درست نہیں کیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ساحلی علاقے کی طرف سے زبردست فائرنگ کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ ہلکے بھاری اور درمیانے ہر طرح کے ہتھیار استعمال ہورہے تھے۔ گاہے بگاہے کوئی چھ سات انچ دہانے والی گن بھی استعمال ہوتی تھی، گونج دار دھماکے سے روشنی پھیلتی تھی جو پانچ چھ میل دور سے بھی صاف نظر آتی تھی پھر مزید ایسی گنز بھی ہمارے آس پاس استعمال ہونے لگیں اور جنگ کا سا منظر دکھائی دینے لگا۔ یہ شدید ہنگامہ جیسے ایک دم شروع ہوا تھا۔ ایسے ہی قریباً ایک گھنٹے بعد اچانک ختم ہوگیا۔ وہ ہیلی کاپٹرز سے مخالفین پر اندھادھند فائرنگ کی گئی تھی جس کے بعد ایک فریق شاید ہار مان گیا تھا۔ اسی دوران میں میرا رابطہ ابراہیم سے ہوگیا۔

اس نے کہا۔ ''ایجنسی والوں نے ائرپورٹ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی جسے ہم نے ناکام بنادیا ہے۔ بہت سے غیرملکی گارڈز مارے گئے ہیں اور گرفتار ہوئے ہیں۔''

ابراہیم کی آواز جوش سے لرز رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''اگر آپ ہمیں بتاتے تو ہم بھی اس کارروائی میں کچھ حصہ ڈال سکتے تھے۔''

''بس جو کچھ بھی ہوا ہے بالکل اچانک ہوا ہے۔ ہمیں بھی تب پتا چلا جب قسطینا فورس کو لے کر یہاں سے نکل چکی تھی۔ بہرحال آپ لوگوں نے بھی تو ایک کارروائی کرہی

ڈالی ہے۔ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی پتا چلا ہے کہ آپ لوگوں نے ہوٹل واشنگٹن میں پہنچ کر کچھ بے گناہ غیر ملکی عورتوں کو بلوائیوں کے چنگل سے نکالا تھا، یہ قابلِ تحسین کام ہے۔ والدہ اور والد بھی خوش ہوئے ہیں۔"

"آپ کی بیگم کا کیا حال ہے؟" میں نے زینب کے بارے میں پوچھا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے اس سے آپ کا ذکر کیا تھا، وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

"آپ جب کہیں میں حاضر ہوں۔"

اسی دوران میں ڈی پیلس کے باہر آتش بازی چھوٹنے لگی۔ آسمان روشنیوں سے بھر گیا۔ لوگ شاید سڑکوں پر نکل آئے تھے اور ائرپورٹ والی لڑائی کے حوالے سے خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ ٹیلی فون پر ابراہیم نے بھی اس بات کی تصدیق کی۔ میں نے ابراہیم سے کہا۔ "لوگ جذبات میں حدیں پار کرنے لگتے ہیں۔ آپ کے ہاتھوں میں اختیار ہے۔ آپ کوشش کریں کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ کوئی امریکی ہو، روسی ہو، یا پھر اسرائیلی بھی ہو اگر وہ ذاتی طور پر گناہ گار اور مجرم نہیں تو پھر وہ رعایت کا مستحق ہے۔"

ابراہیم نے کہا۔ "عزت مآب اور والدہ صاحبہ کے خیالات بھی سو فیصد یہی ہیں اور اللہ کا حکم بھی یہی ہے۔"

اس رات شہر میں مختلف حصوں سے فائرنگ کی آوازیں آتی رہیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ مشتعل لوگوں نے ایجنسی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے گھروں میں گھس کر لوٹ مار کی ہے۔ چند امریکیوں کے قتل کی خبر بھی گردش کرتی رہی۔ میں یہ سب کچھ سن رہا تھا اور شدید قسم کے تفکر کا شکار تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ "ایجنسی" والے جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ہیں اور ان میں مہارت کی بھی کمی نہیں ہے، ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی اور یہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ وہ یقیناً اپنے آپ کو تیار اور یکجا کر رہے تھے۔ ممکن تھا کہ اپنے حواریوں کے ساتھ بھی گٹھ جوڑ میں مصروف ہوں۔ وہ کسی بھی وقت زبردست مزاحمت پیش کر سکتے تھے۔ ریان فردوس نے اگر محتاط رویہ اختیار کر رکھا تھا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ان غیر ملکیوں سے خوف زدہ تھا۔

یہی وقت تھا جب میرے بیڈروم کے دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ "کون؟" میں نے پوچھا۔

"میں جاناں ہوں۔" باہر سے مترنم آواز ابھری اور میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میرے سیل فون پر اس کی کوئی 200 کالز پچھلے دو تین دن میں آچکی تھیں، جو میں نے ریسیو نہیں کی تھیں۔ اب وہ خود یہاں آموجود ہوئی تھی۔ چارو ناچار میں نے دروازہ کھولا۔ وہ جیسے ایک چھناکے سے اندر آگئی۔ اس نے ساڑی باندھ رکھی تھی۔ کانوں میں بڑے بڑے آویزے تھے اور ریشمی بال آبشار کی طرح کندھے سے کولہوں کی طرف جا رہے تھے۔ حسبِ توقع اس کے چہرے پر ناراضگی اور اداسی تھی۔ "کیسے ہیں آپ؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

"میں تو پریشان ہوگئی تھی پھر پتا چلا کہ آپ کے کندھے پر کوئی چوٹ شوٹ آئی ہے۔"

"نہیں کچھ زیادہ نہیں۔ اب بہتر ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا۔

وہ کچھ دیر ناراض نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے سرخ ملائم ہونٹ پر ابھی تک وہ ننھا سا نشان موجود تھا جو سوئی چبھونے کے نتیجے میں بنا تھا۔ وہاں سے خون کی بوندیں نکال کر اس نے میرے لیے رومانی نظم لکھی تھی۔

میں اسے کیسے بھلا دوں
وہ تو میری رگ رگ میں بس چکا ہے
میں برف کے اندھیرے گھر میں تھی
اور پل پل ختم ہو رہی تھی میری زندگی ...... وغیرہ وغیرہ۔

مجھے خاموش پا کر اس نے اپنا رخ کھڑکی کی طرف موڑا۔ آسمان کا ایک حصہ آتش بازی کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ "شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو شاہ زیب۔"

"ہائیں، یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے لگتا ہے شاہ زیب کہ میں نے اپنی اوقات سے بہت آگے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ کہاں آپ؟ کہاں میں ایک بازاری اور کچلی مسلی ہوئی عورت۔ میرے خیال میں یہ آپ کی مہربانی اور رحم دلی ہی ہے جو مجھے آپ کی تھوڑی بہت قربت نصیب ہوئی۔ حقیقت میں تو میں آپ کے التفات کے قابل ہی نہیں تھی۔" اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور نم آنکھوں کے ساتھ بولی۔ "شاہ زیب! کیا آپ میری جسارتوں پر مجھے معاف کر سکتے ہیں؟"

''اگر تم آئندہ جساوتیں نہ کرنے کا وعدہ کرو تو۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

وہ بدستور سنجیدہ رہی۔ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''ہم لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں شاہ زیب! خیالی گھوڑوں پر سوار رہتی ہیں۔ نرم دل شہزادے..... بچوں کے قہقہوں سے گونجتے ہوئے آنگن --- محبت کی بارش میں بھیگتے ہوئے موسم۔ ہم سب کے آئیڈیل ایک جیسے ہی ہوتے ہیں اور ہمارے جیسے میں محرومیاں بھی ایک جیسی ہی آتی ہیں۔ میں گھر سے نکلی تھی تو ذہن میں یہی تھا کہ اپنی پارسائی پر اور اپنے ماں باپ کی عزت پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گی اور ایک نامور ماڈل اور آرٹسٹ بن کر دکھاؤں گی--- لیکن جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے اور ابھی نہ جانے مزید کیا کچھ ہونا ہے۔''

''اور کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''اگر تم سنبھل جاؤ تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ پاکستان میں بھی اب تمہارے لیے وہ خطرات نہیں ہیں جو پہلے تھے۔''

''ہم لڑکیاں بس ایسی ہی تسلیوں اور ایسے ہی وعدوں پر جیتی ہیں۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ ''اب اس زینب کو ہی دیکھیں۔ کہاں سے چل کر کہاں آ گئی۔ اپنوں کو چھوڑا، اپنے گھر بار کو چھوڑا، ایک انجان بندے کے پلے سے بندھ کر ہزاروں میل دور یہاں چلی آئی۔ اسی کو سب کچھ سمجھنے لگی جو اس کا کچھ نہیں تھا، اپنی ساری آس امیدیں اسی کے ساتھ جوڑ کر بیٹھ گئی۔''

زینب کے ذکر نے مجھے چونکایا اور جاناں کی گفتگو میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔ پتا چلا کہ پچھلے چند دنوں میں لوبیاہتا زینب اور جاناں کے درمیان دوستی پروان چڑھی ہے اور وہ کھل کر ایک دوسرے سے دل کی بات کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس اجنبی ماحول اور اجنبی زبان والے انجان لوگوں کے درمیان جاناں کی موجودگی نے زینب کی گھٹن کو کچھ کم کیا ہوگا۔ میں نے جاناں کے لیے کرسی سیدھی کی تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھ سکے اور بات کر سکے (اس سے پہلے میں جاناں کی باتوں کو بس آدھے دل کے ساتھ ہی سن رہا تھا اور اس کے کچھ فقرے تو مجھے ایسے ہی لگے تھے جیسے کسی ڈرامے کی ہیروئن کوئی غم ناک سین کر رہی ہے)

جاناں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ میں مرحوم مولوی فدا کی اس یتیم بچی کو بہت قریب سے جانتا ہوں اور اس کی طرف سے ہر وقت باخبر رہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے زینب کے بارے میں کریدا تو وہ بولی۔ ''چھوٹے صاحب ابراہیم اور زینب کی شادی کی کہانی عجیب ہے شاہ زیب۔ یہ کہانی کم از کم میری سمجھ سے تو بالاتر ہے۔ زینب تو تیز اور خوب صورت ہے لیکن ایسی بھی خوب صورت نہیں کہ اسے اتنے بڑے پرنس کی دلہن بنانے کے لیے ایسے ایسے پاپڑ بیلے جاتے۔ اسے اسلام آباد کے کسی اسپتال سے باقاعدہ اغوا کیا گیا اور پارا ہاؤس میں پہنچایا گیا۔ اب ابراہیم سے اس کی شادی ہو چکی ہے یا یوں کہیں کہ نکاح ہو چکا ہے لیکن اب بھی یہاں بہت کچھ پُراسرار ہے جس کی کوئی توضیح پیش نہیں کی جا سکتی۔ شاید آپ کو یہ سن کر حیرانی ہو کہ ابراہیم اور زینب میاں بیوی بننے کے باوجود ابھی تک میاں بیوی نہیں بنے؟''

''کوئی رکاوٹ ہے؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''یہ رکاوٹ بھی اتنی ہی عجیب ہے جتنی یہ شادی عجیب ہے۔ ابراہیم دن رات اپنی بیوی کے قریب آنے کو تڑپ رہا ہے بلکہ ترس رہا ہے، دوسری طرف زینب بھی اپنے شوہر کی بے قراری دیکھ کر اپنا آپ اس کے حوالے کرنا چاہتی ہے لیکن بے چاری کر نہیں سکتی۔ لگتا ہے کہ لوبیاہتا جوڑا کسی نتیجے سے بہت زیادہ ڈرا ہوا ہے۔''

''کیسا نتیجہ؟ کوئی مرض وغیرہ؟''

''شاید مرض ہی...... لیکن مجھے تو یہ جسمانی مرض کے بجائے کوئی روحانی مرض ہی لگتا ہے یا یوں کہیں کہ پُراسرار مرض۔ شاید چھوٹے صاحب ابراہیم کو ڈر ہے کہ اگر اس نے زینب سے ازدواجی رشتہ بنایا تو وہ نقصان اٹھائے گی۔ شاید آپ کو پتا ہی ہوگا۔ ایک ایسا واقعہ اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے جب ابراہیم کے بڑے بھائی کی لوبیاہتا بیوی سخت بیمار ہو گئی تھی، اور بچ نہیں سکی تھی۔''

''زینب ہماری ہم وطن ہے جاناں--- اور اس وقت بالکل اجنبی لوگوں کے درمیان ہے، تم اس کے ساتھ پوری طرح ''اٹیچ'' رہو اور اس کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

جاناں رازداری کے لہجے میں بولی۔ ''زینب مجھ سے ہر بات شیئر کر رہی ہے پھر بھی وہ کسی وقت اٹک سی جاتی ہے۔ جیسے ذہن پر بہت زیادہ دباؤ ہو...... کل اس نے مجھے ایک عجیب بات بتائی۔''

میں سوالیہ نظروں سے جاناں کی طرف دیکھنے لگا۔

اس نے محتاط نظروں سے بند دروازے اور کھڑکیوں کی طرف دیکھا پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ ''زینب نے مجھے اپنے

جسم کے کچھ حصے دکھائی دے رہے تھے۔ وہاں سرخ نشان تھے اور
ہلکی سی سوجن تھی۔ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا شوہر اسے جہاں
جہاں چھوتا ہے یا اس کا پسینا اسے لگتا ہے، وہاں زینب کا
جسم کئی پہروں تک کے لیے سرخ رہتا ہے...... اور وہ جلن
محسوس کرتی ہے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ایسے خدشات میرے ذہن
میں پہلے سے موجود تھے۔ یہ ایک طرح سے آگ اور
پیٹرول کا کھیل تھا۔ ایک بالکل نوخیز جوڑا، اس قدر قریب
رہتے ہوئے، مکمل طور پر دور کیسے رہ سکتا تھا۔ بے شک ان
لوگوں کے درمیان میاں بیوی والا رشتہ نہیں بنا تھا مگر وہ
"محبت" کے لمحات یقیناً گزارتے تھے اور یہ محبت کے لمحات
کسی بھی وقت ازدواجی رشتے میں بدل سکتے تھے۔ انسان
خطا کا پتلا ہے اور "مرد و زن" کی محبت میں خطا کے
امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "اگر ابراہیم بیمار ہے اور یہ بیماری
زینب کو متاثر کر رہی ہے تو پھر وہ اس سے دور کیوں نہیں
رہتی؟"

وہ عجیب انداز سے مسکرائی اور اس کے ہونٹ کا نشان
کچھ اور نمایاں ہو گیا۔ بولی۔ "میں نے بتایا ہے نا کہ ہم
لڑکیاں بہت عجیب ہوتی ہیں، اپنے محبوب کو خوش رکھنے کے
لیے اس کے قدموں میں اپنے جسم کی کھال بچھانے سے بھی
دریغ نہیں کرتیں۔ وہ سب کچھ جانتی ہے پھر بھی اسے خود
سے دور نہیں رکھ سکتی۔"

"گویا...... تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ اس کا
"محبوب" ہے؟"

"یہ تو مجھے پتا نہیں لیکن وہ اس کا شوہر تو ہے نا اور
شوہر سر کا تاج ہوتا ہے، چاہے بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتا
ہو۔" آخری الفاظ کہتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرا دی۔ اس
کے دبلے پتلے چہرے پر، باہر ہونے والی آتش بازی کے
رنگ منعکس ہو رہے تھے۔ اس کا جسم نازک اور لمبا تھا۔
نیلگوں ساڑی اس پر جچ رہی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی اور اداس
نظر آتی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک مجھے اس میں کچھ زیادہ
دلچسپی نہیں تھی اور میرا دل چاہتا تھا کہ وہ جلد ہی کمرے سے
نکل جائے مگر اب صورتِ حال کچھ مختلف ہو گئی تھی۔ ایک تو
اس کی اداسی نے میرے دل پر ہلکی سی چوٹ لگائی تھی۔
دوسرے مجھے یوں لگ رہا تھا کہ وہ زینب کے سلسلے میں
میری بہت مدد کر سکتی ہے۔ میں ہر وقت زینب کے بارے
میں باخبر رہنا چاہتا تھا اور وہ اس کی رازداں سہیلی بنی ہوئی

میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ لرز کر
میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی ستارہ آنکھوں میں نمی چمک
گئی...... پھر وہ ایک دم میرے گلے سے لگ گئی اور سسکنے
لگی۔ "میں آپ کی بے دام کی غلام ہوں...... مجھے خود سے
جدا نہ کریں...... میں نے...... آپ کو اتنے فون کیے......
آپ نے ایک کا جواب نہیں دیا...... میرا دل چاہ رہا تھا خود
کو ختم کر لوں۔"

کتنی ہی دیر تک وہ ایسے ہی منمناتی رہی۔ میں نے
اس کے بالوں کو بوسہ دے کر خود سے جدا کیا اور اٹھ کر کھڑکی
کا پردہ برابر کر دیا۔ اس کی نیلگوں ساڑی کا پلو اس کے
شانے سے ڈھلک رہا تھا۔ میں اپنے کندھے کی تکلیف کو
نظرانداز کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ایک بار پھر وہی دائرہ تھا...... پھر وہی چکر تھا، گھنی
زلفوں کا سایہ، گرم سانسوں کا لمس، ایک خودفراموشی، ایک
فرار...... اور پھر اس کے بعد وہی ندامت، اپنے آپ پر وہی
غصہ، سرسوں کے زرد کھیت میں کھڑی ہوئی وہی لڑکی۔ بہت
اداس نظروں سے میری طرف دیکھتی ہوئی۔ اس کے ہونٹ
بے حرکت تھے لیکن وہ بولتی تھی اور اس کی آواز میرے
کانوں تک پہنچتی تھی...... آپ تو کہتے تھے، میں تم سے محبت
کرتا ہوں، کیا محبت اتنی جلدی ہار جاتی ہے۔ وہ تو بغیر کسی
امید کے، بغیر کسی آسرے کے مدتوں انتظار کرتی ہے۔
جب کچھ بھی سنائی نہیں دیتا وہ پھر بھی سنتی ہے، جب کچھ بھی
نظر نہیں آتا وہ پھر بھی دیکھتی ہے، وہ کانچ سے پتھر کو توڑنے
اور پانی میں دیے جلانے کی کوشش جاری رکھتی ہے۔ زخموں
سے چور ہو کر بھی وہ وفا کا پرچم بلند رکھتی ہے اور انہونیوں کی
راہ تکتی ہے۔

میں اب تک "سرسوں کے کھیت میں کھڑی لڑکی" کی
آواز سنتا ہی رہا تھا، جواب میں کچھ نہیں بولا تھا لیکن آج میں
بولا۔ میں نے خود کو تصورات میں گم کر دیا اور خاموشی کی
زبان میں کہا...... میں ہوائی قلعے تعمیر کرنے والا کوئی رومانی
ہیرو نہیں۔ میں عملی آدمی ہوں۔ میں جانتا ہوں ایسی محبتوں کا
انجام کیا ہوتا ہے۔ زندگی بھر آہیں بھرو اور بچھڑنے والے کو
یاد کرو، جس کہانی کو انجام دینا ممکن ہی نہ ہو، اس کی تکمیل
کے لیے خود کو ہلکان کرنے سے کیا فائدہ۔ مجھے پتا ہے وہ
میرے لیے نہیں ہے اور نہ میں اس کے لیے ہوں اور وہ کوئی
ایسی حسین و جمیل بھی نہیں جس کا بدل ملنا ممکن نہ ہو...... زندگی
بہت خوب صورت ہے اور صرف ایک بار ملتی ہے۔ میں ان

دیوانوں میں شامل نہیں ہوں گا جو زندگی جیسی خوب صورت
شے کو روگ لگاتے ہیں اور آہیں بھرتے ہوئے قبر تک جا
پہنچتے ہیں۔ میں سراب کے پیچھے نہیں بھاگوں گا۔ زندگی کو
زندگی کی طرح جیوں گا۔ کہتے ہیں کہ قدرت نے ہر دکھ کا
مداوا رکھا ہوا ہے۔ میں بھی مداوا ڈھونڈوں گا۔ میں احمقوں
کی ویران دنیا کا باسی نہیں بنوں گا۔ میں اسے بھلا کر دکھا
دوں گا......

اب رات کا تیسرا پہر چل رہا تھا۔ آتش بازی تو ختم ہو
گئی تھی مگر شہر میں مسلح جتھے گھوم رہے تھے اور نعرہ بازی بھی
ہو رہی تھی۔ جاناں کی نیلگوں ساڑی پھر سے اس کے لیے جسم
پر بہار دکھا رہی تھی۔ اس نے ہیئر کلپ کو دانتوں میں دبا رکھا
تھا اور بالوں کو باندھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھتے ہوئے
بولی۔ ''اب کب ملاقات ہوگی؟''

''جب تم چاہو۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ گلنار ہوگئی اور بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ چلی
گئی تو میں نے دروازہ پھر اندر سے بند کیا اور اپنے آپ کو
''خود فراموشی'' کے حوالے کرنے کے لیے گلاس اپنے
سامنے دھر لیا۔ کندھا درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

☆☆☆
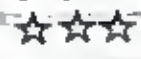
اگلے روز میں دیر تک سویا۔ سونے سے پہلے میں
نے وائن میں پین کلر گولیاں بھی شامل کر لی تھیں۔ گیارہ بج
چکے تھے۔ چمکیلی دھوپ میں نباتات کی خوشبو تھی۔ موسم نیم
گرم اور مرطوب تھا۔ میرا سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ پتا نہیں
کیوں، اٹھتے ساتھ ہی میرا دھیان کبڈی کے مشہور کھلاڑی
اور عجیب کردار سیف کی طرف چلا گیا۔ وہ ابھی تک پاکستان
سے یہاں نہیں پہنچا تھا لیکن اس کو جلد ہی آ جانا تھا۔ وہ اپنے
ساتھ پنجاب کے سارے رنگ لیے پھرتا تھا۔ اتنے میں
انیق آنکھیں ملتا ہوا آ گیا۔ انیق نے میرے کندھے کا حال
احوال پوچھا اور پہلوان حشمت کے بتائے ہوئے چند ٹوٹکے
میرے گوش گزار کیے مگر لگتا تھا کہ بات اب ٹوٹکوں سے آگے
چلی گئی ہے۔ قسطینا کے قوی ہیکل گارڈ کے فولادی مکوں نے
کندھے کو قابلِ ذکر نقصان پہنچا دیا تھا۔ میں ناشتا کر رہا تھا
جب انٹرکام پر ہز ہائی نس قسطینا کی کال آ گئی۔ پہلے آپریٹر
نے کہا۔ ''ہز ہائی نس، آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' پھر
چند سیکنڈ بعد قسطینا کی قدرے رعب دار آواز سنائی دی۔ ''تم
کیسے ہو مسٹر شاہ زائب؟'' وہ زیب کو زائب کہتی تھی۔ بڑی
بیگم کا تلفظ بھی یہی تھا۔

''میں ٹھیک ہوں یور ہائی نس۔'' میں نے اسے پھر
اور آپ سے مخاطب کیا۔

''مجھے آج ایک بات کا پتا چلا ہے، جس کا مجھے بہت
افسوس ہوا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''کیسی بات یور ہائی نس؟''

''مجھے بتایا گیا ہے کہ بدھ کے دن ہوٹل واشنگٹن میں
ہونے والی لڑائی میں تمہارا بایاں کندھا شدید زخمی ہو گیا تھا
اور ایکسریز میں کوئی فریکچر بھی ''ڈائیگنوز'' ہوا تھا۔ تمہیں
مکمل آرام کا مشورہ دیا گیا تھا، اگر ایسی بات تھی تو تم نے
بتایا کیوں نہیں؟''

''آپ کا حکم تھا، میں نے حاضر ہونا مناسب سمجھا۔
مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں ایسی صورتِ حال پیش آ جائے
گی۔''

''اسی بات کا تو افسوس ہے۔ نہ تم نے کچھ بتایا نہ ہمیں
پتا چلا۔ میں جانتی ہوں براڈے نے تمہارے کندھے کے
ساتھ برا سلوک کیا ہے۔'' (براڈے یقیناً اسی گرانڈیل
محافظ کا نام تھا جو ہر وقت سائے کی طرح قسطینا کے ساتھ رہتا
تھا)

''لڑائی اور محبت میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے یور
ہائی نس، مجھے کوئی گلہ نہیں ہے۔''

''لیکن مجھے رنج ہے۔ تم اپنے کندھے کا دوبارہ
ایکسریز کراؤ، بلکہ یہاں سی ٹی اسکین وغیرہ کی سہولتیں بھی
موجود ہیں......''

''آپ کی توجہ کا شکریہ، لیکن ابھی تو میں کوئی ایسی
ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔''

لائن پر چند سیکنڈ خاموشی رہی، پھر اس کی کھنکتی ہوئی
لیکن بھاری آواز ابھری۔ ''پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ
تمہیں کہیں دیکھا ہوا ہے۔ کیا تم اس سے پہلے بھی برونائی یا
جاما جی آئے ہو؟''

''نہیں یور ہائی نس، ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

وہ ایک دم جیسے چونک کر بولی۔ ''ہمارے لیے ایک
اچھی خبر بھی ہے، بلکہ دو اچھی خبریں ہیں۔ ایک تو اسپتال میں
کریم کا آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ اس کی ٹوٹی ہوئی پسلیوں
کو ان کی جگہ پر بٹھا دیا گیا ہے اور اب وہ ہوش میں ہے۔
مجھے اس کی بہت فکر تھی۔ دوسرے کل رات ہم نے
ائرپورٹ پر ایجنسی کا زوردار حملہ کامیابی سے روکا ہے۔ ان
کے تیس کے قریب افراد گرفتار ہوئے ہیں۔ اور مرنے
والوں کی تعداد بھی پندرہ بیس کے قریب ہے۔ اہم بات یہ
ہے کہ ہمارا ایک سپاہی بھی اس لڑائی میں مارا نہیں گیا۔''

"جی ہاں، رات کو جب آتش بازی شروع ہوئی تو ہمیں اس کامیابی کا اندازہ ہو گیا تھا۔"

"دراصل اب گمراہ کزن رائے زل اور ایجنسی کا گٹھ جوڑ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ یہ لوگ کھلم کھلا ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں مگر جاماجی کے لوگ سروں پر کفن باندھ کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اب ایجنسی اور ایجنسی کے پٹھوؤں کو جاماجی سے نکال کر ہی دم لیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یور ہائی نس! میری یہ حیثیت تو نہیں کہ آپ کو مشورہ دے سکوں لیکن میں نے کافی عرصہ مغربی ملکوں میں گزارا ہے۔ میں ان لوگوں کی خصلت کو کافی حد تک جانتا ہوں۔ یہ لوگ اپنا ردِعمل بڑے آرام سے اور سوچ سمجھ کر ظاہر کرتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ اندرونِ خانہ خاص قسم کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ ہمیں چاہیے کہ جشن وغیرہ تو ضرور منائیں لیکن خود کو ریلیکسڈ نہ کریں۔ ان کے متوقع ردِعمل کے لیے تیار رہیں۔"

"یہ باتیں بالکل ہمارے ذہن میں موجود ہیں۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں عزت مآب کی طرف سے سرکردہ کمانڈروں کی ایک میٹنگ بلا رہی ہوں۔ دیگر اہم لوگ بھی شریک ہوں گے۔ تمہیں تو آرام کی ضرورت ہے تاہم میں مسٹر سجاول کو بھی مدعو کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ اس میٹنگ میں اہم فیصلے ہوں گے۔"

ذرا توقف کے بعد اس نے کہا۔ "او کے، میں ایک بار پھر دلی افسوس کا اظہار کرتی ہوں کہ تمہارے کندھے کو نقصان پہنچا ہے اگر درد میں افاقہ نہیں ہو رہا تو تم ذرا یہاں کے بڑے آرتھوپیڈک پروفیسر سے رجوع کر لو۔"

میں نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں۔

ڈی پیلس کے اندرونی حصے میں ہونے والی ہنگامی میٹنگ قریباً تین گھنٹے جاری رہی۔ سجاول نے واپس آ کر وہاں کی کچھ صورتِ حال بتائی۔ اس نے آگاہ کیا کہ کانفرنس روم کے اندر جتنے لوگ تھے، اس سے دس گنا لوگ باہر موجود تھے اور تمام وقت پُرجوش نعرہ بازی کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ ایجنسی والوں اور ان کے حواریوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ یہاں ایجنسی والوں نے اپنا ایک گورنر بنا رکھا تھا۔ اس جوناتھن نامی گورنر نے آہستہ آہستہ خود کو عزت مآب کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ اس شخص کو پکڑ کر نظر بند کر دیا گیا ہے اور کمانڈروں نے ریان فردوس کو باقاعدہ چیف ایگزیکٹو کی کرسی پر بٹھا دیا ہے اور انہیں پورے پورے اختیارات والا نے کا تہیہ کیا ہے۔

میں نے پوچھا۔ "ریان فردوس کے خیالات کیا ہیں؟"

سجاول اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "وہ بڈھا گنگز تو اندر سے ڈرا ہوا ہے لیکن شاید اسے یہ سب کچھ تھوڑا تھوڑا اچھا بھی لگ رہا ہے۔ اختیار اور حکمرانی کس کو چنگی نہیں لگتی...... اور یہ سب کچھ پانے کے لیے اسے زیادہ ہاتھ پیر بھی ہلانے نہیں پڑ رہے۔ سب کچھ تو اس کے جوشیلے پرستار ہی کر رہے ہیں۔"

"قسطینا اور آقا جان وغیرہ کے ری ایکشن کیا تھے؟"

"قسطینا بہت خوش تھی۔ اس نے اعلان کیا کہ آئندہ عزت مآب کا لقب جزیرے میں صرف اور صرف انکل ریان فردوس کے لیے استعمال ہو گا۔ اس پر سب نے زوردار نعرے لگائے۔"

میں سجاول سے باتیں تو کر رہا تھا مگر دھیان اپنے کندھے کی طرف ہی تھا۔ درد بڑھتا جا رہا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ اگر رات عذاب میں نہیں گزارنی تو پھر اسپتال سے رجوع کر لینا چاہیے۔ گولیاں تو رہیں ایک طرف اب انجکشن بھی اثر نہیں کر رہے تھے۔ سجاول نے بھی میرے چہرے سے میرے اندرونی اضطراب کو بھانپ لیا تھا۔ وہ بولا۔ "چل اٹھ جا شاہ زیب، مجھے لگتا ہے کہ تیرا درد بڑھتا جا رہا ہے۔"

انیق نے انگلش میں ہولے سے کہا۔ "جس نے درد دیا ہو، اس سے بڑھ کر اور کون جانتا ہے کہ درد کی صورتِ حال کیا ہے۔"

"کیا کہا تم نے؟" سجاول نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"کہہ رہا ہوں کہ ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے کہ اصل صورتِ حال کیا ہے۔"

"انگریزی کم بولا کر...... منہ ڈنگا ہو جائے گا تیرا۔ پہلے بھی کچھ اتنا سوہنا نہیں ہے۔" سجاول نے ترخ کر کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم ایک بکتر بند گاڑی پر سوار اسپتال کی طرف جا رہے تھے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کندھے کا فریکچر سنگین ہو چکا ہے۔ اچھا ہی ہوتا اگر اس رات میں انیق کی بات مان لیتا اور اکیلا میٹنگ روم میں قسطینا سے ملنے نہ جاتا۔ گاڑی شہر کی مختلف سڑکوں سے گزری۔ ہمیں ایک اور جگہ ایک ناپسندیدہ منظر دیکھنا پڑا۔ ایک امریکن کی لاش درختوں میں اوندھی پڑی تھی اور ایمبولینس کا عملہ اسے وہاں سے اٹھانے کی تیاری کر رہا تھا۔

جس اسپتال میں ہم پہنچے وہ پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ بلند سڑک سے ہمیں نشیب میں دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ ایک وسیع سرسبز علاقہ تھا جس میں کہیں کہیں پام کے درخت دکھائی دیتے تھے اور پانی کی گزرگاہیں نظر آتی تھیں۔ اس وسیع میدان میں جاماجی کے باشندوں کے مخروطی چھتوں والے خوش نما گھر تھے اور جابجا خوب صورتی سے تراشے ہوئے لان تھے۔ ان گھروں سے باہر چمکیلی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اور چھوٹی چھوٹی مارکیٹوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ بہرحال انسان کہیں نظر نہیں آتا تھا اور اگر کہیں آتا بھی تھا تو بس ایک ''جھلک'' کی طرح۔ یقیناً اس کی وجہ بھی یہاں کے دگرگوں حالات ہی تھے۔ ڈرائیور کم گارڈ محسن ہانی آج بھی ہمارے ساتھ تھا اور ہمیں علاقے میں موجود اہم نئی اور پرانی عمارتوں کی تفصیلات بتا رہا تھا۔

مجھے دور کھلے علاقے میں سبزے کی سبز چادر کے اوپر کسی خاردار باڑ کی طویل لکیر نظر آئی۔ میں نے محسن سے اس بارے میں پوچھا تو وہ شستہ انگلش میں بولا۔ ''اسی باڑ کی وجہ سے تو سارا خون خرابا ہو رہا ہے۔ یہ باڑ آج سے چند ہفتے پہلے یہاں سے بہت پیچھے تھی مگر نیوسٹی والوں نے بارڈر لائن کی خلاف ورزی کی اور راتوں رات بکتر بند گاڑیوں اور بے شمار سپاہیوں کے ساتھ اندر گھس آئے۔ اب یہ سارا علاقہ ان کے قبضے میں ہے۔ ہمیں اس لڑائی میں دہرا زخم لگا۔ ایک تو سیکڑوں ایکڑ کا یہ علاقہ ہمارے ہاتھ سے گیا، دوسرے ہمارے ہردل عزیز لیڈر اور ہز ہائی نس قسطینا کے والد محترم عالی جاہ آدم شہید ہوئے۔''

میں نے سبزے کی خوب صورت چادر کے درمیان خاردار باڑ کی وہ بدنما لکیر دیکھی۔ اس لکیر کی دوسری جانب تازہ بنے ہوئے بنکر دکھائی دیتے تھے اور مورچوں کی موجودگی بھی ظاہر ہوتی تھی۔ بہت سی فوجی طرز کی گاڑیاں بھی حرکت کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ ان میں سے کئی گاڑیوں پر راکٹ لانچر اور بڑی گنیں لگی ہوئی تھیں۔ بارڈر کی اس جانب بھی کچھ ایسے ہی انتظامات موجود تھے۔

سجاول نے پوچھا کہ یہ نیوسٹی کا کیا مطلب ہے؟ میں نے یہی سوال انگریزی میں ''کن ورٹ'' کرکے ڈرائیور محسن تک پہنچایا تو اس نے بتایا کہ جو علاقے ہز ہائی نس ابراہیم اور کمال کے سوتیلے بھائی رائے زل نے اپنے قبضے میں کیے ہوئے ہیں انھیں ان لوگوں نے نیوسٹی کا نام دے رکھا ہے۔ مقبوضہ علاقے جزیرے کا قریباً ایک تہائی حصہ ہے۔ مگر یہ لوگ کہیں پر رک نہیں رہے اور پھپھوندی کی طرح پھیلتے جارہے ہیں۔

ایک موڑ کاٹ کر ہم ڈھلوان سڑک پر آگئے اور پھر نیچے اترتے اسپتال کی شاندار عمارت تک جا پہنچے۔ آثار سے نظر آتا تھا کہ چند ہفتے پہلے ہونے والی لڑائی میں تھوڑا بہت نقصان اس اسپتال کو بھی پہنچ چکا ہے۔ مجھے فوراً پروفیسر ڈاکٹر نے دیکھا، جدید مشین پر ایکسرے کیے گئے۔ اندیشے درست نکلے تھے۔ کندھے کی ہڈی۔۔۔ جس میں پہلے باریک سا فریکچر تھا، اب باقاعدہ ٹوٹ چکی تھی اور اپنی جگہ سے ہٹ بھی چکی تھی۔ کام لمبا ہو گیا تھا۔ اب اس کو پلیٹس لگنی تھیں۔ اور باقاعدہ آپریشن کے بعد پلاستر وغیرہ چڑھائے جانے کا بھی امکان تھا۔

میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا، یہ تو ایسا ہی تھا جیسے کسی کھلاڑی کو اہم میچ کھیلنے کے لیے بڑی شان سے بیرونِ ملک لے جایا جائے اور وہ وارم اپ میچ میں ہی ان فٹ ہو کر ٹورنامنٹ سے باہر ہو جائے۔ جس وقت آرتھو پیڈک پروفیسر میری سنگین چوٹ کا باریک بینی سے معائنہ کر رہے تھے، ہلچل سی نظر آئی باوردی گارڈز اور فورس کے سپاہی اٹینشن ہو گئے۔ پتا چلا کہ ہز ہائی نس قسطینا اسپتال میں کسی خاص شخص کی عیادت کے لیے آئی ہوئی تھیں اور اب میرے بارے میں سن کر یہاں میری طرف آرہی ہیں۔ (یہ خاص شخص وہی ایک ٹانگ سے معذور کریم احمد تھا)

میں اسٹریچر پر لیٹا تھا، اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پروفیسر صاحب بھی مؤدب کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف ایڑیاں کھٹا کھٹ بجنے لگیں۔ چند سیکنڈ بعد قسطینا فوجی وردی میں بارعب چال چلتی اندر داخل ہوئی۔ عقب میں چار پانچ اعلیٰ افسر بھی تھے۔ قسطینا نے میرا حال احوال پوچھا۔

پھر پروفیسر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''ان کو ہر وہ بہترین سہولت دی جائے جو یہاں موجود ہے۔ اگر ہمیں باہر سے بھی کوئی ماہر بلوانا پڑا تو ہم دیر نہیں کریں گے۔''

اس نے خود بھی میرے ایکسرے دیکھے اور اس کی آنکھوں میں تشویش آمیز ندامت دکھائی دی۔ وہ جانتی تھی میرے کندھے کا یہ حال اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس نے میرے منہ پر طمانچہ رسید کیا تھا جس کے بعد میٹنگ روم کی صورتِ حال یکایک آؤٹ آف کنٹرول ہو گئی تھی۔

آرتھو پیڈک پروفیسر نے اسے بڑی توجہ سے میری تکلیف کے بارے میں بتایا اور تسلی دی۔ اب یہ فیصلہ ہونا تھا کہ مجھے ابھی اسپتال میں داخل کر لیا جائے یا ضروری ٹیسٹ لینے کے بعد بھیج دیا جائے اور کل شام کو پھر بلا لیا جائے مگر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کسی کو پتا نہیں تھا کہ یہاں کیا صورتِ حال پیش آنے والی ہے، جو ماہر ڈاکٹر ہے وہ مریض بننے والا ہے اور جو مریض ہے اسے ڈاکٹر کی جان بچانے کی کوشش کرنی ہے اور خود اپنے لیے بھی اندھا دھند بھاگ دوڑ کرنی ہے۔ انسان کے اپنے منصوبے اور ارادے ہوتے ہیں، قدرت کی اپنی منشا ہوتی ہے اور ہوتا وہی ہے جو قدرت نے طے کیا ہوتا ہے۔

اچانک ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ یوں لگا کہ اسپتال کے بالکل پاس ہی کوئی عمارت دھماکے سے زمین بوس ہوگئی ہے۔ در و دیوار لرزے اور ہر طرف مریضوں کی آہ و بکا گونجی۔ ابھی ہم سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ دوسرا دھماکا ہوا اور یہ اسپتال کے مین گیٹ کی طرف تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دو مسلح محافظوں کو ہوا میں اچھلتے اور دھوئیں میں گم ہوتے دیکھا۔ ایک کٹا ہوا بازو میری نگاہوں کے روبرو کھڑکی کو چکنا چور کر کے ایک ایکسرے مشین پر گرا۔ لوگ دیوانہ وار چلاتے ہوئے چاروں طرف دوڑے۔ قسطینا نے اپنے ہولسٹر سے بریٹا پسٹل کھینچا اور اپنے گارڈز کو ہدایات دیتی ہوئی کشادہ زینوں کی طرف بھاگی۔

''اسے دیکھو شاہ زیب۔'' سجاول پکارا۔

میں نے چونک کر اپنے قدموں کی طرف دیکھا۔ وہ ماہر پروفیسر سرجن جو چند سیکنڈ پہلے بڑی شان سے مجھے مختلف ہدایات اور تسلیاں دے رہا تھا اب خود اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا اور اس کے پیٹ سے بہنے والا خون فرش کو رنگین کر رہا تھا۔ یقیناً اسے بم کا کوئی پرزہ یا شیشے کا ٹکڑا لگا تھا۔ تب ایک اور پُرہول دھماکا ہوا اور اسپتال کی کینٹین نے آگ پکڑلی۔ اس کے ساتھ ہی مشین گن اور ایم جی 16 ٹائپ رائفلوں کی لرزہ خیز آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ''لگتا ہے۔ نوسٹی کی فورس نے حملہ کر دیا ہے۔ بارڈر لائن یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

سجاول نے جھک کر زخمی سرجن کو کندھے پر اٹھایا اور ہم بھی سیڑھیوں کی طرف دوڑے۔ سجاول کے ہاتھ میں اب وہی پستول نظر آرہا تھا جو بڑی بیگم نے اسے دیا تھا۔ اب دو طرفہ فائرنگ شروع ہوچکی تھی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ سیڑھیوں کی کھڑکیوں میں سے مجھے کھلے میدان میں ریان فردوس کے سپاہیوں کی بھاگ دوڑ دکھائی دی۔ ان کی نشانی ان کی گہری سبز وردی تھی۔ رائے زل کے سپاہیوں کی وردی گہری گرے تھی اور وہ بھی دور سے پہچانے جاتے تھے۔ ان کی طرف سے مارٹر گنوں اور بزوکا کے فائر آرہے تھے۔ بزوکا عام طور پر ٹینکوں کا حملہ روکنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں

لیکن یہاں رائے زل کی فورس ان سے عمارتیں توڑنے کا کام لے رہی تھی۔ ریان فردوس کی سبز فورس بھی پوزیشنیں سنبھال چکی تھی۔ میں نے چند سپاہیوں کو دیکھا انہوں نے کندھوں پر راکٹ لانچر رکھے ہوئے تھے اور فائر کے لیے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔ اسی دوران میں ان کے بالکل قریب مارٹر شیل پھٹا اور وہ دھوئیں میں گم ہوگئے۔

ہم پہلی منزل پر پہنچے تو یہاں کم از کم چار گارڈز خون میں لت پت پڑے دکھائی دیے۔ ان کی سبز جیکٹس گولیوں سے چھلنی تھیں۔ اور خون ایک ریلے کی طرح فرش پر بہہ رہا تھا۔ سجاول نے اپنا پستول بیلٹ میں اڑسا اور ایک سیون ایم ایم رائفل اٹھالی۔ ایک ایل ایم جی میری گرفت میں آگئی۔ یہ ان گارڈز کا ہی اسلحہ تھا جو چند سیکنڈ قبل ایم سولہ گن کے طویل برسٹ سے ہلاک ہوئے تھے۔ دفعتاً سجاول کو کچھ نظر آیا۔ اس نے کندھے سے زخمی سرجن کو اتارا اور ایک راہداری کی طرف دوڑا۔ میں اسے پکارتا ہی رہ گیا۔ اس راہداری سے کسی عورت کے چلانے کی دلدوز آواز آرہی تھی۔ بلکہ یہ ایک سے زیادہ عورتیں تھیں۔

☆☆☆

میں نے قدموں میں پڑے آرتھوپیڈک سرجن کی طرف دیکھا، خون اس کے پورے سفید کوٹ کو بھگو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ جس جگہ پڑا تھا وہاں کسی بھی وقت کسی آوارہ گولی کا شکار ہوسکتا تھا۔ اپنے زخمی کندھے کی وجہ سے میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اسے اٹھا سکتا لیکن میں نے خود پر جبر کیا اور کسی نہ کسی طرح اسے دائیں کندھے پر لادنے میں کامیاب رہا۔ اس کا وزن پینسٹھ ستر کے جی سے زیادہ نہیں تھا۔ ایک برسٹ آیا اور میری ایک جانب والی کھڑکی کا طویل شیشہ چکنا چور ہوگیا۔ شیشے کی بہت سی کرچیاں میرے چاروں جانب گریں، ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے میں نے قسطینا کو دیکھا، وہ سرتاپا ایک ''جنگجو لڑکی'' دکھائی دیتی تھی۔ اس نے ٹیرس کی چار فٹ اونچی دیوار کے پیچھے پوزیشن لے رکھی تھی۔ اس کے اردگرد اس کے جاں نثار گارڈز تھے۔ وہ سب بڑی بے جگری سے کاؤنٹر فائر میں مصروف تھے۔ قسطینا خود بھی ایک چھوٹی نال والی آٹومیٹک رائفل سے فائر کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اردگرد موجود اپنے درجنوں ساتھیوں کو مختلف ہدایات بھی دے رہی تھی۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔

یکایک مخالف سمت سے آنے والے فائر میں بہت تیزی آگئی۔ یوں لگا کہ ہر طرف سے آگ برسنے لگی ہے۔

مارٹر کا ایک گولا سیڑھیوں کے بیچوں بیچ گرا اور میں نے قسطینا کے تین چار ساتھیوں کو شدید زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ قسطینا بھی دھوئیں میں گم ہوگئی۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ محفوظ رہ سکی ہے یا نہیں۔

گہری گرے وردیوں والے سپاہی بڑی تیزی سے آگے بڑھ آئے تھے۔ درجنوں بکتر بند گاڑیاں ان کے ساتھ تھیں۔ عزت مآب ریان فردوس کے سبز پوش پسپا ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

''پکڑو...... کوئی جانے نہ پائے۔'' اسپتال کے گراؤنڈ فلور سے ایک للکارتی ہوئی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے مریضوں کے رونے چلّانے کی آوازیں بھی بلند ہورہی تھیں۔ گراؤنڈ فلور پہ اندھا دھند فائرنگ ہورہی تھی۔ مطلب یہی تھا کہ رائے زل کے سپاہی اندر داخل ہو چکے تھے۔

بے ہوش سرجن بدستور میرے کندھے پر تھا۔ مجھے لگا کہ میں چند سیکنڈ مزید یہاں کھڑا رہا تو ناقابلِ تلافی نقصان اٹھالوں گا۔ سجاول کا خیال ترک کر کے میں بالائی زینوں کی طرف دوڑا۔ حملہ آوروں کے للکارے اب زیریں زینوں میں گونج رہے تھے۔ وہ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ یہ اسپتال ہے، ہر طرف آگ برسا رہے تھے۔ چند گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں۔ میرے جسم کو شدید دھچکا لگا۔ یہی محسوس ہوا کہ مجھے گولی لگ گئی ہے لیکن کہاں؟ ابھی کسی بھی جگہ درد محسوس نہیں ہورہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دو فائر کیے۔ مجھے اپنے عقب میں دھوئیں کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اگر آ بھی رہا ہوتا تو شاید میں وزنی رائفل کو ایک ہاتھ سے سنبھال کر کسی نشانے پر گولی نہ چلا سکتا۔

میں اسپتال کے تیسرے فلور پر پہنچا اور پھر باقی کے زینے طے کر کے چھت پر چلا آیا۔ چھت کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ اسپتال کی یہ عمارت زیادہ بڑے رقبے پر نہیں ہے۔ یہ میرے اندازے کے مطابق کوئی چار کینال رقبہ ہوگا۔ یہاں کچھ ڈش انٹینا اور بہت سے بیکار ائر کنڈیشنرز پڑے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں ٹین کی چادروں کا ڈھیر سا لگا تھا۔ فوری طور پر مجھے چھپنے کے لیے یہی جگہ موزوں نظر آئی۔ اب شام گہری ہوگئی تھی۔ چھت کی بلندی سے میں نے اسپتال کے اردگرد ہونے والی لڑائی کی ایک جھلک دیکھی۔ جگہ جگہ سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے اور ان بادلوں میں تواتر سے موت کے شعلے لپک رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ نیو سٹی کے سپاہی عزت مآب کے سبز پوش سپاہیوں کو دھکیلتے ہوئے کافی آگے تک لے گئے ہیں۔

میں نے پہلے ملا ئشین سرجن کو احتیاط سے فرش پر لٹایا پھر اسے ذرا دھکیل کر آہنی چادروں کے زیریں خلا میں پہنچانے کی کوشش کی۔ ایک سیکنڈ کے مختصر حصے میں مجھے احساس ہوگیا کہ سرجن صاحب اب سرجری اور ہر قسم کی دیگر مصروفیات سے فارغ ہو چکے ہیں۔ گولی گردن کے پچھلے حصے میں کندھوں کے درمیان لگی تھی اور شاید دل جگر وغیرہ میں جا گھسی تھی۔ درحقیقت مرحوم سرجن نے میرے لیے ڈھال کا کام کیا تھا۔ میں نے بھاگتے وقت اسے کندھے پر لاد رکھا تھا۔ اس کا بالائی دھڑ میری پشت پر جھول رہا تھا۔ جو گولی عقب سے آکر میرے جسم میں سوراخ کرتی اسے سرجن ڈاکٹر کے جسم نے روکا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سرجن ڈاکٹر نے میری جان بچائی تھی اور اپنے کیریئر کا یہ آخری کارنامہ اس نے کسی سرجری کے بغیر انجام دیا تھا۔

میں نے ڈاکٹر کے بے جان جسم کو تھوڑا کھینچ کر آہنی چادروں سے دور ہٹا دیا اور خود پیٹ کے بل رینگ کر چادروں کے نیچے چلا گیا۔ اسپتال میں اور اردگرد لڑائی جاری تھی۔ میں نے بھی اپنی گن پوزیشن میں کرلی۔ میرا رخ چھت کے اس دروازے کی طرف تھا جہاں سے میں چھت پر آیا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ اب کسی بھی وقت نیو سٹی یعنی رائے زل کے حملہ آور سپاہی چھت پر آجائیں گے۔ فائرنگ تھرڈ فلور کے مغربی حصے میں ہورہی تھی۔ دھواں تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اس دھوئیں میں بارود کی بو تھی اور جلے ہوئے گوشت کی سڑاند بھی۔

یکایک دروازے پر ہلچل نظر آئی۔ میں نے انگلی ایل ایم جی کے ٹریگر پر رکھ لی۔ دو افراد تیزی سے اندر داخل ہوئے لیکن یہ حملہ آور نہیں تھے۔ میری طرح شاید وہ بھی چھت پر کہیں پوزیشن لینے یا چھپنے آئے تھے۔ انہوں نے تیزی سے چاروں طرف دیکھا اور پھر ان کی نظر بھی ان آہنی چادروں کی طرف ہی پڑی جو اوپر تلے ایک ڈھیر کی صورت چھت کے اس گوشے میں پڑی تھیں۔ ان دونوں کے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ تھا۔ ایک کے ہاتھ میں شاید پستول اور دوسرے کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ چادروں کے قریب پہنچ کر وہ دونوں اوندھے منہ لیٹے اور تب میں نے قسطینا کو پہچان لیا، دوسرا اس کا کوئی جاں نثار ساتھی تھا۔ وہ دونوں پیٹ کے بل رینگ کر اندر چلے آئے اور تب انہیں میری موجودگی کا احساس ہوا۔

''یہ میں ہوں یور ہائی نس۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

مبادا وہ دونوں کوئی غلط حرکت کر بیٹھیں۔

"اوہ گاڈ۔" ہانپتی ہوئی قسطینا کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ یہی وقت تھا جب چھت پر کھلنے والے دروازے پر کئی سائے ایک ساتھ نظر آئے۔

یہ نیوسٹی کی فورس کے لوگ تھے۔ ان کی گہری گرے وردیاں نیم تاریکی میں بھی پہچانی جا رہی تھیں۔ ان کے سروں پر سیفٹی ہیلمٹ اور جسموں پر بلٹ پروف جیکٹس تھیں۔ انہوں نے پھرتی سے چھت پر چاروں طرف دیکھا۔ ٹین کی چادروں کو بھی ٹھوکریں ماریں اور ان میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ہم دم سادھے پڑے تھے۔ ہماری خوش قسمتی کہ کسی کی نظر ہم پر نہیں پڑی۔ وہ لوگ جس تیزی سے آئے تھے، اسی تیزی سے واپس نیچے چلے گئے۔ فقط ایک شخص چھت پر موجود رہا تاہم اس کا رخ بھی چھت کے بجائے سیڑھیوں کی طرف تھا اور وہ نیچے کی صورتِ حال جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

نیچے اب فائرنگ کی شدت بہت کم ہو گئی تھی۔ بس اِکا دُکا گولیاں چلتی تھیں یا پھر مار دھاڑ کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ نیوسٹی کی فورس نے اس علاقے کا مکمل کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ ریان فردوس کے لوگ پسپا ہو گئے ہیں، کچھ مارے گئے ہیں یا پکڑے گئے ہیں۔

قسطینا مجھ سے صرف چند انچ کے فاصلے پر میری ہی طرح اوندھی لیٹی تھی۔ میں اس کی ہانپتی ہوئی سانسوں کی آہٹ سن رہا تھا۔ اس کا ساتھی شاید تھوڑا سا زخمی تھا، کسی وقت وہ بے ساختہ کراہ اٹھتا تھا۔ "نیچے کیا ہوا ہے؟" میں نے قسطینا سے پوچھا۔ لہجہ سرگوشی کا ہی تھا۔

وہ بولی۔ "بزدل لوگ ہیں، اچانک حملہ کیا ہے اور دیکھو اسپتال کو بھی نہیں بخشا۔"

میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ انہیں اسپتال میں آپ کی موجودگی کا پتا چل گیا ہو اور انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا ہو؟"

"ہو...... بھی...... سکتا ہے۔" قسطینا نے سرگوشی کی۔

"کیا آپ کے لوگ مکمل طور پر پسپا ہو گئے ہیں؟"

"لگ تو یہی رہا ہے۔" قسطینا کے لہجے میں ہلکا سا تاسف تھا لیکن اس کے ساتھ تپش بھی تھی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہم اپنے نہیں "دشمن" کے علاقے میں تھے۔ اس اسپتال سمیت اردگرد کی ساری عمارتوں اور سڑکوں پر ریائے زل کی فورس کو کنٹرول حاصل ہو گیا تھا۔ اب کسی قریبی سڑک سے پُرجوش نعروں کی آوازیں بھی ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ 24 گھنٹے پہلے تک جانانی کے لوگ کتنے پُرجوش تھے اور قسطینا نے بھی مجھے بڑے فخر سے بتایا تھا کہ ائرپورٹ پر ہونے والی لڑائی میں ان کا ایک سنگل آدمی بھی کام نہیں آیا۔ لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ "یور ہائی نس، میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ یہ لوگ تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ سخت ری ایکشن شو کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو لائن آف کنٹرول کے اتنا نزدیک نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر ہمارے پاس جدید سہولتوں والا یہی ایک بڑا اسپتال موجود ہے۔"

میں نے دل میں سوچا...... موجود ہے نہیں، موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ قسطینا مزید کچھ کہتی، ایک بار پھر زینوں پر بھاری بوٹوں کی دھا دھم سنائی دی۔ ہمارے دل شدت سے دھڑک اٹھے۔ ہم مزاحمت تو کر سکتے تھے مگر یہ مزاحمت آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں چل سکتی تھی، اور اس بات کا دور دور تک امکان نہیں تھا کہ ایک آدھ گھنٹے میں یہاں کی مجموعی صورتِ حال تبدیل ہو سکتی ہے۔

سات آٹھ مسلح سپاہی چھت پر پہنچ گئے اور اس مرتبہ ان میں ایجنسی کے دو تین افراد بھی دکھائی دیے۔ ایجنسی کے غیر ملکی سپاہیوں کی وردیاں بھی سبز تھیں مگر ان کی ٹوپیاں سبز اور سرخ دھاریوں والی تھیں۔

"دھوکے باز...... حرام زادے...... غدار۔" قسطینا نے ایجنسی والوں کو دیکھا تو دانت پیس کر انہیں صلواتیں سنائیں۔ رائفل پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

لڑائی کے دوران میں غالباً بجلی کے نظام کو نقصان پہنچا تھا۔ اسپتال کے بالائی طور کو تاریکی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ چھت بھی اس میں شامل تھی۔ ان حملہ آوروں کے ہاتھوں میں طاقتور ٹارچیں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ لوگ سرجن ڈاکٹر کی لاش تک پہنچے...... ایک ایجنسی اہلکار نے انگلش میں کہا۔ "یہ یہاں کیسے پہنچا؟"

اس کا ماتحت ملائیشین لہجے کی انگلش میں بولا۔ "لگتا ہے سر زخمی ہو کر اوپر بھاگا اور یہاں گر گیا۔"

"جہاں اسے گولی لگی ہے، یہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر نہیں آ سکتا تھا، کوئی اسے اٹھا کر لایا ہوگا۔ دیکھو، کوئی اور تو موجود نہیں یہاں۔"

آفیسر ہدایات دیتا ہوا نیچے چلا گیا۔ ایجنسی کا ایک اہلکار اور تین چار دیگر افراد اوپر ہی رہے۔ وہ ایک بار پھر

چھت کے کونے کھدروں کا جائزہ لینے لگے۔ انہوں نے ٹین کی چادروں کو الٹ پلٹ کرنا شروع کیا۔ ہم جن گھیرے میں تھے وہ تنگ ہوتا جارہا تھا۔ قسطینا کا ساتھی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں اور قسطینا بھی دم سادھے لیٹے تھے اور کسی بھی صورتِ حال کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کررہے تھے۔

"اشرفی تم ادھر سے دیکھو۔" امریکن افسر نے مقامی اہلکار کو حکم دیا۔

وہ گھوم کر عین اسی طرف آگیا، جہاں سے ہم خلا میں گھسے تھے۔ اب بچاؤ کی امید رکھنا حماقت تھی۔ قسطینا نے انگلی ٹریگر پر رکھ دی اور اپنے بریٹا پسٹل کا رخ خلا کی طرف موڑ دیا۔ میں نے بھی رائفل کو اسی جانب پوزیشن کرلیا۔ وہ شخص لڑکھڑاتا ہوا سا کچھ اور آگے آیا پھر اس نے گھٹنوں اور ایک ہاتھ کے بل جھک کر ٹارچ کا روشن دائرہ چادروں کے نیچے پھینکا، ہم تینوں بالکل ایک گوشے میں سمٹ گئے تھے۔ روشن دائرہ ہمارے بالکل پاس سے گزرا، پھر اس نے قسطینا کے ساتھی کی پنڈلیوں اور پاؤں کو روشن کیا۔ ایسا بس ایک سیکنڈ کے لیے ہوا۔ میری ایل ایم جی کسی بھی وقت شعلے اگلنے کے لیے تیار تھی مگر روشن دائرہ آگے بڑھ گیا اور دائیں بائیں چکرا کر باہر چلا گیا۔ اشرفی نے شاید فتح کے نشے میں ایک دو پیگ لگا رکھے تھے، اس کی نظر نے درست کام نہیں کیا تھا یا پھر ہماری قسمت اچھی تھی کہ اس کی بینائی، اندھے پن میں بدل گئی تھی۔

ایک اور امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اشرفی نام کے اس نامعلوم شخص نے ہمیں "رعایت" دی ہو۔ بہرحال یہ بس ایک قیاس ہی تھا۔ ہم بے حس وحرکت وہاں پڑے رہے اور اپنی دھڑکنیں گنتے رہے۔ ڈاکٹر کی لاش وہاں سے اٹھوائی گئی۔ مسلح محافظ اِدھر اُدھر چکرانے کے بعد چھت کے دروازے کی طرف چلے گئے۔ یہاں کوئی چھوٹا سا باورچی خانہ تھا جس میں سے چائے کی ہلکی سی مہک اٹھ رہی تھی۔

"اب کیا کرنا ہے یورہائی نس؟" میں نے کہا۔

یورہائی نس کو پہلی بار احساس ہوا کہ ٹارچ کی زد سے بچنے کے لیے وہ بالکل میرے ساتھ پیوست تھی۔ دائیں جانب سے اس کا جاں نثار ساتھی اس کے پہلو کو چھو رہا تھا۔ ہم تینوں ٹین کی چادروں تلے اوندھے پڑے تھے۔ قسطینا تھوڑا سا پیچھے ہٹ گئی۔ دائیں جانب سے اس کے ساتھی نے بھی اپنے اور مالکن کے درمیان فاصلہ پیدا کرلیا۔ وہ شرمندہ سی آواز میں بولا۔ "وری سوری یورہائی نس۔"

"کوئی بات نہیں حیات۔" وہ عام لہجے میں بولی۔

مجھے پتا چلا کہ اس کے مقامی ساتھی کا نام حیات ہے۔ اس کی ہتھیلی پر کسی شاٹ گن کا فائر لگا تھا اور ایک چھرا گوشت میں گھسا ہوا تھا۔

"ہمیں ابھی وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ......" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

"کیا ہوسکتا ہے یورہائی نس؟" میں نے پوچھا۔

"شاید عزت مآب کے حکم پر افغان جوابی حملہ کرے۔" قسطینا نے کہا، تاہم اس کے لہجے میں یقین اور جوش کی کمی تھی۔

"مجھے اپنے ساتھی کی بھی فکر ہے۔" میں نے مدھم آواز میں کہا۔

"کون؟...... ہاں تمہارا ساتھی مسٹر سجاول؟ کہاں ہے وہ؟"

"وہ فرسٹ فلور تک میرے ساتھ تھا پھر کسی کو بچانے کے لیے آپریشن تھیٹرز کی جانب چلا گیا، اس کے بعد پتا نہیں چلا۔"

"ادھر تو کافی نقصان ہوا ہے۔ مارٹر کے چار پانچ گولے بھی گرے ہیں...... چلو اگر زندگی ہے تو پھر کوئی آنچ نہیں......"

لیٹے لیٹے اب جسم اکڑنا شروع ہوگیا تھا۔ میں تھوڑا سا پیچھے کھسکا۔ اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ چادروں میں آواز پیدا ہوتی تو چھت پر موجود مسلح سپاہی چونک جاتے۔ پانچ چھ فٹ پیچھے کھسکنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہاں نسبتاً جگہ تھوڑی سی کشادہ ہے۔ ہم کو دو فٹ سے زائد اونچائی مل سکتی تھی۔ اس اونچائی میں اگر ہم سیدھے ہوکر نہیں تو ذرا جھک کر ضرور بیٹھ سکتے تھے۔

میں نے قسطینا کا پاؤں دبا کر اسے پیچھے آنے کے لیے کہا۔ وہ بھی احتیاط سے رینگتی ہوئی اس نسبتاً کشادہ جگہ پر آگئی۔ اب حیات کی باری تھی۔ وہ جب پیچھے ہٹا تو معمولی سی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ ہم جہاں کے تہاں منجمد ہوگئے۔ ہم سے فقط پندرہ بیس میٹر کی دوری پر "نوسٹی" کے خطرناک ہرکارے سرونٹ کچن میں موجود تھے اور چائے وغیرہ پی رہے تھے۔

ایک بار پھر قسمت نے یاوری کی اور وہ لوگ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ حیات بھی پیچھے کو کھسک کر ہمارے پاس آگیا۔ ہم آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ تاہم ہمیں اپنی

کر دیں جھکا کر رکھنا تھیں تا کہ سر چادروں سے نیچے نہ ہو۔

کہیں دور ہیلی کاپٹر کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ غالباً یہ وہ ہیلی کاپٹر تھے...... بلیک ہاک ٹائپ کے۔

قسطینا کے چہرے پر تھوڑی سی چمک آئی۔ ''یہ ہمارے چاپر ہیں......''

''آپ کا کیا خیال ہے، جوابی حملہ......؟''

''شاید......''

ہم کچھ دیر خاموشی سے کان لگا کر آواز سنتے رہے۔ آواز پہلے کچھ قریب آئی لیکن پھر بتدریج دور ہوتی گئی اور معدوم ہو گئی۔ قسطینا ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ پستول بدستور اس کے ہاتھ میں تھا اور ہاتھ گود میں رکھا تھا۔ نیم تاریکی میں وہ بالکل کوئی خوبرو لڑکا ہی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اس ''خوبرو لڑکے'' کو میں تھوڑی دیر پہلے بے جگری سے لڑتے اور اپنے ساتھیوں کو کمانڈ کرتے دیکھ چکا تھا۔ وہ جیسے اپنے آپ میں ابل رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ ان چادروں کے ڈھیر میں سے کسی میزائل کی طرح نکلتی اور دشمنوں پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑتی۔

کچن کے ساتھ ہی ایک سرونٹ کوارٹر ٹائپ جگہ تھی۔ چند مسلح سپاہی وہاں موجود تھے اور بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ کسی وقت کوئی اڑتا ہوا سا فقرہ ہم تک بھی پہنچ جاتا تھا۔ وہ ریان فردوس اور اس کی فیملی کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کر رہے تھے پھر ایک امریکن ایجنٹ یعنی ایجنسی اہلکار نے بلند آواز میں کہا۔ ''کاش وہ لیڈی کمانڈر یہاں ہوتی تو ہم اس سے لڑائی کے کچھ گر ہی سیکھ سکتے......''

دوسرے نے کہا۔ ''لڑائی کے تو نہیں...... دفاع کے گُر وہ تمہیں ضرور سکھا سکتی تھی کیونکہ ہم جیسوں کے گھیرے میں تو اسے اپنے ''دفاع'' سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔''

تین چار افراد لوفر انداز میں ہنسے پھر وہ شاید تاش کھیلنے میں مصروف ہو گئے جو افراد کچن کی طرف موجود تھے وہ اسپتال کے کسی کمرے سے کسی نرس کو پکڑ لائے تھے اور اب اس سے کوئی خاص ڈش بنوا رہے تھے۔ بڑی بھینی بھینی خوشبو اُڑ کر ہم تک پہنچ رہی تھی۔ اس میں تلے ہوئے آلوؤں، مشروم اور چکن کی موجودگی کا پتا چلتا تھا۔ نرس کو ''پکانے'' کے ساتھ ساتھ شاید سپاہیوں کی خرمستیاں بھی سہنا پڑ رہی تھیں۔ کوئی اس سے فحش مذاق کرتا تھا، کوئی چٹکی کاٹ لیتا تھا۔ گاہے بگاہے اس کی احتجاجی آواز بلند ہوتی تھی لیکن اسے ڈانٹ کر دوبارہ کام پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔

یہ ساری آوازیں ہمارے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ کسی وقت تو دل چاہتا تھا کہ ایل ایم جی لے کر نکل پڑوں اور کم از کم ان تین چار مے نوشوں کو تو ضرور جہنم واصل کر دوں۔ پھر ان میں سے کوئی ایک اپنی لڑکھڑاتی ہوئی بھدی آواز میں ایک انگلش گیت گانے لگا۔ اس گیت کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

ہم چل پڑے ہیں تو منزل پر پہنچ کر دم لیں گے
کوئی رکاوٹ ہماری راہ میں نہیں آسکتی
ہم بزدل دشمن کو اس کے بل میں سے نکال کر ماریں گے
اور ہماری بہادری دیکھ کر
دشمن کی سرزمین ہمارے قدم چومے گی
پھل دار درختوں کی ساری ٹہنیاں خود ہمارے لیے جھک جائیں گی
اور وہاں کی خوبرو عورتیں
بڑی خوشی سے ہمارے گلے میں محبت کے ہار ڈالیں گی

''محبت کے ہار'' والے الفاظ گانے میں بار بار آتے تھے اور جب یہ الفاظ آتے تھے سب مل کر گانے لگتے تھے ''محبت کے ہار۔''

ایک کڑاکے دار آواز نے ان میراثیوں کو خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ ان کا کوئی مقامی افسر تھا۔ اس نے انہیں ماں بہن کی گالیاں دیں اور اس بات پر بری طرح لتاڑا کہ وہ میڈیکل کے پیشے سے تعلق رکھنے والی ایک مجبور لڑکی پر مشق ستم کر رہے ہیں۔ وہ فی میل نرس کو ان سے چھڑا کر نیچے اسپتال میں لے گیا۔

ہم ایک بار پھر ٹین کے اس ڈھیر تلے خاموش بیٹھے تھے۔ ہمارا بیٹھنا کافی مضحکہ خیز تھا۔ ہم نے آلتی پالتی مار کر سر حتی الامکان حد تک جھکا رکھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی سزا دی گئی ہو۔ تادیر اس طرح بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا۔ جوں جوں رات آگے کو سرک رہی تھی ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی اور ٹین کی یہ چادریں ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ ایک موقع پر حیات کو کھانسی آگئی اور اس نے جان توڑ کوشش کر کے اس کھانسی کو روکا۔ اس کوشش میں اس کے گلے سے گیں گیں کی دبی ہوئی آوازیں نکلیں......

قسطینا نے اس سے کہا۔ ''حیات! تم لیٹ جاؤ۔ دوبارہ کھانسی نہ ہونے لگے۔''

''نہیں، یور ہائی نس! میں یہ بے ادبی نہیں کر سکتا۔'' اس نے لرز کر کہا۔

''لیکن میں حکم دے رہی ہوں۔'' وہ ملائمت سے بولی۔

کچھ دیر ہچکچانے کے بعد حیات نے اپنے بالائی دھڑ کو قوس کی شکل میں حرکت دی اور پھر ہولے سے کروٹ کے بل لیٹ گیا۔ میں اور قسطینا اسی طرح بیٹھے رہے، باہر سے آنے والی آوازوں کو سنتے رہے۔ ''محبت کے ہار'' الاپنے والی ٹولی تو اب تھک کر خاموش ہو چکی تھی مگر سرونٹ کوارٹر کی طرف گاہے بگاہے شور بلند ہوتا تھا۔ وہاں تاش کی بازی چل رہی تھی اور کھایا پیا جا رہا تھا۔

میرا پیٹ پچھلے بیس گھنٹے سے خالی تھا۔ اب بھوک لگنا شروع ہو گئی تھی۔ تلے ہوئے آلوؤں اور چکن کی بھنی بھنی خوشبو مسلسل نتھنوں میں گھس کر معدے میں ہلچل مچا رہی تھی۔ سڑکوں پر سے مسلح افراد کی گاڑیاں گزرتی تھیں اور کئی دفعہ نعرے بھی سنائی دیتے تھے۔ یہ نعرے رائے زل کے حق میں ہی ہوتے تھے۔ ساتھ میں کسی مدر ماوام کا نعرہ بھی لگایا جاتا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ رائے زل کی والدہ کا نعرہ تھا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی جو ایک عرصے سے خم ٹھونک کر میدان میں آئی ہوئی تھی، باہر سے آنے والی آوازوں میں گاہے بگاہے کسی ایمبولینس کا شور یا فائر کا دھماکا بھی سنائی دے جاتا تھا جس سے ماحول کی سنگینی بڑھ جاتی تھی۔

''آپ کے لیے تو ڈی پیلس میں بہت زیادہ فکرمندی ہو گی؟'' میں نے قسطینا سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں کہا۔

''جنگ میں تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے اور اب یہ ایجنسی اور اس کے پٹھوؤں کے ساتھ کھلی جنگ ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ آپ کی بازیابی کے لیے جوابی حملہ کیا جائے۔''

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ عزت مآب فیصلہ کرتے ہوئے کچھ دیر لگاتے ہیں لیکن یہ بات تو اب طے ہے کہ جوابی حملہ ہو گا اور بڑا زوردار ہو گا۔'' وہ ایک دم چونک سی گئی۔ ''او مائی گاڈ۔'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

اس نے جلدی سے اپنی پینٹ کی پاکٹ تک ہاتھ پہنچایا اور اپنا سیل فون نکال لیا۔ سیل فون دیکھ کر اس نے اطمینان کی طویل سانس لی۔ سیل فون سائلنٹ پر تھا۔ یہ اچھا تھا کہ وہ سائلنٹ پر تھا ورنہ اس فون کی گھنٹی بج جاتی تو یقیناً ہماری بھی بج جاتی۔

میرا فون تو اُدھر ڈی پیلس کی انیکسی میں ہی رہ گیا تھا۔ لہٰذا مجھے فکر نہیں تھی۔ قسطینا کے ساتھ حیات کے پاس بھی فون تھا۔ اس نے بھی قسطینا کی پیروی کرتے ہوئے جلدی سے فون نکالا اور اسے آف کر دیا۔ یقیناً یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہی رہی تھی کہ اب تک حیات کے فون پر کوئی کال نہیں آئی تھی۔

قسطینا فون کو گھورتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اسے آن کر کے اسکرین چیک کرنا چاہتی تھی۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ اسے کالز کی گئی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ ایس ایم ایس بھی آئے ہوں۔ مگر اسکرین روشن کرنے کا مطلب خطرہ مول لینا تھا۔ ٹین کی چادروں کے نیچے چمکنے والا روشنی کا ننھا سا نقطہ بھی سرونٹ کوارٹر اور کچن میں موجود مسلح سپاہیوں کو ہماری طرف متوجہ کر سکتا تھا۔

ہنگامی صورتِ حال کے دوران میں میرے کندھے کا درد وقتی طور پر دب گیا تھا مگر اب وہ پھر مجھے بے چین کر رہا تھا۔ میں قسطینا پر اپنی تکلیف ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ کافی زیرک تھی، بھانپ گئی کہ میں تکلیف میں ہوں۔ اس کی سبز یونیفارم آٹھ پاکٹ والے ڈیزائن میں تھی۔ اس نے ایک پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا باکس نکالا۔ یہ سگریٹ کی ڈبیا کے سائز کا تھا اور اسٹیل کا بنا ہوا تھا۔ اس میں فرسٹ ایڈ کا مختصر اور نہایت ضروری سامان موجود تھا۔ میڈیکل ٹیپ، پین کلر انجکشن اور چند گولیاں۔ اس نے نیم تاریکی میں باکس کھولا۔ کوشش کر کے ایک گولی ڈھونڈی اور سرگوشی میں بولی۔ ''پین زیادہ ہے تو اسے نگل لو۔ لیکن پانی کے بغیر نگلنا ہو گی۔''

حقیقت یہ تھی کہ پیاس کی وجہ سے میرا گلا بالکل خشک ہو رہا تھا۔ اگر میں یہ ٹیبلٹ نگلنے کی کوشش کرتا تو لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ کھانسی آ جاتی تو شاید ہمیں ٹین کی چادروں کے نیچے ہی بھون کر رکھ دیا جاتا مگر درد کا حل بھی کچھ اور نہیں تھا۔ درمیانی راستہ میں نے یہ نکالا کہ اس لمبوتری گولی کو منہ میں رکھ کر چبا لیا اور پیس کر نگل لیا۔ سارے منہ اور گلے میں بے تحاشا کڑواہٹ گھل گئی۔

☆☆☆

جب میں اپنے زخمی کندھے کے علاج کے لیے اس اسپتال کے مین گیٹ میں داخل ہوا تھا، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اسپتال میں داخل ہونے کے بجائے ایک چوہے دان میں پھنسنے جا رہا ہوں۔

ٹین کی بہت سی پرانی چادروں کے نیچے یہ ایک چوہے دان ہی تو تھا۔ مجھے، قسطینا اور حیات کو یہاں ''ٹریپ'' ہوئے قریباً اڑتالیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ ایک طرح سے یہ

تیسری رات بھی جوا پنی تمام تر اذیت کے ساتھ ہمارے سر پر کھڑی تھی۔ قسطینا کے فرسٹ ایڈ باکس میں جتنی پین کلرز موجود تھیں وہ سب میں چبا چکا تھا اور بات صرف میری پین کی ہی نہیں تھی ان اڑتالیس گھنٹوں میں ہماری بھوک اور پیاس عروج پر پہنچ چکی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پیٹ ہی نہیں پورا جسم خالی اور کھوکھلا ہے۔ اس پیاس اور بھوک کو وہ بھینی بھینی خوشبو اور تکلیف دہ بنا دیتی تھی جو شام کو کچن کی طرف سے اٹھتی تھی اور سارے میں پھیل جاتی تھی۔

''لگتا ہے کہ ہمارے ہیلی کاپٹر آ رہے ہیں۔'' حیات نے مری مری آواز میں کہا۔

''ہیلی کاپٹر تو کل بھی دو بار آئے تھے مگر کوئی کارروائی کریں تب ہے نا۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔

''کارروائی تو ضرور ہوگی۔'' قسطینا کی فاقہ زدہ آواز میں یقین کی لہر تھی۔

''ہماری وفات کے بعد ہوئی تو کیا فائدہ۔'' میں نے یہ فقرہ زبان سے ادا نہیں کیا، لیکن دل میں یہی الفاظ تھے۔

کل دوپہر کے بعد قسطینا کے سیل فون کی بیٹری ختم ہو گئی تھی۔ حیات کا فون اس سے پہلے ہی ڈیڈ ہو گیا تھا۔ قسطینا کو آقا جان، حلمی اور ریان فردوس کی طرف سے کئی ایس ایم ایس موصول ہوئے تھے اور اسے اپنی شدید فکرمندی سے آگاہ کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی یقین دلایا گیا تھا کہ اسے وہاں سے نکالنے کے لیے پروگرام ترتیب دیا جا رہا ہے۔ قسطینا نے ریان فردوس کو اپنی ٹھیک ٹھیک پوزیشن سے آگاہ کر دیا تھا۔ حلمی نے خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید اسپتال کی چھت پر سے انہیں ہیلی کاپٹر کی مدد سے اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

یہ سب کچھ بہت خطرناک تھا اور شاید اسی وجہ سے ابھی تک عملی طور پر کچھ بھی نہیں ہو سکا تھا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ جاماجی کی فورس کی طرف سے ایک بڑے حملے کا انتظار کیا جائے..... جاماجی کی فورس یہ علاقہ کلیئر کرا لے اور یوں وہ تینوں بھی ٹین کی چادروں کی اس قبر میں سے نکل سکیں۔

ہیلی کاپٹرز کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ یہ وہی دو بلیک ہاک یو ایچ 60 تھے جو ہم نے جزیرے پر آمد کے وقت ائرپورٹ پر کھڑے دیکھے تھے۔ ''لگتا ہے، اب کچھ نہ کچھ ہوگا۔'' قسطینا کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

ہیلی کاپٹرز کی آواز پہلی مرتبہ اتنی نزدیک آئی تھی۔ میں نے چادروں میں موجود ایک تنگ سوراخ کے ذریعے باہر جھانکنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ اچانک فائرنگ کی لرزہ خیز آواز سے در و دیوار گونج اٹھے۔ گن شپ ہیلی کاپٹرز اسپتال کے اردگرد اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ جواب میں نیچے سے بھی فوراً فائرنگ شروع ہو گئی۔ دور مار رائفلوں اور راکٹ لانچرز کے دھماکے بھی سنائی دیے۔ ایک ہیلی کاپٹر برق رفتاری سے اسپتال کی چھت کی طرف آیا اور ایک برسٹ مارتا ہوا گزر گیا۔ پائلٹ کو یقیناً سمجھایا گیا تھا کہ چھت پر پڑی چادروں کو HIT نہیں ہونا چاہیے۔ گولیوں سے ان چادروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا..... اور اس کے ساتھ ساتھ چھت پر موجود نیوسٹی کے سپاہیوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

یہ ایک ناکام حملہ تھا۔ نیچے سے اتنا شدید فائر کیا جا رہا تھا کہ ہیلی کاپٹرز کسی بھی وقت ناقابلِ تلافی نقصان اٹھا سکتے تھے۔ (اور جیسا کہ بعد میں پتا چلا ایک بلیک ہاک کو نقصان پہنچا بھی تھا)

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہیلی کاپٹرز واپس جا رہے ہیں۔ دونوں ہیلی کاپٹرز نے بمشکل آٹھ دس برسٹ ہی مارے ہوں گے۔ شاید ان کے جلدی واپس جانے کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ ہم ایک اسپتال میں موجود تھے اور ''پائلٹس'' اسپتال پر اندھا دھند گولیاں نہیں برسا سکتے تھے۔

دو چار منٹ تک اسپتال کے اردگرد کی سڑکوں پر ایمبولینسز کے سائرن سنائی دیتے رہے جس سے اندازہ ہوا کہ ہیلی کاپٹرز کی فائرنگ سے کچھ لوگ زخمی یا ہلاک ہوئے ہیں۔ اس کے بعد وہی پہلے والی روٹین کی آوازیں باقی رہ گئیں۔

قسطینا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''لگتا ہے ابھی ہمیں کچھ دیر اور یہاں گزارا کرنا ہوگا۔''

قسطینا بڑے دبنگ لہجے میں بولتی تھی لیکن اب مسلسل بھوک پیاس کی وجہ سے اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔ حیات نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''یور ہائی نس! میں آپ کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟''

''تکلیف تو ہم تینوں جھیل رہے ہیں اور تم دونوں تو زخمی بھی ہو۔''

''میرا زخم ایسا نہیں ہے مالکن کہ میں کچھ کر نہ سکوں۔'' حیات نے فدویانہ لہجے میں کہا۔ اس کی اپنی آواز بھی نقاہت سے ٹوٹ رہی تھی۔

ہیلی کاپٹرز کے مختصر حملے کے بعد چھت پر اب حالات پھر معمول کے مطابق تھے۔ کچن میں شاید بیسن والی مچھلی تلی گئی تھی اور بیف روسٹ کیا گیا تھا۔ باقی دو کھا کر جا چکے تھے لیکن ایک امریکن اور ایک مقامی اب بھی کچن میں موجود تھے۔ میں ایک درز میں سے ان دونوں کے ہیولے

دیکھ سکتا تھا۔ چھت کی بجلی کل شام ہی بحال ہو گئی تھی۔ اب سرونٹ کوارٹرز اور کچن صاف دکھائی دیتے تھے۔

کچھ دیر بعد کچن میں موجود دونوں افراد کسی کے پکارنے پر نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف چلے گئے۔ اب کچن خالی تھا۔ وہاں سرونٹ کوارٹر میں لوگ موجود تھے اور گفتگو ہو رہی تھی۔ یہ گفتگو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والی ''ہیلی کاپٹرز کی فائرنگ'' کے بارے میں تھی۔ ایک آواز آئی۔ ''مجھے تو لگتا ہے پائلٹوں کی جگہ گیدڑ بیٹھے ہوئے تھے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''گیدڑ تو وہاں ڈی پیلس میں بیٹھا ہوا ہے۔ یہ تو اس کے بچونگڑے تھے۔''

پہلے نے کہا۔ ''یار، یہ پوری فیملی ہی ہیجڑوں کی ہے۔''

یہ قصیدہ یقیناً ریان فردوس کی شان میں پڑھا جا رہا تھا۔

بس اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ ہم اپنی اپنی جگہ ساکت لیٹے رہے۔ ہمارے نیچے، ٹائلوں کا فرش تھا۔ یہ فرش دن کے وقت تپنے لگتا تھا اور رات کو یخ ہو جاتا تھا۔ کچھ یہی حال ٹین کی چادروں کا تھا۔ یہ چادریں شاید تعمیر کے دوران میں بچ گئی تھیں اور انہیں فالتو سامان کے ساتھ اس کونے میں ڈال دیا تھا۔ جزیرے کے دن اور رات کے ٹمپریچر میں خاصا فرق تھا۔ دن کے وقت پیاس بے حال کر دیتی تھی اور رات کو سردی کے سبب ''بھوک'' اپنے تیز پنجوں کے ساتھ معدے کو کریدنے لگتی تھی۔ یہ تیسری رات تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کل کا سورج جب طلوع ہوگا اور یہ چادریں گرم ہونا شروع ہوں گی تو ہم شدید ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہو جائیں گے۔

مسئلہ یہ تھا کہ دو چار مسلح گارڈز ہر وقت چھت پر موجود رہتے تھے۔ کبھی یہ تعداد دس بارہ تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ اگر کچن کی طرف کوئی نہیں ہوتا تھا تو سرونٹ کوارٹر کی طرف کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہوتا تھا۔ اب بھی کچن کی طرف خاموشی تھی مگر کوارٹر کی طرف سے گارڈز کی منحوس آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

''ہائیں، یہ کہاں گیا؟'' اچانک قسطینا کی سرگوشی نے مجھے چونکایا۔

میں نے بھی سر گھما کر دیکھا۔ حیات اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔

''ابھی...... تو...... یہیں تھا۔'' قسطینا نے جیسے کراہ کر کہا۔

میں نے خود کو اوندھا کیا اور چادروں کے درمیان موجود ایک باریک جھری سے آنکھ لگائی۔ مجھے حیات نظر آیا۔ وہ نیم تاریکی میں پیٹ کے بل رینگتا ہوا کوئی بیس پچیس فٹ دور پہنچ چکا تھا۔ اس کا رخ کچن کی طرف تھا جہاں سے اب بھی روسٹ گوشت اور تلے ہوئے پیاز کی مہک اٹھ رہی تھی۔ یقیناً اس نے بھوکوں مرنے کے بجائے، کوشش کرنے کو ترجیح دی تھی۔ وہ کچن سے کچھ لے کر آنا چاہتا تھا۔

''وہ کچن کی طرف جا رہا ہے۔'' میں نے سرسراتی آواز میں قسطینا کو مطلع کیا۔

''یہ خطرناک کام کیا ہے اس نے۔'' وہ تاسف سے بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ ہمارے لیے فکرمند ہے، خاص طور سے آپ کے لیے......''

''مگر یہ رسک ہے وہ کتنی دور گیا ہے؟''

''آدھے راستے میں ہے۔''

قسطینا ابھی تک پشت کے بل لیٹی تھی پھر وہ بھی اوندھی ہو گئی اور کسی جھری سے باہر جھانکنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

میں حیات کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک ایک انچ سرکتا ہوا کچن کی طرف جا رہا تھا۔ کچن میں موجود جو دو افراد نیچے گئے تھے، وہ ابھی تک نیچے ہی تھے۔ تاہم وہ کسی بھی وقت اوپر آ سکتے تھے۔ سرونٹ کوارٹر میں موجود افراد میں سے بھی کوئی باہر نکل سکتا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ حیات کو دیکھتا رہا۔ ایل ایم جی پر میری گرفت مضبوط تھی، تاہم ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ کسی تصادم کی صورت میں مجھے کیا کرنا ہوگا۔

حیات بڑی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچن میں داخل ہو گیا۔ قریباً ایک منٹ بعد دوبارہ اس کا ہیولا نظر آیا لیکن اب وہ پیٹ کے بل نہیں رینگ رہا تھا، رکوع کے انداز میں جھک کر چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کے لیے کچھ موجود تھا۔ پانی کی بڑی بوتل بھی تھی۔ وہ کچن اور سیڑھیوں سے دس بارہ قدم ہی آگے آیا تھا کہ دائیں جانب سرونٹ کوارٹر کا دروازہ پُرشور انداز میں کھلا اور ایک مسلح گارڈ ہاتھ میں خالی ٹرے لیے ہوئے برآمد ہوا۔ اس اچانک افتاد سے گھبرا کر حیات واپس مڑا اور تیزی سے سیڑھیوں میں اوجھل ہو گیا۔ خود کو گارڈ کی نظروں سے بچانے کے لیے وہ یقیناً سیڑھیوں پہ کہیں کھڑا ہو گیا تھا۔ گرے یونیفارم والا تنومند گارڈ اپنے آپ میں مگن، کچن کے اندر داخل ہوا اور برتنوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آنے لگی۔ وہ کھانے کے لیے کچھ نکال رہا تھا۔ اس کی واپسی کے بعد ہی حیات سیڑھیوں سے برآمد ہو کر ہمارے پاس پہنچ سکتا تھا۔

یکایک سیڑھیوں کی طرف شور سنائی دیا، اور ہم سکتہ زدہ رہ گئے۔ ''کون ہے یہ؟ پکڑو۔'' کسی غیر ملکی نے کڑک

دار آواز میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز آئی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ وہی پستول ہے جو حیات کے پاس تھا۔

''پکڑو...... جانے نہ پائے۔'' کوئی پھر بھاری آواز میں چلایا۔ دھماچوکڑی مچی۔

میں نے چادروں میں موجود جھری میں سے دیکھا۔ سیڑھیوں کے دروازے پر حیات کا ہیولا نظر آیا۔ اس کے پیچھے گارڈز تھے۔ پھر وہ اوندھے منہ کچن کے سامنے گرا۔ اس کے ہاتھ سے پانی کی بوتل گر کر دور تک لڑھک گئی۔ کئی افراد اس سے چمٹ گئے۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ سوچتے یا کر سکتے ایک بار پھر فائر کی آواز گونجی۔ یہ فائر بھی یقیناً حیات کے پستول سے ہی ہوا تھا۔ ایک دم ہنگامہ سرد پڑ گیا۔ حیات سے چمٹنے والے افراد پیچھے ہٹ گئے۔ مجھے حیات کا بے سدھ جسم دکھائی دیا۔ ایک فربہ اندام امریکی نے نیچے جھک کر حیات کے ہاتھ میں سے پستول نکال لیا۔ قسطینا کو یہ مناظر دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

''اس نے خود کو گولی مار لی۔'' میں نے سرگوشی میں قسطینا کو دردناک اطلاع پہنچائی۔

ہم اپنی اپنی جگہ ساکت اور خاموش لیٹے رہے۔ میں اوندھا لیٹا تھا اور چند انچ کے فاصلے پر قسطینا پشت کے بل پڑی تھی۔ ہمیں غم کی گہری تاریکی نے ڈھانپ لیا تھا۔ کچن کے قریب سے آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کسی نے انگلش میں کہا۔ ''یہ نیچے سے آیا ہے۔ سیڑھیوں کے موڑ پر دیوار سے لگا کھڑا تھا۔''

ایک اور شخص بولا۔ ''لیکن ڈبل روٹی اور روسٹ چکن تھا اس کے پاس...... اس کا مطلب ہے کہ یہ کچن تک پہنچا ہے اور پھر واپس آیا ہے۔''

مختلف آرا پیش کی جا رہی تھیں اور وہ کروٹ کے بل چھت پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اپنی تمام بھوک اور پیاس سمیت وہ راہیِ عدم ہو چکا تھا۔ وہ جاں نثار تھا اور اس نے بتا دیا تھا کہ جاں نثاری کیسے کی جاتی ہے، اسے اپنی بھوک پیاس سے کہیں زیادہ اپنی مالکن کی بھوک پیاس اور زندگی کی فکر تھی۔ اس نے مالکن کو کسی آزمائش میں بھی نہیں ڈالا تھا اور اس سے پوچھے بغیر کچن کی طرف رینگ گیا تھا اور وہ تقریباً کامیاب ہو چکا تھا...... لیکن......

گرتے وقت جو بوتل اس کے ہاتھ سے نکلی تھی، وہ لڑھک کر ہم سے چار پانچ میٹر کی دوری تک پہنچ چکی تھی اور وہ اپنے ہی خون میں ڈوب کر سرخرو ہو چکا تھا۔ اس کا نام حیات تھا...... اور اب وہ ''حیات'' نہیں تھا۔

اس کی لاش کو ایک اسٹریچر نما تختے پر ڈال کر نیچے لے جایا گیا۔ مختلف آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ زیریں فلور پر زور و شور سے کونے کھدروں کی تلاشی لی جا رہی ہے پھر تلاشی لینے والے چھت پر بھی آ گئے۔ ہماری دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ وہ چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھنے لگے۔ انہوں نے ٹین کی چادروں کے ساتھ بھی اٹھا پٹخ کی۔ ایک بار پھر قسمت نے ہماری یاوری کی اور وہ چادروں کے ڈھیر کے پیچھے وہاں جھانکنے میں ناکام رہے جہاں ہم بے حرکت لیٹے تھے۔

رات پل پل آگے کو سرکتی رہی۔ ہم دو بے جان جسموں کے مانند چھت کی سرد ٹائلوں پر لیٹے تھے۔ اب نقاہت اتنی بڑھ چکی تھی کہ بولنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ قسطینا کی قوتِ برداشت میں کوئی شک نہیں تھا لیکن کچھ بھی تھا وہ بھی گوشت پوست کی انسان تھی، اسے چپ سی لگتی جا رہی تھی۔ پچھلے قریباً دس گھنٹے سے کسی ہیلی کاپٹر کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی نہ ہی ارد گرد کوئی اور جنگی سرگرمی نظر آتی تھی۔ ہم بہت تھک جاتے تھے تو اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے ورنہ لیٹے رہتے تھے۔

یہ رات تو جیسے تیسے گزر سکتی تھی لیکن یہ بات واضح تھی کہ جب کل کا سورج طلوع ہوگا اور ٹین کی چادروں کا یہ ڈھیر گرم ہونا شروع ہوگا تو ہمارا ڈی ہائیڈریشن عروج پر پہنچ جائے گی اور شاید ہم اپنے ہوش و حواس کے ساتھ کل کی شام نہ دیکھ سکیں۔ میری نگاہ ایک بار پھر پانی کی اس سفید بوتل پر جم گئی جو ہم سے چار پانچ میٹر کے فاصلے پر موجود تھی۔ ہم اس PET بوتل کو حاصل کر لیتے تو بھی شاید... ایک آدھ دن مزید گزارا جا سکتا۔ لیکن بوتل تک پہنچنا شدید خطرے سے خالی نہیں تھا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں بوتل تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ قسطینا سے بات کی تو بحث ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ''اگر یہ رسک لینا ہی ہے تو پھر میں لوں گی، کیونکہ میں دائیں طرف ہوں اور نکل سکتی ہوں۔''

''آپ اٹھ کر بیٹھ جائیں تو مجھے بھی باہر نکلنے کا راستہ مل سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں جانتی ہوں، تمہارا کندھا بری طرح سوج چکا ہے۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ آسانی سے کرالنگ کر سکو۔''

ابھی ہماری بحث جاری ہی تھی کہ مسئلہ حل ہو گیا۔ ایک سوئپر آیا۔ اس نے کچن کے پاس سے کھانے پینے کی وہ اشیا سمیٹیں جو آخری لمحوں میں حیات کے ہاتھ سے گری تھیں، پھر وہ چادروں کی جانب آیا۔ اس نے پانی والی بوتل اٹھائی اور چلتا بنا۔ ہم دونوں مایوسی اور تاسف کے اندھیرے میں ڈوب کر رہ

گئے۔ میں نے اپنے لہجے کو شوخی سے تر کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے یور ہائی نس...... پہلے آپ پہلے آپ والا محاورہ ہم پر صادق آتا ہے۔"

اس نے کچھ نہیں کہا بس آنکھیں بند کیے لیٹی رہی، تکلیف اور بھوک پیاس انسان سے ہر طرح کے جمالیاتی اور رومانی احساسات چھین لیتی ہے۔ ہم دونوں کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ دور دور تک اس چیز کا احساس نہیں تھا کہ ہم مرد اور عورت ہیں۔

میں ایک بار پھر سجاول اور ڈی پیلس وغیرہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ پتا نہیں کہ سجاول پر کیا بیتی تھی۔ وہ زندہ بھی تھا یا نہیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ گرفتار ہو چکا ہو اور اب آس پاس ہی کہیں دوسرے گرفتار شدگان کے ساتھ بند ہو۔ ڈی پیلس میں انیق پتا نہیں کیا سوچ رہا ہوگا؟ اس کی طرف سے یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ کہیں مایوسی اور پریشانی کے عالم میں کوئی "رسکی" قدم نہ اٹھالے۔ اور جاناں...... وہ یقیناً مسلسل انیق کے کان کھا رہی ہوگی اور اسے مجبور کر رہی ہوگی کہ وہ میری WHERE ABOUTS کے بارے میں معلوم کرے۔ اور پھر سرسوں کا کھیت...... سرما کی چمکیلی دھوپ، ہوا میں اڑتی ہوئی دو لٹیں...... میں سوچتا رہا...... یہ رات کا تیسرا پہر تھا۔ سمندر کی طرف سے مدھم ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی۔ ٹین کی اس قبر سے باہر آسمان پر آخری راتوں کا چاند تھا۔ نیلا آسمان تھا، کیلے، ناریل اور انناس کے درخت ہوا میں جھومتے تھے اور ساحل کے پیچ و خم سے سمندر کی جوشیلی لہریں بغل گیر ہوتی تھیں۔ مگر یہ سب کچھ ہماری نگاہوں سے دور تھا۔ میں نے اپنے ورم زدہ کندھے کو دائیں ہاتھ سے دبا رکھا تھا اور ٹیسوں کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کندھے کا ورم اب کہنی تک پہنچ گیا تھا۔ بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔

"ویری سوری شاہ زائب۔" قسطینا نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"کس بات پر؟"

"تمہارے کندھے کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی ذمے دار میں ہوں۔ میں نے تمہیں براڈے (گارڈ) کے ہاتھوں بری طرح پٹوایا۔ کاش وہ سب کچھ نہ ہوتا۔"

"آپ نے دوبارہ یہ بات کی ہے...... یقین کریں میں اپنی جگہ شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔"

وہ چپ رہی، کوئی آوارہ بلی چادروں کے اوپر سے کھڑکھڑاتی ہوئی گزر گئی اور پھر سناٹا چھا گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ عجیب لہجے میں بولی۔ "تم ایسٹرن ہو نا، ایم ایم اے کے مشہور کھلاڑی......؟"

میرے سر پر جیسے کسی نے بم پھوڑ دیا تھا۔ میں کتنی ہی دیر خاموش رہا۔ آخر میں نے کہا۔ "یہ...... آپ...... کیا کہہ رہی ہیں؟"

وہ ویسے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تم جان ہی چکے ہوگے، مارشل آرٹ میرا بھی جنون ہے۔ جب میں نے تمہیں دیکھا تو پتا نہیں کیوں لگا کہ تمہیں پہلے بھی دیکھا ہوا ہے پھر پرسوں میٹنگ کے بعد تمہارے دوست مسٹر سجاول سے بات ہوئی، اس نے مجھے بتا دیا۔"

"کیا بتا دیا؟"

"یہی کہ تم ڈنمارک سے آئے ہو اور وہاں فائٹنگ وغیرہ کے بہت مشہور کھلاڑی ہو۔ وہ بس اتنا ہی جانتا ہے۔ اسے تمہاری حیثیت کا ٹھیک اندازہ نہیں ہے۔ لیکن میں تو جانتی ہوں کہ ڈنمارک اور ایسٹرن کا کیا مطلب ہے......"

میں سکتہ زدہ سا لیٹا رہا۔ مجھے سجاول سے ایسی توقع نہیں تھی۔ پتا نہیں کہ اس نے یہ سب کچھ کیوں اگل دیا تھا۔ قسطینا نے ہولے سے میرا ہاتھ دبایا۔ "میں فخر محسوس کر رہی ہوں کہ اس وقت ایک ایسا شخص میرے ساتھ ہے، جو بے شمار لوگوں کے لیے ایک لونگ لیجنڈ کی طرح ہے۔"

میں کافی دیر تک اپنے اندرونی اضطراب کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا اور یہ کوشش کرتا رہا کہ میں اپنے خشک گلے کے ساتھ کچھ بول سکوں۔ آخر میں نے کہا۔ "یور ہائی نس، اس سلسلے میں ہم بعد میں بات کر سکتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اگر ہمیں کل کا دن بھی اس جہنم میں گزارنا پڑ گیا تو ہم زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر ہم کچھ کر سکتے ہیں تو آج رات کر گزریں۔"

وہ کافی دیر خاموش رہی، پھر بولی۔ "میں ایک شرط پر تیار ہوں مسٹر ایسٹرن! تم مجھے یور ہائی نس نہیں کہو گے...... اور یہاں سے نکلتے ہوئے ہم ایک جیسا خطرہ مول لیں گے۔ نہ کم نہ زیادہ......" اس کے لہجے میں انوکھی سی اپنائیت محسوس ہوئی۔

چھت پر بھاری بوٹوں کی دھا دھم تھی اور قابض سپاہیوں کی کرخت آوازیں تھیں۔

شکار

تمکین رضا

کام قرینے اور سلیقے سے کیا جائے تو پھر کامیابی ضرور ملتی ہے... وہ اپنے والد کی زندگی اور کام سے متاثر تھی... اور ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنا مستقبل تابناک بنانا چاہتی تھی... اس کے لیے اس نے وقت سے پہلے جدوجہد شروع کردی... اور پھر ایک دن اس کے کیمرے کی آنکھ نے وہ سب دیکھ لیا جو...

سنسنی... تجسس اور حکمت عملی کے زینے طے کرتی کہانی کے نت نئے رنگ

جب اس نے اپنے مووی کیمرے کے عدسے میں اسے دیکھا تو سمجھ گئی کہ اسے مطلوبہ شخص مل گیا ہے۔ واٹسن پارک لوگوں سے بھرا ہوا تھا جو مئی کے سنیچر کے آخری گھنٹوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر نے ٹی شرٹس اور شارٹس پہن رکھے تھے۔ کچھ پختہ راستوں پر چہل قدمی کر رہے تھے اور چند ایک لان میں دوڑ لگا رہے تھے اور ان سب کی یہی کوشش تھی کہ دن کا جو حصہ بچ گیا، اس سے وہ پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔ آشی جانتی تھی کہ

اگر اس نے ان میں سے کسی ایک کا بھی انٹرویو کیا تو یہ کیچڑ میں پاؤں رکھنے کے برابر ہوگا۔ پھر اس بوڑھے کا چہرہ اسکرین پر نمودار ہوا جس نے سیاہ دھاریوں والا سوٹ پہن رکھا تھا اور کوٹ کی اوپری جیب میں ٹائی کے ہم رنگت تکونی تہ والا رومال لگا رکھا تھا۔ اس وضع قطع کے لوگوں کے پاس سنانے کے لیے کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہوتی ہے۔ اس کی آبنوسی چھتری کے سرے پر لگی ہوئی چاندی کی موٹھ تیز دھوپ میں چمک کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ اس نے

دونوں ہاتھوں سے چھڑی کا سرا تھام رکھا تھا اور اپنی بینچ کے پاس سے گزرنے والوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر رہا تھا۔

''معافی چاہتی ہوں جناب۔'' اسٹیسی نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

بوڑھے کی نظریں برابر والے روز گارڈن کی جھاڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اسٹیسی کو اپنے الفاظ دہرانا پڑے تب اس نے نظریں گھما کر اس کی جانب دیکھا اور بولا۔ ''کیا بات ہے لڑکی؟''

''ہائے، میرا نام اسٹیسی کامپٹن ہے اور میں حیران ہوں کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

اس نے فاصلے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی بیوی کو تلاش کر رہا ہوں۔ آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے اور اس نے مجھ سے یہاں ملنے کے لیے کہا تھا لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ راستہ نہ بھول گئی ہو۔''

''زبردست!'' اسٹیسی نے دل میں سوچا۔ اس نے جلدی سے کیمرے کے مانیٹر میں دیکھا کہ وہ بوڑھا پوری طرح فریم میں آرہا ہے پھر بولی۔ ''شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔''

بوڑھے کی آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہوئی اور وہ چہکتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو بہت اچھا ہوگا مائی ڈیئر۔''

''مائی ڈیئر، واؤ......!'' اسٹیسی کے سر میں یہ الفاظ اس طرح گھومنے لگے جیسے اس نے عمدہ شراب کا گھونٹ لے لیا ہو۔ اس نے سوچا کہ یہ بوڑھا اس کام کے لیے بہت مناسب ہے۔

دس منٹ پہلے اسٹیسی نے اپنے باپ کا کینن سی تین سو کیمرا تین ٹانگوں والے اسٹینڈ پر رکھ کر اس کے عدسے کو ایک سو اسی ڈگری پر سیٹ کیا تا کہ اپنے آپ کو دیکھ سکے کہ وہ ایل سی ڈی مانیٹر میں کیسی لگ رہی ہے۔ اس کے بالوں کی دو لٹیں چہرے پر آ گئی تھیں۔ جنہیں اس نے اپنا میک اپ چیک کرنے سے پہلے کانوں کے پیچھے کر لیا۔ وہ میک اپ میں زیادہ اہتمام نہیں کرتی تھی۔ ہلکا سا بلش، پلکوں پر مسکارا اور ہلکے رنگ کی لپ اسٹک لگانے سے اس کا میک اپ مکمل ہو جاتا تھا۔ اس وقت اس نے جینز جیکٹ کے ساتھ ہلکے براؤن کلر کا سلک اسکارف بھی لے رکھا تھا جس سے اس کی معصومیت اور وقار میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

اس طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد اس نے کیمرے میں نیا کارڈ ڈالا اور ریکارڈنگ شروع کر دی۔

وہ پارکنگ لاٹ سے باہر آئی اور گھاس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے بولنا شروع کر دیا۔ ''اسٹیسی کے علاقے میں خوش آمدید۔ اگر آپ پہلی بار یہاں آئے ہیں تو مجھے خوشی ہے کہ آپ میرے وی لاگ کا حصہ بن سکیں گے جیسا کہ آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں اسٹیسی ہوں اور شہر میں گھوم پھر کر کچھ دلکش لوگوں کو تلاش کرتی ہوں۔ آج میں شہر کے جنوبی حصے واٹسن پارک میں موجود ہوں۔ گو کہ دن ختم ہو رہا ہے لیکن دیکھتے ہیں کہ ہمیں کس سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے۔''

اسٹیسی اپنے دائیں بائیں دیکھتی چلتی رہی پھر اس نے ریکارڈنگ بند کر دی۔ وہ اپنی کار پر واپس آئی اور اس نے تین ٹانگوں والا اسٹینڈ گاڑی کی پچھلی نشست پر رکھ دیا پھر وہ کار کا دروازہ بند کرنے کے بعد دوبارہ پارک کی طرف چل دی۔ اسے اپنے نئے وی لاگ کے لیے کسی مناسب شخص کی تلاش تھی۔ اسے یہ موقع بڑی مشکل سے ملا تھا اور وہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہ رہی تھی۔ والدین کو عموماً اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کس طرح اپنے بچوں کی زندگی میں مداخلت کر رہے ہوتے ہیں۔ واقعی وہ بڑے خود غرض تھے اور ہمیشہ اپنی ضروریات کو ترجیح دیتے تھے۔

اسٹیسی نے دو بجے پارک جانے کا پروگرام بنایا تھا لیکن اس کی ماں نے اسے اپنے ساتھ گھر کی صفائی اور کپڑے دھونے میں لگا لیا۔ بعد میں وہ اسٹیسی کو کام ختم کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے خود تیار ہونے چلی گئی۔ اسے شام کو ایک ڈنر پارٹی میں جانا تھا۔

''میں نے تمہارے لیے پیزا منگوا دیا ہے۔'' اس کے باپ نے ماں کے ساتھ کار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''وہ پندرہ منٹ میں آجائے گا۔ تمہیں ٹپ دینے کی ضرورت نہیں۔ وہ میں اس کی قیمت میں شامل کر چکا ہوں۔''

اسٹیسی کو اپنے کام پر جانے کی جلدی ہو رہی تھی لیکن پیزا کے انتظار میں چھ بج گئے۔ اس وقت تک اس کی بھوک ختم ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا۔ 'میں نے دو ہفتے سے کوئی پوسٹ نہیں کی ہے اور اب میں باہر جانے کے لیے اگلے سنیچر کا انتظار نہیں کر سکتی' اس نے پیزا فریج میں رکھا اور اپنا بیگ اٹھا کر چل دی۔

اسٹیسی کے پاس ذاتی کیمرا نہیں تھا چنانچہ اسے اپنے باپ سے ویڈیو کیمرا مانگنا پڑا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ باپ کو اپنے وی لاگ کے بارے میں بھی بتاتی۔ وہ خود ویڈیو گرافر تھا جو شہر کی لا فرموں کے لیے حلفی بیانات اور شہادتیں ریکارڈ کیا کرتا تھا اور ان ویڈیوز کو عدالت میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے پاس یہ ایک اضافی کیمرا تھا جسے وہ ہر

وقت استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اسٹیسی کو کیمرا دینے سے پہلے پوری طرح مطمئن ہونا ضروری سمجھا۔

''وی لاگ۔'' اس کے باپ نے چونکتے ہوئے کہا جیسے اسٹیسی نے کہہ دیا ہو کہ وہ ایک ہاتھی پالنا چاہتی ہے۔ اس نے تصدیق کی غرض سے پوچھا۔ ''یہ بلاگ کی طرح کی کوئی چیز ہے؟''

''ڈیڈی! وی لاگ ایک ویڈیو بلاگ ہے جسے آپ لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنی ویب سائٹ پر پوسٹ کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ اسے یوٹیوب اور دوسرے پلیٹ فارم سے بھی منسلک کیا جاسکتا ہے۔''

''اور تم اس بلاگ میں باتیں کرو گی لیکن کیسی باتیں؟''

''کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں لیکن میرا وی لاگ لوگوں سے متعلق ہے۔ اس کے لیے میں دلچسپ لوگوں کو تلاش کر کے ان کے انٹرویوز کروں گی۔''

اس نے دل میں کہا۔ ''میں تمہارے نقشِ قدم پر چل رہی ہوں ڈیڈی۔''

اس کے باپ نے مبہم انداز میں کہا۔ ''میں نہیں جانتا اسٹیسی۔ ہم نے ہمیشہ تمہیں اجنبی لوگوں سے بات کرنے سے منع کیا ہے۔''

''اب میں بچی نہیں رہی بلکہ سترہ سال کی ہو گئی ہوں۔ اگلے سال مجھے کالج میں داخلہ مل جائے گا اور اس طرح کے پروجیکٹ کالج میں داخلہ کے وقت بہت کام آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے مجھے وظیفہ بھی مل جائے۔ اس لیے کیا میں تمہارا کیمرا استعمال کر سکتی ہوں؟''

اس کے باپ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کہیں مجھے پچھتانا نہ پڑے۔''

وہ اب تک انیس اقساط پوسٹ کر چکی تھی اور سو سے زیادہ لوگ یوٹیوب چینل پر اس کے خریدار بن گئے تھے۔ اس نے ایک خاتون کا انٹرویو کیا تھا جسے پانچ سو سے زیادہ لوگوں نے دیکھا۔ ابھی یہ ابتدا تھی، اس سے نہ صرف اسے کالج میں داخلے اور وظیفہ ملنے میں مدد ملتی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے وہ اپنا مقام بھی بنانا چاہ رہی تھی۔ اس کا منصوبہ ٹیلی وژن پر خبریں پڑھنے کا تھا۔ یہ اس کے اپنے انٹرویو شو کی جانب پہلا قدم ہوتا اور چند ہی سالوں میں وہ ٹیلی وژن کی جانی پہچانی میزبان بن جاتی۔

اپنے والدین کو مطمئن کرنے کے لیے وہ گھر آنے کے بعد انہیں لوگوں سے کیے گئے انٹرویوز کی تفصیلات بتاتی اور انہیں چند فوٹیج بھی دکھا دیتی۔ اسے یقین تھا کہ اس طرح اس کے والدین فخریہ اپنے دوستوں میں بیٹھ کر اس کا تذکرہ کر سکیں گے۔ ''ہماری بیٹی صرف اٹھارہ سال کی ہے اور وہ اب بھی ہم سے باتیں کرنے کے لیے وقت نکال لیتی ہے۔''

کبھی کبھی اسے مایوسی کا سامنا بھی کرنا پڑتا، ایک دن اسٹیسی گھر واپس آئی اور اس نے والدین کو بتایا کہ وہ کوشش کے باوجود کوئی مناسب شخص تلاش نہیں کر سکی۔ ''آج کوئی بھی انٹرویو دینے کے لیے تیار نہیں ہوا۔''

''کوئی بات نہیں، اگلے ہفتے تمہیں ضرور کامیابی ہوگی۔''

وی لاگ میں اس کی سنجیدگی اور دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس کے باپ نے بھی اسے ویڈیو ٹیکنیک کے بارے میں سکھانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک اتوار خاص طور پر اس کے ساتھ یہ سکھانے کے لیے گزارا کہ جب کیمرا اس کے ہاتھ میں ہو تو خفیہ طور پر کس طرح ریکارڈنگ کرنی چاہیے۔

اسٹیسی کمرے میں گئی اور دھڑام سے بستر پر دراز ہو گئی۔ اس نے اپنے جسم کو چادر سے اچھی طرح ڈھک لیا تاکہ اس کی گرماہٹ سے خوف کی سرد لہر دور ہو جائے جس نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس روز وہ وسط شہر میں کسی گمنام گلوکار کو انٹرویو کے لیے تلاش کر رہی تھی لیکن اس کے بجائے اسے سڑک کے کنارے فن کا مظاہرہ کرنے والا ایک ریپر مل گیا جس کی اس نے دس منٹ کی فوٹیج ریکارڈ کی لیکن جب اسٹیسی نے اس کا انٹرویو لینے کی کوشش کی تو اس نے انتہائی ناشائستہ زبان استعمال کی جسے پوسٹ کرنے سے پہلے اسے ایڈٹ کرنا پڑا۔ جب وہ وہاں سے روانہ ہوئی تو دو لڑکوں نے اس کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس پر آوازے کس رہے تھے۔ ان کی حرکتیں دیکھ کر اسٹیسی کو وائلڈ لائف شوز یاد آ گئے جن میں شیر اپنے شکار کا تعاقب کرتے ہیں۔ وہ کار میں سوار ہو کر گھر کے لیے روانہ ہوئی تب بھی وہ سارے راستے اس کا تعاقب کرتے رہے۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کے باہر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے ان کا راستہ روک لیا اور سخت لہجے میں انہیں زبان بند رکھنے اور گھر جانے کے لیے کہا۔ وہ ان دونوں سے عمر میں بڑا اور کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ اس لیے ان لڑکوں کو اس کی بات ماننا پڑی۔ اسٹیسی نے مسکراتے ہوئے اس آدمی کا شکریہ ادا کیا اور اپنے اپارٹمنٹ میں چلی گئی۔

چند منٹ بعد اس نے چادر اتار پھینکی اور کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کا خوف دور ہو چکا تھا اور اس کی جگہ غصے

بیٹے نے لی تھی۔ اس نے [illegible] کی پرفارمنس میں بیٹے ان لڑکوں کی فوٹیج نکال دی جس میں انہوں نے انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کیے تھے۔

اس کی یادوں کا سلسلہ اس وقت ٹوٹ گیا جب اس نے اپنے کیمرے کے عدسے میں ایک سفید بالوں والے شخص کا عکس دیکھا جو کسی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے سوٹ پہنے ایک بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے بوڑھے سے پوچھا۔

''اولیور برٹ لیبی لیکن تم مجھے برٹ کہہ سکتی ہو۔ سب لوگ اسی نام سے بلاتے ہیں۔''

''کیا ہم تمہاری بیوی کو تلاش کرنے کے دوران عکس بندی کر سکتے ہیں۔'' اسٹیسی نے کچھ توقف کرنے کے بعد وضاحت کی۔ ''دراصل یہ ایک اسکول پروجیکٹ ہے جس میں، میں لوگوں سے انٹرویو کرتی ہوں۔ اگر تمہاری بیوی کو تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ تم سے باتیں کرتی رہوں گی تو اس کی وجہ سے میرے اچھے نمبر آجائیں گے۔ کیا یہ ٹھیک رہے گا؟''

''تم میری فلم بناؤ گی؟'' بوڑھا کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ ''کیا تمہارے پاس مووی کیمرا ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے کیمرا اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔'' برٹ نے کہا۔ ''یہ بہت عمدہ سپر ایٹ کینن کیمرا ہے۔''

''ہاں، یہ بہت خاص کیمرا ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہم چاہے گھنٹوں بات کرتے رہیں۔ اس کی فلم بدلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔''

''بہت خوب، تم میری فلم بنا سکتی ہو۔''

اسٹیسی نے اپنے ذہن میں سوالات ترتیب دینا شروع کردیے تاکہ ظاہر ہوسکے کہ یہ واقعی اسکول پروجیکٹ ہے۔ اصل مسئلہ برٹ کی اجازت کا تھا جو اسے مل چکی تھی۔

''تم اپنی بیوی سے ملنے یہاں آئے ہو، کیا یہ صحیح ہے؟''

''اس نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ مجھ سے روز گارڈن میں ملو۔'' برٹ نے قریبی چوکور گھاس کے قطعہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ پارک میں کیتھرائن کی پسندیدہ جگہ ہے۔ میں کافی دیر سے اس کا انتظار کررہا ہوں لیکن وہ ابھی تک نہیں آئی۔ شاید وہ اسٹور پر چلی گئی ہو؟''

''اسٹور؟'' اسٹیسی نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، میری اپنی فارمیسی ہے۔ اسی لیے مجھے کیمروں کے بارے میں معلومات ہیں۔ ہم مختلف اقسام کی فلمیں بیچتے ہیں۔ ان میں سپر ایٹ بھی شامل ہے۔''

''تمہارا اسٹور کہاں ہے؟''

''واٹسن کے کونے پر ہی شرمان کا علاقہ ہے۔ وہیں میری دکان ہے۔ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔''

آدھ گھنٹے پہلے اسٹیسی اسی راستے سے ہوتی ہوئی واٹسن پارک تک آئی تھی لیکن اسے یاد نہیں کہ اس نے وہاں کوئی پرائیویٹ فارمیسی دیکھی ہو۔ البتہ وہ ایک چین اسٹور کے سامنے سے ضرور گزری تھی لیکن اس پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

''کیوں نہ ہم وہاں تک پیدل جائیں اور تمہاری بیوی کو تلاش کریں۔ تم راستہ بتاؤ۔''

جب برٹ کھڑا ہوا تو اسٹیسی اس کا طویل قد دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ دوسرے بوڑھے لوگوں کی طرح اس کی کمر میں کوئی خم نہیں تھا اور وہ بالکل سیدھی تھی۔ چھڑی کا سہارا لینے کے باوجود وہ مناسب رفتار سے چل رہا تھا۔ اسٹیسی اس کے ساتھ چلتے ہوئے ریکارڈنگ بھی کررہی تھی۔

''تم اس شہر میں کب سے رہ رہے ہو برٹ؟''

''میں نے اپنی پوری زندگی یہیں گزار دی۔ پورے چھپن برس۔''

اسٹیسی نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آنے دیا لیکن وہ یہ کسی طرح بھی نہیں مان سکتی تھی کہ برٹ کی عمر چھپن برس ہوگی۔ بظاہر اس کی جسمانی حالت اچھی تھی لیکن اس کے پتلے بالوں اور جھریوں بھری کھال کو دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ وہ ستر یا اسی سے کم کا نہیں۔

''تم چھپن سال کے ہو، کیا مجھے اپنا سنِ پیدائش بتا سکتے ہو؟''

''انیس سو تینتیس۔ جب عظیم معاشی بحران نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں تمہیں اس زمانے کے قصے سنا کر بور کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بہت مشکل وقت تھا۔''

'برٹ سمجھ رہا ہے کہ یہ انیس سو نواسی ہے۔' اسٹیسی نے سوچا۔ اسے حیرت تو ہوئی لیکن کوئی خوف اور صدمہ نہیں ہوا۔ اس کی دادی کا انتقال گزشتہ برس ہوا تھا۔ وہ بھی تاریخیں اور لوگوں کو بھول جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اکثر و بیشتر وہ اسٹیسی کو اس کی ماں کے نام سے پکارا کرتی۔ جب پہلی مرتبہ ایسا ہوا تو اس کی ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''تم

پریشان مت ہو۔ وہ تمہیں دیکھ کر یہ سمجھتی ہے کہ میں اس کے سامنے ہوں۔ تم اس سے اچھی اچھی باتیں کرو تاکہ وہ خوش رہے۔''

''کیا یہ کوئی دماغی بیماری ہے؟'' اسٹیسی نے پوچھا تھا۔

''ممکن ہے۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کتنا عرصہ زندہ رہ سکے گی۔ لہٰذا ہمیں اسے خوش رکھنا چاہیے۔''

اس کی ماں کے الفاظ میں ایک پیش گوئی پنہاں تھی جیسے اسے آنے والے وقت کے بارے میں پہلے سے معلوم ہو گیا ہو۔ آخری چند مہینوں میں اس کی دادی کی یادداشت بالکل ختم ہو چکی تھی اور مرنے سے پہلے ہی اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔

اسٹیسی کے خیال میں برٹ کی کیفیت اس کی دادی جیسی نہیں تھی لیکن کیتھرائن کے حوالے سے اس کے ذہن میں تین ممکنہ منظرنامے ابھر رہے تھے۔ نمبر ایک، وہ شدت سے اپنے گمشدہ شوہر کو تلاش کر رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ خود بھی کسی نرسنگ ہوم میں ہو اور برٹ اسے چھوڑ کر چلا آیا ہو اور تیسرا یہ کہ وہ مر چکی ہے اور برٹ اس کی یادوں میں کھویا ہوا ہے۔ آخری منظرنامہ اس کی وی لاگ پوسٹ کے لیے بہت دلچسپ ہو سکتا تھا کیونکہ ہر کسی کو گمشدہ محبت کی کہانی سے دلچسپی ہوتی ہے اور اگر وہ زندہ ہے اور اسے تلاش کر رہی ہے تو یہ آئیڈیا بھی لوگوں کو پسند آئے گا۔

''تم یہ چھڑی کیوں استعمال کرتے ہو؟''

''کوریا کی جنگ میں میری ٹانگ پر گولہ لگ گیا تھا۔ اگر لوہے کا ٹکڑا نکالا جاتا تو زیادہ نقصان ہوتا لہٰذا تب سے ہی میری ٹانگ میں یہ ٹکڑا موجود ہے۔''

اسٹیسی نے کہا۔ ''اس کی وجہ سے تمہیں جنگ کا زمانہ یاد آتا ہوگا۔''

''کم از کم میں زندہ اور صحیح سلامت تو ہوں۔ میرے کئی دوست ایسے ہیں جو اعضا سے محروم ہو گئے یا تابوتوں میں بند ہو کر گھر واپس آئے۔''

''کیا خوب صورت لائن ہے۔'' اسٹیسی نے سوچا۔ ''اگر یہ اسی طرح بولتا رہا تو مجھے بہ آسانی ایک ہزار ناظرین مل جائیں گے۔''

''کیا تمہارے پاس کیتھرائن کی کوئی تصویر ہے؟''

''بالکل۔'' برٹ نے بازو کے نیچے چھڑی دبائی اور اپنا والٹ نکالا اور ایک تصویر اسے پکڑا دی۔ اسٹیسی نے وہ تصویر اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑی اور اسے کیمرے کے سامنے فوکس کر دیا۔ ایل سی ڈی مانیٹر میں اس نے ایک سنہرے بالوں والی عورت کو دیکھا جس نے جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس کے کندھوں پر چوڑے پیڈ لگے ہوئے تھے۔ اسٹیسی کے والدین کے پاس پرانی فلموں کا ذخیرہ تھا۔ کیتھرائن اپنے حلیے اور لباس کی وجہ سے ان فلموں میں ایکسٹرا گرل کے کردار کے لیے موزوں تھی اور اسٹیسی سمجھ سکتی تھی کہ برٹ اب بھی اس سے اتنی محبت کیوں کرتا ہے۔

''تمہاری بیوی بہت پُرکشش ہے برٹ۔''

''ہاں، وہ اپنا بہت خیال رکھتی ہے۔ اس نے شادی کے بعد ہی بالوں کو رنگنا شروع کر دیا تھا اور اس کے بال بھی تمہارے جیسے ہی ہیں۔''

اسٹیسی کو اپنی دوستوں کے برعکس تاریخ سے ہمیشہ ہی دلچسپی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ کوریا کی جنگ انیس سو پچاس میں ہوئی تھی۔ لہٰذا برٹ ہائی اسکول سے نکلتے ہی سیدھا فوج میں چلا گیا ہوگا لیکن کیتھرائن کو دیکھ کر یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ اس وقت پیدا ہو چکی ہوگی۔

''کیا وہ تم سے عمر میں چھوٹی ہے؟''

''ہاں۔'' وہ فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''وہ میری نوجوان بیوی ہے۔''

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کوئی عمر رسیدہ عورت نہیں تھی جو کسی بیماری کے علاج کے لیے نرسنگ ہوم میں قیام پذیر ہو پھر وہ کہاں ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے برٹ سے چھپنے کے لیے کوئی الگ گھر لے لیا ہو۔ فارمیسی کی آمدنی سے وہ اپنے لیے گھر خرید سکتی تھی۔ یہ جاننے کے بعد اسٹیسی کی نظروں میں اس کا پاکیزہ روپ مدھم ہو گیا۔

اسٹیسی نے وہ تصویر برٹ کو واپس کر دی جسے اس نے دوبارہ اپنے والٹ میں رکھ لیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسٹیسی اس سے دو قدم آگے تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر برٹ کی جانب دیکھا تو اس کی نظر ایک آدمی پر گئی جو برٹ کی بینچ کے پاس کھڑا ہوا تھا اور انہی کی جانب دیکھ رہا تھا بلکہ اس نے اپنی نظریں براہِ راست ان پر مرکوز کر رکھی تھیں۔ اسٹیسی نے زوم کے ذریعے اس کا عکس واضح کرنے کی کوشش کی اور اس کا کرخت چہرہ دیکھ کر یوں لگا جیسے کوئی شکاری اس کا پیچھا کر رہا ہو۔

گو کہ وہ اس سے کافی فاصلے پر تھا۔ اس کے باوجود اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی ہونے لگی۔ اس سے پہلے جن لڑکوں نے ان کا پیچھا کیا تھا ان کی لاف زنی اس کے دماغ سے محو ہو چکی تھی کہ وہ مور تھے جو اپنے پَر پھیلا کر

تماشائیوں کو تفریح فراہم کررہے تھے لیکن اس شخص کا شگون اس کے لیے انتہائی پریشان کن تھا۔ ایسے لوگ جنہیں اپنے جذبات پر قابو پانا آتا ہو، بہت زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اور ان سے کسی بھی بات کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ پارک کے خارجی دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ وہاں سے ایک راستہ پیدل چلنے والوں کے لیے رہائشی علاقہ تک جاتا تھا۔ اسٹیسی نے اندازہ لگالیا کہ برٹ نے واٹسن تک پہنچنے کے لیے اطراف کی گلیوں کو منتخب کیا ہے۔ وہ تیزی سے چلنے لگی یہاں تک کہ وہ دونوں اس شخص کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

سورج بلند وبالا عمارتوں کے پیچھے چھپ چکا تھا جب وہ شرمان کے نزدیک واٹسن کے علاقے میں پہنچے۔ اسٹیسی کو روشنی کم ہوجانے کی پریشانی نہیں تھی۔ اس کے ڈیجیٹل کیمرے میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ کم روشنی کو بھی بڑھا سکتا تھا اور شہروں میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ روشنی دستیاب ہوتی ہے۔ البتہ جب بھی وہ اپنے کزنز کے فارم پر جاتی تو وہاں رات ہوتے ہی تاریکی چھا جاتی اور اگر چاند کی روشنی نہ ہو تو تاریکی کی چادر فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی لیکن شہر کا معاملہ مختلف تھا۔ یہاں رات میں بھی اتنی روشنی ہوتی تھی جو فلم بندی کے لیے کافی تھی۔

اسے اصل پریشانی اس شخص سے ہورہی تھی۔ اس نے واٹسن آتے ہوئے کئی بار پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن وہ اسے نظر نہیں آیا۔ اسے ڈر تھا کہ جب وہ اپنی کار میں سوار ہونے کے لیے واپس پارکنگ لاٹ جائے گی۔ راستے میں بے شمار درخت اور جھاڑیاں ہیں جن میں پوری فوج چھپ سکتی ہے۔ وہ شکاری بھی وہیں کہیں چھپ کر اس کی واپسی کا انتظار کررہا ہوگا تاکہ موقع ملتے ہی اس پر حملہ کردے۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“ برٹ نے اس کے چہرے کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

”ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دراصل اس کام کے بارے میں سوچ رہی تھی جو مجھے کرنا ہے۔“ اسٹیسی نے برٹ کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پاس یہ فارمیسی کب سے ہے؟“

”میں نے فارمیسی میں گریجویشن کرنے کے بعد یہاں کام شروع کردیا تھا۔ یہ سن انیس سو ساٹھ کی بات ہے پھر جب انیس سو اڑسٹھ میں سابقہ مالک ریٹائر ہوگیا تو میں نے یہ دکان اس سے خرید لی۔ یہ بہت اچھی جگہ پر واقع ہے۔ میں نے اس کاروبار کو اتنی ترقی دی کہ ہر سال معقول منافع ہونے لگا۔ اس مصروفیت کی وجہ سے میرے پاس بالکل وقت نہیں رہا پھر کیتھرائن نے اس اسٹور میں چیکر کی حیثیت سے کام شروع کردیا۔ وہیں میری اس سے جان پہچان ہوئی پھر ہم نے انیس سو ساٹھ میں شادی کرلی۔“

اسٹیسی کو بوڑھے شوہر یا بوائے فرینڈ کا آئیڈیا بالکل نہیں بھایا گو کہ اس کی ایک سہیلی ایسے مردوں سے دوستی کیا کرتی تھی جو اس سے عمر میں دس بارہ سال بڑے ہوتے تھے اور اس کے حق میں وہ کچھ اس طرح کے دلائل دیتی۔

”اسٹیسی! یقین کرو، ایسے لوگوں سے دوستی کرنے میں بڑا فائدہ ہے۔ ان کے پاس دولت ہوتی ہے اور یہ مجھے عالیشان ریستوران میں ڈنر کرواتے ہیں۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اسکول کے لڑکوں کی طرح ان کا مزاج ایک منٹ میں تبدیل نہیں ہوجاتا۔“ اس نے کبھی اپنی دوست کی باتوں پر توجہ نہیں دی لیکن اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کیتھرائن نے ایک پختہ عمر کے مرد کو کیوں ترجیح دی ہوگی۔

”کیا تمہارے بچے ہیں؟“

”نہیں، ہم بہت مصروف رہا کرتے تھے۔ شاید اسی لیے اولاد سے محروم رہ گئے۔ تم ہماری بیٹی بن سکتی ہو۔ تمہاری شکل کیتھی سے بہت ملتی ہے۔“

وہ شرمان کے کونے سے چند قدم کے فاصلے پر تھے جب ایک اور آواز نے اسٹیسی کے خیالات پر غلبہ پالیا۔ وہ اس آواز کو سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس طرح کی آوازیں اس وقت بھی اس کے دماغ میں گونجا کرتی تھیں جب وہ اسکول کے زمانے میں دوسری لڑکیوں کی طرح کوئی احمقانہ حرکت کرنا چاہتی تھی لیکن اب یہ آواز بھی اس کی طرح جوان ہوگئی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ یہ اس وقت تک خاموش رہے جب تک وہ اپنے والدین کی عمر کو نہیں پہنچ جاتی لیکن اس سے قطع نظر کہ اس نے کچھ سنا یا نہیں۔ وہ آواز اس کے کانوں میں گونجتی رہی اور اسے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ درست کہہ رہی تھی۔ اس کا مفہوم کچھ یوں تھا۔ ”اس وقت کیا ہوگا جب تم شرمان کی جانب مڑوگی اور برٹ دیکھے گا کہ وہ جگہ ویسی نہیں رہی جیسی چھبیس سال پہلے تھی؟“

”ہمیں واپس پارک کی طرف چلنا چاہیے۔“ اسٹیسی نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ تمہاری بیوی وہاں ہمارا انتظار کررہی ہو۔“

اسٹیسی کی رفتار آہستہ ہوگئی لیکن برٹ آگے بڑھتا رہا۔ اس نے کہا۔ ”ہم وہاں پہنچنے والے ہیں۔ کیوں نہ اسٹور کو دیکھ لیا جائے۔“

"اپنے گھر کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اسٹیسی نے کہا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ جب وہ کونے سے مڑیں گے تو کیا ہوگا لیکن اس کا اندازہ تھا کہ وہ کوئی خوش گوار منظر نہیں ہوگا۔ وہ اب بھی عکس بندی کر رہی تھی۔

برٹ کی رفتار میں کمی آگئی اور وہ ایک جگہ رک گیا۔ لمحہ بھر ساکت کھڑے رہنے کے بعد وہ اسٹیسی کی جانب مڑا اور بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ہم بُرے دور سے گزر رہے ہیں۔ کیتھی پچھلے سال چلی گئی تھی اگر ہمارے بچے ہوتے یا......"

اس کی آواز بھرّا گئی۔ اس نے خلا میں دیکھا لیکن اس کی نظریں کسی ایک مقام پر نہیں رک رہی تھیں پھر اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری۔ وہ اسٹیسی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "اسی لیے آج میں بہت خوش تھا جب کیتھی نے شادی کی سالگرہ پر مجھے فون کیا۔ اس نے کہا کہ وہ روز گارڈن میں ملے گی تاکہ ہم اپنے معاملات کے بارے میں گفتگو کر سکیں۔ وہ میری محبت ہے اسٹیسی اور مجھے اسے دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ مجھے اسے تلاش کرنا ہوگا۔"

اس کے بعد وہ اچانک مڑا اور کونے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ایک ٹانگ میں نقص ہونے کی وجہ سے وہ بُری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کی برق رفتاری دیکھ کر اسٹیسی بھی اس کی جانب لپکی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچتی، برٹ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ جب وہ کونے پر پہنچی تو دیکھا کہ برٹ ایک بار پھر رک گیا تھا۔ وہ اس کی جانب گھوما۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"یہ کیا ہے؟ میرا اسٹور کہاں گیا؟"

اسٹیسی نے بلاک کے ساتھ نظریں دوڑا کر دیکھا۔ اسے کوئی ایسی دکان نظر نہیں آئی جہاں پچیس سال پہلے برٹ کی فارمیسی ہوتی۔ البتہ کچھ دکانوں پر بائیسکل شاپ، سیل فون اور جینز وغیرہ کے بورڈ ضرور لگے ہوئے تھے اس کے علاوہ وہاں دو ریستوران بھی تھے۔ بلاک کے آخری سرے پر واقع دکانوں کو مسمار کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک دواؤں کا اسٹور تعمیر کیا جا رہا تھا جس کے اطراف میں پارکنگ لاٹ بھی تھی۔ جب اسٹیسی نے مڑ کر برٹ کی طرف دیکھا تو وہ اپنی آنکھیں بند کیے سر ہلا رہا تھا جیسے حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کر رہا ہو۔

اسٹیسی نے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولی۔ "مجھے بہت افسوس ہے برٹ۔ میں نہیں جانتی تھی......"

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ سڑک پار کرتے ہوئے اسٹیسی نے پارک والے شخص کو دوبارہ دیکھا۔ وہ اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ جب اسٹیسی نے اس کی جانب دیکھا تو وہ فوراً ہی مڑ گیا اور اپنی نظریں ایک دکان کے شوکیس پر جما دیں جہاں عورتوں کے ہینڈ بیگ لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے اتنے مضحکہ خیز انداز میں یہ حرکت کی تھی کہ اگر اسٹیسی کسی فلم میں یہ منظر دیکھتی تو بے تحاشا قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتی۔ ممکن ہے کہ وہ جیسا سمجھ رہی ہو، وہ نہ ہو۔ وہ شخص ایک بے ضرر شخص بھی ہو سکتا ہے جو خوب صورت لڑکیوں کو دیکھنے پر ہی اکتفا کرتا ہے لیکن وہ اپنی حفاظت کے معاملے میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہ رہی تھی۔

"برٹ!" اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو اسٹیسی نے اس کا بازو پکڑ کر زور سے ہلایا اور بولی۔ "برٹ!"

اس نے اپنی آنکھیں بمشکل تمام کھولیں۔ وہ کچھ پریشان لگ رہا تھا جیسے وہ اسے جانتا ہو لیکن اسے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں ملے تھے۔ 'اوہ میرے خدا' اسٹیسی نے دل میں سوچا۔ "ایک اجنبی میرا پیچھا کر رہا ہے اور جو شخص میری مدد کر سکتا ہے وہ خود اسّی، نوے سال کا ہے۔"

"برٹ...... مسٹر برٹ، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی تاکہ وہ اس پر توجہ مرکوز کر سکے۔ "سڑک کے پار ایک شخص ہے جسے میں نے پارک میں دیکھا تھا۔ وہ مسلسل مجھے گھور رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ میری کار پارک کے عقب میں واقع لاٹ میں ہے۔ کیا تم میرے ساتھ وہاں تک چلو گے۔ میں نہیں سمجھتی کہ تمہارے ہوتے ہوئے وہ کچھ کر سکے گا۔"

برٹ کی آنکھوں سے پریشانی دور ہو گئی۔ اس نے اسٹیسی کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولا۔ "بالکل، میں تمہارا خیال رکھوں گا۔"

وقت گزرنے کے ساتھ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور لیمپ پوسٹوں پر لگی ہوئی روشنیاں فلم بندی کے لیے ناکافی معلوم ہو رہی تھیں۔ اسٹیسی نے دل میں سوچا۔ 'مجھے اتنی دیر سے نہیں آنا چاہیے تھا' لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اس خیال کو رد کر دیا اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اس کی ملاقات برٹ سے نہ ہو پاتی۔ اسٹیسی نے اس کی جو فوٹیج بنائی وہ خالص سونا تھی۔ یہ اس کی اب تک کی سب سے بہترین وی لاگ ہوتی اور اسے بہت سارے لوگ دیکھتے۔ کیتھی کی غیر موجودگی اس کہانی کو مزید پُراسرار بنا دیتی۔ اسٹیسی دیکھنے والوں کو اپنی رائے دینے کی دعوت دیتی کہ ان کے خیال میں کیتھی کے ساتھ کیا ہوا۔ لیکن وہ اس کا اختتام پارک سے دور جانے

کے بعد ریکارڈ کرے گی۔ شاید اس وقت جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ چکی ہو۔

جب وہ پارک میں آئی تھی تو اس وقت درجنوں لوگ پارک میں موجود تھے لیکن اب وہ ویران ہو چکا تھا یہاں تک کہ سوگز کے فاصلے پر واقع پارکنگ لاٹ میں بھی اسٹیسی کی کار کے سوا کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اب بھی وہی کار اس کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ہو سکتی تھی اگر وہ اس میں داخل ہو کر دروازہ مقفل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

اسٹیسی تیزی سے چل رہی تھی اور اس نے اپنے آپ کو برٹ سے بھی قریب رکھا ہوا تھا کیونکہ برٹ سے دور ہونا اس کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ اگر وہ شخص واپس آ گیا ہو اور پارکنگ لاٹ کے سرے پر جھاڑیوں میں چھپا ہوا ہو یا اس کے انتظار میں کار کی ڈکی کے پیچھے کھڑا ہوا ہو تاکہ اسٹیسی جیسے ہی اپنی کار کے قریب پہنچے وہ اس پر جھپٹ پڑے۔ نہیں وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ ممکن ہے کہ برٹ اپنی عمر کی وجہ سے اس کا پوری طرح تحفظ نہ کر سکے لیکن وہ اب بھی دیکھنے میں اتنا مضبوط نظر آتا تھا کہ وہ اجنبی شخص ان دونوں پر حملہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لیتا اور اگر وہ ایسا کرتا تو برٹ کی چھڑی ان کے دفاع کے لیے کافی تھی۔ اگر اس کا وار کامیاب ہو جاتا تو اس شخص کو کافی نقصان پہنچتا۔

جب وہ روز گارڈن کے قریب پہنچے تو اسٹیسی نے محسوس کیا کہ برٹ کی چھڑی کی آواز ہلکی ہو گئی ہے۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑا ہوا تھا اور اس کی نظریں باغ کے جنوب مغربی کونے میں واقع جھاڑیوں پر مرکوز تھیں۔

''برٹ۔'' اسٹیسی نے نرم لیکن پُرزور طریقے سے کہا۔'' آجاؤ، ہم تقریباً پہنچ چکے ہیں۔''

برٹ اس کی جانب مڑا۔ کم روشنی میں بھی اس کی آنکھوں کی سفیدی چمک رہی تھی۔ ''میں جانتا تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔''

''دیکھو مسٹر برٹ! میری کار وہاں کھڑی ہے۔ میں اس میں سوار ہو جاؤں پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تمہیں ہمیشہ سے یہ باغ پسند ہے۔'' وہ اسٹیسی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔'' یہ تمہاری پسندیدہ جگہ ہے؟''

''مجھے تمہاری ضرورت ہے برٹ......!''

کچھ کہے بغیر برٹ نے اسٹیسی کا بازو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ اسٹیسی کو لگا کہ برٹ کی انگلیوں میں فولادی سختی ہے۔ یہ انگلیاں اس کے بازو میں گڑی جا رہی تھیں۔

''تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں کیتھی۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ تم نے کسی اور کو تلاش کر لیا ہے۔ تم میری بیوی ہو اور ہمیشہ رہو گی۔''

''نہیں، چپ ہو جاؤ۔ میں کیتھی نہیں اسٹیسی ہوں۔''

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''نہیں، میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی چھڑی اوپر اٹھائی اور اسٹیسی کا بایاں بازو اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ اسٹیسی کے اندر سے آواز آئی۔'' ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اس سے لڑنا ہو گا۔''

اس کی رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ اس کا بایاں بازو فضا میں بلند ہوا اور اس نے اپنی انگلیوں کے ناخن اس کی آنکھوں کی طرف بڑھائے، برٹ اس پر حملہ کرنا بھول گیا اور اپنی آنکھوں کو بچانے کے لیے اس نے چہرے کے سامنے بازو کر لیے۔ اسٹیسی کو اسی ردعمل کی توقع تھی۔ اس نے موقع غنیمت جان کر اپنا گھٹنا پوری قوت سے برٹ کی ناف کے نیچے دے مارا لیکن یہ اتنی کاری ضرب نہیں تھی کہ اس سے برٹ کو کوئی نقصان پہنچتا۔ وہ اپنی کار کی طرف گھومی اور آگے چھلانگ لگائی اور بے وزنی کی کیفیت میں تیرتی ہوئی زمین پر جا گری۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی کار سے ٹکرائی ہو۔

اسٹیسی نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ برٹ نے دونوں ہاتھوں سے اپنی چھڑی پکڑی ہوئی تھی۔ اس نے چھڑی کا وار روکنے کے لیے اپنے دونوں بازو سر سے اوپر اٹھا لیے۔ کیمرا ابھی تک اس کے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ برٹ نے اپنی چھڑی فضا میں بلند کی۔ اسٹیسی نے آنکھیں بند کر لیں اور زور سے چلائی لیکن اس کی آواز ایک سیکنڈ بعد ہونے والے دھماکے میں دب گئی۔

اس پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ اسٹیسی نے فوراً ہی آنکھیں کھول دیں، برٹ ایک قدم پیچھے لڑکھڑایا۔ اس کے بازو اب بھی فضا میں بلند تھے پھر ایک اور دھماکا سنائی دیا اور اس کا سر پیچھے کی جانب ڈھلک گیا۔ اس کے جسم کا تناؤ ختم ہو گیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔

اسٹیسی اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہی اجنبی ایک ہاتھ میں آٹومیٹک پستول لیے تاریکی سے برآمد ہوا۔ اس نے اپنا پستول نیچے کیا اور دوسرا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کر سیل فون نکال لیا پھر اس نے

ایک نمبر ڈائل کرکے کسی کو مخاطب کرکے کہا۔ ''وِلسن پارک کے روز گارڈن میں پولیس کو گولی چلانا پڑی۔ مجھے پیٹرول یونٹ، ایک سپروائزر اور ایمبولینس کی ضرورت ہے۔ بہتر ہوگا کہ طبی عملے کو بھی بُلالو۔''

☆☆☆

اسٹیسی پارک میں اسی بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی جہاں کئی گھنٹے پہلے اس نے برٹ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ پندرہ منٹ بعد طبی عملے کے لوگ وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے اسے ایک کمبل میں لپیٹ دیا۔

''ہم تمہیں اسٹیٹ اگاتھا لے جاسکتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم وہاں اپنا معائنہ کروالو۔''

''نہیں، میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''فی الحال تمہارے لیے گاڑی چلانا ٹھیک نہیں۔'' پولیس سپروائزر سارجنٹ ڈریمنڈ نے کہا۔ ''میں تمہارے والدین کو فون کرتا ہوں۔ کیا وہ دونوں گھر پر ہیں؟''

''نہیں، لیکن میرے پاس ان کے سیل نمبر ہیں۔''

''وہ یہاں آکر تمہیں لے جاسکتے ہیں اور ان میں سے کوئی ایک تمہاری کار چلا کر لے جائے گا۔ تمہیں ایک خوفناک تجربے سے گزرنا پڑا ہے۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس کی زبان سے بے اختیار نکلا لیکن اسٹیسی کے لیے اسے سچ ماننا بہت مشکل تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ برٹ نے اسے مارنے کی کوشش کیوں کی۔ اس نے چادر میں ڈھکی ہوئی برٹ کی لاش کو دیکھا اور دل ہی دل میں بولی۔ ''تمہارا یہی انجام ہونا تھا۔''

''تمہارے باپ کا فون نمبر کیا ہے؟'' سارجنٹ نے پوچھا۔

ڈریمنڈ نے وہ نمبر ڈائل کیا اور وہاں سے کچھ فاصلے پر چلا گیا تاکہ اسٹیسی کے باپ سے علیحدگی میں گفتگو کرسکے۔ طبی عملے کے لوگ اپنا کام ختم کرچکے تھے اور واپس ایمبولینس کی جانب جارہے تھے۔ انہوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اسٹیسی نے اپنے کندھوں پر پڑے ہوئے کمبل کو بائیں ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا جبکہ اس کے دائیں ہاتھ میں اب بھی کیمرا دبا ہوا تھا۔ ہر چند منٹ بعد اس کی آنکھیں روز گارڈن کے کنارے پڑی ہوئی لاش کی طرف اٹھ جاتیں۔

اچانک ہی اسٹیسی کو اپنے برابر میں بینچ پر بیٹھے کسی شخص کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ وہی اجنبی تھا جس سے ڈر کر وہ بھاگ رہی تھی۔ اس نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم پولیس والے ہو؟''

''سراغ رساں جان ایمرسن، ریٹائرڈ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھی کہ تم میرا پیچھا کررہے ہو۔''

''میں نہیں جانتا کہ مجھے اس پر پریشان ہونا چاہیے کہ تم نے میرے بارے میں اس طرح سوچا یا میرا نوٹس لیا۔''

''کیا تم کیتھرائن کے سلسلے میں یہاں آئے ہو؟''

''ہاں، وہ انیس سو نو اسی میں آج ہی کے دن غائب ہوگئی تھی۔ جو ان کی شادی کی سالگرہ کا دن ہے۔''

''برٹ کا کہنا ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس نے کسی دوسرے کو تلاش کرلیا۔''

''اس کے محبوب نے ہی اس کی گمشدگی کی اطلاع دی تھی۔ میں نے اپنے پارٹنر کے ساتھ مل کر اس کا انٹرویو کیا۔ اس گمشدگی میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اس کے بارے میں صرف ایک شکایت درج ہوئی تھی کہ اس نے اپنی سابقہ محبوبہ کے ساتھ فراڈ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس پر کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا تھا۔ جب ہم نے برٹ کا انٹرویو کیا تو اس کا کہنا تھا کہ وہ کیتھرائن کے کسی محبوب کو نہیں جانتا اور یہ کہ اس نے کیتھرائن کو اس وقت سے نہیں دیکھا جب وہ شادی کی سالگرہ سے دو ہفتے قبل اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔''

اسٹیسی کو برٹ کے کہے ہوئے الفاظ یاد آئے۔ ''کیتھی نے مجھے فون کیا تھا۔ آج ہماری سالگرہ ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے روز گارڈن میں ملاقات کرے گی تاکہ ہم اپنے اختلافات دور کرسکیں۔''

''وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے اس سے اس روز ملاقات کا وقت مقرر کیا تھا جس رات وہ غائب ہوئی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر ان کے درمیان طلاق ہوگئی تو وہ اسٹور سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ یہ بات اس نے اس وقت کہی جب وہ یہ سمجھا کہ میں کیتھرائن ہوں۔ تمہیں اس پر شبہ تھا۔ کیا یہی بات ہے؟''

''ہاں، لیکن میرے پارٹنر کو یقین نہیں تھا کہ ایک جرم سرزد ہوچکا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ کیتھرائن دونوں مردوں کو جھنڈی دکھا کر شہر سے چلی گئی ہے لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ میں دو سال پہلے ریٹائر ہونے تک اس کیس پر کام کرتا رہا پھر گزشتہ سال اسی تاریخ کو اس پارک میں ایک عورت کا قتل ہوا۔ یہ خبر سن کر میرا تجسس بڑھ گیا کیونکہ اسی تاریخ کو کیتھی غائب ہوئی تھی اور مجھے دورانِ تفتیش معلوم ہوگیا تھا کہ یہ پارک ان کے لیے بہت خاص تھا۔ ایک دوست کی وساطت سے مجھے اس عورت کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھنے

کا موقع مل گیا۔ مجھے اس عورت کے زخموں پر چنگل کے نشانات نظر آئے۔ مجھے یاد آ گیا کہ برٹ بھی ایسی چھڑی استعمال کرتا ہے جس کے سرے پر چنگل چڑھا ہوا ہے۔ یہ چھڑی میں نے اس کے پاس دورانِ تفتیش دیکھی تھی اور میں جان گیا کہ اسی ہتھیار سے دونوں عورتوں کو قتل کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ ایک قیاس آرائی ہی تھی اور کوئی بھی حاضر سروس سراغ رساں اس پر اپنا وقت ضائع نہ کرتا لیکن میں ریٹائر ہو چکا ہوں اور میرے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں۔ اسی لیے برٹ کا پیچھا کرتا رہا۔''

اسٹیسی کے لیے یہ انکشافات حیران کن تھے۔ وہ پتھر کے بے جان مجسمے کے مانند بے حس و حرکت بیٹھی یہ سب سن رہی تھی۔ پیٹرسن نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''برٹ تم پر حملہ کرنے سے پہلے روز گارڈن کے کونے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے تم سے یہ بھی کہا۔ 'یہ تمہاری پسندیدہ جگہ ہے' وہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ تم ہی کیٹی ہو جبکہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اسی لیے تم اسے تلاش نہ کر سکیں۔ تمہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے کہاں دیکھا جائے۔''

''لیکن اس نے دوسری عورت کا قتل کیوں کیا اور وہ مجھے کیوں مارنا چاہ رہا تھا؟''

''اس کے ذہن میں کوئی گرہ بیٹھ گئی تھی۔ وہ ہر سال شادی کی سالگرہ پر یہاں آتا اور جو بھی عورت اس کی بیوی سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتی، اسے کیتھرائن سمجھنے لگتا۔ جب وہ عورت اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتی تو وہ چھڑی کے وار سے اسے ہلاک کر دیتا۔ اگر میں اس کا پیچھا نہ کر رہا ہوتا تو وہ تمہاری لاش بھی جھاڑیوں کے پیچھے دفن کر چکا ہوتا۔''

اسی وقت اسٹیسی کو اپنے عقب میں ایک آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پولیس ٹیپ کے باہر اس کے والدین کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ان کی جانب دوڑ پڑی۔ ماں نے اسے گلے لگا کر اتنی زور سے بھینچا کہ اس کی سانس رکنے لگی جبکہ اس کا باپ خود زور زور سے سانس لے رہا تھا تاکہ اپنے آپ کو پولیس افسروں کے سوالات کا جواب دینے کے لیے تیار کر سکے۔

''مجھے اندازہ کر لینا چاہیے تھا کہ اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں ڈیڈی۔ تم میرے لیے پریشان مت ہو۔''

''تم نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ پریشان نہ ہو۔'' اس کی ماں بولی۔ ''جبکہ والدین سے زیادہ اور کون پریشان ہو سکتا ہے۔''

''ہمیں کامیابی ہوئی ہے ماما۔'' اسٹیسی نے پیٹرسن اور دوسرے سراغ رسانوں کو بیلچوں سمیت روز گارڈن کے کونے کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے قتل کے دو کیس حل کیے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارے ذہن میں بہت سے سوالات ہوں گے۔ میں ان سب کا جواب دوں گی لیکن پہلے مجھے گھر لے چلو۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔''

اسٹیسی نے وہ کمبل وہیں بینچ پر چھوڑ دیا اور والدین کے ہمراہ پارکنگ لاٹ کی جانب چل دی لیکن ابھی وہ چند قدم ہی گئے ہوں گے کہ ڈریمنڈ کی آواز سنائی دی۔

''اسٹیسی، رک جاؤ۔''

وہ آہستہ سے مڑتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہے سارجنٹ ڈریمنڈ؟''

''مجھے تمہارا کیمرا ضبط کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ ریکارڈنگ چاہیے۔ پریشان مت ہو۔ یہ کیمرا تمہیں جلد واپس مل جائے گا۔'' وہ اس کے والدین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''لیکن اس میں میرے وی لاگ کے لیے فوٹیج ہے۔''

''اسٹیسی! خدا کے واسطے بچوں جیسی باتیں مت کرو۔'' یہ کہہ کر اس کے باپ نے کیمرا لے کر سارجنٹ کے حوالے کر دیا اور وہ ان کا شکریہ ادا کر کے دوبارہ اس جانب چلا گیا جہاں کھدائی ہو رہی تھی۔

''تم وی لاگ کو بھول جاؤ پیاری بیٹی۔'' اس کی ماں نے کہا۔ ''ہم تمہیں کسی قیمت پر بھی دوبارہ یہ کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔''

''لیکن۔۔۔''

''کوئی بحث نہیں ہوگی۔'' اس کے باپ نے کہا۔ ''تمہاری وی لاگ بند ہو چکی ہے۔''

اسٹیسی نے احتجاج کیا لیکن وہ جانتی تھی کہ اب اسے گھر سے باہر نکل کر لوگوں سے ملنے اور شوٹنگ کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ اپنی فلم میں شامل کرنے کے لیے اس فوٹیج کی ایڈیٹنگ کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ وی لاگ کے لیے کیوں پریشان ہو جب وہ خود اپنی پُراسرار، سنسنی خیز اور کرائم مووی کی فلم میکر اور اسٹار بن سکتی تھی۔ اسے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا اور جانتی تھی کہ آنے والے دنوں میں وہ یوٹیوب کی انجلینا جولی ہوگی۔

ہوگ بروشر پیشے کے لحاظ سے نفسیات کا پروفیسر تھا اور سان ڈیاگو کیمپس میں ایک کتاب پر کام کررہا تھا۔ ویسٹرن اسٹیٹ سیکیورٹی نے عارضی طور پر اس کی خدمات بطور ماہرِ نفسیات حاصل کرلیں۔ وہ اپنے ایک کلائنٹ کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا چاہ رہے تھے۔ اس کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کے بعد ہوگ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ایک خبطی شخص ہے اور اسے وہم ہوگیا ہے کہ کوئی اس کی کمپنی میں چوریاں کررہا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ اس کام سے فارغ

شہرت کی خاطر

تنویر ریاض

ہوش مند آدمی اپنے باطن کا جائزہ لیتا رہتا ہے... ناکارہ فرسودہ اور ناپسندیدہ چیزوں کو ٹھکرا دیتا ہے... کارآمد اور پسندیدہ عناصر کو برقرار رکھتا ہے... ایسا کرنے سے معاشرے میں پھیلی بہت سی برائیوں کا سدباب ہو جاتا ہے... جگمگاتی دنیا سے تعلق رکھنے والے گروپ کی کہانی... ان کے ظاہر... باطن سے جدا تھے... اور ان کو اپنے مفادات ہر شے سے زیادہ عزیز تھے... شہرت کی چاہ... دولت کی ہوس نے ان کو اپنی ذات سے اتنا دور کر دیا تھا کہ وہ اپنے باطن میں جھانکنے کی اہمیت کھو بیٹھے تھے...

شوبز کی رنگینیوں میں ڈوبی سنگین مقاصد کی ملاوٹیں......

ہونے کے بعد ہوگ نے ویسٹرن اسٹیٹس کے مالک ایڈ سیلی سے مستقل ملازمت کے لیے کہا۔ اس کی عمر اٹھاون سال ہو گئی تھی اور وہ اپنے موجودہ کام سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ دوسری طرف اس کی کتاب کا کام بھی اچانک رک گیا۔ ایڈ سیلی نے اس کی صلاحیت سے متاثر ہو کر سراغ رساں کی ملازمت دے دی جبکہ اس کے پاس پولیس کا تجربہ تھا اور نہ ہی اس نے فوج میں ملازمت کی تھی۔

وہ ایک چٹان کے ابھرے ہوئے حصے پر جھکا ہوا اپنی سانس بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کا منظر بالکل واضح تھا۔ جن لوگوں کا وہ تعاقب کر رہا تھا۔ وہ بچے کو تین میل تک لے کر آئے اور اپنے پیچھے خوف کی ایسی لکیر چھوڑ گئے جسے وہ بہ آسانی محسوس کر سکتا تھا۔ اس جگہ پہنچ کر اس کا تعاقب ختم ہو گیا۔ وہاں ریت کے سینے پر اسے ایک ہیلی کاپٹر کے پھسلنے کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ شیرف کے ایک ڈپٹی نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”وہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے روانہ ہو گئے۔“ ہوگ نے کہا۔

ڈپٹی نے قریب آ کر وہ نشانات دیکھے اور بولا۔ ”بہتر ہوگا کہ ہم واپس چلیں۔“

انہوں نے خشک دریا عبور کیا اور ڈپٹی کی جیپ میں سوار ہو گئے۔ پہاڑی سے لاج تک پہنچنے میں انہیں گیارہ منٹ لگ گئے۔ لاج کے دروازے کے باہر تین سرکاری گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ تفتیش کرنے والے پانچ گھنٹے پیچھے رہ گئے ہیں۔

”یہاں سے جانے والوں کے بارے میں کچھ معلومات ہیں؟“ ہوگ نے شیرف کی سینئر سراغ رساں میری ڈائمنڈ سے پوچھا جو بڑے سکون سے بیٹھی جوس پی رہی تھی۔ ہوگ کا خیال تھا کہ اس کی تقرری سیاسی بنیاد پر ہوئی ہو اور شاید وہ گورنر کے دفتر میں کام کرنے والے کسی شخص کی رشتے دار ہے جبکہ میری کو یہ پریشانی تھی کہ ہوگ ایک قابل سراغ رساں ہے اور اگر اس نے کوئی غلطی کی تو فوراً پکڑی جائے گی۔

”ہمارے آنے سے پہلے تین مہمان یہاں سے جا چکے تھے۔ ہم نے ان کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لی ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”ان میں ایک بزنس وومن اور دو فیملیز تھیں۔ ان کا قیام یہاں قانونی تھا اس کے باوجود میں نے ہیری کو مزید چھان بین کے لیے کہہ دیا ہے۔ انہوں نے یہاں کچھ نہیں دیکھا اور نہ ہی کچھ سنا۔ میں نے بچے کی ایک نئی تصویر بھی حاصل کر لی ہے۔“ اس نے اپنے آئی پیڈ پر ایک پھولی ہوئی آنکھوں اور تیکھے نقوش والے بچے کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے۔ میں ریڈیو پر اعلان کروا دوں؟“

ہوگ نے اس بارے میں سوچا لیکن کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

ڈائمنڈ بولی۔ ”یہ والدین کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے گھبراہٹ میں بچے سے پیچھا چھڑا لیا ورنہ......“

”ورنہ کوئی تو اس جانب توجہ دیتا۔“ ہوگ نے کہا۔

”اب بچے کے والدین کیا چاہتے ہیں؟“

”انہیں خود بھی معلوم نہیں، سوائے اس کے کہ وہ کامیاب ہونا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ شیرف کا فیصلہ سننا چاہتے ہیں۔“

”تمہارا خیال درست ہے۔“ ہوگ نے کہا اور دل میں سوچنے لگا کہ شیرف جو بھی فیصلہ کرے تمہاری نوکری چلتی رہے گی، چاہے بچہ اپنی جان سے چلا جائے۔“

وہ لاج میں چلا گیا۔ دروازے پر دو ڈپٹی کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے پاس اپنی پتلونیں سنبھالنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ اس کی لابی اتنی بڑی تھی کہ بچے بہ آسانی فٹ بال کھیل سکتے تھے۔ آمنے سامنے کی دیواروں پر پتھر کے بنے ہوئے آتش دان تھے اور بڑے اسکرین کے ٹی وی سیٹ کے ساتھ لٹکا ہوا ہرن کا سینگ اور کھال کچھ غیر مناسب لگ رہی تھی۔ اس کی نگاہ بچے کے باپ رچرڈ مارٹن پر گئی جو ایک پستہ قد شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے گلے میں پریس ایجنٹ کا کارڈ لٹک رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک فون بھی تھا۔ اس سے پہلے کہ ہوگ اسے روکتا، وہ اپنی بات ختم کر کے بغلی دروازے سے باہر چلا گیا۔

ہوگ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس شخص کے پاس پہنچا جس کی مدد کرنے وہ یہاں آیا تھا۔

”مسٹر مارٹن! وہ تمہارے بیٹے کو مشرق کی جانب تین میل دور لے گئے ہیں جہاں سے انہیں ہیلی کاپٹر مل گیا۔“ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ”کیا تم پریس کو کوئی بیان دینے کے بارے میں سوچ رہے ہو؟“

”نہیں، میں نہیں جانتا کہ ان سے کیا کہوں گا۔“

مارٹن ایک دراز قد اور چھوٹے جبڑوں والا شخص تھا۔ فلموں میں وہ اپنی اصل جسامت سے دگنا مضبوط نظر آتا تھا۔ وہ

فلمی دنیا میں کوئی بڑا نام نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ اس حد تک اپنا نام بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ لوگ اسے پہچاننے لگے تھے اور ہوگ جانتا تھا کہ دوسرے پیشوں کے مقابلے میں ہالی ووڈ میں نام بن جانا کام ملنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد یہ آپ پر منحصر ہے کہ کتنی تیزی سے شہرت کی بلندیوں تک پہنچ سکتے ہیں۔

''یہ کون شخص تھا جس سے تم بات کر رہے تھے؟'' ہوگ نے پوچھا۔

''مالکوف، یہ پروڈکشن کمپنی کے لیے کام کرتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں خاموش رہے گا اگر ایسا کر سکا۔'' مارٹن نے اس دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جہاں سے وہ شخص باہر گیا تھا۔

''غالباً وہ فون پر اپنے کسی دوست کو معلومات فراہم کر رہا تھا۔''

مارٹن نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''آہ!''

''اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ کیا میں اس کو گھٹنا توڑنے کی دھمکی دوں۔''

''ہاں۔''

ہوگ تیزی سے اس دروازے کی جانب لپکا جہاں سے وہ شخص باہر گیا تھا۔ وہ پروڈکشن وین سے دو گز کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ اور ابھی بھی فون اس کے ہاتھ میں تھا البتہ وہ کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ ہوگ نے اس کا شانہ تھپتھپایا جیسے ہی مالکوف نے گھوم کر دیکھا تو ہوگ نے کہا۔

''مسٹر مارٹن پریشان ہیں کہ وہ اپنی بات پوری طرح نہیں بتا سکے۔''

مالکوف نے شکن آلود پتلون اور گولف شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کے سینے پر فلم پروڈکشن کمپنی لائنگ پک، کا بیج لگا ہوا تھا۔ اس نے حیرت سے ہوگ کو دیکھا اور بولا۔

''میں تمہیں نہیں جانتا۔''

''میرا تعلق پرائیویٹ سیکیورٹی سے ہے اور مجھے بش آرمسٹرانگ نے مسٹر مارٹن کی مدد کے لیے طلب کیا ہے۔''

آرمسٹرانگ ایک بڑی فلم پروڈکشن کمپنی ہولوگرام اسٹوڈیوز کا مالک تھا اور اکثر و بیشتر ویسٹرن اسٹیٹس کی خدمات حاصل کیا کرتا تھا۔ خصوصاً اس صورت میں جب ان ڈور شوٹنگ کے دوران بہت سارے اداکار سیٹ پر شور وغل اور ہنگامہ آرائی کیا کرتے تھے۔

مالکوف نے کہا۔ ''مسٹر آرمسٹرانگ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔''

''ابھی تک یہ بات تمہاری سطح کے لوگوں تک نہیں پہنچی۔'' ہوگ نے کہا۔ ''کیا تمہیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ مسٹر آرمسٹرانگ اور مسٹر مارٹن، دونوں ہی نہیں چاہتے کہ یہ بات کسی کو معلوم ہو۔''

''تمہیں نہیں معلوم کہ......''

ہوگ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں سب جانتا ہوں اور تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میرے ہاتھ بہت مضبوط ہیں۔ دو منٹ پہلے ہی میں نے مارٹن سے کہا ہے کہ اگر وہ چاہے تو میں تمہارے گھٹنے توڑ سکتا ہوں۔'' پھر وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''کچھ نہیں جانتا کہ کس وقت میرے دماغ میں کیا بات آجائے۔''

مالکوف اسے غصے سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کسی چیز کو توڑنے کے لیے تمہاری عمر کچھ زیادہ لگتی ہے۔''

''میں بلاوجہ اپنی قوت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اسی لیے ابھی تک شرافت کا مظاہرہ کر رہا ہوں لیکن میں واقعی بہت سنجیدہ ہوں۔ مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ تمہارے تعلقات کہاں تک ہیں۔ تمہیں اپنی زبان بند رکھنا ہوگی جب تک حقائق سامنے نہ آجائیں۔ اگر کسی بے وقوف نے ٹیلی وژن پر سرگوشی میں بھی کوئی ایسی بات کہہ دی جس سے بچے کو تکلیف پہنچے تو مسٹر آرمسٹرانگ یہ فرض کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ دونوں حقائق آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔''

''میں کسی کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔''

''یقیناً تم ایسا کر سکتے ہو۔'' ہوگ نے کہا۔ ''آج کے لیے تمہارا یہی کام ہے اور صرف میں ہی نہیں بلکہ مارٹن بھی اسے سراہے گا اور ہو سکتا ہے کہ مسٹر آرمسٹرانگ بذاتِ خود تمہارا شکریہ ادا کریں۔''

مالکوف نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس معاملے سے الگ ہی رکھو۔''

ہوگ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم شوٹنگ کے دوران موجود تھے؟''

''کبھی کبھی وہاں جاتا ہوں۔ جیسے کل گیا تھا لیکن پرسوں نہیں۔''

''کیا تم نے وہاں کسی غیر متعلقہ شخص کو دیکھا؟''

''نہیں۔ البتہ طبی عملہ وہاں موجود تھا۔ کل ہم بوریگو کے نواح میں شوٹنگ کر رہے تھے۔ تم جانتے ہو کہ وہ کتنی خراب جگہ ہے۔ دوپہر میں وہاں درجۂ حرارت ایک سو دس ڈگری تھا۔ اتنی گرمی میں میری کار اسٹارٹ نہ ہوئی اور اگر وہ مجھے وہاں چھوڑ آتے تو شاید میں مر جاتا۔''

"وہ دوپہر میں شوٹنگ کیوں کر رہے تھے؟"

"یہ سین کی ضرورت تھی۔ فلم کی ڈائریکٹر اس منظر میں سایہ دکھانا چاہ رہی تھی۔"

"کیا وہ لوگوں کی نظروں میں تھی؟"

"تم کہہ سکتے ہو۔"

"کیا ریپر مارٹن بھی.....؟"

مالکوف نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ ہر کام کرے گا جو کسی دوسرے کو کرنا ہوتا ہے اور کبھی شکایت نہیں کرتا۔ مجھے یقین نہیں کہ اس پر سو فیصد اعتبار کیا جاسکتا ہے لیکن وہ یہی چاہتا ہے کہ ہر کوئی اسے پیشہ ور سمجھے۔"

"تم اس پر یقین کیوں نہیں کرتے؟"

"میں یہاں ایک عرصے سے ہوں اور میں نے یہاں کچھ زیادہ حقیقی لوگ نہیں دیکھے لیکن میں کسی حد تک مارٹن پر بھروسا کرسکتا ہوں۔ اب میں جاؤں گا اور جیسا تم چاہتے ہو، اس بچے کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ بہتر ہوگا کہ تم شیرف کے آدمیوں سے بھی بات کرلو۔ مجھے اس موٹے ڈپٹی کے بارے میں کچھ تحفظات ہیں۔"

"شکریہ۔" ہوگ نے کہا اور موٹے ڈپٹی کی تلاش میں نکل پڑا۔

پانچ منٹ بعد اسے وہ ڈپٹی مل گیا۔ ہوگ نے اسے بتایا کہ اگر کوئی بات بھی لیک ہوئی تو مارٹن کی فیملی کا ردعمل بڑا شدید ہوگا اور وہ لوگ کوئی بھی انتقامی کارروائی کرسکتے ہیں پھر وہ لاج سے باہر آگیا اور ایک سوئمنگ پول سے گزرتا ہوا مارٹن کی رہائش گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے لیے ایک ایک منٹ قیمتی تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ معاملہ اس کی پہنچ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ مارٹن اور اس کی بیوی کے پاس ایک چھوٹا مکان تھا جس کے اطراف میں فیتہ باندھ کر اسے جائے واردات بنا دیا گیا تھا کیونکہ بچہ ٹہلتا ہوا کہیں نکل گیا تھا یا کسی نے اسے بستر سے اٹھا لیا تھا۔ اب مارٹن ایک نسبتاً چھوٹے مکان میں چلا گیا تھا۔ اس کے دروازے پر ویسٹرن اسٹیٹس کی ایک نوجوان عورت گارڈ کے طور پر پہرا دے رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہوگ نے کہا۔

"ہائے جوسی تم یہاں کب آئیں؟"

"چالیس منٹ پہلے۔ جیسے ہی یہاں پہنچنے کے لیے کہا گیا۔ میں نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔"

ہوگ نے بیرونی دروازے پر دستک دی اور اندر چلا گیا۔ میری ڈائمنڈ سیل فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ ریپر مارٹن اور اس کی بیوی قریب ہی کھڑے ہوئے تھے۔ مارٹن امید بھری نظروں سے ڈائمنڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مارٹن اداکاروں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن مارٹن کو دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ اپنی لائنیں بھول گیا ہو اور ڈائمنڈ فون پر بات ختم کرنے کے بعد اسے کچھ بتائے گی۔ پولیس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایسی صورت حال سے نمٹنے کا طریقہ بتائے۔

جل مارٹن نے اسے آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ صحن کے دروازے کی طرف چل دیا۔ وہ بھی اس کے پاس چلی آئی۔ اس کا قد بھی ہوگ کے برابر تھا اور اس نے زیادہ میک اپ بھی نہیں کیا ہوا تھا۔

"میرے شوہر کا کہنا ہے کہ وہاں ایک ہیلی کاپٹر بھی تھا۔" اس نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ وہ اسے کہیں لے گئے ہیں اور اب تاوان کا مطالبہ کریں گے۔ میری سمجھ میں تو یہی بات آتی ہے، وہ کوئی پاگل نہیں تھا جو لوئیس کو اٹھانے آیا ہو۔"

"میری عقل بھی یہی کہہ رہی ہے۔" ہوگ نے کہا۔ "چار سال کا بچہ۔ زیادہ سے زیادہ اس کا وزن پینتیس پونڈ ہوگا۔ وہ اسے تین میل تک لے گیا۔ ایک اوسط درجے کا شخص بھی یہ کام کرسکتا ہے۔ اگر اس کا کوئی مقصد ہو۔ میرا خیال ہے کہ وہ دو تھے کیونکہ قدموں کے نشان سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ان کے لیے یہ کام اور بھی آسان ہوگیا ہوگا۔"

جل مارٹن نے کہا۔ "ہم تاوان دیں گے چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔"

"تم ہماری مدد کرسکتی ہو۔" ہوگ نے کہا۔ "کون جانتا ہے کہ تمہارے پاس اتنی رقم ہے کہ تاوان ادا کرسکو؟"

اس کی شکل بگڑ گئی اور وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

"ہمارے پاس رقم نہیں ہے۔ اس کا انتظام کرنا ہوگا۔"

"کیا تمہارے خاندان میں کوئی ایسا فرد ہے جو رقم کا بندوبست کرسکے؟"

جل مارٹن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ہوگ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "ایک گھنٹے کے اندر مزید پولیس والے بھی آجائیں گے۔ ان میں ایف بی آئی کی تجربہ کار ٹیم بھی ہو گی۔ وہ بھی تم سے یہی کچھ جاننا چاہیں گے جو میں پوچھ رہا ہوں لہٰذا تم میرے ساتھ اس کی مشق کرسکتی ہو۔ کیا تمہارے جاننے والوں میں کوئی ایسا شخص ہے جو تمہارے بیٹے کو اغوا کرسکے۔ کوئی سرپھرا کزن یا دیوانہ دوست؟"

"ریپر کے جاننے والوں میں آدھے پاگل ہیں۔ اسی

کی طرح۔ سوائے بوڑھوں کے۔"

"اس کی طرح، وہ کیسے؟"

"جانوروں کے کرتب دکھانے والے۔ فلموں میں آنے سے پہلے ریپر بھی یہی کام کیا کرتا تھا پھر ایک اسسٹنٹ مین نے مشورہ دیا کہ وہ فلموں میں ایکسٹرا کے طور پر کام حاصل کرنے کی کوشش کرے کیونکہ فلموں میں ہمیشہ مضبوط جسم والوں کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ اس نے یہی کام شروع کر دیا پھر بش نے فیصلہ کیا کہ ریپر معاون کرداروں کے لیے بھی موزوں ہوسکتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اسے کس نوعیت کے کردار ملے ہیں۔"

"نہیں۔" ہوگ نے اعتراف کیا۔ "لیکن مجھے اندازہ ہے۔"

"ظاہر ہے میرے شوہر کے سب دوست پاگل ہیں لیکن وہ لوئیس کو اغوا نہیں کریں گے۔"

"چاہے وہ اس سے حسد ہی کیوں نہ کرتے ہوں؟"

اس نے کمرے کے دوسری جانب بیٹھے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور بولی۔ "ایسے شخص سے کوئی کیسے حسد کرسکتا ہے جو پرانی جینز پہنتا ہو۔"

"اچھا نکتہ ہے۔" ہوگ نے کہا۔ گوکہ وہ اس سے متفق نہیں تھا۔ "کیا تم نے قرب وجوار میں کسی اجنبی کو دیکھا ہے؟"

"یہاں ہر شخص اجنبی ہے لیکن ان میں کوئی بدمعاش معلوم نہیں ہوتا۔"

ہوگ نے اس کی کہنی پکڑی اور بولا۔ "میں ایسا نہیں سمجھتا۔ انہوں نے بچی کا پتا لگانے کے لیے پیسے خرچ کیے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ پیشہ ور ہیں۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ اغوا برائے تاوان کا معاملہ ہے۔"

اس نے مارٹن کی بیوی سے مزید سوالات کیے لیکن کوئی خاص بات معلوم نہ ہوسکی۔ ایف بی آئی کے لوگ اس معاملے میں بہتر ہیں۔ ایک ایجنٹ اس کا ہاتھ پکڑے گا اور دوسرا وہ سوالات پڑھنا شروع کردے گا جس کی مشق وہ برسوں سے کرتے آرہے ہیں۔"

اس کے عقب میں مکان کا دروازہ کھلا اور ایک طویل قامت عورت اندر داخل ہوئی۔ ریپر مارٹن اسے دیکھتے ہی چلایا۔ "ہیلن!" اور اس کی جانب لپکا۔

"مجھے ابھی معلوم ہوا ہے۔" اس عورت نے سر سے بیس بال کیپ اتارتے ہوئے کہا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سنہری بال اور چپٹا چہرہ تھا۔ اس نے ریپر مارٹن کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"تم کیسا محسوس کررہی ہو؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" جل مارٹن نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں کیا محسوس کرسکتی ہوں۔"

وہ عورت مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں نے شوٹنگ روک دی ہے اور لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ واپس لاس اینجلس جاسکتے ہیں لیکن کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں جب تک لوئیس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوجائے۔" پھر وہ ہوگ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "یہاں کا انچارج کون ہے؟"

"وہاں جو ڈپٹی کھڑا ہوا ہے۔"

"تم کون ہو؟"

"اگر تم بش آرمسٹرانگ کے لیے کام کررہی ہو تو میں بھی تمہارے باس کے لیے کام کرتا ہوں۔"

"اوہ، یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔" اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرا نام ہیلن میسن ہے اور میں اس فلم کی ہدایت کار ہوں۔"

وہ ہیلن سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "ہوگ بروسٹر، ویسٹرن اسٹیٹس سیکیورٹی۔"

ہیلن نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولی۔ "کیا یہ سوشل سیکیورٹی کی طرز کی کوئی کمپنی ہے؟"

ہوگ نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ میری ڈائمنڈ کی طرف بڑھ گئی۔ اسی وقت کسی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہوگ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو وہاں ایک مضبوط جسامت والا شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان عورت بھی تھی۔ ان کے پیچھے جوزی گھبرائی ہوئی کھڑی تھی۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے مسٹر بروسٹر۔ میں جانتی ہوں کہ لوگوں کو باہر روکنا میری ذمے داری ہے۔"

"اب جو آئے اسے گولی ماردینا۔" ہوگ نے کہا۔

"تم دونوں کون ہو؟"

اس کے پیچھے آنے والے ریپر مارٹن نے یہ آواز بلند کہا۔ "کلائیڈ! تم کیسے آگئے؟" اس کے بعد وہ سنہرے بالوں لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "ایملی؟"

"ہم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آئے ہیں۔ شاید تمہیں ہماری ضرورت ہو۔" ایملی نے کہا۔ "ہم میں سے دو کے پاس ریوالور بھی ہیں لیکن ہم ایسے لوگوں کی موجودگی میں اس پر بات نہیں کرسکتے جنہیں ہم نہیں جانتے۔"

''یہ شخص بش کے لیے کام کرتا ہے۔'' مارٹن نے کہا۔
''اور میں ریوالوروں کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔'' ہوگ نے کہا۔ ''تم فلم میں کام کررہے ہو؟''
ایملی نے جواب دیا۔ ''کلائیڈ ایکسٹرا ہے۔ یہ پہلے بھی کئی فلمیں کر چکا ہے۔ میں سیٹ پر انتظامات دیکھتی ہوں۔''
''میں نے آرمسٹرانگ کی بیشتر فلموں میں کام کیا ہے۔'' کلائیڈ جھینپتے ہوئے بولا پھر اس نے مارٹن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سب ساتھی لاج میں موجود ہیں۔ ریپر، تم نے ہی کہا تھا......''
''یہ کچھ نہیں کہے گا۔'' ہوگ بولا۔ ''وہ سوچ رہا تھا کہ میری ڈائمنڈ سے کہہ کر ان سب کو گرفتار کروادے۔ پھر وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے کتنے ساتھی وہاں ہیں؟''
''ایملی کو ملا کر سات۔''
''تم میں سے کوئی گزشتہ شب ریزورٹ میں ٹھہرا تھا۔ ممکن ہے کہ کسی نے کچھ دیکھا یا سنا ہو؟''
''نہیں، ہم سب موٹل میں ٹھہرے تھے۔ وہاں ہزک کے ساتھ ہی ایک بار بھی ہے۔''
''یہ موٹل کہاں پر ہے؟''
''ہائی وے سے چالیس میل کے فاصلے پر۔''
''تمہارے بقیہ ساتھی وہیں پر ہیں؟''
''ہاں، وہ جو یہاں نہیں رہتے۔'' ایملی نے کہا۔
''مسٹر آرمسٹرانگ تھوڑے وقفے سے یہاں شوٹنگ کرتے رہتے ہیں اور یہاں کئی ایسے مقامی لوگ ہیں جو ضرورت پڑنے پر ایک دن کے لیے بھی کام کرنے آجاتے ہیں۔ اب ریپر اسٹار بن چکا ہے اور لگتا ہے کہ اب ہمیں زیادہ کام کرنا پڑے گا۔''
''کیا ان میں سے کسی مقامی شخص نے تنگ تو نہیں کیا؟''
''تھوڑا بہت تو سبھی کرتے ہیں۔''
''کیا ان میں سے کوئی بچہ اغوا کرسکتا ہے؟''
''شاید ان میں سے دو ایسے ہوسکتے ہیں لیکن میں یقین نہیں کرسکتی کہ وہ ایک بچے کو اغوا کرسکتے ہیں۔''
''لیکن وہ اسے غیر قانونی نہیں سمجھتے ہوں گے۔'' ہوگ نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔
پھر اس نے کلائیڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے کبھی کوئی غیر قانونی کام کیا ہے؟''
''میں کوئی بھی غلط کام کرنے سے پہلے اس کی سزا کے بارے میں سوچتا ہوں۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو ریپر کے بیٹے کو نقصان پہنچا سکے۔''
ہوگ نے ان دو آدمیوں کے نام معلوم کیے جو غیر قانونی کام کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے پھر اس نے وہ نام میری ڈائمنڈ کو دے دیے اور اسے لاج کے حفاظتی اقدامات کے بارے میں متنبہ کیا۔ جب کلائیڈ اور ایملی واپس لاج کی طرف چلے گئے تو ریپر مارٹن نے انہیں اس طرح دیکھا جیسے وہ خود بھی ان کے ساتھ جانا چاہ رہا ہو۔ اس نے ہوگ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''اغوا کرنے والوں کو فون کرنا چاہیے تھا، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''
''وہ تمہیں بے چین کررہے ہیں۔ میرے ساتھ باہر آؤ؟''
''اگر ان کا فون آگیا تو......؟''
''ایک ہینڈ سیٹ ساتھ لے چلو۔ ہم کہیں دور نہیں جارہے۔''
وہ باہر آگئے۔ اس وقت ساڑھے نو بج رہے تھے۔ گویا اس واقعے کو ساڑھے پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ مارٹن ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اب وہ کسی بھی وقت فون کرسکتے تھے۔ جوہی ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے ہوگ کو بتایا۔ ''میں نے اس عورت کو اس لیے اندر آنے دیا کہ وہ میری گردن کو مرغی کی طرح مروڑ دے گی۔''
''شاید وہ ایسا کردیتی۔'' ہوگ نے اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔
ریپر مارٹن اپنے ہاتھ میں ایک فون سیٹ لیے ہوئے باہر آیا۔ ہوگ اسے جوہی سے دور لے گیا اور بولا۔ ''تم جس فلم میں کام کررہے ہو، کیا اس میں کوئی مسئلہ ہے؟''
''میں ایسا نہیں سمجھتا۔ ہیلن چند روز پہلے کہہ رہی تھی کہ ہم شیڈول سے دو دن آگے ہیں۔''
''کیا کسی کو اس فلم سے کوئی مسئلہ ہے؟''
''یہ میں نہیں جانتا۔ تم سمجھ رہے ہو کہ کوئی اس فلم کو تباہ کرنے کے لیے لوئیس کو اغوا کرسکتا ہے؟''
''جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ ایک انوکھا واقعہ ہے۔'' ہوگ بولا۔ ''تمہاری بیوی کہہ رہی تھی کہ تمہارے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔ اس سے ایک سوال ذہن میں آتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ اگر میں ایک ایکٹر کے بیٹے کو اغوا کرنا چاہوں تو کسی ایسے شخص کا انتخاب کروں گا جو میرا مطالبہ پورا کر

لگے۔

''دیکھو مسٹر بروسٹر......!'' مارٹن نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''معاف کرنا۔ میں صرف سوچ رہا تھا۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ جب وہ مجھے فون کریں گے تو انہیں کیا جواب دوں گا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اپنے بیٹے کی پروا کرنا چھوڑ دوں۔''

ہوگ ٹہلتا ہوا مکان سے دس بارہ گز دور چلا گیا لیکن وہاں سے بھی وہ مکان کے داخلی دروازے پر نظر رکھ سکتا تھا پھر اس نے اپنے فون پر بش آرمسٹرانگ کا نمبر ملایا اور بولا۔ ''شاید تم سے مارٹن کے بیٹے کی بازیابی کے لیے تاوان کا مطالبہ کیا جائے تاہم ابھی تک ایسا کوئی مطالبہ سامنے نہیں آیا ہے لیکن مارٹن اور اس کی بیوی کا کہنا ہے کہ ان کے پاس تاوان کی ادائیگی کے لیے رقم نہیں ہے۔ ایسی صورت میں تمہیں ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔''

''اگر میں انکار کر دوں تو کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اس کا اثر تمہارے اداکار اور فلم پر ضرور پڑے گا۔''

''وہ کوئی اسٹار نہیں ہے اور نہ ہی میں اسے اس جیسا معاوضہ دیتا ہوں۔ وہ اس فلم میں ثانوی کردار ادا کر رہا ہے۔ ایجنٹ کو ادائیگی کرنے اور دوستوں کا ادھار نمٹانے کے بعد اس کے پاس کچھ نہیں بچتا۔ میں نے بھی اپنے ماتھے پر بورڈ نہیں لگا رکھا کہ بہت نرم دل انسان ہوں۔ میں اس سلسلے میں اپنی انشورنس کمپنی سے بات کروں گا۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکیں گے۔ تمہیں یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا۔''

آرمسٹرانگ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اچھی خبریں سناتے رہو۔ اگر میں نے مارٹن کے لیے یہ جوا کھیلا تو اس کی وصولی کے لیے اسے مزید چھ فلموں میں سائن کرنا پڑے گا۔ کیا ایف بی آئی والے آگئے؟''

''وہ آنے ہی والے ہیں۔''

''ان سے کیا امید کی جاسکتی ہے؟''

''ان کے کام کرنے کا اپنا طریقہ ہے جو ہر ایک پر فٹ نہیں بیٹھتا لیکن ان کے پاس ہم سے زیادہ تجربہ ہے۔''

''کیا وہ یہ کہیں گے کہ تاوان کی رقم ادا کر دی جائے؟''

''غالباً!''

''تمہارے خیال میں یہ رقم کتنی ہوگی؟''

ہوگ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''غالباً دس لاکھ کے

شادی مبارک

بیٹا: ابو میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔
باپ: پہلے تم یہ کہو کہ معافی چاہتا ہوں۔
بیٹا: کس بات کی معافی؟
باپ: پہلے کہو معافی چاہتا ہوں۔''
بیٹا: مگر میں معافی کیوں مانگوں میں نے کیا غلطی کی ہے؟
باپ: میں نے کہا نا کہ پہلے معافی مانگو۔
بیٹا: مگر میں نے کیا کیا ہے جس کی معافی مانگوں؟
باپ: پہلے معافی مانگو۔
بیٹا: اچھا ابو میں معافی مانگتا ہوں۔
باپ: اب تم نے ٹریننگ لے لی ہے...... شادی کے بعد کسی بات کے بغیر ہمیشہ بیگم سے معافی مانگنے کے لیے تیار ہو۔ اس کا مطلب ہے تم شادی کے قابل ہو گئے ہو۔ میری طرف سے اجازت اور مبارک باد قبول کرو۔

منزلِ مقصود

تین شرابی نشے میں دھت شراب خانے سے باہر آئے۔ گھر جانے کے لیے اور ٹیکسی کو اشارہ کر کے اس میں بیٹھ گئے اور چلنے کو کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ان کے نشے کو دیکھتے ہوئے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور دس منٹ تک انجن کو چلنے دیا اور انجن بند کر کے اس نے شرابی کو کہا، آپ کی منزل آگئی۔

باہر آنے کے بعد پہلے شرابی نے ڈرائیور کو کرایہ اور ٹپ دی۔ دوسرے شرابی نے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا کہ بہت ہی احتیاط سے ڈرائیو کر کے ان کو اپنی منزل پر پہنچا دیا۔ مگر تیسرے شرابی نے ڈرائیور کو گھونسا مارا۔ جس پر ڈرائیور نے سوچا کہ یہ شرابی جان گیا کہ میں ان لوگوں کو کہیں بھی نہیں لے گیا اور بے وقوف بنایا۔ مگر پھر بھی کہا اپنی رفتار کو قابو میں رکھو۔ تم نے اتنی تیز گاڑی چلائی کہ تقریباً ہم لوگوں کو مار دیتے۔ DRIVE CARE FULL

مرسلہ: ظہیر بابر کی خوشی

اندر ہی ہوگی۔ وہ بھی اتنی ہی رقم کا مطالبہ کریں گے جو متاثرہ شخص ادا کرسکتا ہو۔ اس وقت وہ بچہ ان کے لیے ایک اثاثہ ہے، اگر انہوں نے بہت بڑا مطالبہ کردیا اور کوئی بات طے نہ ہوسکی تو وہ بچہ ان پر بوجھ بن جائے گا۔'' وہ مکان کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''فلم کی شوٹنگ کیسی جارہی ہے؟ کیا ہیلن ایک اچھی ڈائریکٹر ثابت ہوئی؟''

''وہ چھوٹے بجٹ کی ایکشن فلمیں بناتی ہے لیکن اس کے سیکس سین الجھے ہوئے ہوتے ہیں، وہ جانتی ہے کہ یہ کوئی آرٹ نہیں ہے۔''

''وہ تمہارے مطلب کی ڈائریکٹر ہے۔ اس فلم کے بارے میں بتاؤ؟''

''اچھی ہی ہوگی۔ تم کیا جاننا چاہ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں۔ مجھے صرف گھبراہٹ ہورہی ہے۔''

ہوگ واپس مین لاج پر گیا جہاں اس کی ملاقات موئے ڈپٹی سے ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ ''ہیلی کاپٹر کا کچھ پتا چلا؟''

''ہم ہر اس اڈے پر فون کررہے ہیں جہاں سے اس کے بارے میں پتا چل سکتا ہے لیکن لگتا یہی ہے کہ وہ کسی میدان پر اترا ہے۔''

''یا پھر کسی ہوٹل کی چھت پر؟'' ہوگ نے خیال ظاہر کیا۔

''میں نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ میں اپنے آدمیوں کو بتادوں گا۔''

وہ فون نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگا اور ہوگ سوچ رہا تھا کہ اور بھی کئی ایسی جگہیں ہیں جہاں ہیلی کاپٹر اتر سکتا ہے۔ چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ بچہ اب تک کہیں نہ کہیں پہنچ گیا ہوگا۔

دو سفید ایس یو وی گاڑیوں کے انجن کی آواز سنائی دی اور ہوگ سمجھ گیا کہ ایف بی آئی کی ٹیم پہنچ گئی۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ ہوگ نے ان کا لاج کے مرکزی دروازے پر استقبال کیا اور انہیں اس مکان تک لے گیا جہاں مارٹن اور اس کی بیوی موجود تھے۔ وہ خود باہر رک گیا تا کہ ایف بی آئی کی ٹیم ان سے سوالات کرسکے۔

''اغوا کرنے والوں کو اب تک فون کرلینا چاہیے تھا؟'' جل مارٹن نے کہا۔

''ہر صورتِ حال مختلف ہوتی ہے۔'' ایک ایجنٹ نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم عام طور پر لوگوں کو چوکنا رہنے کے لیے کہتے ہیں۔ میڈیا کو بھی اس معاملے میں شامل کرلینا چاہیے۔''

دوپہر تک ریزورٹ میڈیا کے لوگوں سے بھر چکا تھا اور سان ڈیاگو سے آنے والی میڈیا کی ٹیم نے چارج سنبھال لیا۔ میری ڈائمنڈ بخوشی پس منظر میں چلی گئی جبکہ ہوگ ٹیلی فون پر اپنے باس ایڈ سیلی سے بات کررہا تھا۔

''ان لوگوں کے آنے کے بعد میرا کام ختم ہوچکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک یا دو گھنٹے بعد میں کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہوجاتا لیکن......''

''آرمسٹرانگ چاہتا ہے کہ تم موقع پر موجود رہو۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اور کوشش کرو کہ ہمارے نام بیچ میں نہ آئیں۔''

ایف بی آئی ٹیم کا انچارج نیڈ براؤن ایک طویل قامت اور چھوٹے چہرے والا شخص تھا۔ ہوگ اسے اور فارنسک وومن کو جیپ کے ذریعے اس جگہ تک لے گیا جہاں ہیلی کاپٹر کے گھسٹنے کے نشانات تھے۔

''تم نے ان کا یہاں تک تعاقب کیا؟'' براؤن نے پوچھا۔

''اس میں مجھے کوئی ہوشیاری نہیں دکھانا پڑی۔ ان دونوں نے بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس لیے صبح کے وقت ان کا تعاقب کرنے میں آسانی رہی۔ تم اس ٹریک کی کئی تصویریں لے سکتے ہو۔''

براؤن تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم کئی گھنٹے پہلے یہاں آگئے تھے۔ تم نے اس فیملی کے بارے میں کیا رائے قائم کی؟''

''وہ خوف زدہ ہیں لیکن یہ ایک مصنوعی خوف لگتا ہے۔ جیسے وہ اداکاری کررہے ہیں۔''

''تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ کئی لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسٹیج پر اداکاری کررہے ہیں۔ کسی اور کا لکھا ہوا اسکرپٹ انہیں پسند نہیں آتا لیکن وہ اس کے مطابق اداکاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

نیڈ براؤن ہیلی کاپٹر کے نشانات دیکھ کر تھک چکا تھا۔ اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ وہ زیادہ دیر تک بچے کو اپنے پاس رکھنے کی کوشش کریں گے۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کا فون آنے والا ہے؟''

براؤن جیپ کی طرف واپس جاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اسی بات کی پریشانی ہے کہ اب تک فون کیوں نہیں آیا۔ بعض اوقات سب گڑبڑ ہوجاتا ہے۔ انہوں نے بچے کو بہت مضبوطی سے پکڑا ہوگا۔ اسے زوردار تھپڑ مارے ہوں گے...... پھر وہ سارے ثبوت ضائع کردیں گے اور ہمیں کبھی اس کا جواب نہیں ملے گا۔

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" ہوگ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا اس سے پہلے بھی تمہارا واسطہ اغوا کاروں سے پڑا ہے؟"

"نہیں۔"

"ہم یہی سمجھتے ہیں کہ وہ کاروباری ذہن کے لوگ ہیں اور دہشت نہیں پھیلاتے پھر سب لوگ خوشی خوشی گھر چلے جاتے ہیں۔"

اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے کان لگا کر چند سیکنڈ سنا پھر بولا۔ "اوہ میرے خدا! بچے کا باپ غائب ہوگیا۔"

وہ واپس ریزورٹ آئے اور تیزی سے مارٹن کے مکان کی جانب بڑھے۔ ایک ایف بی آئی ایجنٹ نے براؤن کو بتایا۔ "مارٹن باتھ روم میں تھا اور اپنے ساتھ فون بھی لے گیا تھا لیکن کسی نے گھنٹی کی آواز نہیں سنی۔ وہ بڑے سکون سے چلتا ہوا آیا اور باہر نکل گیا۔"

"اور تم نے اس کی نگرانی نہیں کی؟"

"مسز مارٹن اپنے فون پر کسی بش نامی شخص سے چلا چلا کر باتیں کر رہی تھی۔"

ہوگ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "ریپر مارٹن اس کی فلم کمپنی میں کام کرتا ہے اور آرمسٹرانگ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آیا وہ تاوان کی رقم ادا کر سکتا ہے۔"

"کیا وہ یہ رقم ادا کر سکتا ہے؟"

"اگر اس نے ایسا نہ کیا تو کنجوس کہلائے گا۔"

دوسرے ایجنٹ نے رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔ "وہ اپنی کار میں گیا ہے۔ شیرف کی ایک ڈپٹی کا کہنا ہے کہ اس نے مارٹن کو کار میں بیٹھتے اور چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ کیا ہم اسے روکنا چاہیں گے؟"

نیڈ براؤن اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ "دیکھتے ہیں کہ مارٹن فون کرتا ہے اور کہاں سے؟"

ہوگ نے اس ایجنٹ سے پوچھا۔ "کیا مارٹن کے ساتھ کوئی اور بھی گیا ہے۔ لاج میں اس کے دوستوں کا گروپ ہے۔"

"میں نے انہیں دیکھا ہے۔" ایجنٹ نے کہا۔ "مارٹن اکیلا ہی گیا ہے۔"

ہوگ اس صوفے کی جانب بڑھا جہاں جل مارٹن بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا آرمسٹرانگ نے کوئی ایسا انتظام کیا ہے کہ تمہارے شوہر کو کچھ رقم مل سکے؟"

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور بولی۔ "نہیں، بش نے کہا ہے کہ کمپنی ہمارے ساتھ کھڑی ہوئی ہے۔ ایک دفعہ یہ معلوم ہو جائے کہ اغوا کار کتنی رقم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔"

"ایف بی آئی ایجنٹ نے بتایا ہے کہ تم آرمسٹرانگ پر چلا رہی تھیں؟"

"میں اسے بتا رہی تھی کہ ریپر نیا معاہدہ اسی وقت سائن کرے گا جب ہمارا بیٹا واپس مل جائے گا۔ اس سے پہلے وہ یہ بات کیسے کر سکتا ہے۔ بالآخر وہ اس پر راضی ہو گیا۔" اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بنیادی طور پر وہ ایک اچھا آدمی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وکیلوں نے یہ آئیڈیا اس کے دماغ میں ڈالا تھا۔"

"تم کیا سمجھتی ہو۔ تمہارا شوہر کہاں گیا ہے؟"

اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ "اوہ میرے خدا! وہ بہت ہی احمق ہے۔ اپنے نام کی طرح۔ اس نے کبھی گانا نہیں گایا لیکن وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک سخت جان بندے کا نام لگتا ہے جبکہ اس کا اصل نام کیرول ہے لیکن وہ اسے کبھی پسند نہیں آیا۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ اسے اغوا کرنے والوں نے فون کیا ہوگا؟"

اسی اثنا میں نیڈ براؤن بھی ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا لیکن اس نے بیچ میں مداخلت نہیں کی۔

"میں نہیں جانتی لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس کے پاس ضرور فون آیا ہوگا۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اغوا کاروں کو ریپر کا سیل نمبر کیسے معلوم ہوا؟"

جل مارٹن نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

"اور اگر آرمسٹرانگ نے رقم کا بندوبست نہیں کیا تو تمہارا شوہر فون سنتے ہی فوراً کیوں چلا گیا؟"

"میں نے تمہیں بتایا کہ وہ احمق ہے۔ میں نے واقعی ایک بے وقوف شخص سے شادی کی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بہت بہادر سمجھتا ہے۔ اس نے کار کی ڈکی میں ایک شاٹ گن رکھی ہوئی ہے اور وہ اپنے بیٹے کو واپس لانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔"

اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی براؤن ایک طرف چل دیا۔ ہوگ نے اسے شیرف کے آدمیوں کو ہدایات دیتے ہوئے سنا۔ وہ انہیں مارٹن کی کار کو محتاط طریقے سے روکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ہوگ نے اسے دروازے پر پکڑ لیا اور کہا۔ "کیا مجھے معلوم کرنا چاہیے کہ مارٹن نے آرمسٹرانگ سے کوئی رابطہ کیا؟"

"یہ ایک اچھا آئیڈیا ہے۔" اس نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

ہوگ نے آرمسٹرانگ کا نمبر ملایا اور اس سے پوچھا۔ "کیا تم نے مارٹن سے کچھ سنا؟"

"میں اس کی بیوی سے بہت کچھ سن چکا ہوں۔" بش آرمسٹرانگ نے کہا۔

"تمہارا اسٹار اپنے طور پر فرار ہوگیا ہے۔ جل مارٹن کا خیال ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو بچانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔"

آرمسٹرانگ نے کوئی جواب نہیں دیا تو ہوگ نے کہا۔ "یہ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان رہے گی۔ کیا یہ کوئی پبلسٹی اسٹنٹ تو نہیں؟"

آرمسٹرانگ نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں اس معاملے میں کسی طرح بھی شامل نہیں ہوں۔"

"تم جانتے ہو کہ میں کیوں حیران ہو رہا ہوں۔ مارٹن تم سے زیادہ معاوضہ مانگنا چاہتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ بچے کے اغوا سے اس کی شہرت میں اضافہ ہوگیا ہے۔"

"میں ایسی حماقت کو معاف نہیں کروں گا۔"

"اس کے علاوہ کوئی ایسا شخص جو تمہارے لیے کام کر رہا ہو؟"

"شاید سو سے زیادہ لوگ میرے لیے کام کرتے ہیں۔ میں ہوشیار نہیں بلکہ سستے لوگوں سے کام لیتا ہوں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم یہ احمقانہ خیال اپنے آپ تک محدود رکھو؟"

ہوگ نے فون بند کر دیا اور نیڈ براؤن سے کہا۔ "آرمسٹرانگ کو مارٹن کا کوئی فون نہیں آیا۔"

"چلو کچھ کھاتے ہیں۔" براؤن نے اپنی ساتھی ایجنٹ سے کہا۔ "ریسٹورنٹ سے سینڈوچ منگوالو۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم میں سے ایک جل مارٹن کے پاس ہی رہے۔ ممکن ہے کہ رچر مارٹن اس سے رابطہ کرے۔"

ایجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسی وقت اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون سننے کے بعد نیڈ براؤن کو بتایا۔ "سیل ٹاور کی اطلاع ہے کہ مسٹر مارٹن کو روٹ سترہ پر واقع ایک پرانے انڈین کیسینو کے قریب سے فون کیا گیا تھا۔ یہ ٹاور تیس میل کے دائرے کے اندر ہونے والی کسی بھی کال کا سراغ لگا سکتا ہے۔"

"کیا ہمیں فون کرنے والے کا نام معلوم ہو سکتا ہے؟" براؤن نے پوچھا۔

"یہ پری پیڈ کال تھی لیکن ہم فون کرنے والے کا پتا لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" ہمیں وہاں جانا ہوگا۔ کیا تم ہمارے ساتھ چلو گے بروڈسنر؟"

میری ڈائمنڈ نے براؤن کو تازہ ترین اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ "ہمیں دو بھائیوں لیری اور رینڈی ہینس کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔ موٹر وہیکل ڈپارٹمنٹ نے ان کے ڈرائیونگ لائسنس بھی ای میل کر دیے ہیں۔"

"کیا وہ اسی پتے پر رہتے ہیں؟"

"نہیں، بلکہ چند بار وہ جیل بھی جا چکے ہیں۔"

"تمہیں یہ نام کیسے معلوم ہوئے؟"

"وہ اس فلم کے یونٹ کا حصہ ہیں اور جس جگہ ہم جا رہے ہیں۔ وہ ہیڈن اسپرنگس کہلاتی ہے۔ پہلے یہاں ایک کیسینو بنایا گیا تھا جو بعد میں توڑ دیا گیا۔"

ہائی وے پر چالیس میل جانے کے بعد وہ ہیڈن اسپرنگس موٹیل کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک بغلی سڑک پر پہنچے۔ میری نے دو فرلانگ دور کھڑی ہوئی کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ مارٹن کی گاڑی ہے۔"

براؤن نے اپنی گاڑی اس سے بارہ فٹ دور روک دی اور وہ تینوں ایس یو وی سے باہر آکر مارٹن کی گاڑی کو دیکھنے لگے۔ کار کی ڈکی کھلی ہوئی تھی اور اس میں کوئی شاٹ گن نہیں تھی۔ براؤن نے کار میں جھانک کر دیکھا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا پھر اس نے فون پر کسی سے پوچھا۔ "سیل فون کی لوکیشن کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟"

ہوگ، خاتون ایجنٹ کا جواب نہیں سن سکا لیکن براؤن کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہے۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر سو گز دور واقع ویران کیسینو پر پہنچے۔ یہ ایک گول عمارت تھی جس کا سامنے کا دروازہ غائب تھا اور لگتا تھا جیسے کھڑکیاں کبھی لگائی ہی نہیں گئی تھیں۔ راہداری میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ہوگ کا خون رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔

"اوہ میرے خدا!" میری ڈائمنڈ نے کہا۔ "یہ تو لیری ہینس ہے۔"

براؤن چلایا۔ "مارٹن! تم کہاں ہو؟"

"میں اس عمارت کو کلیئر کرنے کے لیے ٹیم بلاتی ہوں۔" میری نے کہا۔

براؤن نے تاریک عمارت میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ہمارے پاس وقت کم ہے۔" یہ کہہ کر وہ لاش کے پاس سے گزرتا ہوا کیسینو میں داخل ہوگیا۔ ہوگ نے بھی اس کی

عمارت کی عمارت کے اندرونی دروازے بھی غائب تھے اور برقی تنصیبات بھی الگ کر دی گئی تھیں۔ بائیں جانب کمرے تھے جو کبھی دفتر کے طور پر استعمال ہوتے ہوں گے۔ کچن اور باتھ روم کی بھی سب چیزیں غائب تھیں۔ ان تینوں کو پوری عمارت کا جائزہ لینے میں کئی منٹ لگ گئے۔ ہوگ کو ایک جانب روشنی کی لکیر نظر آئی۔ وہ باہر جانے کا راستہ تھا جس کا دروازہ غائب تھا البتہ کسی نے اسے بند کرنے کے لیے وہاں پلائی وڈ کی چادر لگا دی تھی۔ اس نے دھکا دے کر اسے ہٹایا اور باہر نکل آیا۔ وہاں ایک اور لاش پڑی ہوئی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر مارٹن اپنے بیٹے کو سہارا دیے بیٹھا ہوا تھا۔

اس لڑکے نے پاجامہ پہن رکھا تھا اور اس کا ایک پاؤں بری طرح سوج گیا تھا۔ یہ سوجن سانپ کاٹنے سے ہوئی تھی اور بچے کی آنکھیں بند تھیں۔

''میرا خیال ہے کہ ہم نے دوسرے بھائی کو بھی تلاش کر لیا ہے۔'' میری ڈائمنڈ نے کہا۔ ''البتہ مجھے بچے کا بہت افسوس ہے۔''

میڈیا کے لوگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہیں روکنا بہت مشکل تھا۔ میری ڈائمنڈ نے میڈیا کے لوگوں کو دور رکھنے کے لیے مارٹن کی کار کے گرد ایک حصار قائم کر دیا تھا۔ اب اسے شیرف کا انتظار تھا جو اسپیشل ایجنٹ براؤن کو ملنے والی شہرت میں اپنا حصہ وصول کرنے آرہا تھا۔

جب ریپر مارٹن اپنا بیان دے رہا تھا تو ہوگ کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چنانچہ اس نے باری باری ایڈ سیلی، بش آرمسٹرانگ اور پروڈیوسر ڈائریکٹر ہیلن سے بات کی۔

''کیا تم نے پیٹس بوائز کی خدمات مقامی لیبر کے طور پر حاصل کی تھیں۔'' اس نے ہیلن سے پوچھا۔

''مجھے تم سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ بولی۔

وہ نتھنے پھلاتے ہوئے بولا۔ ''یقیناً ہے، تم مجھے نہیں بتانا چاہتیں لیکن یہاں سارے ٹی وی رپورٹر کہہ رہے ہیں کہ یہ تمہاری غلطی تھی۔''

''تم —'' اس نے غصے میں بہت کچھ کہہ دیا پھر بولی۔ ''انہوں نے ایک ہفتہ پہلے دو دن تعمیراتی کام کیا تھا۔''

''اور اس طرح انہوں نے مارٹن اور اس کے بیٹے کو دیکھ لیا۔''

''میں شکست قبول کر لوں گی۔'' اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

ہوگ بروڈیٹر نے ایڈ سیلی کو بھیجنے کے لیے جو رپورٹ لکھی۔ اس میں کوئی ایسی بات شامل نہیں تھی جس کے بارے میں اسے خود بھی یقین نہیں تھا۔ البتہ اس نے زبانی طور پر ایڈ سیلی کو بتایا کہ ریپر مارٹن کو پیٹس بوائز جیسے لوگ پسند تھے۔ وہ ہمیشہ سے ہی مضبوط اور سخت جان لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا عادی تھا۔ ان لوگوں سے ملنے کے بعد اس نے اپنے بیٹے کے جعلی اغوا کا منصوبہ بنایا تاکہ اس طرح اسے غیر معمولی شہرت مل سکے اور وہ اگلی فلم کے لیے آرمسٹرانگ سے منہ مانگا معاوضہ وصول کر سکے۔ اس بات کا بھی زیادہ امکان ہے کہ ان دونوں بھائیوں میں سے کسی نے بھی بچے کو گھر سے اغوا نہیں کیا بلکہ مارٹن خود ہی اپنے بیٹے کو لے کر نصف شب گزرنے کے بعد ان کے پاس چھوڑنے گیا۔ منصوبے کے مطابق جب پولیس اور ایف بی آئی کے لوگ اغوا کنندگان کو تلاش کرنے میں ناکام ہو جاتے تو وہ اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے شاٹ گن لے کر نکل پڑتا۔ وہ لوگ اسے دیکھ کر فرار ہو جاتے اور کسی کو بھی ان کے بارے میں علم نہ ہوتا۔ مارٹن اپنے بیٹے کو واپس لے آتا اور اس کی واہ واہ ہو جاتی لیکن وہ دونوں بھائی بچے کی حفاظت نہ کر سکے اور بچے کو سانپ نے ڈس لیا اور مارٹن نے مشتعل ہو کر دونوں بھائیوں کو گولی ماردی جو کہ اس کے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔''

''عمدہ کہانی ہے۔'' ایڈ سیلی نے کہا۔ ''کچھ ہی دنوں میں تم اسے بھول جاؤ گے۔''

''مجھے بچے کے مرنے کا بہت افسوس ہے۔ مارٹن نے شہرت کی خاطر اپنے بیٹے کی زندگی داؤ پر لگا دی۔''

''تم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق تمہارے پہنچنے سے پہلے ہی بچے کی موت واقع ہو چکی تھی۔''

''میں جانتا ہوں۔''

''لیکن میں تم سے شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ مارٹن کی بیوی اس منصوبے میں شامل نہیں تھی۔'' ایڈ سیلی نے کہا۔

''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوگا؟''

''ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے لیکن اسے ایک مہینے کا وقت دو جو کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے کافی ہے اگر وہ اپنے شوہر کو مار دیتی ہے تو تم مجھے سوڈا الرو دو گے۔''

ہوگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایسی شرط نہیں لگانا چاہتا تھا جس کے بارے میں اسے خود بھی یقین نہیں تھا۔

دیوانہ

ارشد بیگ

انسان کی نیت بھی شاید اس کی بخشش کا پیمانہ ہے۔ کوئی اپنا مال و اسباب دوسروں کی خاطر استعمال میں لاتا ہے اور بعض اس نیت کے مالک ہوتے ہیں جن کا سامنے والے کی دولت پر کوئی حق نہیں بنتا مگر وہ اپنی بدنیتی کے حصار میں مدہوش ہو کے اسے اپنے لیے مخصوص سمجھتے ہیں۔ دیوانوں اور فرزانوں کے درمیان جاری رسّاکشی...

عجیب دوراہے پر کھڑے پولیس آفیسر کی ذہنی کشمکش کا احوال

جب میں ہل ٹاپ پہنچا تو پولیس لیفٹیننٹ اولیور بائن لان میں ایک قدموں کے نشان کے برابر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا اور چھوٹے قد کا فوٹوگرافر بڑا سا چشمہ لگائے اس نشان کی تصویریں لے رہا تھا۔ اپنا کام ختم کرنے کے بعد فوٹوگرافر سیدھا کھڑا ہو گیا لیکن بائن کی نظریں اب بھی اسی نشان پر تھیں۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر ایک سرد آہ بھر کر وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

''میں نے سوچا کہ شاید تمہیں یہاں سے کوئی کہانی

مل جائے۔" وہ میرا استقبال کرتے ہوئے بولا۔ وہ کافی سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ "لیکن یہ ایک خودکشی کا کیس ہے۔"

"فون پر جو کچھ تم نے بتایا۔ اس سے تو یہ خودکشی کا کیس معلوم نہیں ہوتا۔ مجھے تو اس میں بہت کچھ نظر آرہا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" بائن نے ایک اونچی تاروں کی باڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس نے لافورڈ ہومز کے مکان اور اس سے ملحقہ پانچ ایکڑ علاقے کو گھیر رکھا تھا۔ اس وقت یہ میدان پولیس والوں، مقامی حکام اور قرب و جوار میں رہنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ باڑ ایک موثر رکاوٹ تھی۔ اس کی اونچائی دس فٹ تھی اور اس کے اوپری سرے پر خاردار تار لچھے کی شکل میں لپٹا ہوا تھا۔ اس سے چھ فٹ کے فاصلے پر تمام درخت اور جھاڑیاں صاف کر دی گئی تھیں اور ایسی شاخیں جو اس باڑ کو چھو رہی ہوں انہیں بھی کاٹ دیا گیا تھا۔

"اس میں برقی رو دوڑ رہی ہے۔" بائن نے کہا۔ "ہومز گن کے کارکن جنگ کے زمانے میں چھوٹے ہتھیاروں کو یہیں ٹیسٹ کیا کرتے تھے۔ اگر باڑ کو کوئی چھو لے یا شارٹ سرکٹ ہوجائے تو فوراً ہی الارم بجنے لگتا ہے۔ اس سسٹم کے فول پروف ہونے کی ضمانت دی گئی ہے لیکن گزشتہ شب یہ الارم نہیں بجا۔ اس کا مطلب ہے کہ باڑ کو نہیں چھیڑا گیا اور نہ ہی اس کے قریب زمین پر کسی قسم کے نشانات پائے گئے ہیں۔ بہرحال اگر تم سیڑھی بھی استعمال کرو تو باڑ کو چھوئے یا الارم بند کیے بغیر اسے نہیں پھلانگ سکتے۔"

"اس سے تو یہی لگتا ہے کہ گزشتہ شب باہر کا کوئی آدمی مکان میں داخل نہیں ہوا اور اگر باہر سے کوئی نہیں آیا تو لافورڈ ہومز قتل بھی نہیں ہوا بلکہ اس نے خودکشی کی ہے۔" بائن فاتحانہ انداز میں بولا۔

"اگر ایسا ہے تو تم اس پیروں کے نشان میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟"

بائن نے ایک بار پھر اسے دیکھا۔ وہ آدھے پاؤں کا نشان تھا جیسے کوئی پنجوں کے بل کودا ہو۔ ایک بڑے درخت کی لٹکی ہوئی شاخوں نے لان پر سایہ کر رکھا تھا اور حال ہی میں دوبارہ بیجوں کی بوائی کی وجہ سے زمین صاف اور قدرے نرم ہوگئی تھی۔ ورنہ یہ نشان اپنی جگہ نہ بناتا۔

"گزشتہ شب سے پہلے یہ نشان یہاں نہیں تھا۔" بائن نے کہا۔ "یہ بات مالی نے حلفیہ بتائی ہے۔ اس نے سورج غروب ہونے سے پہلے یہاں پانی بھی دیا تھا۔ یہ کسی ایسے شخص کے پاؤں کا نشان ہے جو مکان کی طرف دوڑ رہا تھا لیکن یہ صرف پنجے کا نشان ہے اور اس سے کچھ زیادہ معلوم نہیں ہو پائے گا۔"

"اس سے صرف یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ہوسکتا ہے گزشتہ شب باہر کا کوئی آدمی اندر کودا ہو لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ الارم بند کیے بغیر باڑ کے اوپر سے کوئی اندر نہیں آسکتا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ مالی کے پاؤں کا نشان ہے لیکن وہ اس سے انکار کر رہا ہے۔"

چند لمحوں تک بائن کچھ سوچتا رہا۔ اس دوران وہ بار بار اپنی ناک کو انگوٹھے سے مسلتا رہا پھر جیسے اسے کچھ خیال آگیا۔ اس نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے لاج کی طرف دیکھا جہاں ہومز گن اینڈ آرمز ورکس کا پریذیڈنٹ لافورڈ ہومز اپنی اسٹڈی میں مردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں گولی لگی تھی۔

"میرے ساتھ آؤ۔" اس نے کہا۔ "تم لاش دیکھنا چاہو گے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کی موت نصف شب کے قریب ہوئی۔ گزشتہ شب اس کے پاس مالی، اس کی بیوی اور بٹلر ریمنڈ کے سوا کوئی اور نہ تھا۔"

"کیا ان میں سے کوئی ایک اسے قتل نہیں کرسکتا؟"

"مالی اور اس کی بیوی ساڑھے نو بجے سونے کے لیے چلے گئے تھے۔ دونوں نے اپنے بیان میں یہی بات کہی ہے جس سے ان کی جائے وقوعہ سے غیر موجودگی ثابت ہوجاتی ہے اور مجھے ان کی بات پر یقین ہے کیونکہ یہاں انہیں کافی آسانی ہے اور ان کے پاس قتل کرنے کا کوئی محرک نہیں تھا۔ ریمنڈ پرانا وفادار ہے اور ہومز کے پاس پندرہ سال سے ملازمت کر رہا ہے۔ اسے ہوشیار و محتاط ہونے کی وجہ سے بہت اچھی تنخواہ ملتی ہے۔ اس لیے اس پر بھی شک نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہوسکتا ہے کہ کوئی پہلے سے آکر یہاں چھپ گیا ہو؟"

"ایسی صورت میں وہ یہاں سے واپس نہیں جاسکتا۔ یہ باڑ آنے والوں کی طرح جانے والوں کا بھی راستہ روکتی ہے لہٰذا یہ ناممکنات میں سے ہے۔ بہرحال ہومز گزشتہ روز غیر متوقع طور پر یہاں آیا۔ اس کے ساتھ ریمنڈ بھی تھا۔ واپسی میں وہ گلین ریسٹ نامی سینی ٹوریم میں بھی رکا جہاں اس کا بھتیجا جیک زیرِ علاج ہے۔"

"میں جیک کو جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم اسے جانتے ہو؟" بائن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، وہ کیسے؟"

"ہم کالج کے ہاسٹل میں ایک سال تک ساتھ رہے تھے۔ میں گریجویشن کر رہا تھا اور اس سے عمر میں بڑا ہونے کے باوجود ہمارے تعلقات بہت اچھے تھے۔ وہ ایک طویل قامت اور ذہین لڑکا تھا اور اچھا مقرر ہونے کے ساتھ باسکٹ بال بھی کھیلتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی اچھی جگہ پر جائے گا۔"

"کالج کے بعد اس کے بارے میں کچھ سنا؟"

"ہاں، خبریں ملتی رہتی تھیں۔ اس کے باپ کی موت یہیں ہل ٹاپ میں ہوئی پھر جنگ میں اس کا زخمی ہونا، ذہنی توازن بگڑ جانا، اس کی واپسی وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔"

"بہر حال لافورڈ ہومز وہاں صرف جیک کی خیریت معلوم کرنے کے لیے رکا تھا۔ وہ یہاں شام چھ بجے پہنچا اور اس کے بعد معمول کے مطابق باڑ میں برقی رو چھوڑ دی گئی۔"

"کیا وہ کسی سے خوف زدہ تھا؟"

"نہیں، البتہ اس کے دشمن ضرور ہوں گے جو اسے قتل کر سکتے ہیں۔ مثلاً سابق ملازمین یا ایسے کاروباری لوگ جن سے اس نے بے ایمانی کی ہو یا کسی محبوبہ کا بھائی وغیرہ وغیرہ لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے کہ کوئی اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ یہ سارے انتظامات اس نے اپنے تحفظ کے لیے کر رکھے تھے۔ وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد مطالعہ کی غرض سے اسٹڈی میں چلا گیا۔ ریمنڈ نے اسے گیارہ بجے تک اسٹڈی میں دیکھا۔ پھر اگلے ایک گھنٹے کے دوران کسی وقت اس کی موت واقع ہو گئی لیکن کسی نے بھی گولی چلنے کی آواز یا اس کی چیخ نہیں سنی۔ گھر کے دروازے مقفل نہیں تھے کیونکہ اسے برقی باڑ پر بھروسا تھا۔"

ہم ایک کھلے ہوئے دروازے کے ذریعے ہال میں داخل ہوئے اور وہاں سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹے کمرے میں گئے جس کی کھڑکی سے وادی کا دلکش نظارہ کیا جا سکتا تھا لیکن کمرے کے اندر کا منظر کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ دروازے کے بالمقابل لیمپ کے برابر میں ایک کرسی پر وہ فربہ اندام شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر بے ڈھنگے پن سے ایک جانب لڑھک گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور سیدھے گال پر زخم کا نشان نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی بائن نے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے دونوں بازو کرسی سے لٹک گئے اور دونوں ہاتھوں سے ایک ایک اعشاریہ بتیس کے آٹومیٹک ریوالور قالین پر گر پڑے۔

"ریمنڈ نے اسے اسی حالت میں صبح آٹھ بجے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی کمرے کی لائٹ روشن تھی۔" بائن نے کہا۔ "یہ تو بالکل خودکشی کا منظر ہے۔"

"دو ریوالور کے ساتھ۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "اس سے پہلے دو ریوالور والے قاتلوں کے بارے میں تو سنا تھا لیکن دو ریوالوروں سے خودکشی...... یہ میں پہلی بار سن رہا ہوں۔"

"بائیں ہاتھ والے ریوالور سے فائر نہیں ہوا۔ اس کی نال میں ایک ناقص گولی پھنس گئی تھی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس نے کوشش کی تھی لیکن گولی نہیں چلی لہٰذا اس نے دوسرا ریوالور استعمال کیا یا پھر کوئی اور بات ہے۔ یہ خودکشی ہے یا نہیں؟"

"نہیں۔" وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ یہ خودکشی ہے۔ دو ریوالور یہاں پائے گئے ہیں اور پیروں کا نشان بھی ملا ہے۔ اسی لیے مجھے یہ خودکشی نہیں لگتی۔"

"لیکن تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

"صرف پیر کا نشان اور تم اسے ہی ثبوت کہہ سکتے ہو۔"

اس نے دروازے کے برابر میں دیوار پر لگے ہوئے لکڑی کے تختے کی جانب اشارہ کیا جہاں دروازے کی چوکھٹ سے چند انچ کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گڑھا نظر آ رہا تھا۔ اس کے بالکل نیچے فرش پر بھی ایسا ہی ایک اور گڑھا تھا جو قدرے بڑا اور کم گہرا تھا۔

"بٹلر کا کہنا ہے کہ اس نے یہ گڑھے گزشتہ روز نہیں دیکھے تھے۔"

"اس سے کیا مطلب نکلتا ہے؟"

"تمہارا اندازہ بھی وہی ہے جو میرا ہے۔" بائن نے مرے ہوئے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اپنے بھائی اور کمپنی کے بانی ہیریسن ہومز سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی بڑی سی تصویر مرے ہوئے شخص کی لاش کے بالکل اوپر دیوار پر آویزاں تھی۔ وہ سفید بالوں والا طویل قامت اور دیکھنے میں ایمان دار شخص لگ رہا تھا۔

"اسے خودکشی ہی سمجھا جائے گا۔" بائن نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "جس طرح اس کے بھائی کی موت کو

حادثہ قرار دے دیا گیا تھا۔"

"ہیریسن۔" میں چلاتے ہوئے بولا۔ "جیک کا باپ! وہ یہاں جنگ کے دنوں میں ایک چٹان سے گر کر مر گیا تھا۔ کیا تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ اسے بھی قتل کیا گیا تھا؟"

"میں تمہیں کچھ بتانے کی کوشش نہیں کر رہا لیکن جنگ کے زمانے میں ناقص ہتھیاروں کی بڑی کھیپ میدانِ جنگ میں بھیجی گئی جو ہومز کی فیکٹری میں تیار کیے گئے تھے۔ ہیریسن اپنے بھائی لافورڈ، پروڈکشن چیف اور چند دوسرے منیجرز کو لے کر تحقیقات کی غرض سے یہاں آیا اور اسی دوران وہ چٹان سے گر کر ہلاک ہو گیا جب وہ اپنے بھائی کے ہمراہ وہاں سے گزر رہا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ لافورڈ ناقص اسلحہ کی سپلائی کا ذمے دار تھا اور اسی نے اپنے بھائی کو مار دیا تاکہ حقائق سامنے نہ آسکیں۔"

"کوئی بھی اسے ثابت نہ کر سکا اور نہ ہی کسی کو ناقص اسلحے کی سپلائی کا ذمے دار ٹھہرایا گیا اور کچھ ہی دنوں میں یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا لیکن بھائی کے مرنے کے بعد لافورڈ نے کمپنی کا انتظام سنبھال لیا۔ جیک ان دنوں اٹلی کے ایک اسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ اس کے سر میں شدید چوٹ آئی تھی۔ وہ فوج میں خدمات انجام دینے سے مستثنیٰ ہو سکتا تھا لیکن اس نے اپنا نام لکھوا لیا۔"

میں نے سر ہلا دیا۔ "جیک کے بارے میں یہ تمام تفصیلات اخباروں میں شائع ہو چکی تھیں۔" "تم نے اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا؟" میں نے پوچھا۔

اولیور بائن میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے مجھے ماضی میں بھی کئی جرائم پر مبنی کہانیاں دی تھیں۔ جنہیں لکھ کر میں نے کافی شہرت کمائی۔ اس نے کہا۔ "میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ جیک کس طرح پاگل ہوا۔ کیا تمہیں کبھی اس پر حیرت نہیں ہوئی؟"

"بالکل ہوئی تھی اور میں اس بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا لیکن نہ کر سکا۔"

"یہ اس کے چچا کی غلطی تھی۔" اس نے مردہ شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "باپ کی موت کے ایک سال بعد جب جیک فوج سے واپس آیا تو لافورڈ کمپنی کا انتظام سنبھالے ہوئے تھا۔ جیک نے کمپنی واپس لینے کی کوشش کی لیکن اس چالاک شخص نے بڑی ہوشیاری سے ضابطہ کی کارروائی کر کے خود کو کمپنی کا مستقل صدر بنا لیا تھا۔ وہ اپنے زخم چاٹتا رہ گیا اور اس کے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ اسے شبہ ہونے لگا کہ چچا نے اس کے باپ کو مارا ہے۔ اس کو پورا یقین تھا کہ ناقص اسلحے کی سپلائی کا ذمے دار بھی لافورڈ ہی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ چچا اس کی کمپنی پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور جیک ان میں سے کچھ بھی ثابت نہ کر سکا۔ اس کے دماغ کا بوجھ بڑھتا گیا اور وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ چنانچہ اسے پاگل خانے میں داخل کر دیا گیا۔"

"اس کے دماغی خلل کی نوعیت کیا ہے؟"

"وہ اپنے آپ کو کوئی اور شخصیت سمجھنے لگا ہے۔"

"مثلاً کون؟"

"وہ اپنے آپ کو شرلاک ہومز سمجھنے لگا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کے جسم میں شرلاک ہومز کی روح ہے۔"

"لیکن یہ......" میں کہنے والا تھا کہ یہ ناممکن ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نپولین، جولیس سیزر یا چنگیز خان ہیں۔

"ڈاکٹروں کے مطابق یہ بالکل فطری بات ہے۔" بائن نے کہا۔ "اسے لڑکپن سے ہی سراغ رسانی کا شوق تھا۔ اس کا پورا نام جان شیرون ہومز ہے لیکن لڑکے اسے شرلاک کہا کرتے تھے اور اسے بھی یہ نام پسند تھا۔ اس نے شیخی بگھاری اور کہنا شروع کر دیا کہ شرلاک ہومز اس کا رشتے دار تھا۔ اس نے اپنے پسندیدہ سراغ رساں کی تمام کہانیاں پڑھیں۔ ان پر ڈرامے بنائے اور ان میں اداکاری کی۔ بہرحال یہ ایک کھیل تھا جسے اس نے بہت زیادہ بڑھا لیا لیکن جب وہ جنگ سے واپس آیا تو زخم خوردہ اور تھکا ہوا تھا۔ چچا سے ملنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو بے یار و مددگار محسوس کیا چنانچہ اس کے دماغ نے پلٹا کھایا اور وہ ذہنی طور پر اپنے لڑکپن کے دور میں واپس چلا گیا اور جان شیرون ہومز کے بجائے شرلاک ہومز بن گیا۔"

"اوہ میرے خدا!"

"میں سوچ رہا ہوں کہ تم سے پھر میں اس کو کس نام سے مخاطب کر کے فون کرو گے؟"

"اسے فون کروں گا مگر کیوں؟"

بائن نے ایک بار پھر اس موٹے شخص کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں رک کر ہم مزید کچھ نہیں کر سکتے لیکن ہم اگر جیک کو فون کریں تو ظاہر ہوگا کہ چچا اس کا علاج کر رہا ہے۔"

"لیکن چچا تو مر چکا ہے۔ وہ جیک کا علاج کیسے کر سکتا

ہے؟''

''مرے ہوئے چچا کی طرف سے۔'' بائن نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

گلین ریسٹ پچاس ایکڑ پر محیط تھا اور یہ ہل ٹاپ کے جنوب میں چالیس میل کے فاصلے پر برک شائرز میں واقع تھا۔ وسط میں ایک بڑی عمارت تھی جو غالباً سمر ریزورٹ ہوگی اور اس کے اطراف میں کئی کاٹیج بنے ہوئے تھے۔ نسبتاً کم امیر لوگ مرکزی عمارت میں قیام کرتے جبکہ بہت زیادہ امیر اور غیر متشدد لوگوں کو کاٹیج دیے جاتے تھے۔

زیادہ تر مکینوں کو دن کے اوقات میں خدمت گاروں کے ہمراہ میدان میں آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت تھی۔ ان کے چاروں طرف اینٹوں سے بنی ہوئی ایک اونچی دیوار تھی جہاں دن رات محافظوں کا پہرا ہوتا تھا۔ ہم وہاں بائن کی کار کے ذریعے سہ پہر میں پہنچے۔ بائن فوراً ہی مرکزی دفتر میں چلا گیا۔ اس کی واپسی بیس منٹ بعد ہوئی۔ پھر ہم گاڑی چلاتے ہوئے دو سو گز کے فاصلے پر واقع ایک انگریزی طرز کے کاٹیج میں پہنچے جو درختوں سے گھرا ہوا تھا۔

''یہ وہ جگہ ہے جہاں انہوں نے جیک کو رکھا ہوا ہے۔'' بائن نے وہاں رکتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایک سال سے کہیں نہیں گیا اور اس نے اپنے چچا کو بھی یہاں داخل ہونے کے بعد کبھی نہیں دیکھا۔ وہ اس کا حال پوچھنے کے لیے کبھی کبھار یہاں آتا ہے لیکن جیک اپنے چچا کی شکل دیکھتے ہی بے قابو ہو جاتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو کبھی ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔''

''کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ تمہارے دماغ میں اس کے علاج کا احمقانہ خیال کیسے آیا؟''

''یہ پاگل پن نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے اس کی اجازت دے دی ہے۔ جیسے ہی اسے اپنے چچا کی موت کا علم ہوگا اور وہ جان جائے گا کہ اب اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ وہ نارمل زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔''

''پھر انتظار کس بات کا ہے۔ تم اسے وہ اخبار کیوں نہیں دکھا دیتے جس میں اس کے چچا کی موت کی خبر شائع ہوئی ہے۔''

''یہ مناسب نہیں ہوگا۔ غیر متوازن ذہن اتنی جلدی حقیقت کو قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا میں کوئی دوسرا طریقہ آزمانا چاہتا ہوں۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''میں نے اسے اسکاٹ لینڈ یارڈ کا انسپکٹر بائن بن کر فون کیا تھا جو ایک کیس کے سلسلے میں شرلاک ہومز کی مدد لینے آیا ہے۔ یہ کیس لافورڈ ہومز کے قتل کا ہے جو شرلاک ہومز کا دور پرے کا رشتے دار ہے۔''

''یہ کارآمد ہو سکتا ہے۔'' میں نے مطمئن ہونے کے انداز میں کہا۔ ''اگر وہ اس حد تک پاگل ہے کہ تمہاری کہانی پر یقین کرے۔''

''وہ اس پر یقین کرے گا۔ میں اس سے پہلے بھی کچھ معاملات میں اس سے بات کر چکا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ مجھے کوئی مشورہ نہ دے سکا لیکن اس کا ذہن ضرور اس جانب مائل ہو گیا تھا۔ دراصل میں نے ایک سال پہلے ہی اس میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی کیونکہ اس کے یہاں آنے میں تھوڑا بہت میں بھی ذمے دار ہوں۔ میں اس روز اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ گشت پر تھا جب ایک کار انتہائی تیز رفتار سے وہاں سے گزری۔ اسے جیک چلا رہا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ شرلاک ہومز ہے اور وہ اپنے مضمون کے لیے مختلف گاڑیوں کی رفتار چیک کر رہا ہے۔ یہ ان گاڑیوں کے بارے میں ہے جو خطرناک مجرموں کا تعاقب کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا تو وہ گاڑی سے باہر آ کر مجھ سے لپٹ گیا جیسے کوئی اپنے بچھڑے ہوئے بھائی سے ملتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ شرلاک ہومز کی کہانیوں میں بائن نام کا بھی کوئی کردار ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ دا ایڈونچر آف دشیریا لاج میں انسپکٹر بائن نامی ایک ہوشیار آفیسر تھا۔''

''میں جانتا ہوں۔ میں نے وہ کہانی پڑھ رکھی ہے۔ بہرحال ہم جیک کو گھر لے گئے اور ایک مہینے بعد وہ یہاں آ گیا۔ وہ کبھی کبھی جنون کی کیفیت سے باہر آتا ہے لیکن اگر اسے ہلکا سا اشارہ بھی مل گیا کہ وہ اصلی شرلاک ہومز نہیں ہے تو اس کے ذہن پر بہت برا اثر پڑے گا۔ اس لیے ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''میں محتاط رہوں گا لیکن تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''تم ڈاکٹر واٹسن کا رول کرو گے۔''

''ڈاکٹر واٹسن؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں تم سنہرے بالوں والے فربہ اندام شخص ہو اور دیکھنے میں انگریز لگتے ہو۔ وہ تمہیں اپنا پرانا دوست سمجھے گا اور تم اس پر یہی ظاہر کرو گے کہ لندن سے جانے کے بعد

اسے کبھی نہیں دیکھا۔ تم نے عقبی صحن میں شہد کی مکھیوں کے چھتے دیکھے ہیں ناں؟“

”ہاں، اوہ میرے خدا۔ تمہارا مطلب ہے کہ......“

”ہاں، وہ ریٹائر ہو چکا ہے اور اس کا یہ کاٹیج سیسکس میں ہے جہاں وہ شہد کی مکھیاں پال رہا ہے۔ اس کی نرس اور ہاؤس کیپر کا نام مسز ہڈسن ہے جو اس کی دیکھ بھال کے لیے لندن سے آئی ہے۔ اب ہم اندر جا رہے ہیں۔ تم فوراً ڈاکٹر واٹسن بن جاؤ۔“

بائن کے دستک دینے پر مسز ہڈسن نے دروازہ کھولا اور ہمیں دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رونق آگئی۔

”اندر آجاؤ انسپکٹر بائن۔“ پھر وہ چلاتے ہوئے بولی۔ ”ڈاکٹر واٹسن، مسٹر ہومز فون آنے کے بعد سے ہی تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ تمہیں اسٹڈی میں بٹھایا جائے۔“

یہ کہہ کر وہ ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی اور بولی۔ ”میں مسٹر ہومز کو بلاتی ہوں۔ وہ عقبی صحن میں ہیں۔“

اس کے جانے کے بعد مجھے کمرے میں بکھری ہوئی کتابوں اور کاغذات کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ ہومز ہمیشہ سے ہی مطالعہ کا شوقین تھا اور لگتا تھا کہ اس کی یہ عادت یہاں بھی جاری ہے۔ میں نے جو کتابیں دیکھیں، وہ میں سے بھی زیادہ موضوعات پر تھیں۔ تمام اخبارات اور رسالے انگریزی میں تھے۔ میز پر دو کتابیں کھلی رکھی تھیں جیسے انہیں حال ہی میں پڑھا گیا ہو۔ بقیہ کتابوں کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ہال میں قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند لمحوں بعد ہی ہومز کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے پرانی سی پتلون پہن رکھی تھی۔ ہاتھوں پر دستانے اور سر پر ہیلمٹ تھا۔ اس نے یہ دونوں چیزیں اتار کر کمرے کے وسط میں رکھ دیں۔

”واٹسن!“ وہ میرے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ کر بولا۔ ”اس گرم جوشی کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن مجھ سے ملنے بہت کم لوگ آتے ہیں جس کی وجہ سے مجھے اپنے جذبات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔“

اس نے اپنے آپ کو کرسی پر گرایا اور برابر میں رکھی ہوئی کیبنٹ کا دروازہ کھولنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ پہلے کے مقابلے میں دبلا اور خستہ حال تھا۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ اس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

”واٹسن...... انسپکٹر بائن۔“ اس نے کیبنٹ سے ایک بوتل اور تین گلاس نکالتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں تازہ دم ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ لمبا سفر طے کر کے آئے ہو اور یقیناً تم نے راستے میں بھی اس کیس کے بارے میں باتیں کی ہوں گی۔“

”کیس؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیسا کیس ہومز؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن تمہاری ایک جیب میں کاغذ اور دوسری جیب میں چار پنسلیں دیکھ کر تو یہی لگتا ہے کہ تم نوٹس لینے کی تیاری کر کے آئے ہو اور اگر کوئی کیس نہیں ہے تو پھر یہ تیاری کیسی؟“

”ہاں بالکل۔“ میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ بائن مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ ہومز نے تینوں گلاسوں میں مشروب ڈالا اور ایک ایک گلاس ہمیں پکڑا دیا پھر وہ بائن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں گارنٹی سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کیس حیران کن اور اہم ہے لیکن میں اسے نہیں لے سکتا۔ میں ریٹائر ہو چکا ہوں۔“

”لیکن تمہیں تو ابھی یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم کس کیس کے سلسلے میں تم سے مشورہ کرنے آئے ہیں؟“ بائن نے احتجاج کرنے کے انداز میں کہا۔

”یہ یقیناً شاندار ہوگا ورنہ واٹسن اس میں دلچسپی نہ لیتا۔“ ہومز نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”حیران کن بھی۔ ورنہ تم یہاں موجود نہ ہوتے اور اہم اس لیے کہ تم مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے واٹسن کو ساتھ لے کر آئے ہو لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے اور ماڈرن کرمنالوجی ایک سائنس بن گئی ہے۔ میں اپنے دن گزار چکا ہوں اور اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

”مجھے ڈر تھا کہ تم ایسا ہی محسوس کرو گے مسٹر ہومز۔“ بائن نے کہا۔ ”لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ امید بھی کرتا ہوں کہ تم میری مدد کرو گے کیونکہ اس کا تعلق تمہارے ایک دور پرے کے رشتے دار سے ہے۔“

”بالکل۔“ اس نے اپنی پلکیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میرا خاندان بہت محدود ہے۔ تم کس کی بات کر رہے ہو اور وہ فرد ظالم ہے یا مظلوم؟“

”میں لافورڈ ہومز کی بات کر رہا ہوں۔“ بائن نے کہا۔ ”اسے قتل کر دیا گیا ہے۔“

”قتل کر دیا؟“ ہومز کا چہرہ جگمگا اٹھا اور اس کی آنکھوں کی وحشت ختم ہوگئی۔ اس نے کہا۔ ”ہاں، مجھے یقین

ہے کہ لافورڈ ہومز سے کوئی رشتے داری ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ اس سے کیا رشتہ ہے۔ اس کا قتل کب ہوا؟''

''گزشتہ شب، اپنے گھر میں جو یہاں سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔''

''مجھے اس کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔'' ہومز نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

بائن نے محتاط انداز میں لافورڈ کی موت کے بارے میں تفصیل بیان کرنا شروع کی۔ ہومز خاموشی سے سنتا رہا۔ بائن نے یہ بات زور دے کر کہی کہ اس آدھے پاؤں کے نشان اور لائبریری کی لکڑی میں دو گڑھوں کے سوا کوئی سراغ نہیں ملا۔ جب اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے لاش کی پوزیشن بیان کی اور بتایا کہ اس کے دائیں ہاتھ میں وہ ریوالور تھا جس سے فائر ہوا جبکہ بائیں ہاتھ کے ریوالور کی نال میں گولی پھنس گئی تھی تو ہومز سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''حیرت انگیز......!'' اس نے کہا۔ ''اس میں کئی امکانات ہو سکتے ہیں۔ تم اس پہیلی کو کس طرح دیکھتے ہو واٹسن؟''

''مجھے ان حقائق میں ایسا کچھ نظر نہیں آتا جس کی بنیاد پر ہم اسے قتل قرار دے سکیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''جبکہ یہ خودکشی کا کیس زیادہ لگ رہا ہے پھر ہم یہ کیوں فرض نہیں کر لیتے کہ یہ خودکشی تھی۔''

''تم دوسرے ریوالور کے بارے میں کیا کہو گے جو جام ہو گیا تھا؟'' ہومز نے مجھے دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ممکن ہے کہ لافورڈ ہومز اس کا معائنہ کر رہا ہو اور یہ اس ناقص اسلحہ میں سے ہو جو فیکٹری سے سپلائی کیا گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اسے ندامت ہو رہی ہو گی کہ ان ناقص گولیوں کی وجہ سے کئی بہادر سپاہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے لہٰذا اس نے خودکشی کر لی۔''

''شاباش۔'' ہومز تالی بجاتے ہوئے بولا۔ ''تم جیسا شخص ہی اس طرح کا نظریہ تخلیق کر سکتا ہے لیکن یہ عملی سے زیادہ کسی کہانی کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ بائن تم بتاؤ، پولیس کس نتیجے پر پہنچی؟''

''پولیس کا خیال ہے کہ لافورڈ نے خودکشی کے لیے بیک وقت دو ریوالور استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان میں سے ایک فائر ہوا اور دوسرا جام ہو گیا۔ یہ دونوں ریوالور جس حالت میں ملے۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔''

''بہت خوب۔'' ہومز بولا۔ ''لیکن تمہیں اس پر یقین نہیں ہے؟''

''نہیں، کیونکہ لافورڈ ہومز ایسا شخص نہیں تھا جو اپنے آپ کو مار سکے۔ اگر تم میری تھیوری پوچھتے ہو تو مجھے یہ قتل ایک انتقامی کارروائی لگتا ہے۔ قاتل کوئی سابق سپاہی ہو سکتا ہے جس کی زندگی ناقص اسلحہ کی وجہ سے برباد ہو گئی ہو یا پھر اس کا کوئی عزیز، رشتے دار یا دوست اس کی وجہ سے مارا گیا ہو۔ لہٰذا وہ اپنے ساتھ بے کار ریوالور لے کر آیا اور لافورڈ کو قتل کرنے کے بعد اسے خودکشی کا رنگ دے دیا۔ ناکارہ ریوالور اس نے یہ ظاہر کرنے کے لیے وہاں پھینک دیا کہ اس نے انصاف کا تقاضا پورا کر دیا۔''

''یہ ایک امکان ہو سکتا ہے۔'' ہومز نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا ان میں سے کوئی ریوالور سرکاری تھا؟''

''نہیں۔'' بائن نے کہا۔ ''جس ریوالور سے لافورڈ مارا گیا۔ وہ اس کا اپنا تھا اور عام طور پر اس کی میز کی دراز میں ہی ہوتا تھا۔ دوسرے ریوالور کی شناخت نہیں ہو سکی۔ اس پر کوئی سیریل نمبر نہیں ہے جس کا مطلب ہے کہ نمبر لگنے سے پہلے ہی اسے فیکٹری سے نکال لیا گیا تھا۔ لافورڈ بہ آسانی یہ کام کر سکتا تھا لیکن اس طرح یہ ایک بار پھر خودکشی کا کیس لگتا ہے لیکن مجھے اس پر یقین نہیں۔''

''نہ ہی میں اس پر یقین کرتا ہوں۔ ہومز خاندان جارحیت پسند ہے۔ وہ خودکشی نہیں کر سکتے۔ بہرحال یہ ایک

نئی معلومات

عدالت میں فیصلے کا دن آ گیا اور جج صاحب ملزم کے خلاف فیصلہ دینے والے تھے کہ ملزم کا وکیل جج کے کمرے میں داخل ہوا اور کہا۔ ''عالی جناب آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کیس کو پھر سے کھولیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ کچھ نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں جس سے میرے کلائنٹ کے بچاؤ میں مدد ملے گی۔''

جج نے پوچھا۔ ''تمہارے پاس کیا نئی معلومات ہیں اس کیس کے سلسلے میں؟''

''میرے کلائنٹ کے پاس پچاس لاکھ روپے اور ہیں مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔'' وکیل نے جواب دیا۔

پشاور سے کاشان عباسی کا جواب

پیچیدہ معما ہے اور مجھے بھی اس میں دلچسپی محسوس ہورہی ہے۔ لیکن میں ریٹائر ہوچکا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم میری مدد کے بغیر بھی کامیاب ہوجاؤ گے۔''

''کاش مجھے بھی اتنا ہی یقین ہوتا۔'' بائن نے کہا۔ ''مشکل یہ ہے کہ میرے پاس صرف ایک پاؤں کا نشان اور لکڑی کے پینل پر دو گڑھے ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ یہ سراغ کافی نہیں۔''

''میں اس سے اتفاق کرتا ہوں لیکن اس نشان کا بغور معائنہ کیا جائے تو بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔''

بائن کا چہرہ روشن ہوگیا اور وہ بولا۔ ''شاید تم اسے دیکھنا چاہو۔ اس کے لیے جائے وقوعہ پر جانے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس اس نشان کی بہت اچھی تصویر ہے۔''

ہومز کچھ ہچکچایا تو میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً اس تصویر کو ایک نظر دیکھ لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ فرض کرلیا کہ تم اس سے کچھ معلوم نہیں کرسکتے لیکن اسے دیکھنے میں کیا مضائقہ ہے؟''

''کیوں نہیں واٹسن؟ وہ متفق ہوتے ہوئے بولا۔ ہم اس تصویر کا معائنہ کرلیتے ہیں اور اگر تمہارے پاس لکڑی کی دیوار پر پڑے ہوئے گڑھوں کی تصویریں ہیں تو وہ بھی دیکھ لیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔''

بائن نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے کچھ تصویریں نکالتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس وہاں کی تمام تصویریں ہیں۔ میدان، گھر، باڑ، لاش کی پوزیشن......''

''اس کی ضرورت نہیں۔ تمہارا کہنا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی سراغ نہیں ملا اور مجھے تمہارے بیان پر یقین ہے۔''

بائن نے ان میں سے کچھ تصویریں منتخب کیں اور انہیں ہومز کے حوالے کردیا۔ ان میں تین تصویریں پیر کے نشان کی تھیں۔ ایک کلوز اپ اور بقیہ دو میں اس نشان کے اردگرد کی زمین بھی نظر آرہی تھی۔ دوسری تین تصویریں لکڑی پر پڑے ہوئے گڑھوں کی تھیں۔

ہومز نے ایک محدب عدسہ کی مدد سے ان تصویروں کو دیکھا اور مجھے پکڑانے کے بعد کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تصویریں بڑی معنی خیز ہیں۔ واقعی فوٹوگرافی کا فن بہت ترقی کرگیا ہے۔''

''بہت ممکن ہے۔'' میں نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے تو ان سے کچھ اندازہ نہیں ہورہا۔''

سمجھنے کی کوشش کرو واٹسن۔'' وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔ ''بائن کا کہنا ہے کہ قتل سے پہلے یہ نشانات موجود نہیں تھے لہٰذا عقل یہی کہتی ہے کہ وقوعہ کے دوران یہ وجود میں آئے۔''

''ٹھیک ہے، میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔''

''لکڑی پر دو گڑھے۔ ایک دیوار اور دوسرا عین اس کے نیچے فرش پر۔ ان سے تمہیں کچھ معلوم نہیں ہورہا۔''

''لگتا ہے کہ کوئی چیز دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گری ہے۔''

''شاباش واٹسن، بظاہر یہ کوئی بھاری چیز لگتی ہے جو دیوار پر پھینکی گئی۔ اتفاقیہ طور پر ٹکرانے سے یہ گڑھے نہ پڑتے۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ وہ کیا چیز تھی۔ کس نے پھینکی اور کون یہ پھینک سکتا ہے؟''

''لافورڈ ہومز۔ اس کی کرسی کا رخ دروازے کی جانب تھا۔''

''بالکل صحیح۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کن حالات میں اس نے یہ بھاری شے اس قیمتی لکڑی کے پینل پر دے ماری۔ یقیناً وہاں کوئی آیا ہوگا۔ لافورڈ ہومز بے خبر نہیں تھا۔ اس نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔''

''لیکن اس نے کیا چیز پھینکی؟'' میں نے پوچھا۔ ''اگر یہ گڑھوں کے نشان تمہیں اتنا کچھ بتارہے ہیں تو تم اس بھاری چیز کے بارے میں بھی جان گئے ہوگے۔''

''اس نے وہ ریوالور ہی پھینکا ہوگا جس سے فائر نہ ہوسکا۔ تمہارا کیا خیال ہے بائن؟''

''بالکل درست مسٹر ہومز۔'' بائن تعریفی انداز میں بولا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب قاتل کمرے میں داخل ہوا تو لافورڈ ہومز کے ہاتھ میں وہ ریوالور تھا۔'' میں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

ہومز نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''ضروری نہیں۔''

''میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔'' اور اگر لافورڈ ہومز کے ہاتھ میں ریوالور تھا تو اس کا مطلب ہے کہ اسے قاتل کی آمد کا علم تھا لیکن ایسی صورت میں اپنا دوسرا ریوالور کیوں نہیں نکالا جو اس کی میز کی دراز میں رکھا ہوتا تھا۔ اس نے بٹلر کو کیوں نہیں بلایا۔ کوئی چیخ نہیں ماری۔ ریوالور سے گولی نہیں چل سکی پھر اسے کس طرح قتل کیا گیا کہ وہ خودکشی نظر آئے۔ اس کے علاوہ کسی جدوجہد کے آثار بھی نظر نہیں

آئے؟"

"آرام سے واٹسن آرام سے۔" ہومز نے ایک ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم معاملے کو مزید پیچیدہ بنا رہے ہو۔ بہرحال میں ایک مفروضہ پیش کرسکتا ہوں جس میں ان تمام سوالوں کا جواب مل جائے گا۔"

"اور وہ مفروضہ کیا ہے؟"

ہومز چند لمحے خاموش رہا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں واٹسن! دوسرے ثبوتوں کی عدم موجودگی میں یہ محض قیاس آرائی ہوگی اور تم جانتے ہو کہ میں قیاس آرائی کے بارے میں کیا محسوس کرتا ہوں۔ اب ہم پاؤں کے نشان کی بات کرتے ہیں جس میں بائن نے غیر معمولی دلچسپی لی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے پاؤں کے نشان کی تصویر اٹھائی۔ چند منٹ تک اسے محدب عدسے سے دیکھتا رہا پھر واپس تصویر میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ زیادہ معلوماتی ہے۔ تم نے اس نشان کی اہمیت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ گو کہ اس سے ہمیں مجرم کا نام، اس کے کپڑوں کا رنگ یا قومیت کا پتا نہیں چلتا لیکن اس کی جانچ تصویر سامنے آجاتی ہے اور اس کے اندر آنے اور باہر جانے کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔"

"کیا؟" بائن سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی نظریں ہومز پر جما دیں۔ "کیا تم اس تصویر کے ذریعے یہ سب معلوم کرسکتے ہو؟"

"یہ آدھے پیر کی تصویر ہے اگر پورے پاؤں کا نشان ہوتا تو مزید معلومات مل سکتی تھیں۔" ہومز نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔ "ہم اس تصویر کا منطقی انداز میں جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمیں کیا نتیجہ ملتا ہے۔ اس نشان کو دیکھ کر پہلا مفروضہ یہی بنتا ہے کہ یہ کسی ایسے شخص کے پاؤں کے نشان ہیں جو تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہو؟"

"ہاں۔" بائرن نے جلدی سے کہا۔ "مجھے پورا اتفاق ہے مسٹر ہومز۔"

"لیکن اس نشان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شخص مکان سے دور نہیں جا رہا بلکہ اس کی طرف دوڑ رہا تھا جس کا مطلب ہے کہ وہ ڈر کر نہیں بھاگا اور تم نے یہ بھی کہا کہ کوئی چیخ یا الارم کی آواز بھی نہیں سنائی دی لیکن قتل سے پہلے مکان کی طرف دوڑنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ وہ خفیہ کارروائی کرنا چاہتا تھا چنانچہ وہ تو حملہ کرنے کی غرض سے دوڑ رہا تھا اور نہ ہی وہ بھاگ رہا تھا پھر اس کے تیز رفتاری سے دوڑنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟"

ہم دونوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ایک اور امکان ذہن میں آتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ قوتِ رفتار حاصل کرنے کے لیے دوڑ رہا ہو۔"

"وہ کس لیے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم ایک بار پھر تصویر کو دیکھتے ہیں۔ اس میں درخت کی لٹکی ہوئی شاخوں کا سایہ زمین پر نظر آرہا ہے جس میں بارہ فٹ اونچی ایک شاخ بالکل واضح ہے۔"

"ہاں۔" بائن نے کہا۔ "یہ تقریباً بارہ فٹ ہی ہے۔"

"پھر ہماری تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔" ہومز نے چلاتے ہوئے کہا۔ "کسی شخص کے دوڑنے سے پنجوں کا نشان اتنا گہرا نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ شخص دوڑ نہیں رہا بلکہ کود رہا تھا اور یہ نشان اس وقت بنا جب اس نے بارہ فٹ اونچی شاخ کو پکڑنے کے لیے چھلانگ لگائی۔"

"لیکن اس نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے کہا۔ "یقیناً وہ درخت میں چھپنا نہیں چاہ رہا ہوگا۔"

"بالکل نہیں۔ کیونکہ کوئی الارم نہیں بجا۔ اس لیے اسے چھپنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اس تصویر کو غور سے دیکھنے پر پتا چلتا ہے کہ صنوبر کے درخت کی شاخیں ایک دوسرے درخت کی شاخوں سے باہم مل رہی ہیں جو برقی باڑ کے نزدیک ہے لیکن اس تصویر میں وہ دوسرا درخت نظر نہیں آرہا جس کی شاخیں باڑ کی دوسری جانب بھی پھیلی ہوئی ہوں گی۔ لہٰذا قاتل اس شاخ کے ذریعے دوسرے درخت تک پہنچا اور باڑ کے اوپر سے ہوتا ہوا دوسری جانب کود گیا۔ اس نے کام مکمل ہونے کے بعد واپس جانے کے لیے بھی راستہ اختیار کیا۔"

"تم کامیاب ہوگئے مسٹر ہومز!" بائن چلاتے ہوئے بولا۔ "یہی اس کا صحیح جواب ہے۔"

"لیکن یہ کام تو ٹارزن ہی کرسکتا ہے۔" میں نے اعتراض کیا۔

"پھر ہم فرض کرلیتے ہیں کہ وہ کوئی ٹارزن جیسا شخص ہی ہوگا۔" ہومز نے پورے اعتماد سے کہا۔ "جیسا کہ بائن نے کہا کہ منطق سے ہم بھی نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں۔"

"لیکن تم نے یہ بھی کہا تھا مسٹر ہومز کہ یہ نشان تمہیں اس آدمی کے حلیے اور شخصیت کے بارے میں بھی بتا رہا

ہے۔ کیا تم نے مذاق میں یہ بات کہی تھی؟"

"میں ایسے معاملات میں کبھی مذاق نہیں کیا کرتا۔"
ہومز نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ نشان دو پگڈنڈیوں کے درمیان ہے جو ایک دوسرے سے بارہ فٹ کے فاصلے پر ہیں۔ دوڑنے کے دوران اس کے قدموں کا درمیانی فاصلہ چھ فٹ تھا جو ایک لمبے آدمی کی پہچان ہے اور لمبا شخص ہی بارہ فٹ اونچی شاخ کو پکڑنے کے لیے چھلانگ لگا سکتا ہے۔ اس کا پنجہ بہت چھوٹا ہے یعنی اس کی ہڈیاں چھوٹی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک دبلا شخص ہے۔ ویسے بھی بھاری بھرکم شخص کے لیے یہ کود پھاند ممکن نہیں لہٰذا ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کوئی دبلا اور لمبا شخص ہے۔ بظاہر کوئی ایتھلیٹ ہی لگتا ہے۔"

بائن نے تعریفی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ اس نشان سے کچھ معلوم نہیں ہوسکتا لیکن تم نے مجھے غلط ثابت کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ تم اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے۔"

"تھوڑا بہت اور بتا سکتا ہوں۔" ہومز نے انکساری سے کہا۔ "یہ شخص بہت کم کھاتا ہے اور تیز مشروب نہیں پیتا۔ کبھی کبھی اسے اعصابی کمزوری اور نیند نہ آنے کی شکایت ہوتی ہے۔ شاید یہ شخص برج بھی کھیلتا ہے، ذہین ہونے کے علاوہ محتاط طریقے سے منصوبہ بندی کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی جذباتی اور ناعاقبت اندیش بھی ہے۔ کبھی سوشل ہو جاتا ہے اور کبھی موڈی بن کر اپنا وقت گزارتا ہے۔ بہرحال ان چھوٹے موٹے حقائق کے علاوہ مزید کچھ بتانے سے قاصر ہوں۔"

"تم ایسی باتیں کر کے ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو۔" میں نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے ابھی تک قائل نہیں کر سکے کہ اس نشان سے تم اس شخص کی اندرونی فطرت پڑھ سکتے ہو۔"

ہومز ہنستے ہوئے بولا۔ "میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا لیکن تمہارا اصرار ہے تو بتا دیتا ہوں۔ یہ تو ہم جان چکے ہیں کہ وہ شخص دبلا اور لمبا ہے۔ جن حالات میں یہ جرم ہوا اس سے ہم اس کی ذہانت، منصوبہ بندی کی صلاحیت، جذباتیت اور بے پروائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جہاں تک اس کے مزاج، برج کھیلنے کی صلاحیت، تیز مشروب سے پرہیز اور بے خوابی کا تعلق ہے تو یہ سب میں نے شیلڈن کی ان دو کتابوں کو پڑھ کر حرف بحرف بیان کیا ہے جو میری میز پر رکھی ہوئی ہیں۔ واٹسن تمہیں یہ کتابیں ضرور پڑھنا چاہئیں۔ ان کتابوں میں شیلڈن نے تمام انسانوں کو چند طبعی اقسام میں تقسیم کیا ہے اور ان سب کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں۔ اس تناظر میں ہم اسے اس گروپ میں رکھ سکتے ہیں جو بے خوابی کا مریض ہو۔ تیز مشروب سے پرہیز کرتا ہو، وغیرہ وغیرہ۔"

"اس سے آگے تمہارا کام شروع ہوتا ہے بائن۔ تم اس جرم کی تمام تفصیلات کمپیوٹر میں ڈال دو۔ اس طرح تمہیں مجرم کا بالکل صحیح خاکہ مل جائے گا۔ میں اس نتیجے کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔"

اس کے بعد ہماری ملاقات ختم ہوگئی۔ ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو راستے میں بائن نے کوئی بات نہیں کی۔ البتہ میرے گھر پہنچ کر اس نے دو بوتلیں نکالیں اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ "اس نشان کو دیکھ کر میں بھی کہہ سکتا ہوں۔" اس نے نقل اتارنے کے انداز میں کہا۔ "کہ تمہارا قاتل لمبا، دبلا، ایتھلیٹ، ذہین، جذباتی، بے خوابی کا مریض اور برج کا اچھا کھلاڑی ہے۔"

"جیک نے جو کچھ کہا تم اسے سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہو۔"

"بالکل، میں اسے سنجیدگی سے لے رہا ہوں۔ اس کا ایک ایک لفظ درست ہے۔"

"لیکن جیک کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"تو کیا ہملیٹ پاگل نہیں تھا۔" بائن نے کہا۔ "دونوں واقعات میں خاندانی مشابہت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہملیٹ کے خاندان میں چچا نے اس کے باپ کو قتل کیا اور ہملیٹ اپنے آپ کو پاگل ظاہر کرتا رہا تاکہ وہ اپنے چچا کو قتل کر سکے۔"

"کیا؟" میں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ "لیکن۔۔۔لیکن۔۔۔"

"کیا تم اب بھی نہیں سمجھے۔ جیک نے ہی لافورڈ ہومز کو قتل کیا ہے۔"

بائن نے اپنے لیے ایک اور گلاس بھرا۔ میرے تاثرات دیکھ کر اس کی حس مزاح لوٹ آئی تھی۔ وہ بولا۔ "کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے ہو کہ ہم اس کا علاج کرنے گئے تھے۔ وہ محض ایک ڈراما تھا جس میں تم نے بہت اچھی پرفارمنس دی۔ اگر تمہیں حقیقت معلوم ہوتی تو تم یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ میں دیکھنا چاہ رہا تھا کہ جیک کس حد تک اعتراف کرتا ہے اور اسے بھی یہ بات معلوم تھی۔ چنانچہ اس نے ہر بات کا اعتراف کر لیا اور شرلاک ہومز بن کر بڑی احتیاط کے ساتھ

سب کچھ بتا دیا جسے ایک بے وقوف بھی سمجھ سکتا ہے۔"

"لیکن وہ تو پاگل ہے۔"

"اس نے ہیملیٹ کا ذکر بھی کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ دونوں واقعات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور میرے شیلف سے ایک کتاب نکال کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ "شیکسپیئر نے یہ بات پہلے کہی تھی 'گو کہ یہ پاگل پن ہے لیکن اس میں بھی ایک طریقہ پنہاں ہے۔' میں ہمیشہ اس فقرے پر غور کرتا رہا جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ لڑکپن میں شرلاک ہومز کی ایکٹنگ کیا کرتا تھا تو مجھے اس میں دلچسپی ہوگئی لیکن جب وہ ڈاکٹروں کو بے وقوف بنا سکتا تھا تو میں اس سے کیا سوال کرتا۔ میں نے اس پر نظر رکھی لیکن کوئی وجہ تلاش نہ کرسکا۔"

"لیکن جیک یہ قتل نہیں کرسکتا۔ وہ گزشتہ ایک سال سے گلین ریسٹ میں بند ہے۔"

بائن نے نتھنے سکیڑے اور ایک بڑا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ "گلین ریسٹ میں بھی سب یہی سمجھتے ہیں لیکن جب وہ درختوں کی شاخیں پکڑ کر ہل ٹاپ میں جا سکتا ہے تو اسی طرح گلین ریسٹ سے باہر جانا اور واپس آنا کیا مشکل ہے۔ گزشتہ رات اسے معلوم ہوا کہ اس کا چچا ہل ٹاپ جاتے ہوئے گلین ریسٹ پر رکا تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے کار دیکھ لی ہو۔ رات کے وقت وہ کاٹیج سے نکلا۔ ایک درخت پر چڑھا اور دیوار سے باہر کود گیا پھر ریل کے ذریعے ہل ٹاپ پہنچا اور درختوں کے ذریعے اندر داخل ہوگیا۔ اس نے یہ منصوبہ بندی بہت پہلے کر رکھی تھی۔ اس نے بغیر نمبر کا ایک ریوالور فیکٹری سے چرا کر پہلے سے چھپایا ہوا تھا۔ اس میں وہ گولی ڈالی جو ناقص اسلحہ کے ڈھیر سے نکالی گئی تھی۔"

"لافورڈ اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے چچا پر ریوالور تان لیا اور میز کی دراز کھول کر اس کا اپنا ریوالور بھی قبضے میں لے لیا پھر جو ریوالور وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ وہ لافورڈ کو دیا کہ وہ اس پر گولی چلائے۔"

"اس نے ایسا کیوں کیا؟ اگر گولی چل جاتی۔"

"اس نے چانس لیا تھا۔ اگر گولی چل جاتی تو وہ مر جاتا ورنہ وہ لافورڈ کو مار دیتا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، وہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ واقعی اس گولی میں کوئی ایسا نقص ہے جس کی وجہ سے کئی لوگ مارے گئے لیکن گولی نہیں چلی۔ لافورڈ نے غصے میں وہ ریوالور اس پر پھینکا۔ جیک پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا پھر اس نے لافورڈ کو قتل کیا اور دونوں ریوالور اس کے ہاتھ میں تھما دیے تاکہ یہ خودکشی معلوم ہو۔ اپنا کام ختم کرکے وہ دوسری گاڑی سے واپس آیا اور سورج نکلنے سے پہلے گلین ریسٹ پہنچ گیا۔

"جب ہم وہاں گئے تو تمہیں یہ سب معلوم تھا؟"

"سب نہیں لیکن مجھے یہ اندازہ ضرور تھا کہ درختوں کے ذریعے کوئی شخص گھر میں داخل نہیں ہو سکتا جو پہلے یہ مشق نہ کر چکا ہو اور وہ شخص جیک ہومز ہی ہو سکتا ہے۔ جیسے ہی میری سمجھ میں یہ بات آئی تو دوسری گتھیاں سلجھنا شروع ہو گئیں۔"

"تم اُسے کب گرفتار کرو گے؟"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" بائن نے بے بسی سے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ وہ جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ثابت کر سکتا ہے۔ وہ پاگل خانے میں بند ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ لوگ یہ اعتراف کرلیں گے کہ ان کا ایک مریض پاگل خانے سے فرار ہو کر قتل کر سکتا ہے۔ وہ بائبل پر ہاتھ رکھ کر کہہ دیں گے کہ یہ ممکن نہیں ہے اور فرض کرو کہ میں کچھ ثابت کر سکا تب بھی کیا ہوگا۔ جیک کو تین یا چار ڈاکٹر پاگل قرار دے چکے ہیں۔ کیا وہ اعتراف کرلیں گے کہ انہیں بے وقوف بنایا گیا ہے۔"

اس نے اپنا گلاس ختم کیا۔ ہونٹ صاف کیے اور ہیٹ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "تم نے کئی قتل کی کہانیاں لکھی ہوں گی لیکن شرطیہ کہتا ہوں کہ ایسی کہانی پہلے کبھی نہیں سنی ہو گی۔ جیک نے پہلے ایک فول پروف قتل کیا پھر خود ہی سراغ رساں بن کر اپنے آپ کو مجرم بھی ظاہر کر دیا۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ قتل اس نے کیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ کیوں کیا اور کیسے کیا۔ اس کے باوجود ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں۔ وہ صحت یاب ہو کر ایک دن بڑا آدمی بن جائے گا۔ دیکھو اور انتظار کرو۔"

ایک ماہ بعد میں نے اخبار میں خبر پڑھی۔ "گن کمپنی کا وارث گھر آگیا۔"

"جان ایس ہومز جو جنگ میں سر کی چوٹ لگ جانے کی وجہ سے ذہنی مریضوں کے اسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ گزشتہ روز اپنے گھر واپس آگیا ہے۔ ہومز گن اینڈ آرمز ورکس کے بورڈ آف ڈائریکٹر کی خصوصی میٹنگ میں اُسے کثرتِ رائے سے کمپنی کا صدر بنا دیا گیا ہے۔ یہ جگہ مسٹر ہومز کے چچا لافورڈ ہومز کے انتقال کے بعد خالی تھی۔ مسٹر ہومز فوری طور پر اپنے فرائض سنبھال لیں گے۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

آوارہ گرد

قسط: 31

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشار خان المعروف ککل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا۔ اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ ککل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص رست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہن کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کمیل دادا شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا۔ زہرہ بانو، شفیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور حوالی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پادر کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، بعد میں اس مشن میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پادر کو مصلحتاً ڈراپ کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ پاسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ پاسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ پاسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نوودلتیا سیٹھ نوید سانچے راالاؤ کو وہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ناؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھگوانی شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ پاسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ پاسکل ہولارڈ سی آئی اے میں ٹائیگر فیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا رست راست سے جی کو ہارا شہزی کو ٹائیگر فیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام جھنگری سے ہوتی ہے۔ جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولوش ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے اسے ہائی جیک کر کے خود اس کا سربراہ بن جاتا ہے۔ ہشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے۔ جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ جنگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھگوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کو ہارا کی بوٹ میں بلیو ٹکسی کے چندر ماتھر، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو ٹکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹکسی کے چیف سی جی بھگوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت واضح ہو گئی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا

ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یون بھوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ۔ بے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، بے جی کو مارا اور اس کے ساتھی بھولک کو بے بس کر دیتا ہے، سوشیلا اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جوگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جوگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آ پہنچے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک ڈاکٹر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث شہزی کی حالت اور خراب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جوگی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔ شہزی کو ایک صبح کلینک سے مہارانی کے کارندے زبردستی اپنی حویلی لے جاتے ہیں۔ مہارانی ان کو قید میں ڈال دیتی ہے۔ اس اثنا میں پولیس کے ہمراہ شہزی کے دشمن حویلی پر دھاوا بول دیتے ہیں، ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شہزی سوشیلا کے ہمراہ فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی...... مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی ستم ظریفیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوپارا اور چندرناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیر اثر تھا کہ ریتا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی ریتا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر دیکھتے پل کے پل کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو تعسی تک پہنچ جاتا ہے۔ وہاں کی سکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو تعسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے۔ اور سی جی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھوانی شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلا اور کہیلن داوا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کور سبلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

رات کی اس پرہول تاریکی میں کلی منجارو کی اسرار بھری سرزمین کی طرف ہمارا سفر جاری تھا۔

جیپ کی اگلی دونشستوں میں سے ایک پر ڈرائیور اور اس کے برابر میں نانا شکور، اس کے عقب کی ایک سیٹ پر میں اور سوشیلا جبکہ پچھلے حصے میں سامان اور اسلحے کے تھیلے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ وہیں نانا شکور کا ایک ساتھی ری کوئل گن تھامے دبکا بیٹھا تھا۔

اگرچہ نانا شکور کا ارادہ اپنے اصل ٹارگٹ کی طرف روانگی سے قبل بھولا ناتھ سے حملے کا انتقام لینے کے لیے اس کے ٹھکانے اے بے ساؤتھ کالونی کے کلب میں ہلا بولنے کا تھا مگر میرے ...... اصرار پر اس نے یہ ارادہ ملتوی کر کے اپنے کچھ خاص ساتھیوں کو یہ مشن سونپ دیا تھا۔

اس مہم میں ہم بس کل پانچ افراد ہی تھے۔ ولدلی علاقے پر مشتمل چھائی کا وہ جنگل جہاں سے اس وحشی قبیلے کی راجدھانی کی سرحدیں شروع ہوتی تھیں، اس سے کسی حد تک نانا شکور بھی واقف تھا، وہ یہاں سے پچیس تیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، چھائی کا گھنا ولدلی جنگل ہی قبیلے کی سرحد کہلاتی تھی۔ اس کے بعد قدم بہ قدم خطرہ شروع ہو جاتا تھا، وہاں ہمارا اپنے دشمنوں سے بھی ٹکراؤ ہونا لازمی تھا اور کلی منجارو سے بھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق یا یوں کہہ لیں کہ ڈولی سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں وہاں راستے میں ہمارا اجنبی دشمن ٹولے سے بھی سابقہ پڑ سکتا تھا، شاید انہی باتوں اور خدشات کی روشنی میں میرے دل میں یہ خیال ابھرا تھا کہ وہاں ایک بڑی جنگ کی شکل میں دمادم مست قلندر ہونے کی توقع تھی۔

رات کی ابھی ابتدا تھی۔ جیپ مناسب رفتار سے اپنی

منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ ہمارے اطراف میں میلوں تک بنجر ویرانہ بکھرا ہوا تھا، فضا مرطوب سی تھی اور موسم خنک محسوس ہوتا تھا۔ جنگلی مچھروں اور کیڑوں مکوڑوں سے نمٹنے کے علاوہ ہمارے پاس مرہم پٹی اور اینٹی موسکیٹو اسپرے بھی تھا۔ مچھر دانی اور سلیپنگ بیگز تھے، خشک خوراک کے دستی کین اور خیمہ زنی کا سامان بھی۔ جبکہ فاضل فیول کے دو بڑے گیلن جیپ......... کے ساتھ نصب تھے۔ تیاری ہماری بھرپور تھی جبکہ ایڈونچر پُرخطر تھا اور سفر جاری تھا۔

نانا شکور اگلی سیٹ پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا جبکہ میں اور سوشیلا ایک دوسرے سے دھیرے دھیرے باتوں میں معروف رہے۔ جیپ ہچکولے کھاتی مناسب رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ راستہ نیم پختہ اور کئی جگہوں پر بل کھاتا ہوا تھا، علاقہ میدانی تھا لیکن جلد ہی یہ سلسلہ چھوٹے بڑے ٹیلے نما ٹیلوں پر محیط ہونے لگا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد روئیدگی اور لمبے گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے درمیان سے بل کھاتا راستہ اب اندیشوں بھرا محسوس ہونے لگا، جیپ کی ہیڈ لائٹس میں سامنے تک گھور تاریک سناٹے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

لگ بھگ کوئی دو گھنٹوں بعد نانا شکور نے ہمیں محتاط ہونے کا اشارہ دیتے ہوئے یہ اعلان بھی کر ڈالا کہ چمائی کے جنگلی علاقے کی حدود شروع ہو چکی تھی، جس کا مطلب تھا کہ کلی متجارو کی سرزمین میں ہم داخل ہو چکے تھے یا ہونے والے تھے۔

جیپ کی تیز ہیڈ لائٹس میں سامنے دور تک کا راستہ ویران اور تاریک ہی نظر آرہا تھا، تاہم ہمارے اطراف میں اب چھدری چھدری جھاڑیوں کے سلسلے کی ابتدا ہو چکی تھی۔ چند درختوں کے بدہیئت سے جھکے جھکے ہیولے بھی نمودار ہونے لگے تھے۔ چمائی کا جنگل شروع ہو چکا تھا۔ کیونکہ اس کے فوراً ہی بعد بتدریج جنگل گھنا ہوتا چلا گیا تھا جس مقام پر جنگل کی ترتیب بکھری بکھری سی معلوم ہوتی تھی وہاں نانا شکور نے اپنے ساتھی ڈرائیور کو جیپ روکنے کا کہا۔

جیپ رکتے ہی اس نے انجن بند کر دیا۔ ایکا ایکی ماحول میں ٹھنکے پن جیسا سناٹا چھا گیا۔

اب ہمارے سامنے چمائی کا گھنا تاریک جنگل تھا۔ کہیں کہیں روشنی کی کہکشاں چمک رہی تھی، یہ جگنو تھے۔ فضا مرطوب تھی اور ہوا بڑی سبک خرام...... ہم پانچوں جیپ میں تھوڑی دیر تک ساکت بیٹھے رہے۔ ہماری ہم یہ خود ہی نظریں سامنے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ڈوبے جنگل پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ نانا نے ڈرائیور کو رکنے کا کیوں کہا تھا۔

”کیا کوئی خاص بات ہے نانا صاحب؟“ بالآخر میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے نیچی آواز میں کہا۔

”نہیں کوئی بات نہیں......“ وہ بدستور سامنے نظریں گاڑھے ہوئے بولا۔ ”میں دراصل راستے کا تعین کرنا چاہ رہا تھا۔“

”کیا بھول رہے ہو راستہ؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں دراصل محفوظ اور نسبتاً شارٹ کٹ راستے کا تعین کرنا چاہ رہا ہوں......“

”ہم......“ میرے منہ سے نکلا اور میں بھی اطراف میں یونہی دیکھنے لگا۔

”اس طرف چلو...... اور ہتھیار ہاتھوں میں پکڑ لو......“ چند منٹوں بعد نانا نے حکم صادر کیا۔ میں نے پستول نکال لیا تھا اور سوشیلا نے بھی یہی کیا جبکہ نانا اپنا پستول پہلے ہی نکال چکا تھا۔

اب جیپ کسی باقاعدہ راستے پر نہیں تھی۔ ڈرائیور بڑی مہارت سے جیپ چلا رہا تھا۔ اچانک ڈرائیور کے حلق سے کراہ سی خارج ہوئی۔ اس کا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر گردن کی طرف گیا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا اور اسٹیئرنگ ہاتھ سے چھوٹتا چلا گیا۔ جیپ ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ شکر تھا کہ رفتار آہستہ تھی، تاہم پھر بھی ہم ایک دوسرے پر لڑھک گئے۔

”نیچے اترو...... کسی نے بلو پائپ فائر کیا ہے......“ نانا شکور چلایا۔

”بلو پائپ“ کے ذکر پر میرے پورے بدن میں ایک تیز سی سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بلو پائپ ان وحشی جنگلی باسیوں کا بڑا ہی زہریلا اور خطرناک ہتھیار تھا۔ کسی درخت کی کھوکھلی شاخ کے اندر زہر میں بجھا ہوا کانٹا منہ سے پھونک مار کر پھینکا جاتا تھا اور زد میں آیا ہوا شکار اسی وقت بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو جاتا تھا۔ ہم اس طرف جوابی فائر بھی نہیں کر سکتے تھے، یہ خاموش موت کی صورت میں اور بغیر دکھائی دیے جھپٹتا تھا، اس لیے اس سے دشمن کی سمت کا اندازہ نہیں ہو پاتا تھا۔

ہم سب ایک اندازے سے چھلانگ مار کر نیچے اترے اور جیپ کی آڑ میں ہو گئے اور اپنے سامنے تاریک جنگل کے سینے میں نظریں گاڑ دیں۔ نانا شکور نے اس بار

سرسراتی سرگوشی میں کہا۔
''یہ کمی متجارو کے پہرے داروں میں سے کوئی ہوگا۔
ایک دم ٹارچ روشن کردو اور اس کی روشنی چاروں طرف پھینکو،
جو بھی دکھائی دے، گولیوں سے بھون ڈالو......''
ہم سب کے پاس ٹارچیں تھیں، جنھیں آن کرتے ہی
ہم نے ان کی روشنی چاروں طرف پھینکی تو مجھے اندھیروں
میں ڈوبے گھنے درختوں میں کچھ تنگ دھڑنگ انسانی ہیولے
متحرک نظر آئے، میں نے اپنی گن کا رخ اس طرف کر کے
فائر کھول دیا۔ رات کے پُرہول تاریک سناٹے میں میری
گن زور سے گرجی اور میں نے ان درختوں سے کئی انسانی
ہیولوں کو کریہہ انگیز چیخیں مارتے ہوئے گرتے دیکھا۔ نانا
شکور کے آخری بچے ہوئے ساتھی، جس کا نام جمی تھا، اسے
بھی چھپے ہوئے زہریلے دشمن نظر آ گئے تھے، چنانچہ اس کی
ہیوی رنی کوئل گن بھی گرجی تھی۔ چند انسانی چیخوں کے بعد
ایک دم خاموشی چھا گئی۔ نانا شکور نے بھی ایک دم فائر بندی
کا اشارہ دے دیا۔
''ان وحشیوں کی جانب سے یہ حملہ غیر متوقع تو نہیں
لیکن قبل از وقت ضرور تھا......'' نانا شکور ہمارے قریب
آتے ہوئے بولا۔ ''اتنی جلدی ان سے مڈبھیڑ ہونے کی توقع
نہ تھی...... جس کا صاف مطلب ہے کہ ان وحشیوں نے اپنی
سرحدوں کی کڑی نگرانی شروع کر دی ہے۔'' وہ اپنا جملہ مکمل
کرتے ہوئے جیپ کی طرف بڑھا اور ہمیں بھی آنے کا
اشارہ کیا۔
''ہمیں رات کے بجائے دن کے اجالے میں سفر کرنا
چاہیے تھا۔'' میں نے بھی قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''رات
کے اوقات میں یہ اندھیرے جنگلی دلدلی علاقے ان
وحشیوں کے لیے آسان شکارگاہیں ثابت ہو سکتی ہیں، ہم
جیسے تو ان کے لیے آسان شکار ثابت ہوتے ہیں۔''
''تمہاری بات میں رد نہیں کر سکتا دوست!'' نانا شکور
جیپ میں سوار ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن دن میں اور زیادہ
خطرہ ہوتا ہمیں...... خیر، اب چلنے کی کرو۔''
ایک ساتھی کی جان گنوانے کے بعد ہمارا سفر دوبارہ
شروع ہو گیا۔ لیکن تازہ حملے کے بعد ہمیں اب ہر پل
خطرے کا احساس دامن گیر رہنے لگا تھا۔ نانا شکور کا خیال تھا
کہ کمی متجارو وحشیوں کی آبادی اب بھی کافی فاصلے پر تھی، مگر
اس خدشے کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ جگہ جگہ ان
لوگوں نے پہرے بھی بٹھائے ہوئے ہوں گے۔
''کیا ان وحشیوں کے دماغ میں اپنے وسیع تر دفاع
کے لیے ایسی دوراندیشی کا عمل دخل سمجھ میں آنے والی بات
ہو سکتی ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت کہا تو نانا شکور نے
صاف انکار کر دیا تب میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔
''اس کا واضح مطلب ہے کہ ان وحشیوں کی
راجدھانی میں ہی نہیں بلکہ ان کے دماغوں میں بھی کسی ہم
جیسے آدمیوں نے اپنی عمل داری قائم کر لی ہے۔''
میری بات پر نانا شکور نے گردن گھما کر حیرت آمیز
توصیفی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''ویل ڈن
دوست! کیا کہنے تمہارے، تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا
ہے۔ اگرچہ ہمارے ساتھی ڈولی نے بھی کچھ ایسی معلومات
ہمیں فراہم کی تھیں لیکن ان میں ابہام تھا مگر تمہارے اس
قیافے نے یہ شبہ بھی دور کر دیا۔''
''قیافوں سے شبہے دور نہیں ہوتے شکور صاحب!''
میں نے ایک پُرسوچ ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔
''حالات و دوراں، انسان کی بعض ایسی حسوں کو ابھارنے کا
باعث بنتے ہیں کہ وہ پیش آمدہ سے پیش آئندہ حالات کو فوراً
بھانپ لینے کی حس پا لیتا ہے۔''
''تمہارا فلسفہ میرے لیے ثقیل سہی لیکن میں اپنی
سوجھ بوجھ اور تجربے سے تمہارے بارے میں اتنا ضرور کہہ
سکتا ہوں کہ تمہارے اندر بعض ایسی قدرتی صلاحیتیں موجود
ہیں جو وقت سے پہلے بہت کچھ بھانپ لیتی ہیں۔'' نانا ہنستے
ہوئے بولا۔
''یہ پاور آف آبزرویشن ہے اور اس صلاحیت کی عملی
جھلک میں بارہا اپنی آنکھوں سے شہزی کے ساتھ رہتے
ہوئے نمونے کے طور پر دیکھتی رہی ہوں۔'' کافی دیر سے
خاموش بیٹھی ہوئی سوشیلا نے بھی بالآخر لب کشائی کی۔
''اصل بات یہ ہے کہ ہمیں ان سارے عوامل کو ذہن
میں رکھنا ہوگا۔'' میں سنجیدہ موضوع کی طرف آتے ہوئے
بولا۔ ''ہمارے دشمنوں کو عقل و وحشت کی قوت حاصل ہو چکی
ہے۔ وہ اسی ذریعے سے فائدہ اٹھا کر ہمیں چیننے کے درپے
ہوگا۔ بس! دعا کرو وہ ہمارا کوئی دشمن نہ ہو۔''
''شہزی! ویسے تمہارا ذہن کیا کہتا ہے، اس بارے
میں کہ ان وحشیوں کو کن لوگوں نے رام کیا ہوگا؟ بھولا ناتھ
کے آدمیوں (شاکا وغیرہ) یا پھر یہ کوئی اور لوگ ہوں گے
جن کے بارے میں ڈولی نے پورے یقین کے ساتھ مگر مبہم
سی نشاندہی کی تھی؟'' سوشیلا نے مجھ سے پوچھا۔
''سوشیلا جی نے تو میرے اندر کافی دیر سے پھڑکنے
والے اس سوال کو اچک لیا...... پھر کیا کہتے ہو دوست! اس

بارے میں؟" نانا شکور نے بے اختیار کہا۔
فضا میں اب سیلی سیلی سی نباتاتی باس پھیلنے لگی تھی۔
یوں لگتا تھا جیسے یہاں جابجا کیچڑ زدہ زمین ہو......
اسی وقت جیپ کو ایک جھٹکا لگا، ہم سب چونک گئے۔
جیپ کا پچھلا حصہ "بے ڈول" سا ہونے لگا، ڈرائیور نے ایکسلریٹر پورا دبا دیا۔ جیپ کی رفتار آہستہ ہی تھی لیکن اب پچھلی سائڈ سے بے قابو ہو رہی تھی، صاف ظاہر تھا کہ اس کے عقبی دونوں ٹائر کسی "کیچ زدہ" گڑھے میں پھنسنے لگے تھے اور جیپ کا اگلا حصہ اوپر کو اٹھا جا رہا تھا۔
"دلدل۔" معاً میرے ٹھٹکتے ہوئے ذہن رسا میں ابھرا اور میں چلا کر ڈرائیور سے بولا۔ "ایکسیلیٹر مت دو...... جیپ دلدل میں جا رہی ہے......"
میرے اعلان نے جیسے ایک لرزہ خیز تھرتھری مچا دی۔ جس کا الٹا اثر ہوا...... ڈرائیور نے بوکھلاہٹ میں جیپ سے چھلانگ لگا دی، نانا شکور بھی یہی حرکت کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ میں نے پچھلی سیٹ سے ہاتھ بڑھا کر اسے روک لیا۔
"یہ بے وقوفی مت کرو...... نیچے بھی دلدل ہے۔" وہ وہیں جہاں کا تہاں رہ گیا۔ ڈرائیور کی حالت دیدنی ہو گئی، وہ دلدل میں اتر گیا اور آن ہی آن میں سینے تک اندر دھنس گیا۔ دلدل میں دھنس کر مرنے کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔ وہ سارے تاثرات اس کے چہرے سے عیاں تھے اور تھوڑی دیر بعد ہی اس کی آواز اور لہجے سے بھی جھلکنے لگے۔
"مم...... مجھے بچاؤ...... آہ......"
ہم اسے کیا بچاتے ہمیں اپنی پڑ چکی تھی۔ کیونکہ جیپ پوری ... دلدل میں دھنس چکی تھی اور ہم خود بھی اس میں پھنس رہے تھے۔ جیپ کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا اور وہ دھیرے دھیرے اندر دھنسی جا رہی تھی۔ میں نے نانا شکور سے انجن بند کرنے کا کہا۔
اس کا چہرہ ست کر رہ گیا تھا، اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس اچانک ظہور پذیر ہوتی خطرناک اور جان لیوا صورت حال سے کیونکر نمٹا جائے؟ جبکہ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا، میں اپنے حواسوں کو قابو کیے ہوئے تھا اور ساتھ ہی نظریں تیزی کے ساتھ گردوپیش کا جائزہ لینے میں محو تھیں۔ ڈرائیور ابھی تک اپنی جان بچانے کے لیے چلائے جا رہا تھا، وہ خاصا توانا اور تنومند تھا اور اب یہی خاصیت اس کی مصیبت بن رہی تھی۔ وہ جتنا ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا، اتنا ہی اندر دھنس رہا تھا۔ میں نے چلا کر اس سے کہا۔
"حرکت مت کرو، کوشش کر کے جیپ کی باڈی کے ساتھ چپکے رہو......"
"جیپ بھی تو دھنس رہی ہے......" یہ بات نجانے کس نے کہی تھی، مگر میں اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ ہم بہ آسانی اس سمت جیپ سے اگر چھلانگیں لگاتے تو کنارہ زیادہ دور نہ ہوتا۔ میں نے تاک کر ایک لمبی زقند بھری، بلاشبہ یہ "رن" لیے بغیر ایک ہی جگہ جمے رہ کر لانگ جمپ لینے کی کوشش تھی جس میں، میں کامیاب رہا تھا۔ دلدل کے کنارے گرا تو کیچ میں لتھڑ گیا۔ کائی زدہ اور دیگر نباتاتی ناگوار سی... بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور میرا جی الٹنے لگا، بڑی مشکلوں سے میں نے خود پر قابو پایا اور اسی وقت میرا ایک ہاتھ کنارے اگی ہوئی جھاڑیوں پر پڑا اور میرے ہاتھ میں جھنڈدار گچھا آ گیا، اسے پکڑ کر میں کنارے پر آ گیا۔
"سوشی! رسی پھینکو جلدی...... مگر زیادہ مت ہلنا...... نانا! تم اپنی جگہ بے حس و حرکت رہو۔ ہے تو ہے کس سے مس بھی نہ ہونا۔ حواس اپنے قابو میں رکھو......"
وہ دونوں سمجھ گئے تھے کہ میں کیا کرنا چاہ رہا تھا، سوشی نے میری ہدایات پر فوراً عمل کیا اور جیپ میں موجود رسی نکال کر اس کا گچھا سا بنا کر میری طرف اچھال دیا۔
جیپ آدھی سے زیادہ دلدل میں دھنس گئی تھی اور کوئی وقت جاتا تھا کہ سوشی اور نانا شکور بھی دلدل میں جا گرتے۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ رسی کے ایک سرے کو اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر باندھا، ادھر دلدل میں نصف سے زیادہ دھنسے ہوئے ڈرائیور نے ایک خطرناک حرکت کر ڈالی۔ وہ جیپ میں چڑھنے کی تگ و دو کرنے لگا۔ جس کے باعث جیپ کے دلدل میں دھنسنے کا عمل تیز ہو گیا۔ میں چلا کر نانا شکور سے بولا۔
"اس بے وقوف سے کہو کہ رک جائے، جتنا حرکت کرے گا اتنا دلدل کے اندر جائے گا...... اور اپنے ساتھ تم دونوں کو بھی لے ڈوبے گا۔ میری محنت اکارت چلی جائے گی اور تم سب بھی جان سے جاؤ گے۔"
نانا شکور نے یہی بات اپنے ساتھی سے کہہ دی۔ میں نے رسی کے دوسرے سرے کا گچھا بنا کر جیپ کی طرف پھینکا جو، سوشیلا نے اچک لیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے میری ہدایت پر دلدل میں چھلانگ لگا دی۔ میں نے اسے رسی کی مدد سے تیزی کے ساتھ باہر گھسیٹ لیا۔ جیپ ڈوب کر

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر بن گئی تھی

میڈیکل ایڈ کے نام پر عالمی پیمانے پر ہونے والے جرائم کی کہی ان کہی داستان، وہ نادانستگی میں ایک بہت بڑے گروہ سے ٹکرا گیا تھا۔

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

غائب ہو چکی تھی۔ نانا شکور دلدل میں سینے تک دھنسا ہوا تھا اور ڈرائیور گردن تک۔ نانا شکور نے اسے اپنے ساتھ چپکا لیا تھا۔ وہ دونوں اب حسرت زدہ مگر مردنی سی آنکھوں سے، کنارے پر موجود میری اور سوشیلا کی طرف تکے جا رہے تھے۔

''نانا...... میں رسی پھینک رہا ہوں، تم دونوں اسے تھام کر آجاؤ گے، حوصلہ مت ہارنا......''

یہ کہتے ہوئے میں نے رسی کا لچھے دار سرا ان کی طرف اچھال دیا۔ میری کوشش کو دیکھتے ہوئے اب ڈرائیور نے بھی ذرا حوصلہ پکڑ لیا تھا اور اس نے چیخنا بند کر دیا تھا، حالانکہ وہ ایک بڑے گینگ کا آلۂ کار تھا، مگر دلدل جیسی موت کا تصور بھی کم بھیانک نہ تھا۔

رسی نانا شکور کے قریب کیچ میں پڑی، جسے نانا شکور نے دبوچنا چاہا مگر ناکام رہا، نتیجے میں وہ گردن تک اندر چلا گیا، میں تشویش زدہ ہو گیا۔ ڈرائیور تو بے چارہ پورا ہی اندر دھنس چکا تھا، اس کا سر بھی دلدل کی کیچ زدہ سطح سے غائب ہو چکا تھا مگر آخری لمحات تک جان بچانے کی فطری تگ و دو اس نے اپنا ایک ہاتھ، دلدل کی سطح سے باہر نکالے رکھنے کی صورت میں جاری رکھے ہوئے تھی۔ میرا دل ان دونوں کے متوقع لرزہ خیز انجام سے کانپ سا گیا۔

''پپ...... پلیز...... ! شہزی انہیں بچالو...... آہ، میں یہ بھیانک منظر نہیں دیکھ سکتی۔''

میرے قریب کھڑی سوشیلا نے لرزیدہ آواز میں مجھ سے کہا۔ میں نے دیکھا، نانا شکور اب پتھرائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا منہ اور ناک اندر دھنس چکا تھا۔ میرے وجود میں لرزہ طاری ہو گیا۔ میں نے رسی کھینچ کر دوبارہ ان کے طرف اچھالی تو وہ اس بار نانا شکور کے ہاتھ میں آگئی جو اس نے باہر نکالا ہوا تھا۔ ہاتھ میں رسی آتے ہی نانا شکور نے اسے دبوچ لیا۔ اس کر یہہ حقیقت سے وہ بھی اچھی طرح واقف تھا کہ اگر اس بار رسی ہاتھ سے گئی تو وہ بھی گیا۔

''سوشی! میری مدد کرو......'' میں نے رسی کھینچنا شروع کر دی اور سوشیلا سے کہا۔ وہ فوراً حرکت میں آئی اور وہ بھی رسی پکڑ کر کھینچنے لگی۔

میں نے دیکھا نانا شکور کیچڑ میں لتھڑا ہوا باہر کو آنے لگا، اس نے اپنے ساتھی کو بھی ایک ہاتھ سے بہ مشکل دبوچ رکھا تھا...... پھر دفعتاً اسے جھٹکا لگا، بدنصیب ڈرائیور کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا مگر وہ خود کنارے پر آ گیا۔ میں جلدی سے اس کی جانب لپکا اور اسے باہر نکال لیا۔ بدنصیب جمی (ڈرائیور) کو دلدل نے نگل لیا تھا۔

نانا شکور کے کپڑے، چہرہ، پورا جسم دلدلی کیچ سے آلودہ ہو رہا تھا۔

''سوشی! اسے سنبھالو، میں جمی کو دیکھتا ہوں۔'' میں نے سوشیلا سے کہا اور دلدل میں چھلانگ لگانے لگا تھا کہ سوشیلا چیخی۔

''نہیں شہزی......!''

اسی وقت نانا شکور نے میرا ایک پاؤں دبوچ لیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ''وہ ختم ہو چکا ہے، کوئی فائدہ نہیں اپنی جان گنوانے کا۔''

''میں ایک کوشش کر کے دیکھتا ہوں، تم میری رسی تھامے رکھو......'' میں چلایا، جمی کے اس عبرت ناک انجام پر میرا دل دکھنے لگا تھا۔

''نہیں...... نہیں شہزی! وہ بہت اندر جا چکا ہے...... یہ پانی نہیں ہے کہ تم اتنی آسانی سے اندر غوطہ لگا دو گے......''

سوشیلا جنونیوں کے انداز میں مجھ سے لپٹ گئی تھی کہ میں اب تب میں کہیں اندر چھلانگ لگا ہی نہ دوں۔

شدید کرب کے عالم میں، میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ میری نظریں اس منحوس دلدل کی کیچ زدہ سطح پر جمی رہیں، جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہمارے ساتھی کو اس نے بھوکے انداز میں نگلا تھا۔

''اٹس اوکے...... شہزی! اس بے چارے جمی کی اسی طرح ہی لکھی تھی۔'' نانا شکور بولا۔

''ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ ہمارا بہت سا سامان اور اسلحہ، وقت سمیت پہلے ہی ضائع ہو چکا ہے۔''

''کیا اس حالت میں ہمیں اپنا یہ پُرخطر سفر جاری رکھنا چاہیے؟'' سوشیلا نے نجانے کس خیال کے تحت یہ بے وقوفانہ سوال کیا تھا جس پر نانا شکور بُرا مناتے ہوئے اسے گھور کر بولا۔

''تمہارا کیا خیال لڑکی! ہمیں اپنے دو ساتھیوں کی جان گنوانے کے بعد واپس پلٹ جانا چاہیے؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ ذرا خفیف ہو کے بولی۔ ''میں نے ایسا احتیاط کے پیش نظر کہا تھا۔''

''آگے بڑھو...... ابھی ہمارے حوصلے پست نہیں ہوئے نہ ہی ہوں گے۔'' نانا شکور نے مضبوط لہجے میں کہا اور پھر ہم آگے بڑھ گئے۔

رات گہری ہو چلی تھی۔ ہم اپنی سواری، اسلحہ اور

کارآمد سامان سمیت وہ ساتھی گنوا بیٹھے تھے۔ اسلحے کے نام پر ہمارے پاس اب کچھ بھی نہیں تھا، ہاں! البتہ میرے اور نانا شکور کے پاس قرولی نما خنجر ضرور تھے، جو ہماری داہنی پنڈلی میں بندھی نیام میں اڑسے ہوئے تھے۔

مچھروں کی سی خراش بھنبھناہٹیں الگ پریشان کر رہی تھیں۔ کسی تاریکی میں چھپے ہوئے پہرے دار وحشیوں کی طرف سے بلو پائپ فائر کیے جانے کا الگ دھڑکا لگا ہوا تھا۔ یہ ان کم بخت وحشیوں کا بڑا ہی جان لیوا اور خطرناک ہتھیار تھا جو آن ہی آن میں انسان کو یوں موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیتا تھا جیسے کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو اور بندہ پانی بھی نہ مانگ سکے اور پلک جھپکتے ہی موت کے منہ میں لمبی نیند جا سوئے۔

نانا شکور آگے تھا، سوشیلا درمیان میں اور میں سب سے پیچھے تھا۔ نانا شکور کی ہی ہدایت کے مطابق ہم نے یہ ترتیب رکھی تھی۔ تاہم اپنے گرد و پیش پر بھی ہماری نظریں گردش کر رہی تھیں، ٹارچ ہمارے پاس ایک ہی تھی، جو نانا شکور کے ہاتھ میں تھمی ہوئی تھی لیکن وہ اس نے آف کر رکھی تھی۔ شکر تھا کہ آسمان صاف تھا اور طباق چاند کی روشنی اور اس کے ہمراہ تاروں کی موج ظفر موج کی ضوفشانی کے سہارے ہم راستے کا تعین کیے محتاط روی کے ساتھ منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے ہم نے پہلے ہی حملے میں ان وحشی پہرے داروں کا قلع قمع کر ڈالا تھا ورنہ اب تک ان سے مڈبھیڑ ہو چکی ہوتی۔" میں نے چلتے چلتے کہا۔ مقصد نانا شکور کی تسلی بخش رائے لینا تھا کہ وہ کیا کہتا ہے؟

"ایک حد تک تمہاری بات درست ہے۔" وہ ایک جگہ رکا، ہم بھی رک گئے، گرد و پیش پر اس نے ایک گہری اور محتاط نظر ڈالی اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "دو تین کلومیٹر کے بعد اس راجدھانی کی اندرونی سرحد شروع ہوتی ہے، اصل خطرہ وہیں ہمارا منتظر ہے۔"

"تو کیا ان سے ٹکراؤ لازمی ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"اگر ان کی اندھیرے میں دیکھنے کی تیز حس رکھنے والی نظروں میں نہ آئے تو یہ اہم مرحلہ بغیر کسی ہنگامے کے طے ہو سکتا ہے، مگر اس کی امید کم ہی ہے۔" نانا شکور نے جواب دیا۔ "دیکھ لیے جانے کی صورت میں وہ سارے ہی تیر تفنگ اور تیز چوبی نرسلوں کے ساتھ ہم پر پل پڑیں گے۔"

"ہم۔۔۔ مگر ہمارے پاس تو اسلحہ بھی نہیں ہے، ہم کیسے ان کا مقابلہ۔۔۔؟" سوشیلا اچانک نانا شکور کو اپنی جانب سخت نظروں سے گھورتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ میرا ہونٹ سے مسکرانے کو جی چاہا تھا، تاہم بات رکھتے ہوئے فوراً ہی موضوع بدل کر نانا شکور سے بولا۔

"نانا صاحب! تمہیں یہاں کے ماحول کا کچھ تو تجربہ ضرور ہوگا، کوئی ایسی گزرگاہ ہو جسے اختیار کرتے ہوئے ہم ان وحشیوں کی نظروں میں آئے بغیر اپنی منزل تک پہنچ سکیں؟"

"میں اسی پر غور کر رہا ہوں۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "لیکن میرا نہیں خیال کہ وہاں سے بھی ہم بہ آسانی ان کی اندرونی سرحد پار کر سکیں۔"

"کوئی بات نہیں، اگر ان سے حملہ ناگزیر ہوا تو پیچھے ہم بھی نہیں ہٹیں گے۔" میں نے کوہ شکن لہجے میں کہا تو نانا بولا۔

"میں یہی چاہتا ہوں کہ تم دونوں بھی ذہنی طور پر اس جنگ کے لیے تیار رہو، مگر تمہاری ساتھی مجھے ذرا کمزور دل معلوم ہوتی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے نانا صاحب! یہ بہت بہادر خاتون ہے۔۔۔" میں نے سوشیلا کے بارے میں اس کی غلط فہمی دور کرنے کی سعی چاہتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ یہ اب تک اس سے زیادہ خطرناک حالات میں، نہتا ہونے کے باوجود، کئی مواقع پر میری جان بھی بچائی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس بار کی مہم ذرا مختلف نوعیت کی ہے تو اس نے محض احتیاط کے پیش نظر یہ بات کہی تھی۔"

"اچھا دفاع کیا تم نے اس کا۔" وہ بولا۔ "میں بس یہ چاہتا ہوں، تم دونوں خود کو ذہنی طور پر ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رکھو، یہ ہماری جس قدر خطرناک مہم ہے اتنی ہی غیر یقینی بھی، کوئی بھی کسی وقت بھی، چشم زدن میں ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ سکتا ہے، جیسے ابھی میرے دونوں ساتھی مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ چلتے رہو۔" وہ یہ کہہ کر آگے بڑھتا رہا، رکے ہم بھی نہیں۔

ہم بہت محتاط ہو کر آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ قدِ آدم جھاڑیوں اور سیاہ چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چاند کی روشنی میں بھی چٹانوں کی سنگلاخ سطح چمکتی نظر آ رہی تھی۔

یہاں پہنچ کر نانا شکور رک گیا۔ پھر ہماری طرف مڑ کر اس نے اپنا ایک ہاتھ بلند کر کے ہمیں نہ صرف رکنے کا بلکہ خاموشی اختیار کیے رکھنے کا بھی اشارہ کیا۔

میں اور سوشیلا قدرے ٹھٹک کر رک گئے۔ ہم نے

دیکھا وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر چند سیکنڈوں کے بعد ہم سے قدرے نیچی آواز میں، ان کالی چٹانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"ان چٹانوں کے پیچھے کچھ لوگ آباد ہیں...... ذرا اب دھیان سے قدم آگے بڑھانا اور میرے ایک ذرا بھی اشارے کو رد نہ کرنا...... آؤ......" کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا، میں اور سوشیلا جیسے پھونک پھونک کر آگے قدم بڑھانے لگے۔

ہم تینوں اب ایک نسبتاً بلند چٹان کی سنگلاخ سطح پر سینے اور کہنیوں کے بل پر عمودی رخ پر رینگ رہے تھے۔ نانا شکور نے اب "ترتیب" بدل دی تھی۔ ہم تینوں اب ساتھ ساتھ ہی آگے بڑھ رہے تھے۔

سرے پر پہنچ کر نانا شکور نے ہمیں وہیں دبکے رہنے کو کہا اور پھر خود چٹانی سرے سے اپنا ذرا سا سر ابھار کر دیکھا، میری اور سوشیلا کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں کہ اس نے ہمیں بھی ذرا اوپر کھسک آنے کا اشارہ دیا۔ میں اور سوشیلا بیک وقت رینگ کر سرے پر آئے۔

میں نے دیکھا، دوسری سمت ایک نیم جنگلاتی سی وادی سی تھی جہاں جابجا خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور ان کے دامن میں مجھے دو سفید رنگ کے "سیلانی خیمے" نصب دکھائی دیے۔ ایک بڑی سی گاڑی کھڑی تھی، خیمے کے سامنے الاؤ روشن تھا، جس کے گرد کچھ لوگ بیٹھے دکھائی دیے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں، یہ سب چونکہ اتنی دور سے ہیولوں کی صورت نظر آرہے تھے اسی لیے ان کے چہرے نہیں پہچانے جارہے تھے۔ تاہم اپنی وضع قطع سے ان میں ایک جوان عورت بھی دکھائی دیتی تھی، باقی تین چار کے قریب مرد تھے، ممکن تھا ایک دو خیمے کے اندر بھی موجود ہوتے۔

"یہ لوگ کون ہوسکتے ہیں؟"

"شاکا گروپ......" نانا شکور سرسراتے لہجے میں بولا۔

"لیکن یہ تو یہاں بڑے آرام سے موجود ہیں؟" میں نے کہا۔ "جبکہ تمہاری ساتھی جاسوس ڈولی نے بھولا ناتھ کے ڈورا ڈوری کلب سے ان کے بارے میں جو معلومات دی تھیں، اس کے مطابق یہ گروپ کسی مصیبت کا شکار ہوچکا تھا، جس کا صاف مطلب ہے کہ وہ لوگ قلی منجارو کی آبادی والے علاقے میں داخل ہوچکے تھے۔"

"میرے ذہن میں اس وقت کسی اور گروپ کا تصور نہیں آرہا۔" نانا شکور بولا۔ "اگرچہ ڈولی کی آخری اطلاعات کے مطابق بھولا ناتھ بھی از خود اپنے ساتھیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ہے مگر اتنی جلدی اس سے مڈبھیڑ ہونے کی مجھے ابھی کوئی توقع نہیں۔"

میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچ رہا تھا۔ یہ درست تھا کہ نانا شکور کے ذہن میں بھولا ناتھ کے سوا اور کسی گروپ کا تصور نہیں آسکتا تھا، لیکن کم از کم میرے اور سوشیلا کے معاملے میں بالکل ایسا نہیں تھا۔

ڈولی کی معلومات بالخصوص میرے لیے زیادہ سنسنی خیزی کی حامل تھی۔ کیونکہ میری نظر میں ایک صرف شاکا کا گروپ (بھولا ناتھ کا ساتھی) نہیں تھا، کوریلا سمیت لولوش کے ساتھیوں سے جی کوہارا کا بھی تھا۔

جیسا کہ لولوش کا یہ جلاد صفت ساتھی پورے انڈیا میں میرے خون کی بو سونگھتا پھر رہا ہوگا اور اس وقت تک اسے یقیناً اپنے سب سے بڑے حلیفی گروپ "بلیو ٹکسی" کے کرنل بھجوانی سمیت اس کے نیست و نابود ہونے کا علم ہوچکا ہوگا۔ میری اس عظیم اور شاندار فتح پر لولوش سے لے کر باسکل ہولارڈ تک دنگ رہ گئے ہوں گے۔ کوہارا انڈیا میں بیک وقت دوہرے مشن پر کاربند تھا، ایک مجھے قیدی بنا کر لولوش کے حوالے کرنا چاہتا تھا، دوسرے وہ جنرل کے ایل ایڈوانی کے قبضے سے طلسم نور ہیرا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

یہ بات میرے ذہن میں آتی تھی کہ جس طرح بھولا ناتھ مجھے زیر کرنے کے لیے میرے تینوں قیدی ساتھیوں کو یرغمال بنانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا، اس کی بھنک اس کے کانوں تک بھی پہنچ گئی ہوگی اور اس نے بھی اپنے چند بری ساتھیوں کے ساتھ یہاں کا رخ کیا ہو۔

یہ بات میں اپنے ذاتی تجزیے کے علاوہ ڈولی کی نانا شکور کو فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کہہ سکتا تھا لیکن ڈولی نے اور بھی بہت سے گروپس کا ذکر کرنے کے ساتھ یہ اطلاع بھی دی تھی کہ ان میں سے ایک گروپ نے ان وحشی قبائلیوں پر اپنی اجارہ داری قائم کرلی تھی۔

اب پتا نہیں وہ کون سا گروپ تھا؟ اور اس نے قلی منجارو پر کس نوعیت کی اپنی عمل داری قائم کرلی تھی، آیا انہیں زیر کرکے اپنا غلام بنالیا تھا یا پھر یہ کسی ایسے معاہدے یا دوستانہ تعلقات کی بنا پر انہیں اپنا حلیف بنانے پر مجبور کردیا گیا ہوگا...... یہ کون لوگ ہوسکتے تھے، اس کے بارے میں ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

"یہ لوگ بلیو ٹکسی کی باقیات اور ان کے حلیف ساتھیوں کا بھی گروپ ہوسکتا ہے؟" میں نے کہا تو نانا شکور

چونک کر بولا۔

''تمہارا مطلب ہے یہ لوگ بھولا ناتھ کے آدمی (شاکا وغیرہ) نہیں ہو سکتے ؟''

''یہی مطلب ہے میرا.....'' کہتے ہوئے میں نے اسے کورشیلا اور سے جی کو ہارا کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ اگرچہ بلونتی کے ساتھ میری دیرینہ چپقلش کے متعلق گھوترا جی نے بھی اسے سرسری بتایا ہوگا، تاہم صراحت جاننے کے بعد اسے بھی میری بات سے متفق ہونا پڑا۔

''ان سے جنگ ناگزیر ہے تو ٹھیک......ورنہ خاموشی سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔'' نانا شکور نے مشورہ دیا تو میں نے کہا۔

''سردست یہی بہتر رہے گا...... کیونکہ اس وقت ہمارا اصل ٹارگٹ یہاں کسی دشمن گروپ سے بھڑنا نہیں، اپنے ساتھیوں کو چھڑا کر بہ خیریت یہاں سے واپس لے جانا ہے......''

''صحیح...... آجاؤ پھر اس طرف......'' میری رائے لینے کے بعد وہ یہ کہتے ہوئے ایک طرف کو رینگ گیا۔

ہم تینوں اس سیاہ چٹانی ڈھلان کی آڑ میں اسی طرح کہنیوں اور سینے کے بل پر رینگتے ہوئے دوسری سمت کی طرف بڑھنے لگے۔ نانا شکور کے مطابق آبادی والا علاقہ کچھ زیادہ دور نہ تھا، اس سیاہ چٹانی وادی کے پیچھے کلی منجارو آباد تھے۔

کافی آگے جا کر ہم نے اپنے پیروں پہ چلنا شروع کر دیا۔ الاؤ اور وہ سیلانی خیمہ دور رہ گیا تھا۔ اب دیکھ لیے جانے کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ ہم تینوں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے کہ دفعتاً ہی ہم ایک عجیب سی ابھرنے والی آواز پر چونک پڑے۔ یہ بگل سے مشابہ آواز تھی۔

''رک جاؤ......'' معاً ہی نانا شکور نے سرگوشی میں کہا اور ساتھ ہی ڈھلان میں ابھری جھاڑیوں کی آڑ میں ہو گیا، میں اور سوشیلا بھی اس طرف آ کر دبک گئے۔

''یہ کیسی آواز تھی؟'' سوشیلا کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔

''شاید ہم دیکھ لیے گئے ہیں......'' نانا شکور نے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔ ''بگل نما یہ آواز نرسنگے سے بجائی گئی ہے۔''

''او......'' میرے منہ سے تشویش زدہ آواز خارج ہوئی۔

''اپنے گردوپیش سے چوکنا رہتے ہوئے آگے بڑھتے رہو......'' کہتے ہوئے نانا شکور نے حرکت کی اور ہم اس کی تقلید میں آگے بڑھنے لگے۔ یہاں چٹانی ڈھلان میں جابجا خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جلد ہی مجھے اپنے دیکھ لیے جانے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس چٹان کی پتھریلی سطح ہی نہیں بلکہ جھاڑیاں بھی چقماق کی خصوصیت رکھتی تھیں جو ہمارے بھاری جوتوں کی رگڑ سے جگنو جیسی چنگاری چھوڑ رہی تھیں۔ اس کا مجھے اچانک ہی احساس ہوا تھا جب میں نے اپنے اور نانا شکور کے پیروں تلے یہ جگنو چمکتے پائے تھے۔ میں نے فوراً نانا اور سوشیلا کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا۔

ٹھیک اسی وقت ہمارے بائیں سمت تیز روشنی نمودار ہوئی...... ہم نے چونک کر اس طرف دیکھا اور چہرے ہمارے فق ہو گئے۔ وہ آتشی تیر تھے جو اس طرف پھینکے گئے تھے۔ ہماری پھٹی پھٹی آنکھیں ان پر جم کر رہ گئیں، ہم ان کے نشانے پر تو نہیں تھے، تاہم جب وہ ذرا فاصلے سے ہمارے دائیں بائیں جھاڑیوں میں گرے تو ہمیں اندازہ ہوا کہ ہمارے ساتھ کلی منجارو وحشیوں نے کیسی خطرناک چال چلی تھی۔ بھڑکتے شعلوں میں بجھے ہوئے ان تیروں نے آناً فاناً جھاڑیوں میں آگ لگا دی تھی۔ آن کی آن میں ہم تینوں بھڑکتے شعلوں کی روشنی میں نہا گئے اور اسی وقت ہمیں کہیں قریب ہی تیز وحشیانہ چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی شور کی آواز ابھری۔

پہلی بار

دیہاتی پہلی بار کراچی آیا اور اسٹیشن سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھا۔ ٹیکسی خوفناک گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہوئی۔ زوردار جھٹکے سے آگے بڑھی لہراتی ہوئی اور نہایت تیز رفتاری سے کئی سڑکوں سے گزری۔ کئی آدمی اس کے نیچے آتے آتے بچے کئی گاڑیوں سے اس کی ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ دیہاتی کی گھگھی بندھ گئی۔ آخر کار اس نے ڈرائیور کا کندھا ہلایا اور عاجزانہ لہجے میں بولا۔

''بھائی صاحب، ذرا آہستہ چلائیں، میں پہلی بار ٹیکسی میں بیٹھا ہوں۔''

اس پر ڈرائیور نے گونج دار قہقہہ لگایا اور بولا۔

''خوچہ! فکر مت کرو...... اگر تم پہلی بار ٹیکسی میں بیٹھی اے...... تو ام بھی پہلی بار ٹیکسی چلا رہی اے...... حساب برابر اے......''

☆☆☆

سنگی منجارو کے اس ''ٹارش گن'' سسٹم کو سمجھنے میں ہمیں چنداں دیر نہ لگی تھی۔

''بھاگو اس طرف...... ورنہ ہم پر تیروں کی بارش ہو جائے گی......'' نانا شکور یہ کہتے ہی دوڑا، میں اور سوشیلا بھی اس کے عقب میں دوڑے...... چلوں پہ تیر چڑھ چکے تھے، کیونکہ اگلے ہی لمحے ہمارے اردگرد تیر گرنے لگے۔ ہم میں سے کوئی کسی بھی وقت ان تیروں کی بے رحم بوچھاڑ کی زد میں آسکتا تھا اور کیا خبر ان کی انیاں زہر میں بجھی ہوئی ہوں۔ ہمارے اردگرد جلتی سلگتی جھاڑیوں نے جہنم کا منظر بنا رکھا تھا۔ اس کی تپش سے ہم پسینے میں نہا گئے تھے، یہ ہمارے لیے دہری تہری مصیبت کا سبب بنی ہوئی تھی۔ ایک طرف اس کی روشنی ہمیں دشمنوں کی نظروں میں نمودار کیے ہوئے تھی تو دوسری طرف یہ ہمارے لیے تیز تپش کا باعث بن رہی تھی۔

''نانا...... ! ہمیں جلدی کسی محفوظ پناہ گاہ کی طرف پہنچنا ہوگا، ورنہ......''

''آہ......'' میری بات حلق میں ہی رہ گئی، اسی وقت مجھے سوشیلا کی کراہ آمیز چیخ سنائی دی اور میں نے اسے منہ کے بل گرتے دیکھا۔ میں گھبرا گیا اور اسے آگے بڑھ کر سنبھالنا چاہا تو اسی وقت میری نگاہ اس کے پاؤں پر پڑی۔ اس کی پنڈلی پر ایک تیر پیوست تھا، وہ اپنی ٹانگ پکڑے کراہنے لگی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک دم تیر کو کھینچ کر نکال دیا، سوشیلا مارے اذیت کے مرغ بسمل کی طرح تڑپ گئی، میں نے اسے خود سے بھینچ لیا، وہ بھی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی جاں گسل تکلیف کو گویا میں نے اپنے اندر سمونا چاہا تھا اور اسے کافی سکون ملا تھا مگر وہ ہولے ہولے سسکنے لگی اور درد سے کراہنے بھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور وہیں بیٹھ کر اس کے زخم کو دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے دبا کر گندا خون نکالا تاکہ زہر کا کم سے کم اثر ہو۔ وہ ابھی ہوش میں تھی اور کراہ رہی تھی۔

''آہ...... شہزی! میں اب نہیں چل سکتی، تم دونوں چلے جاؤ، ورنہ مارے جاؤ گے میری وجہ سے......'' اس نے کراہتے ہوئے قدرے دکھ بھری آواز میں کہا تو میرا جی کٹ کر رہ گیا۔

''کیسی بے وقوفوں جیسی باتیں کر رہی ہو، میں بھلا تمہیں اس حالت میں چھوڑ سکتا ہوں، چلو......'' کہتے ہوئے میں نے اسے اپنے کاندھے پر اٹھا لیا۔ نانا شکور بھی سوشیلا کی حالت پر تشویش زدہ تھا۔ ہم مزید وقت ضائع کیے بغیر آگے بڑھے اور اس طرف سے بچ کر گزرنے کی کوشش کر رہے تھے، جہاں جھاڑیوں نے آگ پکڑ رکھی تھی۔ جلد ہی مجھے ایک اندھیری دراز نظر آ گئی۔ فوراً ہی ہم اس اندھیری دراڑ میں داخل ہو گئے۔ یہاں مجھے اندازہ ہوا کہ دراڑ اندر سے خاصی گہری تھی۔ ہم تینوں اس میں بہ آسانی سما گئے۔

میں نے نانا کے ہاتھوں سے ٹارچ لے لی تھی، اسے روشن کر کے دراڑ کا جائزہ لیا تو مجھ پر ایک خوش کن انکشاف ہوا کہ یہ اندر سے غار کی طرح تھی اور یقیناً یہ کسی دوسری طرف کھلتا تھا۔

فوری طور پر ہم خطرے سے بچ گئے تھے، مگر خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ دراڑ کا سرا تنگ تھا مگر اندر سے یہ کشادہ تھی۔ ہم اس میں سما کر بیٹھ گئے تھے۔ کھلے سرے سے باہر جھاڑیاں جلتی ہوئی اب بھی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اب بجھنے کے قریب تھیں۔

''نانا...... ! تم سرے پر ذرا جا کر کھڑے ہو جاؤ اور کسی بھی خطرے کو محسوس کرتے ہی مجھے بتاؤ...... میں تب تک سوشیلا کے زخم کا جائزہ لیتا ہوں۔'' میں نے اس سے کہا اور وہ فوراً اٹھ کر اس طرف کھسک گیا۔

اس کے بعد میں نے سوشیلا کو غار نما دراڑ کی پتھریلی زمین پر لٹا دیا اور اس کی پتلون کے پائنچے کو اوپر گھٹنے تک کھینچ دیا۔ زخم پر میں نے ٹارچ کی روشنی پھینکی تو وہاں سے مجھے خون رستا ہوا نظر آ رہا تھا اور زخم کے گرد نیلاہٹ ابھرنے لگی تھی۔

میں نے اسی کی پینٹ کو پائنچے سے پھاڑ کر اس کی پٹی بنا دی اور زخمی پنڈلی کے گرد باندھ دی۔ پھر سوشیلا کے چہرے کا جائزہ لینے لگا، جو بری طرح ستا پڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہی نہیں بلکہ پورا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی پیشانی کو چھوا تو وہ تپ رہی تھی۔ وہ تیز بخار میں بھی جلا تھی۔ اگرچہ پسینا آنے کی صورت میں بخار کی شدت کم ہو سکتی تھی، لیکن لگتا ایسا ہی تھا جیسے تیر کی انی تیز اور سریع الاثر زہر میں بجھی ہوئی تھی۔

ہماری ادویات وغیرہ کا سارا سامان جیپ سمیت چھائی کے جنگلی دلدل میں غرق ہو چکا تھا۔

''شہزی!'' اچانک مجھے نانا نے پکارا...... میں چونکا اور اس کی طرف متوجہ ہوا، اس کی نگاہیں دراڑ کے سرے سے باہر جمی ہوئی تھیں، میں اس کی طرف کھسکا اور باہر جھانکا۔ وہاں اب جلی ہوئی جھاڑیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا، تاریکی میں روشنی کی آنا چکا تھا جلتی ہوئی جھاڑیوں کے بجھنے

یے بدبو پھیل چکی تھی مگر وہاں اب اس کی جگہ روشنی کے ... اپنے کاندھے پر اٹھانا چاہا تو وہ کراہ کر بولی۔
دوسرے بُرج نے لے لی تھی۔ ننگ دھڑنگ وحشیوں کا ایک غول تھا، جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں جلتی ہوئی بانس اور پھونس کی شمعیں اٹھا رکھی تھیں، ان کی ننگی سیاہ پشت سے لمبے کمان اور ترکش بندھے ہوئے تھے، کچھ کے ہاتھوں میں نیزے اور سنان نظر آرہے تھے، ان کی تعداد دس، پندرہ کے قریب تھی۔

''یہ ہمیں اس دراڑ میں تلاش لیں گے، شہزی!'' نانا شکور نے کہا۔ اس کا کہنا کچھ غلط بھی نہ تھا۔ اگر ہم اس خوش فہمی میں رہتے ہوئے یہاں مزید ڈیرا ڈالے رہتے کہ یہ دراڑ ان کی نظروں میں نہیں آسکتی تھی تو یہ ہماری بہت بڑی بے وقوفی ہوتی۔

''آؤ جلدی......'' میں نے اس سے کہا اور پلٹا۔ جب سوشیلا کی طرف آیا تو میرا چہرہ ایک دم فق ہوگیا۔

اس کی ٹانگ زخم کی طرف سے سوج گئی تھی، جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اب چلنے پھرنے سے بالکل قاصر ہو چکی تھی جبکہ وہ ہنوز نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی اور درد سے بھی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ اس بے چاری کی ہیئت کذائی پر میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور اسے فوراً سنبھال کر

''میں سہارے سے چل لوں گی، کب تک مجھے تم اٹھاؤ گے......''

''شاباش سوشی! ہمت کرو......اٹھو!'' میں نے اسے مزید حوصلہ دیا۔ میرا دل اندر سے اس کی قابلِ رحم حالت پر کڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا، نانا شکور نے ہمیں آگے چلنے کو کہا اور خود ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ سوشیلا میرے سہارے لنگڑا کر چل رہی تھی۔

اسی وقت عقب میں ہمیں دراڑ کے سرے پر مختلف آوازوں کا شور سا سنائی دیا۔ میرا دل ایک دم نازل ہوتے خطرے کی بو کو محسوس کرتے ہوئے بری طرح دھڑ دھڑانے لگا۔

''اپنی رفتار تیز کرو...... یا اسے اپنے کاندھوں پر اٹھالو......'' معاً عقب سے نانا شکور کی پُرتشویش سی آواز سنائی دی۔ ''وہ لوگ شاید دراڑ کے اندر داخل ہوگئے ہیں۔''

یہ سنتے ہی میں نے اور کچھ نہیں سوچا اور سوشیلا کے نرم و نازک جسم کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا، اس کے حلق سے ہلکی سسکاری خارج ہوئی تھی۔ میں اسے اٹھائے تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

اکلی مجارو دا فریقی نسل کی ایک وحشی قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کا مہذب دنیا سے کوئی لاحقہ نہ تھا، یہ دشمن کو دیکھتے ہی اسے کوئی موقع دیے بغیر بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ ان سے رحم یا کسی ''موقع'' کی ذرا بھی توقع نہ کی جاسکتی تھی۔

ہم بھی نہتے ہی تھے، جبکہ ان وحشیوں کے پاس جدید ہتھیار نہ سہی لیکن ہم نہتوں کے مقابلے میں تو یہ بہر حال مسلح ہی تھے۔ یوں بھی تیر، سنان اور بھالے کم خطرناک نہیں ہوتے...... پل بھر میں گوشت پوست کے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار ڈالتے ہیں، پھر تعداد میں بھی زیادہ تھے، سوشیلا زخمی تھی۔ اس کی ٹانگ سوج رہی تھی اور پتا نہیں کب تک یہ عمل جاری رہنا تھا۔

''وہ قریب آنے لگے ہیں، ہمیں اب رک کر ان کا مقابلہ کرنا پڑے گا......''

معاً نانا نے کہا اور مجھے رکنا پڑا۔ ذرا پیچھے گردن گھما کر دیکھا تو تنگ و تاریک غار نما دراڑ میں آگ جیسی روشنی کو سلگتے دیکھا جو ان وحشیوں کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی سرکنڈوں اور بانس کی مشعلوں کی تھی، جس کا صاف مطلب تھا کہ ان لوگوں کو ہماری یہاں دراڑ کے اندر موجودگی کا احساس ہو چکا تھا۔

ان وحشیوں کی فطرت تھی کہ یہ لوگ ہجوم کی صورت میں وارد ہوتے تھے اور دشمن کو دیکھتے ہی غل غپاڑا مچانا شروع کر دیتے تھے۔ وہ شاید اس طرح دشمن کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کرتے تھے۔ میں نے سامنے دیکھا، دراڑ نما غار آگے سے داہنی جانب گھوم رہی تھی۔ میں نے نانا سے کہا۔

''اس موڑ پر پہنچو......''

وہ شاید میرا مقصد سمجھ گیا تھا اور بلاچون وچرا اس نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔

موڑ کاٹ کر میں رک گیا۔ سوشیلا کے بے سدھ وجود کو پتھریلی زمین پر آہستگی سے رکھنے کے بعد میں پلٹا۔ دیکھا تو نانا شکورا اپنی پنڈلی والی نیام سے خنجر نکال چکا تھا، میں نے بھی یہی کیا اور اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

''یہ دراڑ اتنی چوڑی نہیں ہے کہ یہ سب وحشی ایک ساتھ ہم پر پل پڑیں...... اس لیے ایک ایک کو ہم بہ آسانی ڈھیر کر سکتے ہیں......'' میں نے کسی خیال کے تحت نانا سے کہا۔

''لیکن...... زیادہ دیر ایسا نہیں چل سکے گا، یہ لوگ موقع محل کے مطابق اپنی حکمت عملی بدل سکتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''اب بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے، تم سوشیلا کو لے کر نکل جاؤ، مجھ سے جہاں تک ہو سکا میں ان وحشیوں کا مقابلہ کرتا رہوں گا اور راستہ روکے رکھوں گا۔''

اس کی بات نے مجھے ہولا کر رکھ دیا، بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو نانا......؟ میں ہرگز تمہیں ان وحشیوں کے رحم و کرم پر تنہا نہیں چھوڑوں گا۔'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کلی مجارو کا غول قریب آگیا۔ ہمیں مزید بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا کہ دو وحشیوں کو سنان سنبھالے موڑ سے نمودار ہوتے پایا۔ انہیں ہماری گھات کا اندازہ نہ تھا، اس لیے وہ اپنی جھونک میں جیسے ہی موڑ کاٹ کر ہمارے سامنے ابھرے تو ہم دونوں کے نرغے میں آگئے، ایک کی گردن پر نانا نے اپنے خنجر کی تیز دھار آزما ڈالی، اس وحشی کی شہ رگ کٹتے ہی خون کا فوارہ اس کی گردن سے ابلا اور نانا شکورا کا چہرہ نہا گیا۔

دوسرے وحشی نے فوراً سنبھالا لینا چاہا اور نانا پر اپنی سنان سے وار کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میں نے خنجر ایک خاص ٹرک سے اس کی طرف اچھال دیا جو اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر ترازو ہو گیا۔ وہ اپنے حلق سے ایک بھیانک چیخ خارج کر کے گرا، تو نانا اور میں نے بیک وقت پھرتی سے ان مردہ وحشیوں کے نیچے ہتھیاروں پر قبضہ جما لیا۔

ترکش اپنی پشت پر باندھنے کا ابھی ہمارے پاس موقع نہ تھا، تاہم ان کے تیز انیوں والے سنان ہم نے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔

وحشیوں کو شاید ابھی تک اپنے ساتھیوں کے انجام کا صحیح طرح اندازہ نہیں ہو پایا تھا، اگرچہ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کی لرزہ خیز چیخ بھی سنی تھی لیکن اگر ان میں اتنی عقل ہوتی تو یہ وحشی ہی کیوں کہلاتے۔

بہرکیف ہمارے ہاتھوں اسی ''جھونک'' میں اپنے مزید چار پانچ ساتھیوں کی جانیں گنوانے کے بعد ہی انہوں نے محتاط روش اختیار کی اور پہلے تو انہوں نے چیخنا چلانا بند کیا، اس کے بعد اجنبی زبان میں دبی آوازوں میں کچھ بولنے لگے۔ ان کی جلتی ہوئی مشعلوں کی روشنی اندر بھی پڑ رہی تھی۔

ہمارے پاس جو جدید اسلحہ تھا وہ چھائی کے جنگل میں غرق ہو گیا تھا۔ ورنہ ان باقی ماندہ وحشیوں کے لیے تو ایک دستی بم یا برسٹ ہی کافی تھا۔

''سوشیلا کو اٹھاؤ جلدی......'' نانا نے مجھ سے کہا۔ چند

سیکنڈوں میں ایک بار پھر سوشیلا میرے کاندھوں پر تھی۔

''نکل چلو اب.....'' نانا نے کہا اور پھر ہم نے پیش قدمی شروع کردی۔

ایک مشعل ہمارے ہاتھ لگ گئی تھی، اسی کی روشنی میں ہم اس اندھیری درواڑ میں آگے بڑھتے رہے جبکہ نانا شکور میری طرف پیٹھ کیے بڑھ رہا تھا..... اس نے اب سنان چھوڑ کر تیر کمان ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور چلّے پر ایک تیر بھی چڑھا رکھا تھا۔

اسے اپنے عقب میں (سامنے) جو بھی کلی منجارو نظر آتا وہ اسے تیر کا شکار بنا ڈالتا۔ اس کی یہ حکمت عملی مجھے کارآمد لگی..... مگر بدقسمتی سے الٹے پیروں چلنے کے باعث ایک جگہ قدرے ابھری ہوئی پتھریلی سطح پر اس کا پاؤں رپٹا اور وہ نیچے آرہا۔ یہ تو شکر تھا کہ میں آگے بڑھتے ہوئے پیچھے بھی گاہے بگاہے نگاہ ڈالتا آرہا تھا، میں نے اسے گرتے دیکھا تو رُک گیا، اسے سنبھالا دینے کے لیے میں نے ابھی سوشیلا کو زمین پر لٹایا ہی تھا کہ دو وحشیوں کو خونخوار سی چیخیں مارتے ہوئے، گرے پڑے نانا شکور پر جھپٹتے دیکھا، سوشیلا کو اسی حالت میں چھوڑ کر میں سنان پکڑ ان کی طرف دوڑا۔

ایک نے مجھ پر اپنا نیزہ پھینکنا چاہا، جو درواڑ کی تنگ اور نیچی چھت کے درمیان اٹک کر رہ گیا، وہ اسے سیدھا کر ہی رہا تھا کہ میں نے سنان اس کے تنگ دھڑنگ پیٹ میں بھونک دی۔ وہ کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ گرا تو دوسرے وحشی کو نانا سے نبرد آزما ہوتے دیکھا لیکن، دوسرے ہی لمحے میں نے اس وحشی کی بھی آخری چیخ سنی، نانا نے اس پر شاید اپنے مہلک خنجر سے وار کیا تھا۔

اسی وقت دو تین مزید وحشیوں کو در آنے کا موقع مل گیا۔ اس تنگ اور نیچی چھت والی غار نما درواڑ میں یہ ہولناک جنگ بڑی کٹھن اور خطرناک تھی۔

کئی ایک مواقع پر میرے ہاتھ سے سنان چھوٹ گئی تھی۔ ایک وحشی موقع تاک کر چیختا ہوا مجھ پر پل پڑا۔ ہم دوبدو ہوگئے، اس کم بخت نے میری گردن دبوچ لی۔ اس کا چہرہ بڑا ہی مکروہ اور بدبو چھوڑتا ہوا محسوس ہوا تھا مجھے۔

میں نے اس کے پیٹ میں اپنی داہنی ٹانگ کا گھٹنا رسید کردیا۔ وہ منہ پھاڑ کر حلق کے بل چیخا تو انتہائی ناگوار ... بو کا بھبکا میرے چہرے اور نتھنوں سے ٹکرایا۔ اف..... اس قدر تیز اور زہریلی... بو تھی کہ میرا جی الٹ گیا۔ مجھے قے سی ہوگئی حالانکہ میں مضبوط دل گردے کا آدمی تھا۔ نانا شکور اب کافی سنبھل چکا تھا۔ وہ بھی ان سے نبرد آزما تھا۔

تب ہی میرے کانوں سے سوشیلا کی چیخ ٹکرائی۔ میں اس طرف پلٹا اور دنگ رہ گیا۔ ایک وحشی اسے ٹانگ سے پکڑ کر کسی منحوس عفریت کی طرح گھسیٹے لے جارہا تھا۔ میں اس طرف دوڑا تو اسی وقت ایک وحشی نے عقب سے میری ٹانگوں کو دبوچ لیا یہ وہی تھا جس کے پیٹ میں، میں نے اپنا گھٹنا رسید کیا تھا، وہ شاید خاصا سخت جان ثابت ہوا تھا۔ اس نے موقع پاتے ہی مجھے ٹانگوں سے دبوچ لیا تھا۔ میں منہ کے بل گرتے گرتے بچا اور سنگلاخ دیوار سے ٹکرایا، پھر پلٹ کر اپنی ایک ٹانگ چھڑائی اور وہی اس کے چہرے پر دے ماری۔ بھاری بوٹ کی ٹو نے اس کا گال پھاڑ ڈالا۔ وہ چیخ کر وہیں بے حس و حرکت نظر آنے لگا۔

میں نے اس سمت دیکھا جدھر ایک وحشی سوشیلا کو اٹھائے بھاگا تھا وہاں اب وہ نظر نہیں آیا۔ میں اندر سے ہول گیا، میں نے پلٹ کر ایک نگاہ نانا شکور پر ڈالی، وہ دو وحشیوں کے نرغے میں آچکا تھا۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے اسے یوں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا، لہٰذا میں اس کی مدد کو بڑھا، ایک وحشی نے اپنی سنان کا رخ میری جانب کر کے اچھالا۔ میں پھرتی کے ساتھ ایک طرف ہو کے خود کو اس سنان کی مہیب نوک سے بچا تو گیا تھا، مگر اس کی انی میرے بائیں بازو میں ضرور پیوست ہوگئی، میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہوگئی۔ میں ڈھنے لگا تھا کہ یکدم نانا شکور نے اس وحشی کو نپٹانے کیا داؤ آزما کر گرا ڈالا جس نے سنان سے میرا وجود گھائل کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ وہ نانا شکور کے اوپر گرا تھا کہ میں نے بھیانک چیخ سنی، میں دہل گیا، سمجھا یہی تھا کہ نانا شکور اس کی زد میں آگیا ہے، مگر ایسا نہ تھا، بلکہ اس کے اوپر گرنے سے نانا شکور کو اس پر اپنا خنجر آزمانے کا موقع مل گیا تھا۔

''اٹھو شہزی! دوڑو..... ان کی تعداد بڑھتی جارہی ہے.....'' نانا شکور بولا۔

''اس طرف آؤ..... ایک وحشی سوشیلا کو اٹھا لے گیا ہے.....'' میں نے اپنے زخمی بازو پر ہاتھ رکھے ہوئے نانا سے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

میں اپنے زخمی بازو کی پروا کیے بغیر دیوانہ وار آگے بڑھا جارہا تھا، سوشیلا کی طرف سے مجھے بے انتہا تشویش کھائے جارہی تھی۔ وہ وحشی کے قبضے میں تھی اور وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ وہ اگرچہ اکیلا تھا اور موقع پاتے ہی اس نے سوشیلا کو جا دبوچا تھا اور آن ہی آن میں اسے لے اڑا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ خبیث وحشی سوشیلا کو

لیے کسی بھی وقت اپنے ساتھیوں سے جاملتا یا پھر اسے لیے اپنے قبیلے کی طرف کا رخ کرتا۔ میں ہاتھوں کو ٹٹولنے کے انداز میں اس تنگ و تاریک غار نما دراڑ میں جتنی تیزی کے ساتھ چل سکتا تھا، چلا جارہا تھا، مجھے اس بات کی بھی کوئی پروا نہ تھی کہ نانا شکور میرے عقب میں آرہا تھا یا نہیں، بس ایک دیوانہ وحشت سوار تھی اس وقت میرے سرپہ کہ سوشیلا کو جو وحشی دبوچ کر بھاگا تھا، مجھے اسے نہیں چھوڑنا تھا۔

اچانک مجھے ذرا ہی فاصلے پر سوشیلا کی چیخ سنائی دی۔ میری تشویش فزوں تر ہوگئی، میں نے پل کے پل مزید چند گز کا فاصلہ تیزی کے ساتھ طے کیا اور مجھے روشنی کی جھلک دکھائی دی، یہ یقیناً دراڑ کا دوسرا سرا تھا اور روشنی باہر چھٹکی ہوئی چاندنی کی تھی۔

ٹھیک اسی وقت مجھے اس روشنی میں سرے پر اس وحشی کا ہیولا دکھائی دے گیا، جس نے کاندھے پر کسی کو اٹھا رکھا تھا، وہ یقیناً سوشیلا کے سوا اور کون ہوسکتا تھا۔ منزل کو قریب پاکر میری رگوں میں کیا پورے وجود میں پارا دوڑ گیا اور پھر میں محض چند پل میں اس وحشی کے سرپہ جا پہنچا۔ وہ دراڑ کے تنگ سرے سے باہر نکلنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس پر جھپٹا مارتے وقت میرے حلق سے بھی مارے جوش غیظ کے ایک دہاڑ خارج ہوگئی۔

وحشی کی پشت پر میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کا گھونسا تان کر پوری قوت سے رسید کیا تھا کہ اس کے حلق سے مارے تکلیف کے خاصی زوردار چیخ نکلی۔ وہ لہرا کر گرنے ہی والا تھا کہ میں نے اس کے کاندھے سے سوشیلا کو اچک لیا۔ وحشی نے اپنا شکار ہاتھ سے جاتے دیکھا تو سنبھل کر پلٹا اور خوف ناک غراہٹ سے مجھ پر جھپٹنے کی کوشش چاہی۔ میں نے اسے ٹانگ رسید کی، جو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لی۔ سوشیلا مارے دہشت کے چیخے جارہی تھی۔ میں نے اسے چھوڑا اور بجلی کی سی تیزی سے تڑپ کر دوسری ٹانگ وحشی کے چہرے پر رسید کر ڈالی، اس کے لیے مجھے زمین سے اچھلنا پڑا تھا، کیونکہ میری ایک ٹانگ اس کے ہاتھوں میں تھی۔

شکر تھا کہ یہ سب کچھ دراڑ کے باہر سرے کے قریب ہورہا تھا اور یہاں جگہ خاصی کھلی تھی۔ لامحالہ مجھے زمین پر گرنا پڑا، میں اٹھ بھی جاتا، مگر بدقسمتی سے میں زخمی بازو کے رخ پر گرا تھا اور وہ نیچے پتھریلی زمین پر دب کر کھل گیا۔ اذیت کی ایک تیز لہر میرے سارے وجود میں سرایت کرگئی اور میں بلبلا اٹھا، یہی سبب تھا کہ مجھے دوبارہ اٹھنے میں دیر ہوگئی۔

بدبخت وہ وحشی بھی کچھ زیادہ ہی سخت جان واقع ہوا تھا۔ مجھ سے اتنی مار پٹنے کے باوجود وہ تن کر کھڑا ہوگیا تھا اور اپنے مختصر سے جانگیے میں بندھے ایک عجیب ساخت کے خنجر نما آلے سے مجھے مارنے کو لپکا، میرے پاس فوری دفاع کے لیے وقت نہ بچا تھا، فقط یہی کرسکتا تھا کہ مہلک چرکے سے خود کو بچا پاتا، وہ بھی بہ مشکل، مگر ٹھیک اسی وقت میں نے اس کی گردن میں ایک تیر پیوست ہوتے دیکھا جو اس کی گردن کے آر پار ہوکر وہیں اٹک گیا تھا۔ وحشی کے حلق سے چیخ بھی خارج نہ ہوسکی اور وہ اسی طرح خنجر نما آلہ پکڑے، تیورا کر گرا۔

سوشیلا اپنی زخمی ٹانگ کے ساتھ گھسٹتی ہوئی میرے قریب آنے کی کوشش کررہی تھی کہ نانا شکور کو بھی میں نے دراڑ کے باہر پایا۔ اس کے ہاتھوں میں کمان تھی۔ اس وحشی کو نشانہ اسی نے ہی بنایا تھا۔

وہ میری طرف لپکا اور مجھے سہارا دے کر کھڑا کردیا۔

''شکریہ نانا...... تم بروقت تیر نہ چلاتے تو......''

''تمہارے زخم سے دوبارہ خون رسنا شروع ہوگیا ہے......'' وہ میری بات کاٹ کر گہری تفکیر سے بولا۔

''سوشیلا کو سنبھالو اور نکلنے کی کوشش کرو......'' میں نے اس کی بات کی پروا کیے بغیر کہا۔ ''وہ وحشی یہاں بھی کسی وقت پہنچ سکتے ہیں۔''

میں نے اپنے زخمی بازو پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے نانا نے بھی مجھ سے کوئی بحث نہ کی اور زخمی سوشیلا کو سہارا دے کر اٹھالیا۔ اس کے بعد ہم جتنی تیزی سے اس جگہ سے دور ہوسکتے تھے، دور ہوتے چلے گئے۔

ایک نسبتاً محفوظ مقام پر ہم نے ڈیرا جمایا۔ یہ دو عمودی دیوقامت چٹانی پتھر تھے، جن کے درمیان... تنگ سی جگہ تھی، لیکن ہم تینوں اس میں بہ آسانی سما گئے تھے۔ یہاں قدآدم جھاڑیوں کی بہتات تھی۔

ہمارے سیدھے ہاتھ کی طرف ایک چٹانی درہ نظر آتا تھا، عقبی رخ پر اندھیری کھائیاں تھیں، جبکہ سیدھے ہاتھ اور سامنے کے رخ پر نیم پہاڑی جنگل تھا اور شاید کوئی چشمہ یا ندی بھی قریب میں کہیں موجودگی کا پتا دیتی تھی، اس پار کیا تھا، یہ ہمیں نہیں پتا تھا، کیونکہ وہاں سے وقفے وقفے سے پانی کے چھپاکوں کی آواز آجاتی تھی۔

آسمان صاف اور روشن تھا۔ طاق چاند عین وسط میں نجرے تھال کی طرح جیسے اٹکا ہوا نظر آتا تھا۔ باقی چہار سو

ویرانی اور ایک عجیب سی تھکی ہوئی خاموشی کا راج تھا۔

نانا شکور نے اپنی شرٹ پھاڑ کر میرے زخمی بازو پر پٹی باندھ دی تھی۔ لیکن ہمیں سب سے زیادہ فکر سوشیلا کی ہو رہی تھی۔ نانا شکور نے میری پٹی کرنے کے بعد سوشیلا کی ٹانگ کے زخم کا بھی جائزہ لیا تھا۔ خود میں نے بھی دیکھا تھا۔ یہاں چاند کی روشنی صاف پڑ رہی تھی۔ ٹارچ کہیں گر گئی تھی، مشعل بھی نہیں تھی اور نہ ہی ہم ایسی کوئی شے جلا سکتے تھے کہ کہیں ہمارے اس ٹھکانے کی دشمنوں کو خبر نہ ہو جائے۔ کلی منجارو دوبارہ بھی نمودار ہو سکتے تھے۔ اس خدشے کو اب تادیر جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا کہ کلی منجارو قبیلے کو ایسے وراندازوں کا علم ہو چکا تھا جو نہ صرف ان کی راجدھانی میں گھسے چلے آئے تھے بلکہ ان کے قبیلے کے بہت سے افراد ہمارے ہاتھوں مارے بھی جا چکے تھے۔ چونکہ کلی منجارو ایک وحشی اور آزاد قبیلہ تھا اور یہاں یقیناً سرداری نظام ہو سکتا تھا۔ ایک ہی ان کا سردار ہو سکتا تھا، یا پھر وہ لوگ جنہوں نے بہ قول ڈولی کے ان کے اذہان غلام بنا لیے تھے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ لوگ بھی ہمارے لیے مربوط پلاننگ کر سکتے تھے جنہوں نے ان وحشیوں پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر رکھا تھا۔ کون ہو سکتے تھے یہ لوگ، اس کا پتا ابھی چلانا باقی تھا۔

ہمیں بھوک اور پیاس کا احساس ہونے لگا۔ بھوک کسی حد تک برداشت کی جا سکتی تھی، مگر پانی کے بغیر گزارا مشکل ہی تھا۔ میرے ہونٹ پیاس کی شدت سے خشک ہو گئے تھے اور یہی حال نانا شکور کا بھی تھا جبکہ سوشیلا کی حالت زیادہ قابلِ رحم تھی۔

اسے ہم نے ایک چٹانی دیوار کے سہارے پر ٹکا کر نیم دراز کر رکھا تھا۔ تھوڑی دیر تک سستانے کے بعد میں نے نانا شکور سے کہا۔

''ہمیں پانی کے چند گھونٹ درکار ہیں، مجھے قریب میں پانی کے ہلکے ہلکے جھپاکوں کی آواز تو سنائی دی ہے، تم یہاں محتاط ہو کر بیٹھو، میں دیکھ کر آتا ہوں......''

میری بات پر نانا شکور نے ہولے سے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی جبکہ سوشیلا میری بات سن کر یکدم ہراساں سے لہجے میں بولی۔

''شش...... شہزی! تم کہیں نہیں جاؤ گے...... ادھر ہی رکے رہو، جائیں گے تو ہم ساتھ، کہیں تم کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جاؤ......'' میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''تم میری فکر مت کرو...... سوشی! پانی ہماری ضرورت ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ پانی کا خاصا ذخیرہ کہیں قریب ہی موجود ہے۔ میں صرف دیکھ کر آتا ہوں، لیکن ابھی ہمارا ایک ساتھ نکلنا بہتر نہ ہوگا۔ ہم اکٹھے ہی آگے بڑھیں گے۔''

میں نے دیکھا اسے میری بات پر کچھ زیادہ تسلی نہیں ہوئی، اس نے ایک نگاہ قریب کھڑے نانا شکور پر ڈالی اور اس سے ملتجیانہ انداز میں بولی۔ ''نانا صاحب! یہ بھی بے چارہ میری طرح زخمی ہے...... اسے مت جانے دو، تم ٹھیک ہو ذرا، تم ہی چلے جاؤ ناں......''

''میں تیار ہوں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' نانا شکور نے اپنے شانے اچکا کر کہا اور خاصی معنی خیز نظروں سے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم ادھر ہی رہو شہزی! مجھے جانے دو...... میرا خیال ہے پانی کی موجودگی اس طرف لگتی ہے۔'' اس نے آخر میں اسی سمت ہی اشارہ کیا تھا جہاں میرا بھی محتاط اندازہ تھا۔

وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اب وہاں چٹانی پتھروں کے اس مختصر سے دامن میں سوشیلا اور میں رہ گئے تھے۔

نانا شکور اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔ وقت جیسے چیونٹی کی رفتار سے گزر رہا تھا، جبکہ ایک ایک لمحہ اندیشوں بھرا محسوس ہوتا تھا۔ وحشتی رات اس اسرار بھری فضا میں شاید اپنے آخری پہر کے سفر کی طرف گامزن تھی۔ فضا سرد سی ہونے لگی تھی۔ مست خرام ہوا میں نمی کا احساس جوں کا توں موجود تھا۔ البتہ آسمان کی ہیئت کچھ بدلنے لگی تھی۔ وہاں میں نے بادلوں کو ڈیرا ڈالتے ہوئے دیکھا تو متفکر سا ہونے لگا۔

''شہزی! میں تو تم لوگوں کے لیے مصیبت بن گئی......'' معاً سوشیلا نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تم لوگوں کے ساتھ آنے کی ضد نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا سا تھا اور آواز بے چارگی لیے ہوئے تھی، میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم سوشی! تم بھلا ہمارے لیے کیونکر مصیبت بن گئی ہو؟ زخمی تو میں بھی ہوں، اس میں بھلا تمہارا کیا قصور ہے؟''

اچانک کہیں گولی چلنے کی آواز ابھری، ہم دونوں بری طرح چونک کر ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے کہ اس بار برسٹ چلنے کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ میں نے جلد بازی میں کوئی حرکت کرنے کے بجائے آواز کی سمت کا اندازہ لگایا

اور نانا شکور کی طرف سے مجھے کچھ تسلی ہوئی کہ وہ جس طرف گیا تھا وہاں اپنا کچھ نہیں تھا، ورنہ میں اسی طرف کا رخ کرتا۔

یہ آواز اس طرف سے آئی تھی، جدھر ہم نے تھوڑی دیر پہلے وہ سیلانی خیمہ دیکھا تھا۔ جہاں کچھ اسلحہ بدست لوگ الاؤ جلائے بیٹھے تھے اور ان کے ہمراہ ایک جوان عورت بھی تھی۔

”یہ..... فائرنگ کی آواز کیسی ہے؟“ سوشیلا نے کہا۔ میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس سے کہا۔

”مجھے صورتِ حال کا جائزہ لینا ہوگا، تم گھبرانا مت، میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں اس طرف کو بڑھا جدھر سے فائرنگ کی آواز آئی تھی۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ دوبارہ برسٹ چلا۔ اس بار آواز کچھ قریب سے آئی تھی۔ میں نے ایک چٹانی چھجے پر چڑھ کر دوسری طرف نیچے ذرا دور جھانکا، چاند کی روشنی وہاں تک پھیلی ہوئی ضرور تھی مگر اس طرف گھنے درختوں اور قد آدم جھاڑیوں کی کثرت کے باعث کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میں کچھ سوچ کر واپس پلٹا اور چاہتا تھا کہ نانا شکور کے پیچھے جاؤں، میں نے اسے سوشیلا کے پاس دیکھ لیا تو سکون کی سانس لی۔

”یہ فائرنگ کی آواز کیسی تھی؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”لگتا ہے یہ سیلانی خیمے والے تھے، کیونکہ آتشی ہتھیار ان کے سوا اور کسی کے نہیں ہو سکتے، ان لوگوں کا بھی شاید ان وحشیوں سے ٹکراؤ ہو گیا ہے۔“ میں نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ نانا شکور بولا۔

”ہرگز نہیں۔“ میں نے اس کے خیال سے صریحاً اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اب یہاں سے ہلنا بھی مت اور ادھر ہی سوشیلا کے پاس رکے رہو..... میں ذرا آگے جا کر.....“ آواز میرے منہ میں ہی دب گئی۔

اسی وقت دوبارہ مختصر سا برسٹ فائر ہوا جو بے حد قریب تھا۔ یہاں تک کہ مجھے ایک سے زائد افراد کی چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ میرے اعصاب یک لخت تن گئے۔ میں نے نانا شکور کو مخصوص اشارہ کیا اور پھر وہ میرا اشارہ سمجھ کے ایک طرف کو آگے بڑھا اور میں نے اپنی پیش قدمی کا رخ اس طرف موڑا جدھر سے مجھے فائرنگ اور چیخوں کی آواز آئی تھی۔ اچانک مجھے کسی کے دوڑنے اور ہانپنے کی آوازیں سنائی دیں، وہ نائٹ پینٹ شرٹ میں ملبوس آدمی تھا، اس کے ہاتھ میں گن تھی، ٹھیک اسی وقت اس کی کربناک چیخ ابھری اور وہ منہ کے بل گرا تو میرے قدموں کے بالکل قریب تھا، اس کی پشت میں پہلو کے قریب ایک تیر پیوست ہو چکا تھا۔

لامحالہ میری نظر اس طرف پڑی جہاں سے وہ دوڑا چلا آ رہا تھا، وہاں میں نے دو وحشیوں کو دیکھا، ان میں ایک کے ہاتھ میں تیر کمان اور دوسرے کے سنان تھی۔

وہ اپنے شکار کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ میں اپنی جگہ پر ہی دبک گیا۔ تاہم میری نظریں اسی بدنصیب آدمی پر جمی ہوئی تھیں جوان کا شکار ہوا تھا، میں یہ دیکھ کر چونکا تھا کہ وہ ابھی زندہ تھا اور ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ گرنے کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے گن بھی چھوٹ گئی تھی، وہ یقیناً خالی ہو گئی تھی، ورنہ وہ ان سے جان بچانے کی کوشش میں بھاگنے کے بجائے ان پر فائر ضرور کھولتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے پاس فاضل گولیاں بھی ہوتیں، مگر اسے گن لوڈ کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔

پل کے پل میں نے ہونٹ بھینچ کر کچھ سوچا اور پھر ان دونوں وحشیوں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا۔ سنان بدست وحشی نے اپنے شکار کو زندہ پا کر اپنی سنان اس کی پشت میں گھونپنے کے لیے بلند کی ہی تھی کہ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس پر جا پڑا، اس کا دوسرا ساتھی اس اچانک افتاد پر بوکھلا گیا، میں نے اپنے شکار کے جبڑے پر پوری قوت سے گھونسا رسید کیا تھا، وہ گھوم کر گرا تھا اور اس کی سنان میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کا ساتھی اپنی پشت پر بندھے ترکش سے تیر نکال کر کمان کے چلے پر چڑھا ہی رہا تھا کہ میں نے سنان اس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ اس کے حلق سے ابھرنے والی چیخ بڑی کربناک تھی۔

میں نے سنان واپس کھینچی تو وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا۔ اس کا دوسرا ساتھی مجھ سے مقابلہ کرنے کے بجائے عجیب سے انداز میں چیختا چلاتا ہوا ایک طرف کو دوڑا۔ اس کی چیخ کے مخصوص آہنگ سے میں نے پل کے پل اندازہ لگایا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو اس طرف پکار کر بلانا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے اور بھی ساتھی یہاں موجود تھے۔ میں نے اس زخمی کو سنبھالا دینا چاہا۔

”آوے.....“ وہ کراہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے

منع کیا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ تیر سے گھائل ہونے کے بعد ہلنے جلنے سے بھی قاصر تھا۔

میں نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے کی کوشش چاہی تو بری طرح ٹھٹکا۔ وہ بری رنگ و نسل کا معلوم ہوا۔ چونکہ میرا مقابلہ سے جی کوہارا کے بری ساتھیوں سے ہوتا رہا تھا، اسی لیے مجھے اس کی مخصوص بر میوں والی شبیہ نے اس بات پر چونکا دیا تھا کہ وہ یقیناً سے جی کوہارا کا ساتھی ہی تھا۔ وہ مجھے آخری سانسوں میں لگ رہا تھا۔ میں نے اسے سنبھالا دیا اور پوچھا۔

"تم کون ہو؟ اور یہاں ان کے ہتھے کیسے چڑھ گئے؟ کیا تمہارے اور ساتھی بھی ہیں؟" میں نے اس سے انگلش میں کہا تھا۔ پہلے اس نے بری زبان میں کچھ کہنا چاہا تھا، مگر مجھے انگلش بولتے پا کر اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بہ مشکل کہا۔

"تت... تم لوگ... کک... کون ہو؟"

"ہم اپنے ایک پاکستانی دشمن شہزاد احمد خان شہزی کی تلاش میں آئے ہیں یہاں، کیا تم اس کے بارے میں ہمیں کچھ بتا سکتے ہو؟" میں نے اپنی زیرک مغزی سے کام لیتے ہوئے اس سے وہی کہا جو میرے ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کا بھی ایک مقصد ہو سکتا تھا۔ یہ بتاتے ہوئے میں نے اس کے ستے ہوئے بشرے کا بہ غور جائزہ بھی لیا تھا۔ حسب توقع اس کے چہرے پر، باوجود نیم مردنی کے کچھ ایسے تاثرات ابھرے تھے کہ میرا اندھیرے میں پھینکا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر لگا ہو۔ بولا۔

"تت... تم کہیں، بب... بلیو تنگی کے... آہ..." تکلیف کے باعث وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔

"ہاں... ہاں! ہم انہی کے ایجنٹ ہیں اور ہماری ایک ساتھی کوریلا بھی ادھر ہی کہیں موجود ہے۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ وہ اپنے کچھ ساتھیوں کی تلاش میں ادھر آیا ہوا ہے۔"

"کک... کوہارا کو جانتے ہو تم؟" وہ بولا۔

میرا دل یک بیک زور سے دھڑکا۔ ترنت بولا۔

"ہاں...! کدھر ہے وہ؟"

"وہ ادھر ہی... ہے اور... اور..." اس کی آواز ڈوبنے لگی۔

"ہاں... بولو، بولو کدھر ہے وہ؟" میں جوش سے بولا۔ اس کے چہرے پہ موت کی زردی چھانے لگی تھی۔ وہ بہ مشکل بتانے لگا۔

"تت... تمہاری ساتھی کک... کوریلا ہمارے ساتھ ہی ہے، وہ بھی باس کے ساتھ ادھر ہی..." اسی وقت اس نے ایک ہچکی لی اور دم توڑ گیا۔

میں بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ایک بات کی تصدیق تو ہو گئی تھی کہ وہ سیلانی خیمے والے سے جی کوہارا کا ہی گروپ تھا اور وہ عورت کوریلا ہی تھی۔ مگر یہ جاننے کی ضرورت تاحال تھی کہ اب وہ کہاں تھے؟ یہ بات طے تھی کہ ان لوگوں کا ہی ٹکراؤ کل مخارو وحشیوں سے ہوا تھا اور اس کی وجہ ہم ہی ہو سکتے تھے، کیونکہ یہ وحشی ہم سے لڑتے ہوئے ہمارے تعاقب میں ہی یہاں تک آئے تھے اور یہ ممکن تھا کہ ان کی نظروں میں یہ لوگ بھی آ گئے ہوں گے مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ لوگ (کوہارا اور کوریلا) اب کہاں تھے؟ آیا ان وحشیوں کے ساتھ لڑتے ہوئے کہیں مر کھپ گئے تھے یا پھر کہیں اریب قریب جا چھپے تھے۔

بہرکیف کوہارا وغیرہ کی یہاں موجودگی کا مجھے ایک ہی مقصد سمجھ میں آتا تھا کہ وہ مجھے زیر کرنے کی نیت سے میرے تینوں ساتھیوں، اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا کو قابو کرنے کے لیے ہی یہاں آئے تھے، مگر مجھے اپنے اس خیال سے خود ہی اختلاف ہوا۔

یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر سکی تھی کہ چلو کوریلا کی موجودگی تو یہاں سمجھ میں آتی تھی کہ وہ پہلے ہی سے کرنل سی جی بجوانی کے حکم پر یہاں موجود تھی مگر کوہارا اس پُرخطر وادی میں کیسے اور کیوں کر ٹپک پڑا تھا؟ پھر کوریلا ان کے ساتھ کس طرح جا ملی تھی؟ کافی جواب طلب تھے۔

ابھی میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ اچانک میں نے دائیں جانب آہٹ سنی، میں چونک کر مڑا اور بے اختیار ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا، وہ نانا شکور تھا۔ اس کے ہاتھ میں ستانی تھی۔ میں نے مردہ بری کی تلاشی لی تو اس کے قبضے سے مجھے فاضل راؤنڈ کا ایک میگزین مل گیا۔ وہ میں نے اپنے قبضے میں کیا اور اس کی گن بھی اٹھالی، میگزین میں نے گن سے اٹیچ کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"یہ کس کی لاش ہے؟ تم نے اسے ہلاک کیا؟" نانا نے پوچھا۔

"نہیں یہ وحشیوں کا شکار ہوا ہے، اس کے پہلو میں زہریلا تیر پیوست ہے۔ واپس چلو، وحشی ادھر پہنچنے والے ہیں۔" میں نے اسے ساری بات بتا دی اور ہم سوشیلا کے پاس آ گئے تو یہ دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا لگا کہ اس کی حالت

بہت ہی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ وہ اپنی ٹانگ پکڑے بُری طرح سسک کر رو رہی تھی۔ ٹانگ کا زخم خراب تو ہو ہی رہا تھا، مگر اس کی ٹانگ بھی پھول کر کپا ہونے لگی تھی، وہ بے چاری اب کسی سہارے سے چلنے پھرنے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔

"پپ...... شہزی! تمہیں خدا کا واسطہ...... مم۔۔۔ میری یہ ٹانگ کسی طرح کاٹ ڈالو، بہت درد ہو رہا ہے، آہ۔۔۔ مم۔۔۔ میں درد برداشت نہیں کر پا رہی ہوں۔"

وہ روتے ہوئے مجھ سے بولی۔ اس کی بے چارگی اور ہیئت کذائی پر میرا اپنا دل بھی دکھنے لگا تھا۔ اس کا خوبصورت چہرہ اس وقت اذیت کے مارے مسخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ درد اور اینٹھن کی شدت سے وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔

"تمہیں منع تو کیا تھا ہم نے کہ مت آؤ ہمارے ساتھ...... اب بھگتو اس درد کو، بلکہ اب تو ہمیں بھی تمہیں بھگتنا پڑے گا...... مصیبت کی طرح۔"

نانا شکور نے بر ہمی سے کہا تو اس کی بے حسی پر میرا دماغ الٹ گیا۔ میں اس کی طرف گھوما اور ایک زوردار گھونسا اس کے چہرے پر جڑ دیا۔ میرے بھاری ہاتھ کا گھونسا کھا کر وہ چند قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا تھا۔ میں نے گھورتے ہوئے پُرطیش لہجے میں کہا۔ "دوبارہ سوشیلا کے لیے ایسی بات اپنے منہ سے مت نکالنا نانا۔۔۔! ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

گھونسا کھانے کے بعد اس کے نچلے ہونٹ سے خون کی پتلی لکیر کھنچ آئی تھی، جسے اس نے اپنے ایک ہاتھ سے پونچھتے ہوئے میری جانب پُرغیظ نظروں سے گھورا تھا، غصے سے اس کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا، لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ایک گہری سانس خارج کر کے شاید اپنے اندر کے امڈتے ہوئے ابال پر قابو پایا اور اپنا دایاں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"اٹس او کے۔۔۔ میں شاید غلط کہہ گیا تھا۔۔۔ سوری۔۔۔"

مجھے اس کی بات پر جس قدر غصہ آیا تھا وہ اسے گھونسا رسید کرنے اور اس کے "سوری" کہنے پر اب بتدریج فرو ہونے لگا، لیکن میرے اندر کی وہ کثافت پھر بھی نہ دھل سکی تھی جو اس نے سوشیلا کے بارے میں ایسے سفاکانہ اور بے حیایانہ الفاظ کہہ کر میرے اندر پیدا کر دی تھی۔

"پپ...... پلیز! میری وجہ سے تم دونوں آپس میں مت لڑو۔۔۔ ہم سب خطرے میں گھرے ہوئے ہیں، میں اپنی غلطی پر پشیمان ہوں۔۔۔" سوشیلا نے کراہتے ہوئے مشکل کہا تو میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"سوشی! ہمت سے کام لو۔۔۔ مایوس کیوں ہوتی ہو؟ میں ساتھ ہوں ناں...... اللہ پر بھروسا رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حالات مخدوش ضرور ہیں مگر مجھے یقین ہے، یہ بہت جلد بہتر ہو جائیں گے۔"

میری بات پر اس نے نیم بازسی نگاہوں سے مجھے دیکھا، اس کے لبوں پہ ایک پھیکی پھیکی سی مگر حوصلہ لیتی مسکراہٹ چمکی تو تھی مگر اس کا چہرہ اس کی معدوم پڑتی ہمت کا ساتھ دیتا ہوا نہیں محسوس ہوتا تھا۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں، میں نے دھیرے سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو وہ تپ رہی تھی۔ اسے تیز بخار نے بھی آلیا تھا۔ سوشیلا کی طرف سے میری پریشانی اور تشویش بڑھنے لگی، اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی جو سردست مجھے مشکل ہی نظر آتی تھی۔

میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور بولا۔

"سوشی! ہمیں یہاں سے آگے نکلنا ہوگا، تم حوصلہ رکھو، میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے جب سوشیلا کو اٹھانا چاہا تو وہ بُری طرح کراہ کے رہ گئی۔

"اب یہ کاندھوں پر اٹھائے جانے کے قابل بھی نہیں رہی ہے۔" نانا شکور نے کہا اور میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچنے لگا تو وہ بولا۔ "فکر نہ کرو، میں کچھ ٹہنیوں اور جھاڑیوں کا اسٹریچر بناتا ہوں، تم ادھر ہی اس کے پاس رکو، مگر محتاط رہنا، ہم اب بھی دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔

"یہ گن لے جاؤ اپنے ساتھ اور اپنا تیر کمان مجھے دے دو۔"

"رہنے دو...... تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔" نانا نے میری طرف دیکھے بغیر اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر کہا اور جھاڑیوں کی طرف چلا گیا۔

"آدمی سخت ہے، مگر دل کا برا نہیں ہے، تم اس کی باتوں کا برا مت منانا سوشی! نہ ہی اپنے دل پہ لینا۔" میں نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ سوشیلا سے کہا تو اس نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں گن ہاتھ میں لیے وہیں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

وقت اندیشناک اور وسوسہ انگیز لمحات کی دھمک دیتا، بھاری سل کی طرح دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ ہر سو گھمبیر سی سنسناتی ہوئی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پتا کھڑکا اور دل دھڑکا جیسی صورت حال تھی۔

نانا شکور کا کہنا درست تھا۔ سوشیلا کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اب یہ کاندھوں پر بھی اٹھائے جانے کے قابل نہیں رہی تھی، اس طرح اس کی سوجی ہوئی ٹانگ کا درد بڑھنے لگتا، بلکہ یہ مزید خراب ہو سکتی تھی، اس کا زخم خراب ہو رہا تھا اور کافی سے زیادہ سیپٹک ہو چکا تھا۔

گن میرے ہاتھ میں تھی اور میں سوشیلا کے قریب بیٹھنے سے کترا رہا تھا، پتا نہیں کیوں وہ مجھے قریب پا کر اول فول بکنے لگتی تھی، بہت مایوسانہ باتیں کرنا شروع کر دیتی تھی۔ یہ سب میرے لیے پریشانی کا سبب بن سکتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد نانا شکور بہت سی خشک جھاڑیاں اور ٹہنیاں اور توڑ لایا، ان میں درختوں کی چھال بھی تھی۔ وہ اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک بڑے سے گٹھر کی صورت میں لایا تھا۔

اس کے بعد میں نے بھی اس کا ہاتھ بٹانا ضروری سمجھا، یہی وجہ تھی کہ ہم نے تھوڑی سی دیر میں ہی ایک ”گزارے لائق“ اسٹریچر بنا لیا۔ ٹہنیوں کو لپیٹ کر اس کی رسی بنالی گئی تھی اور اس کی مدد سے جھاڑیوں اور درختوں کی چھال کو پھیلا کر ان سے نتھی کر لیا اور باقی ٹہنیوں کی ایک لمبی سی رسی کھینچ دی تھی، جسے جسم کے گرد لپیٹ کر اسٹریچر کو بہ آسانی گھسیٹا جا سکتا تھا۔ میں نے اور نانا شکور نے سوشیلا کو احتیاط سے اٹھا کر اس اسٹریچر پر لٹا دیا۔

”مجھے اگر ایک مخصوص پودے کی جڑی بوٹی مل جائے تو میں اسے پیس کر سوشیلا کے زخم پر لگا دوں گا، میں نے تلاشنے کی کوشش کی تھی، مگر نہیں نظر آیا وہ پودا۔“ نانا اسٹریچر کی ٹہنی نما رسی کو اپنی پشت پر باندھتے ہوئے بولا تو میں نے فوراً کہا۔

”یہ میں کر لیتا ہوں، تم......؟“

”نہیں، تمہارے پاس گن ہے اور تم ہماری حفاظت کے لیے ساتھ چلتے رہو گے۔“ اس نے انکار کیا۔ میں نے اپنی گن کی چال درست کی اور پھر ہم آگے بڑھ گئے۔

اسی وقت مجھے شور کی سی آواز سنائی دی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے شک تو تھا کہ جو آخری وحشی مجھ سے بچ کر چیختا چلاتا ہوا بھاگ نکلا تھا وہی اپنے ساتھیوں کو اس طرف نہ لے آیا ہو۔ میں نے نانا سے اپنے اسی خدشے کا اظہار کیا تو وہ بولا۔

”ہمیں ان سے الجھنے کے بجائے چلتے رہنا چاہیے، جتنے یہ ہمارے ہاتھوں مریں گے اس سے زیادہ تعداد میں یہ دوبارہ ہمارا راستہ روکنے کے لیے آجائیں گے۔“

میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا اور ہم محتاط روی سے آگے بڑھتے رہے۔

سوشیلا کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں یہاں سے اس وقت تک نہیں ہٹتا جب تک کوریلا اور کوہارا کو نہ چھاپ لیتا، کیونکہ وہ دونوں خبیث بھی ادھر ہی کہیں اریب قریب میں موجود تھے۔

ہم آگے بڑھتے رہے اور میری نظریں تیزی سے گرد و پیش میں گردش کر رہی تھیں۔ وحشیوں کا ٹولا کہیں دور تھا، اور ہم ایک اندازے سے ان کی مخالف سمت میں بڑھ رہے تھے۔ ہمارے دائیں جانب اندھیری گہری گھاٹیاں تھیں اور بائیں طرف سنگلاخ کالی چٹانیں تھیں۔

ہم انہی کے درمیان راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ چاند کہیں دور جا چھپا تھا، تاروں کی روشنی میں ہم پراسرار ہیولوں کی صورت آگے بڑھ رہے تھے۔

ایک مقام پر اسٹریچر کی رسی ٹوٹ گئی۔ ہمارا سفر تھم گیا۔ مگر نانا شکور نے چند ہی منٹوں میں وہ رسی کسی طرح دوبارہ جوڑ لی اور ہم پھر آگے بڑھ گئے۔

ہم اب اس چٹانی وادی کے دامن میں آ گئے تھے جہاں جا بجا قد آدم جنگلی جھاڑیاں اور گھنے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، ایک جگہ پر ہمیں بہتی ہوئی نہر سی دکھائی دی۔ ہم اس کے کنارے آ گئے۔ ہمارے عقب میں سیاہ چٹانوں کے کوہان کسی خوابیدہ عفریت کی طرح جھکے جھکے نظر آ رہے تھے۔

ہم نہر کے کنارے آ گئے اور اپنے ہاتھوں کی اوک میں پانی لے کر پینے لگے۔ پانی صاف اور میٹھا تھا۔ اسی اوک میں پانی بھر بھر کر میں نے سوشیلا کے لبوں سے بھی لگایا۔ نانا کچھ سیر ہونے کے بعد مجھ سے یہ کہہ کر ایک طرف تاریک جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا کہ وہ اس پودے کی تلاش میں جا رہا ہے، جسے پیس کر اس کا لیپ سوشیلا کی ٹانگ کے زخم کے لیے کارآمد ثابت ہو سکے گا۔

ادھر جب میں تیسری بار اپنے ہاتھوں کی اوک میں پانی بھر کر اس کے چہرے کی طرف لے گیا تو وہ بے اختیار سسک پڑی، اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ اتر آئی۔ وہ اپنا منہ پھیر کر رو پڑی۔ پانی میری اوک سے قطروں کی صورت ٹپک کر اس کی مسکی ہوئی شرٹ پر گرنے لگا۔ میں نے باقی ماندہ پانی پھینک کر اسے سنبھالا دیا اور بڑی ملائمت سے بولا۔

”کیا ہوا سوشی؟ کیوں رو رہی ہو تم......؟“ میری

بات پر اس نے اپنی آنکھوں کی جھلملاتی نمی کو پونچھا اور دلگیر لہجے میں بولی۔

"شہزی! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں......"

"ہاں! کہو...... مگر پلیز، اس طرح رو کر مت کرو...... حوصلہ رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"شہزی! مجھ سے ایک وعدہ کرو...... اگر...... اگر میں زندہ نہ رہی تو...... تم اس ظالم درندے ایڈوانی سے میری بہن اور اس کی فیملی کے قتل کا انتقام ضرور لو گے۔" اس کی بات نے مجھے دکھ کے ایک گہرے احساس تلے رنجور سا کر دیا۔ اس کی حالت گویا اس نہج پر آگئی تھی کہ وہ بے چاری اپنی زندگی سے ہی مایوس ہونے لگی تھی۔ اسے ایسی باتیں کرتے دیکھ کر میرا اپنا دل دکھ سے بھر گیا اور میں نے بے اختیار ایک دوستانہ اپنائیت سے اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا اور بولا۔

"سوشی! تمہیں کچھ نہیں ہوگا، تم میرے ساتھ اس سفاک آدمی ایڈوانی سے اپنی بہن اور اس کے معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لو گی، لیکن ایسی مایوسانہ باتیں مت کرو، نانا شکور جڑی بوٹی ڈھونڈنے گیا ہے، مجھے لگتا ہے کہ وہ یہاں کا اور ایسے حالات کا عادی ہے۔ مجھے امید ہے وہ تمہارے علاج کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا اور تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی......"

میری بات پر اس کے چہرے پر پھیکے پن کے تاثرات ابھرے تھے جیسے وہ سمجھ رہی ہو کہ یہ سب محض ایک بہلاوے کے سوا کچھ نہ تھا، پھر دفعتاً ہی میں نے اس کے دکھ سے ستے چہرے پر ایکا ایکی خوف اور ہراس کے آثار اُمڈتے دیکھے، جس نے مجھے بھی ٹھٹکا دیا، اس کی ذرا دیر پہلے نمناک آنکھوں میں اب پل کے پل دہشت اتر آئی تھی اور پھر میری پشت کی جانب خوف زدہ سی نگاہوں سے تکتے ہوئے اس کے لبوں پر ارتعاش ابھرا۔ وہ اسی طرح کپکپاتی آواز میں اسی سمت دیکھتے ہوئے بولی۔

"ششش...... شہزی! وہ...... وہ......" کہتے ہوئے اس نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلی کا میری پشت سے پرے اشارہ بھی کر ڈالا۔ میں نے یک بیک گردن موڑ کر اپنے عقب میں دیکھا اور دوسرے ہی لمحے میری سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔

☆☆☆

تاروں بھری مدھم مدھم سی روشنی میں، سبک خرام بہتی، جھلملاتی نہر کے کنارے ایک خاصا جسیم شیر ایستادہ دونوں ٹانگوں پر جھکا پانی پی رہا تھا۔ یہ کالے رنگ کا شیر تھا، جو صورت سے ہی خوفناک اور کریہہ معلوم ہوتا تھا، اس کے سیاہ بھیانک جبڑوں سے خونخواری ٹپک رہی تھی۔

ابھی میں اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ معاً اسی جیسے دو تین اور سیاہ رنگ کے شیر وہاں آن موجود ہوئے اور نہر کے کنارے بہتے پانی کی سطح میں تھوتھنیاں ڈال دیں۔

"ششش...... ششش...... آواز بالکل مت نکالنا......" میں نے دم بخود سی سرگوشی میں سوشیلا سے کہا تھا۔ اس نے خوف کے مارے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا، جو واضح طور پر اس کے پورے وجود کی کپکپاہٹ کی غمازی کرتا محسوس ہو رہا تھا۔

گن مجھ سے ذرا فاصلے پر پڑی تھی۔ ان خوفناک اور خونخوار درندوں کی دہشت ہی ایسی تھی کہ اس نے مجھے ساکت سا کر کے رکھ دیا تھا۔ مجھے زیادہ فکر نانا شکور کی طرف سے ہو رہی تھی، جو اسی سمت جھاڑیوں کی طرف گیا تھا، جہاں اسے مخصوص جڑی بوٹی والے پودے کی تلاش تھی۔

میں اب یہی دعا مانگ رہا تھا کہ کاش! نانا شکور کی بھی ان درندوں پر نگاہ پڑ جائے اور وہ وہیں محتاط ہو کر فوراً چھپ جائے۔

وہ چاروں کالے شیر پانی پینے میں مصروف تھے۔ میں نے سوشیلا کو اشارے سے ہی کسی بھی قسم کی آواز نکالنے سے منع کر دیا تھا اور خود نہایت دھیرے سے اپنی گن کی طرف سرکنا شروع کیا تو اسی وقت پہلے والے شیر نے پانی کی سطح سے اپنا تھوتھنا نکالا اور ہوا میں منہ کر کے کچھ سونگھنے کی کوشش کرنے لگا، اسی وقت وہ ہولے سے غرغرایا...... میں اپنی جگہ رک گیا۔

اس نے شاید "آدم بو" سونگھ لی تھی اور اب وہ میری طرف ہی اپنی مقناطیسی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اف...... کس قدر تیز سرخ اور چمک دار آنکھیں تھیں اس درندے کی جس میں خونخواری کا عنصر غالب تھا۔ وہ یک ٹک میری جانب گھورتا رہا اور میرا پورا وجود جیسے اس کی مقناطیسی نظروں کے سامنے "ہپناٹائزڈ" ہو گیا۔ گویا ہم دونوں ہی اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہے تھے۔

میں نے گن کی جانب اپنی پیش قدمی اسی وقت ہی موقوف کر دی تھی۔ چہ جائیکہ وہ مجھ پر حملہ نہ کر دے۔

اس ایک شیر کا حملہ کرنے کا مطلب ہوتا اس کے باقی ساتھی بھی ہم پر پل پڑتے۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی بھی کہ ایک دم گن اٹھا لوں مگر میں نے اپنی اس نادانی کو

دبائے رکھا۔ یہ شکاری درندے تھے، کوئی عام جانور نہیں کہ ایک گن سے ہلاک ہو جاتے، انہیں مارنے کے لیے مخصوص قسم کی طاقت ور اور بھاری گنیں مستعمل ہوتی تھیں، اسی لیے میں نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ ان سے "پنگا" لینے کے بجائے، کنی کترائی جائے اور یہی میں کر رہا تھا۔

اسی وقت دوسرا شیر بھی پانی پی کر سیر ہو گیا اور اپنے پہلے والے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا۔ تب ہی اس کی بھی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ ہولے سے غرایا...... پھر اس کا پہلا والا ساتھی، اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا۔

رات کی اس تاروں بھری روشنی میں نہر کے کنارے ان چاروں شیروں کی سیاہ چکنی جلد چمک رہی تھی اور آنکھوں سے خونخواری مترشح تھی۔

جلد ہی یہ چاروں میری طرف سے توجہ ہٹا کر آپس میں اٹکھیلیاں کرتے رہے۔ میں نے ذرا سکون کا سانس لیا۔ وہ اب جانے کے لیے پر تولے ہوئے تھے...... اور میں کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ کر کے انہیں اپنی طرف مائل بہ حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ میرے پاس اب موقع تھا کہ میں اپنی گن آگے بڑھ کر اٹھا لیتا۔

یہی وہ وقت تھا جب یہ چاروں آپس میں "دھینگا مشتی" کرتے ہوئے، ایک طرف کو تاریک جنگل کی طرف بڑھنے والے تھے کہ اچانک ان میں سے ایک نے زوردار دہاڑ ماری۔ تیسرے نمبر والے شیر نے جس طرف اپنا خونخوار تھوتھنا اٹھا کر دہاڑ ماری تھی، میری نظریں بھی غیر ارادی طور پر اسی طرف کو اٹھی تھیں اور اگلے ہی لمحے میرا چہرہ فق ہو گیا...... وہاں نانا شکور کھڑا تھا...... اس کے ہاتھ میں کچھ جھاڑی نما ڈنٹھل سا تھا، جو اس نے اپنے پیروں پر پھینک دیا تھا اور اپنی پشت سے کمان اور تیر کھینچ کر اس نے چلے پر تیر چڑھا لیا تھا۔ میرے لیے اس کی یہ حرکت خودکشی کرنے اور اپنی موت کو از خود دعوت دینے کے مترادف تھی۔ تیسرے نمبر والے شیر کو شاید اس کی یہی حرکت بری لگی تھی اور اسی لیے اس نے غصے میں آکر دہاڑ ماری تھی۔

"نہیں نانا...... ! تیر مت چلانا...... یہ سب تمہیں چیر پھاڑ ڈالیں گے......" مجھے بے اختیار چیخنا پڑا تھا۔ میری تیز آواز پر باقی تین شیر میری طرف دیکھ کر غرانے لگے۔ ان کا انداز بتدریج جارحانہ اور خونخوار ہوتا جا رہا تھا۔

ادھر نانا شکور کو گھورنے والا شیر اس کی طرف غراتے ہوئے لپکا اور نانا شکور نے اپنے دفاع میں اور کوئی چارہ نہ دیکھتے ہوئے اس پر تیر چلا دیا۔ تیر شیر کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ اس نے ایک دل دہلا دینے والی دہاڑ ماری اور وہیں سے ہی نانا شکور پر جست بھری، شکر تھا کہ نانا شکور نے اس کے تیور پہلے ہی بھانپ لیے تھے۔ اس نے تیر چلانے کے فوراً ہی بعد اپنی جگہ بدلی تھی اور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

ادھر میری طرف لپکنے والے تین شیر اپنے ساتھی کی دہاڑ پر رک گئے اور دوسری طرف متوجہ ہوئے۔

میں نے اب ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنی گن اٹھا لی، ان میں سے چوتھا شیر غراتے ہوئے میری طرف لپکا۔ میں نے اس پر پورا برسٹ چلا دیا۔

گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور شیر اچھل کر گرا۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔

گولیوں کی مہلک بوچھاڑ نے اس کی گردن چھید ڈالی تھی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے اور ہانپنے لگا۔ باقی شیر گولیوں کی گھن گرج سے بری طرح بدکے اور نہر والی جنگلی جھاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ نانا شکور کے پیچھے لپکا ہوا شیر بھی نجانے کدھر غائب ہو گیا تھا اور خود نانا شکور بھی۔

میرے اعصاب تنے ہوئے تھے اور رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی، ان خونخوار درندوں سے نبرد آزمائی کا یہ میرا پہلا ہی موقع تھا۔ خود مجھ پر ان خونخوار درندوں کی وحشت سی طاری تھی۔

مجھے نانا شکور کی فکر ہوئی مگر مجھ میں اس طرف جانے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی، جدھر وہ، اپنی طرف لپکتے ہوئے زخمی شیر کے حملے سے بچ کر غائب ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر مڑ کر سوشیلا پر ڈالی۔ وہ بے چاری بھی بری طرح وحشت زدہ تھی اور خوف سے اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا، ٹانگ کے زخم کی وجہ سے وہ پہلے ہی ادھ موئی ہو رہی تھی۔ کمزوری اور نقاہت کے باعث اب تو اس سے ہلا جلا بھی نہیں جا رہا تھا۔

میں اس کی طرف آیا اور اسے تسلی دی، اس کے بعد نانا کو آواز دی۔ جواب ندارد...... ناچار میں نے اس کی طرف پیش قدمی کرنی چاہی جدھر وہ غائب ہوا تھا۔ ابھی میں نے ایک قدم اس طرف بڑھایا ہی تھا کہ اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔ نانا شکور اچانک ہی نمودار ہوا تھا۔ اسے سلامت دیکھ کر میں نے سکون کی سانس لی تھی۔ اس نے بھی مسکرا کر اپنا ایک ہاتھ فضا میں بلند کیا تھا اور پھر وہ پودوں کے اس ڈنٹھل کو اٹھانے کے لیے جھکا جو وہ سوشیلا کے لیے توڑ کر لایا تھا کہ اچانک اس کے عقب سے ایک خونخوار غراہٹ ابھری اور میں نے اسی کالے شیر کو نانا شکور کی عقبی تاریک جھاڑیوں سے نمودار ہوتے دیکھا۔

نانا کے پاس اب اس کے حملے سے بچنے کا وقت نہ تھا، شیر نے جست بھری اور وہ نانا شکور پر جھپٹا۔ دونوں گرے اور نانا شکور شیر کی گرفت میں مچلنے لگا، جبکہ شیر کی کوشش تھی کہ وہ اپنے تیز نکیلے دانتوں والے جبڑے میں اس کا نرخرہ دبوچ لے، مگر نانا شکور اسے کوئی ایسا موقع نہیں دے رہا تھا۔ یہ وہی شیر زخمی شیر تھا جس پر نانا شکور نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی تیر چلایا تھا، جو ابھی تک شیر کی گردن میں پیوست تھا۔

میں چند ثانیے کے لیے اپنی جگہ پر سن ہو کر رہ گیا، اور سمجھ میں ہی نہ آسکا کہ کیا کروں، لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی گن سے برسٹ فائر کر دیا۔ یہ دھیان رکھا تھا کہ گولیاں نانا شکور کو پچھاڑنے کی کوشش کرنے والے شیر کے اریب قریب ہی زمین میں پیوست ہوں۔ میری یہ ترکیب کارآمد ثابت ہوئی۔ شیر نے بوکھلا کر نانا شکور کو چھوڑا اور قریب جھاڑیوں کی جانب جست بھری اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے احتیاط کے پیش نظر ان جھاڑیوں کی طرف، جدھر شیر غائب ہوا تھا، ایک برسٹ اور چلا دیا تاکہ وہ موذی پھر کسی موقع کی تاک میں وہیں کہیں دبک گیا ہو تو دور چلا جائے۔

اس کے بعد میں زمین پر پڑے نانا شکور کی طرف دوڑا اور اسے سنبھالا دیا۔ اس کے جسم پر خراشیں تھیں اور چہرے پر بھی سرخ لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔

''شکر ہے، بال بال بچا ہوں، ورنہ تو گیا تھا آج......'' نانا شکور ایک زندہ دل مسکراہٹ سے بولا۔

''تم ٹھیک ہو ناں......؟'' میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں! ٹھیک ہی ہوں دوست! تمہارا شکریہ......'' وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا اور ہولے سے کراہا بھی تھا۔ میں نے ڈنگل اٹھایا اور نانا کے ساتھ چلتا ہوا سوشیلا کی طرف آیا۔

''ان کی ٹہنیوں میں جڑے پتوں کو الگ کر کے نہر کے پانی سے ان کا لیپ بناؤ۔ ذرا جلدی، یہ کالے شیر انتقام اور دشمنی کے معاملے میں ہم انسانوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ جگہ فی الفور چھوڑنا ہو گی۔'' نانا نے سوشیلا کے قریب ہی درخت کے تنے سے پشت ٹکا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس کی بات پر میں نے فوراً عمل کیا اور جلدی جلدی ان مخصوص پودوں کی ٹہنیوں سے پتے نوچ کر الگ کیے اور نہر کے قریب جا کر میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں پہاڑی پتھروں سے پیس کر جیسے تیسے لیپ تیار کیا اور ایک چھال پر اسے رکھ کر ان کے پاس آ گیا۔

''تھوڑا لیپ بچ جائے تو تم اپنے بازو کے زخم اور میری خراشوں پر بھی لگا دینا، کہیں سیپٹک ہی نہ ہو جائے مجھے بھی......''

میں نے سوشیلا کی ٹانگ کے زخم کو دھویا۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگی۔

''دوا اس کے زخم میں لگانے سے پہلے اس کے منہ میں کوئی کپڑا ٹھونس دو، کیونکہ اس دوا کے لگنے سے، اس کے زخم میں مرچوں جیسی آگ لگ جائے گی۔''

''نن...... نہیں، مم...... میں یہ مرہم نہیں لگاؤں گی......'' نانا نے اس لیپ کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ سوشیلا بے اختیار چلا اٹھی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور ہمت دلائی۔

''سوشی! تم تو ایک باہمت اور بہادر عورت ہو...... محض ایک ذرا سی تکلیف پر بچوں کی طرح بلک اٹھی ہو...... یہ تو دیکھو، اس تھوڑی سی تکلیف کے بدلے تمہاری ایک بڑی اذیت ناک تکلیف رفع ہو جائے گی، چلو شاباش ہمت کرو، یہ لو کپڑا، منہ میں دبا لو......''

میرے سمجھانے پر اس نے کچھ ہمت پکڑی اور اپنا منہ کھولا۔ میں نے کپڑے کی ایک دھجی کا گولا بنا کر اس کے منہ میں پھنسا دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے چھال سے لیپ اٹھایا اور اس کی ٹانگ کے زخم پر لگایا، مرہم لگتے ہی سوشیلا مرغ بسمل کی طرح تڑپی اور دونوں ہاتھوں سے میرا شانہ دبوچ لیا۔

''جلدی سے مرہم رکھتے جاؤ......'' نانا بولا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور مرہم کو ہاتھ کی مدد سے اس کے سارے زخم پر لیپ کرتا چلا گیا۔ سوشیلا کا جسم درد اور جلن کے مارے خزاں رسیدہ پتے کے مانند کپکپا رہا تھا۔ اس کی بند آنکھوں کے گوشوں سے آنسو پھوٹ نکلے تھے۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ اس کا کپکپاتا ہوا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ چہرے کی زردی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے شانے پر اس کے ہاتھوں کی گرفت بھی ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔ تنے پر ٹکا ہوا اس کا سر بھی ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ میں نے ازراہ تشویش نانا سے کہا۔

''اسے کیا ہوا......؟''

''فکر کی بات نہیں......'' نانا بولا۔ ''درد کی شدت

سے یہ بے ہوش ہوگئی ہے۔''

''لیکن اس طرح یہ شاک میں جاسکتی ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہ مرہم کا اثر ہے۔ اب بتدریج اس کے زخم پر ٹھنڈک پڑتی جائے گی اور ذرا دیر بعد اسے خود ہی ہوش آجائے گا۔''

اس کے بعد میں نے نانا کی خراشوں پر بھی بچا کھچا مرہم لگا دیا۔ اس نے اپنے دانتوں تلے ایک ٹہنی دبالی تھی۔ تھوڑا بہت میں نے اپنے بازو کی پٹی کھول کر اس پر بھی لگا دیا۔ خاصی تیز ٹیس اٹھی تھی اس مرہم کے لگانے سے جو میں نے اپنے دانت اور ہونٹ بھینچ کر بہ مشکل دبائی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے بیتنے لگا۔ آسمان پر اب سپیدہ سحر کا ملگجا پن نمودار ہونے لگا تھا۔ جنگل میں پرندوں کی چہچہاہٹ گونجنے لگی تھی۔ سامنے نہر کا پانی پُرسکون انداز میں بہہ رہا تھا۔ اس دوران میں نے وہاں کچھ دوسرے جنگلی جانوروں کو کنارے پر آکر پانی پیتے دیکھا تھا۔ ان میں چیتل اور سانبھر بھی تھے اور ہرن بھی۔ چھوٹی نسل کی لومڑیاں اور سوروں کے غول کو بھی دیکھا تھا۔

سوشیلا اب شاید سو رہی تھی اور نانا بھی اسی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے سوگیا تھا۔ اس کے زخم کی جلن پر بھی شاید مرہم کی ٹھنڈک پڑنے لگی تھی۔ تھکا ہوا میں بھی تھا اور نیند سے میرا بھی برا حال ہو رہا تھا۔ اب تو بھوک بھی ستانے لگی تھی۔ میں نے سوچا اگر اسی طرح بیٹھا رہا تو نیند سے بوجھل آنکھیں مجھے بھی بے سدھ سلادیں گی لہٰذا میں گن سنبھالے اپنی جگہ سے اٹھا اور گردوپیش کا جائزہ لیا۔

نہر کے کنارے ہی ذرا فاصلے پر مجھے ایک جھکا جھکا درخت دکھائی دیا جس پر ٹماٹر کی طرح کے گول گول پھل لگے ہوئے تھے۔ میں اس طرف کو بڑھ گیا۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا یہ املوک قسم کا کوئی پھل تھا جسے عام فہم میں جاپانی پھل بھی کہا جاتا تھا۔ رنگ بھی اس کا نارنجی تھا۔ میں نے پہلے ایک توڑ کر کھایا۔ اس کا چھلکا سخت مگر گودا اندر سے نرم تھا۔ میں نے یہ بہت سارے توڑ لیے، اور اپنے ساتھیوں کی طرف آگیا۔ دیکھا تو سوشیلا کو ہوش آچکا تھا۔ اس کا حسین چہرہ ستا ہوا تھا تاہم طبیعت میں اس کی اب کافی بہتری نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد بھی حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے مسکرا کر ملائمت بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''اب کیسا محسوس کررہی ہو؟'' جواباً اس نے ایک نگاہ اپنی ٹانگ کے زخم پر ڈالی اور غیر ارادی طور پر میری نظر بھی زخم پر پڑی اور مجھے کافی حیرت ہوئی۔ لیپ نے اس کا زخم خاصی حد تک خشک کردیا تھا۔ اس میں جو گندا مواد وغیرہ بہہ رہا تھا وہ رک گیا تھا۔ سوجن میں بھی کافی کمی آتی محسوس ہو رہی تھی۔

''میرا خیال ہے زخم ٹھیک ہو رہا ہے.....'' میں نے کہا۔ ''لو یہ پھل کھاؤ...... بہت شیریں ہے۔'' میں نے املوک قسم کا پھل اسے دیا۔

''تم نے کھایا؟'' اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا اور میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ وہ پھل کھانے لگی۔ میں قریب سوئے ہوئے نانا شکور کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ خراٹے لے رہا تھا اور تنے سے لڑھک کر زمین پر آگیا تھا۔

''تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں، شہزی! تم بھی ذرا دیر کو سو لیتے......'' معاً سوشیلا نے مجھ سے کہا۔ ''تم یقیناً ہماری چوکیداری کرتے رہے ہو ساری رات......''

''ہاں! جب وقت ملے گا سونے کا تو سو جاؤں گا مگر ہمیں اب یہاں سے آگے روانہ ہونا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

سوشیلا نے ایک نگاہ قریب بے سدھ سوئے ہوئے نانا شکور پر ڈالی اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ زخم بھرنے اور کچھ افاقہ ہونے کے باعث سوشیلا کی زندہ دلی لوٹ آئی تھی۔

''یہ صاحب تو اس طرح یہاں جنگل میں پڑے سو رہے ہیں جیسے اپنے گھر کے بیڈروم میں ہوں۔''

''نیند تو سولی پہ بھی آجاتی ہے، کیا کرتا بے چارہ! ویسے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، اسی کی کوشش سے تمہارا اتنا خطرناک زخم اب ٹھیک ہونے کو ہے۔''

''ہاں! اس میں کوئی شک نہیں، اس نے بروقت اپنی قابلیت کا استعمال کیا، ورنہ تو میری ٹانگ گلنے کے قریب ہو گئی تھی۔'' سوشیلا کے لہجے میں نانا شکور کے لیے مشکورانہ اعتراف تھا۔ آگے بولی۔

''یہ بے چارہ بھی مرتے مرتے بچا تھا، اف...... کس قدر خوفناک درندے تھے وہ کالے شیر...... جب ایک نے اس پر حملہ کیا تو میں نے خوف سے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ شکر ہوا کہ تم نے بروقت فائرنگ کرکے اسے بچالیا......''

''نانا کا خیال ہے یہ کالے شیر دشمنی اور انتقام کے معاملے میں انسانوں سے کم خطرناک نہیں ہوتے۔ گھات لگا

کہ یہ دوبارہ حملہ کر سکتے ہیں، اسی لیے ہمیں اس جگہ کو جلد از جلد چھوڑنا ہوگا۔''

''یہ تو آرام فرما رہے ہیں، اسے جگاؤ پھر......''

میں نے نانا شکور کو آہستہ سے جھنجوڑ کر جگایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''ارے...... صبح ہوگئی اور ہم ابھی تک ادھر ہی ہیں......'' وہ بوکھلا کر بولا۔ پھر اس کی نگاہ املوک پر پڑی، وہ اس پر ٹوٹ پڑا۔

''تم نے کھائے شہزی؟'' وہ ایک املوک کا گودا نگلتے ہوئے میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ اس کی باچھوں سے رس ٹپک رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے وہاں سے کوچ کیا۔ سوشیلا کو اسی اسٹریچر پر لٹایا تھا۔ ابھی اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنی ٹانگوں اور کسی کے سہارے پر چل سکتی۔

اس بار میں اس کا اسٹریچر کھینچ رہا تھا۔ گن میں نے نانا شکور کو تھمانی چاہی تھی مگر اس نے گن لینے سے انکار کر دیا تھا اور اس نے اپنا تیر کمان ہی سنبھالے رکھا تھا۔

نیند اور تھکن کی وجہ سے میرا سر بھاری ہو رہا تھا اور سوشیلا کو میری اس حالت کا اندازہ تھا، اس نے مجھے سرگوشی میں کہا بھی تھا کہ میں اسٹریچر نانا شکور کو تھما دوں، مگر میں نے انکار کر دیا، کیونکہ اس کی ذمے داری ہم دونوں نے باری باری نبھانی تھی۔ ابتدا میں نانا شکور نے ہی اسے کھینچا تھا اب میری باری تھی۔

اس چٹانی اور نیم ڈھلانی جنگل میں صبح کا ذب کی روشنی پھیلنے لگی تھی اور پرندوں کی چہچہاہٹ سے جنگل گونجنے لگا تھا۔ ہم اس چٹانی اور نیم ڈھلوانی جنگل کے درمیان میں اپنی منزل کی جانب بڑھے چلے جارہے تھے۔

ایک جگہ سے نہر پار کرنا پڑی تو اسٹریچر کو پار لگانے کا مسئلہ کھڑا ہوگیا، کیونکہ نہر پر کوئی باقاعدہ پل نہیں بنا ہوا تھا، عارضی طور پر ایک موٹے تنے والے درخت کا شہتیر دونوں کناروں پر گرا دیا گیا تھا۔ ہم وہیں ٹھہر گئے۔

''میرا خیال ہے کہ اسی طرح نہر کے ساتھ ساتھ تھوڑی دور اور آگے چلا جائے، کیا خبر کوئی باقاعدہ پل نظر آ ہی جائے۔'' میں نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا تو نانا شکور بولا۔

''یہ وقت ضائع کرنے والی بات ہوگی اور کیا معلوم آگے ہمارے لیے کون سی نئی مصیبت تیار کھڑی ہو۔ یوں بھی نہر کو پار کیے بغیر ہماری منزل قریب نہیں ہو سکتی، اسی تنے پر سے نہر پار کرنا پڑے گا۔'' اس کا لہجہ تھا، پھر وہ میرے تذبذب کی وجہ سمجھتے ہوئے بولا۔

''سوشیلا کو تم کاندھے پر ڈال لو...... اور خالی اسٹریچر میں سنبھال لیتا ہوں، ابھی اس کی شاید سوشیلا کو مزید ضرورت پڑے گی، ورنہ میں اسے ادھر ہی پھینک دیتا۔''

میں نے سوشیلا کی طرف دیکھا۔ وہ اسٹریچر پر نیم دراز سی ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے اپنی زخمی ٹانگ کی طرف بے چارگی سے دیکھا۔

''جلدی کرو...... وقت نہیں ہے ہمارے پاس......'' نانا بولا۔

میں نے سوشیلا کو احتیاط سے اٹھایا، اس نے ہونٹ بھینچ کر اپنی تکلیف کو دبانے کی سعی کی اور پھر میں نے اسے اپنے کاندھے پر اٹھا لیا۔

اس کی ٹانگ کا زاویہ بدلا تو اس کے زخم کی اذیت ناک تکلیف جاگ پڑی، باوجود کوشش کے برداشت نہ کر پائی اور کراہنے لگی، میں بھی مجبور تھا لہٰذا اس کی کراہوں کی پروا کیے بغیر پل کی طرف بڑھا۔ میرے عقب میں نانا شکور تھا۔ اس نے اسٹریچر کو لپیٹ کر اپنے کاندھے پر ڈال دیا تھا۔

شہتیر خاصا موٹا تھا، تاہم سیلن اور کائی زدہ ہونے کے باعث وہ کہیں کہیں سے پھسلواں بھی ہو رہا تھا۔ ہم پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھاتے جارہے تھے۔ درمیان میں آکر شہتیر ذرا جھول کھا رہا تھا اور پانی کی سطح سے ٹکراتا بھی تھا۔ اسی سبب یہاں پھسلن زیادہ تھی۔ میں گویا اب سانس روکے ایک ایک قدم بڑے دھیان سے اٹھانے لگا۔

ٹھیک اسی وقت قریب ہی دائیں جانب پانی میں ایک زوردار چھپاکے کی آواز ابھری، جس نے مجھے بری طرح چونکا دیا، بلکہ میرا دھیان پلٹنے کی وجہ سے میں اپنا توازن بھی کھونے لگا تھا، بڑی مشکل سے میں نے خود کو سوشیلا سمیت نہر میں گرنے سے بچایا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ کہیں، نانا شکور نہر میں نہ جا گرا ہو...... تب ہی اچانک نانا شکور کی عقب سے سرسراتی سرگوشی ابھری......

''اپنے پیر جمائے رکھنا شہزی! ہمارے دائیں جانب پانی میں مگرمچھ ہیں......'' اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ میں بھی گوشت پوست کا انسان تھا، اس وقت ہم جیسی صورت حالات سے دوچار تھے، وہاں اچھے اچھوں کا پانی پتا ہو جاتا ہے۔ اس نازک صورت حال میں ہم گویا پل صراط کا سفر طے کر رہے تھے، ایسے میں

مگرمچھوں کے ذکر نے میرے پورے وجود میں سنسنی آمیز سی کپکپی دوڑا دی تھی اور میرے پاؤں ایک لمحے کو لڑکھڑا گئے تھے۔

''شش...... ہوشیار...... پاؤں جمائے رکھو اور یہ گن مجھے دو......'' عقب سے نانا شکور نے مجھے کہا۔

گن میرے بائیں کاندھے سے جھول رہی تھی، میں نے ایک ہاتھ سے سوشیلا کے نرم و نازک وجود کو اپنے دائیں کاندھے پر سنبھالے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے گن کاندھے سے اتار کر نانا شکور کی طرف بڑھائی، وہ مجھ سے نسبتاً بہتر پوزیشن میں تھا، اس نے فوراً گن میرے ہاتھ سے اچک لی اور ایک بار پھر مجھے پیروں پہ جمے رہنے کی تاکید کرتے ہوئے ہوشیار کیا کہ وہ برسٹ فائر کرنے والا ہے، تو میں نے اس سے کہا۔

''ٹھہرو نانا......! اگر ضروری ہے تو فائر کرو، ورنہ......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے برسٹ فائر کردیا۔

یہ میرے لیے اچانک تھا۔ میرے پاؤں ڈگمگا گئے، میں پانی میں گرنے سے بال بال بچا تھا۔ میرے دائیں جانب پانی میں طوفانی ہلچل پیدا ہوئی۔ ساتھ ہی خونخوار انداز میں ایک زوردار غراہٹ کی آواز بھی ابھری۔ میں نے غیرارادی طور پر اپنی گردن موڑ کر اس طرف دیکھا تو وہاں پانی کی سطح سرخ ہونے لگی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے بہت قریب دو غار جیسے بھیانک جبڑوں کو نمودار ہوتے دیکھا، ایک نے نانا شکور کے پیروں پر حملہ کیا تھا جبکہ دوسرے نے میری طرف۔ ان کا حملہ ناکام گیا، میں گرتے گرتے بچا، مگر بدقسمتی سے نانا شکور خود کو نہ بچا سکا اور چیختا ہوا نہر میں جا گرا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پل کے پل مگرمچھوں نے اس پر ہلا بول دیا۔ ساتھ ہی ایک برسٹ چلا۔ یہ اندھا فائر کیا تھا نانا شکور نے۔ اس کے بعد اس کی دردناک چیخوں اور مگرمچھوں کی غراہٹوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

سوشیلا بھی خوف سے چیخنے لگی۔ خونخوار مگرمچھوں کو نانا شکور کی ضیافت اڑانے کے لیے چھوڑ کر میں سوشیلا کو تھامے آگے بڑھنے لگا۔ میں نانا شکور کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے جلدبازی یا خوف کی بوکھلاہٹ میں ایک فاش غلطی کر ڈالی تھی۔ نانا شکور کو ایک مشہور مثال کے مطابق دریا میں رہتے ہوئے مگرمچھوں سے بیر نہیں لینا چاہیے تھا۔

میں کسی نہ کسی طرح دوسرے کنارے پہنچ گیا اور رکا پھر بھی نہیں کہ کہیں وہ بھوکے مگرمچھ میرا پیچھا کرتے ہوئے خشکی پہ ہی نہ آجائیں۔ سامنے گھنا جنگل اور پہاڑیاں تھیں۔ یہاں بھی ویسا ہی منظر تھا جیسا نہر کے دوسرے کنارے پر تھا۔ نہر سے کافی آگے جاکر میں ذرا سستانے کے لیے رکا اور سوشیلا کو اپنے کاندھے سے اتارا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آئے ہوئے تھے۔

نانا شکور ہم سے اچانک بچھڑ گیا تھا۔ میرا ذہن نہیں مان رہا تھا۔ میرا دل و دماغ اس حقیقت کو ماننے سے ہی قاصر تھا کہ نانا شکور کا ایسا بھیانک اور عبرت ناک انجام بھی ہوسکتا تھا۔ میرا دل اس کی یوں اندوہناک موت پر خون کے آنسو رو پڑا اور بےاختیار میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ذرا دیر میں وہ کسی جھاڑی سے، زندہ دل مسکراہٹ کے ساتھ نمودار ہوگا۔ یہ شکر تھا کہ اس نے مجھے کچھ نہ کچھ راستہ سجھا دیا تھا جس کے سہارے میں اپنی اصل منزل کی جانب اپنا یہ پرمصائب سفر جاری رکھ سکتا تھا۔

''شہزی! کک...... کیا نانا شکور واقعی ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا ہے؟'' معاً سوشیلا نے دکھ سے لرزتے لہجے میں مجھ سے کہا۔

''یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا ہے کہ نانا شکور جیسا بہادر اور جاں نثار دوست اب اس دنیا میں نہیں رہا۔'' میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ ''لیکن مجھے اصل دکھ تو اس بات کا ہے کہ نانا شکور کا انجام اتنا بھیانک بھی ہوسکتا تھا۔ وہ آخر کو ہماری مدد کے لیے اور اپنے دوست گھوراجی کی وفاداری میں ہمارے ساتھ ہولیا تھا۔''

''اب تو نانا شکور کا چیپٹر کلوز ہوگیا شہزی! کیا ہماری منزل اب اس کی جانکاہ موت کے بعد بھٹک جائے گی؟'' سوشیلا نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ایسا نہیں ہوگا......'' میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ''نانا شکور نے کافی حد تک ہمیں ہماری منزل تک پہنچا دیا ہے۔''

''پھر بھی نانا شکور کا خلا پُر نہیں ہوسکتا، اس خطرناک اور اہم ترین مہم میں، اس کی کمی ہمیں محسوس ہوتی رہے گی، اس کا ساتھ ہمارے لیے، بالخصوص تمہارے لیے بےحد غنیمت تھا۔'' سوشیلا کا کہنا درست تھا۔ میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کرکے اس کی بات کی تائید کرتے کہا۔

''نانا شکور کا ساتھ میرے لیے واقعی بڑے حوصلے کا باعث تھا۔ اللہ اس کی مغفرت فرمائے...... اس نے ایک نیک کاز کے لیے اپنی جان قربان کی ہے۔ گناہ گار تو ہم سب

ہی ہیں، لیکن کیا پتا اللہ کو اس کی یہ ادا پسند آجائے، اور وہ بخش دیا جائے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے زیرِ لب آمین کہا تھا۔

اچانک سوشیلا خاموش ہوگئی، میری نظر غیر ارادی طور پر اس کے چہرے پر پڑی تو مجھے یوں لگا جیسے وہ کچھ سننے کی کوشش کررہی تھی۔

"خیریت......؟" میں نے ہولے سے بدستور اس کی طرف تکتے ہوئے پوچھا۔

"ششش......ذرا یہ آواز تو سنو......"

اس کی بات پر میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور میں نے اپنی سماعتیں جو توجہ کیں تو معاً ہی میں ٹھٹکا۔ "یہ کسی گاڑی کی آواز ہے......" پہچانتے ہی میں نے کہا اور سوشیلا پریشان سی دکھائی دینے لگی۔

"تم ذرا اس طرف، جھاڑیوں کے اندر دبک کر بیٹھ جاؤ، میں صورتِ حال کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں......"

"ششش......شہزی! پلیز، زیادہ دور مت جانا......"

"بالکل فکر مت کرو...... حالات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ حوصلہ رکھو...... ابھی آتا ہوں میں......" میں اسے تسلی دے کر آواز کی سمت بڑھا۔

میں نہتا تھا، جبکہ سوشیلا کے لیے عارضی طور پر بنایا ہوا اسٹریچر بھی نانا شکور سمیت نہر میں جا گرا تھا۔ اس لیے میں ضرورت سے زیادہ ہی محتاط تھا۔ آواز واضح ہوتی جارہی تھی۔

وہ کوئی گاڑی ہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس دشوار گزار علاقے میں فور وہیلر کس طرح اور کہاں سے آگئی تھی؟ اور نہر پار کیسے پہنچ گئی؟ لیکن یہ کوئی خاص ایشو نہ تھا۔ ایک گاڑی کے ذریعے نہر کنارے کا بہت سارا راستہ پاٹا جاسکتا تھا، ممکن تھا کہ انہیں گاڑی سمیت نہر پار کرنے کا کوئی متبادل رستہ مل گیا ہو، ایک اور بات بھی میرے ذہن میں گردش کرنے لگی۔

یہ کیا ضروری تھا، گاڑی سوار نہر پار سے ہی آئے ہوں، وہ پہلے سے ہی یہاں موجود ہوسکتے تھے، اور کوئی بعید نہیں تھا کہ جنگلی منجارو وحشیوں سے جنگ کے بعد یہ ان کا کوئی حلیف گروپ ہو...... جو ہماری ہی تلاش میں نکلا ہو۔

میں قدِ آدم جنگلی جھاڑیوں اور اونچے نیچے سیاہ پہاڑی پتھروں کی اوٹ لیتا ہوا ایک ڈھلان سر کرکے اوپر کی طرف پہنچا تو ٹھٹک گیا۔ میری نگاہ اسی جیپ پر پڑی جسے میں نے کل رات کو جنابی کے جنگل کی آخری حدود اور نہر کی دوسری طرف پڑاؤ کی صورت میں موجود پایا تھا۔

میں محتاط روی سے چلتا ہوا تھوڑا اور قریب پہنچا۔ سامنے نہر کا کنارا تھا اور اسی کنارے کنارے پرانے ماڈل کی لمبے "ڈالے" والی جیپ کو اسی طرف دوڑے چلے آتے دیکھا، جہاں میں اور سوشیلا تھوڑی دیر کو ستانے کے لیے ڈیرا ڈالے موجود تھے۔

جیپ لحظہ بہ لحظہ اسی مقام کی طرف دوڑی چلی آرہی تھی، مخصوص ساخت کی اس جیپ میں فوریسٹر بند ڈرائیونگ کیبن، اس کا عقبی حصہ کھلا ہوا تھا، جہاں دو مسلح افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ جبکہ ڈرائیونگ کیبن میں بھی مجھے اس کی ونڈ اسکرین سے دو افراد براجمان نظر آئے۔ مگر وہ ابھی پہچاننے میں نہیں آرہے تھے۔

میں ابھی واپس سوشیلا کی طرف پلٹنے کے خیال سے رکا ہی تھا کہ اچانک میں نے جیپ کو رکتے دیکھا۔ میں خود بھی وہیں ٹھہر گیا بلکہ تھوڑا اور قریب پہنچ کر ایک سیاہ اونچے پہاڑی پتھر کی آڑ میں آکر بہ غور ان کی طرف دیکھنے لگا۔

جیپ کے ڈرائیونگ کیبن کا دروازہ کھلا اور دو افراد نیچے اترے تو انہیں دیکھتے ہی فرطِ غیظ و جوش سے میرے پورے وجود کا لہو سمٹ کر چہرے اور آنکھوں میں اتر آیا۔ ان میں سے ایک میرے دشمنوں کی باقیات میں سے تعلق رکھتی تھی، یعنی کورینا اور دوسرا ابتدائیہ سے، وہ سے جی کوبارا تھا۔

اگرچہ سے جی کوبارا کو بھی میں نے یہاں کم زک نہیں پہنچائی تھی اور اس کا بے آف بنگال میں موجود اس کی سپر ٹاپ لگژری بوٹ کی صورت میں نیٹ ورک کو تباہی سے دوچار کرڈالا تھا بلکہ اس سمیت اس کے بیشتر ساتھیوں کو بھی فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا جبکہ خود وہ رنگون سے مجھے اپنے "گریٹ ماسٹر" لولوڈش کے ایما پر اغوا کرکے اس کے قدموں میں ڈالنے کے عزم سے آیا تھا۔

باقی جیپ کی عقبی سیٹوں سے ان کے جو دو ساتھی اترے تھے، وہ بھی اپنی وضع قطع سے برمی ہی معلوم ہوتے تھے۔

برما اس جزیرے سے نسبتاً نزدیک ہونے کی وجہ سے شاید لولوڈش اسے وقتاً فوقتاً نئی افرادی کمک بھیجتا رہتا تھا۔

ممکن تھا یہاں وحشیوں کے ساتھ ان کے ٹکراؤ کی صورت میں اس کے مزید ساتھی بھی مارے گئے ہوں۔ اب بہرحال اس کے دو ہی ساتھی بچے تھے۔ یہ اندازہ میں نے

گزشتہ شب ہونے والی فائرنگ اور وحشیوں کی ہاہو کی آوازوں سے ہی لگایا تھا۔

اس کا صاف مطلب تھا کہ ہم نے... نہر کے دوسری طرف کے کنارے پر جو پڑاؤ دیکھا تھا وہ انہی کا تھا۔

اب یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کوریلا یا سے جی کوہارا کو میری یہاں آمد کا پتا تھا یا نہیں، تاہم ان دونوں کی یہاں موجودگی کا ایک ہی مقصد مجھے سمجھ میں آتا تھا اور وہ یہی ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کا مجھ پر تو کوئی بس نہیں چل سکا تھا، اور اب یہ میرے تینوں ساتھیوں کو یرغمال بنانا چاہتے تھے، یہ شاید انہیں ترنوالہ سمجھے ہوئے تھے۔

لیکن باوجود اس کے عقل اس بات کو تسلیم کرتی تھی، لیکن میری عقلِ سلیم کچھ اور ہی اشارہ کر رہی تھی کہ بات صرف اتنی بھی نہیں تھی۔ کوریلا کی یہاں موجودگی تو سمجھ میں آتی تھی کہ وہ پہلے ہی سے بجوانی کے حکم پر یہاں موجود تھی اور میرے تینوں ساتھی بھی اسی کی قید میں یہاں موجود تھے۔

بعد میں کلی منجارو کے حملے کے باعث کوریلا (بجوانی کے) یہاں قابض ساتھی مارے گئے اور میرے تینوں ساتھیوں کو وحشی اٹھالے گئے تھے، (یہ ممکن تھا کہ کوریلا کے کچھ ساتھیوں کو بھی انہوں نے یرغمال بنا لیا ہو، اگرچہ اس میں بھی ابہام تھا کہ بھلا ان وحشیوں کو انہیں قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟) لہٰذا اب کوریلا اپنے مشن میں یہاں مصروف تھی۔ مگر کوہارا کی یہاں موجودگی میری عقلِ سلیم سے بالاتر تھی۔ بے شک بجوانی کے ذریعے (جب وہ زندہ تھا) اسے اس صورتِ حالات کا علم ہو گیا ہو، کیونکہ آخر کار کوہارا کو بھی تو میری تلاش تھی، وہ بھی کوریلا سے رابطہ کر کے اس کی مدد کے طور پر ہی سہی یہاں آ گیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ کوہارا رنگون میں مقیم اپنے گریٹ ماسٹر لولوش سے پل پل کی ہدایات لیتا رہا ہے۔

ان ساری باتوں کے باوصف پتا نہیں کیوں مجھے کوہارا کی یہاں موجودگی کا سبب صرف اس قدر ہی نہیں معلوم ہوتا تھا، اس کی اور بھی کوئی خاص وجہ تھی۔

میں نے اس نقطے کو ذہن میں رکھا اور اب ان کی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے لگا تو میں چونک پڑا۔ وہ دونوں جیپ سے اترتے ہی زمین پر جھک کر کچھ دیکھنے لگے، انداز ان کا ایسا ہی تھا جیسے اپنی کھوئی ہوئی شے تلاش کر رہے ہوں۔ میں سنگ سیاہ کی آڑ لیتا ہوا ذرا اور ان کے قریب ہوا تاکہ ان کے تبادلہ خیال کی صورت میں ہونے والی متوقع گفتگو کو سن سکوں۔

"وہ لوگ کسی مصیبت کا شکار ہو کر اپنا کوئی ساتھی گنوا بیٹھے ہیں، مگر زخمی ساتھی ان کے ساتھ ہی ہے......"

میں نے کوریلا کو سے جی کوہارا سے یہ کہتے سنا اور سُن ہو کر رہ گیا۔ میں نے دیکھا، کوہارا اس کی بات پر بھونچکا ہو کے اس کی صورت تکتا رہ گیا۔ کوریلا نے پُرغور انداز میں اپنی بات جاری رکھی، بولی۔

"نہ صرف یہ بلکہ اب نہر پار کرنے کے بعد اس نے اپنے کسی زخمی ساتھی کو کاندھے پر اٹھا لیا ہے، کیونکہ یہاں سے اسٹریچر کے گھسیٹنے کے نشان معدوم ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ یقیناً نہر کا پل پار کرتے ہوئے کسی حادثے سے دوچار ہوئے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اب یہ جو کوئی بھی ہیں، اب صرف دو ہی باقی بچے ہیں؟" کوہارا کو میں نے کوریلا سے یہ کہتے سنا۔

"ہاں!" کوریلا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس گروپ کو بھی ہماری طرح، ان وحشیوں سے مقابلہ ہونے کے بعد اپنے بہت سے ساتھیوں سے محروم ہونا پڑا ہے۔"

میں گویا سرتاپا سماعت بنا ان کی گفتگو کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ کوریلا بلیوتسی کی ایک گھاگ ایجنٹ تھی اور وہ یہاں اپنی ساری تربیتی صلاحیتیں آزما رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں کوہارا ایک جنگجو مگر گنوار اور جاہل آدمی تھا۔

بہرکیف اب دیکھنا یہ تھا کہ آیا کوریلا کو باہر کی (جزیرے سے باہر کی) باتوں کا کس حد علم تھا؟ کیونکہ بجوانی کی میرے ہاتھوں ہلاکت کے بعد میں اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ کوریلا کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ اس کا چیف باس کرنل سی جی بجوانی میرے ہاتھوں واصل جہنم ہو چکا تھا اور میں اپنے ساتھیوں کی تلاش میں انڈیمان کا رخ کر چکا تھا وغیرہ۔ کیونکہ بلیوتسی کا قلع قمع کرنے کے بعد یہ عین ممکن تھا کہ کسی ساتھی نے کوریلا کو فون وغیرہ کے رابطے کے بعد ساری صورتِ حال بھی گوش گزار کر دی ہو؟ میں نے بھی ریتا (کی سہیلی کے) کے ڈوپلیکس میں جب بجوانی کی کوریلا سے بات کروائی تھی تو وہ بھی بلراج سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی اچانک آمد کے باعث کافی حد تک ادھوری رہ گئی تھی۔ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ کوریلا یا کوہارا کے پاس اب لاسلکی رابطے کے لیے کوئی سامان بھی بچا ہو۔

لہٰذا اب مجھے ان دونوں شخصوں کی جوڑی کے آپس

میں باتوں کے دوران ہی ان ساری حقیقتوں کا اندازہ لگا تا تھا۔ لگتا تھا کچھ ایسا ہی تھا جیسے مستقبل میں بہت سے سنسنی خیز انکشافات متوقع تھے۔

''تمہارا کیا خیال ہے کوریلا! یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ ہمارے دشمن یا پھر کوئی اور دوست یا دشمن گروپ؟'' میں نے کوہارا کو ریلا سے کہتے سنا۔

''ہمارا یہاں کوئی دوست گروپ نہیں ہو سکتا۔ دشمن گروپ ایک ہی ہے...... شہزی اور اس کی ساتھی سوشیلا...... اور میرا پہلا خیال شہزی کی طرف ہی جاتا ہے۔'' کوریلا نے گہری اور پُرسوچ متانت سے جواب دیا تو کوہارا نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''لیکن شہزی کو یہ کیسے پتا چلا ہوگا کہ اس کے تینوں ساتھیوں کو تم لوگوں نے یہاں قید کر رکھا تھا؟'' اس کے مستفسر ہونے پر کوریلا نے ایک گہری سانس لی...... اور بولی۔

''مجھے ملنے والی آخری اطلاعات کے مطابق شہزی نے کوریلا ایکشن کے ذریعے ہیڈ کوارٹر پر ہلا بولا تھا اور چیف باس کو اٹھالے گیا تھا۔ لیکن پھر ٹرانسمیٹر ڈیوائس سے محرومی کے بعد میرا کسی سے رابطہ نہ ہو سکا کہ اب وہاں کیا صورت حال ہے۔ تاہم ان نے چیف باس (کرنل بھجوانی) سے اگلوا ہی لیا ہوگا اپنے ساتھیوں کے بارے میں، اسی خیال سے میں کہہ رہی تھی کہ شہزی بھی یہاں کا رخ کر سکتا ہے۔''

''حیرت ہے، ایک اکیلے شہزی نے اتنا بڑا پالا کیسے مار لیا؟ را کے ایک انتہائی تربیت یافتہ ایڈوانس ونگ (بلیو تلسی) کے ہیڈ کوارٹر میں گھس کر۔''

''کمانڈو ایکشن ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' کوریلا نے اس کی بات کاٹ کر کہا...... ''اور شہزی بھی بہرحال کوئی عام شخص نہیں ہے، ایک تربیت یافتہ کمانڈو ہے۔ بڑے کڑے دل سے ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ پاکستان کی انٹیلی جنس اور آرمی دنیا کی ٹاپ ٹین لسٹ میں سب سے اوپر ہے۔ کئی ممالک اپنی فوجی تربیت کے لیے پاکستانی آرمی سے مدد لیتے رہے ہیں۔ کیا تم خود اب تک شہزی کا کچھ بگاڑ پائے ہو؟ جبکہ اس نے تمہیں ابھی تک تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔''

''میری بات اور ہے......'' وہ تلخی سے بولا۔ صاف لگتا تھا کہ اس نے کوریلا کی بات کا برا منا لیا تھا۔ ''تم لوگوں کی تربیت بھی ایسی خطوط پر ہوئی ہوگی جو شہزی نے حاصل کر رکھی ہے اور پھر تمہارے ملک میں گھس کر اس نے تمہارے ونگ کا بیڑا غرق کر ڈالا۔ اگرچہ کافی حد تک میں نے بھی شہزی پر قابو پالیا تھا لیکن میری اپنی ایک بیوقوف ساتھی چندرکلا کی غداری کے باعث وہ بچ نکلا۔ مجھے تو لگتا ہے، جس وقت تم لوگ اسے میری بوٹ سے اپنے ٹھکانے پر لے کر گئے تھے، اس نے وہ یاد رکھا ہوگا، تم لوگوں کی تباہی وہیں سے شروع ہوئی ہے۔''

''ایک حد تک تمہاری بات درست بھی ہے۔'' کوریلا کو اعتراف کرنا پڑا، یا پھر وہ اس پُرخطر مہم میں اس

کے ساتھ تھی اور مصلحت سے کام لے رہی تھی۔ تاہم آگے بولی۔

''اگرچہ ہم اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے ہیڈ کوارٹر لے کر گئے تھے۔ ہوسکتا ہے اس نے اپنی غیر معمولی ذہانت کے بل بوتے پر اس کا محل وقوع بھانپ لیا ہو...... اور بعد میں اس نے بھیدی بن کر ہماری لنکا ڈھادی۔'' اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی، میں نے کوہارا کو ہلکا سا قہقہہ لگاتے سنا جبکہ کوریلا کی بات پر میرے ہونٹوں پہ بھی زہریلی مسکراہٹ کھنچ گئی۔

یہ حقیقت ہی تھی کہ جس وقت بجوانی نے مجھے لینے کے لیے اپنے تین اہم ساتھیوں، چندرناتھ، شیام اور کوریلا کو کوہارا کی بوٹ پر بھیجا تھا تو وہ تینوں مجھے بلیو ٹیکسی کے ہیڈ کوارٹر لے گئے تھے، واپسی میں میری خوش قسمتی تھی کہ میری آنکھوں پہ بندھی ہوئی پٹی تھوڑا نیچے اتر آئی تھی اور میں نے باریک جھری سے سارے محل وقوع کا اندازہ کرلیا تھا۔

''لیکن کوہارا! میں تمہاری طرف سے ایک الجھن میں مبتلا ہوں......'' اچانک کوریلا نے یہ کہہ کر نہ صرف کوہارا کو بلکہ مجھے بھی چونکا دیا تھا۔

''کیسی الجھن؟'' میں نے کوہارا کو کہتے سنا۔

''یہی کہ تم نے کس وجہ کے تحت یہاں کا رخ کیا تھا؟''

کوریلا کا یہ وہی سوال تھا جو میرے ذہن میں بھی ایک الجھن کی صورت میں پہلے ہی سے کلبلا رہا تھا۔

اس لیے میں بھی کوہارا کا جواب سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوگیا، مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا اچانک فضا میں ایک گونج دار آواز ابھری۔ وہ دونوں چونک کر سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے بھی آواز کی سمت اوپر سر اٹھا کر دیکھا۔ نہر والے جنگل کی سمت سے ایک ہیلی کاپٹر نمودار ہوا اور ہمارے اوپر سے گزرنے لگا۔

''جیپ کی آڑ میں ہو جاؤ...... یہ وہی لوگ لگتے ہیں......''

میں نے سے جی کوہارا کو چلاتے ہوئے سنا اور پھر وہ سب جیپ کی آڑ میں چلے گئے۔ خود میں پہلے ہی پتھر کی آڑ میں تھا...... تاہم کوہارا کا ہیلی کاپٹر کو دیکھ کر یہ کہنا کہ ''جیپ کی آڑ میں ہو جاؤ...... یہ وہی لوگ لگتے ہیں'' مجھے الجھن میں مبتلا کر گیا، ظاہر ہے اس کا یہی مطلب ہوسکتا تھا کہ وہ انہیں جانتا ہوگا، تو پھر یہ ہیلی کاپٹر سوار کون لوگ ہوسکتے تھے؟ میرا اپنا ذہن بھی سوالیہ نشان بن گیا۔

ہیلی کاپٹر نے ایک نیچی اڑان بھری اور وہ عین جیپ کے اوپر آکر فضا میں معلق ہوگیا۔ میری نظریں بہ غور کاپٹر پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا زاویہ کچھ اس طرح کا تھا کہ مجھے سردست اس میں سوار صرف دو ہی افراد دکھائی دے سکتے تھے۔

ایک تو پائلٹ تھا دوسرا آدمی جو اس کے ساتھ بیٹھا تھا اس نے اپنے ہاتھوں میں دوربین تھام رکھی تھی جو وہ اپنی آنکھوں سے لگائے نیچے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے دوربین گلے میں جھلا کر ایک میگافون تھامتے دیکھا، وہ شاید ان سے مخاطب ہونا چاہتا تھا۔

''ہیلو...... تم لوگ کون ہو؟ اپنا تعارف کراؤ...... ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جائے گا......''

یہ دھمکی آمیز اعلان ہندی اردو میں ہی کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی میں نے ہیلی کاپٹر کے عقبی حصے کا ایک دروازہ سلائڈ ہوتے دیکھا تو میرے پورے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں رینگ گئیں، وہاں سے تین چست لباس میں ملبوس مسلح افراد کی جھلک دکھائی دینے لگی، جنہوں نے رائفلیں تھام رکھی تھیں اور ان کا رخ نیچے جیپ کی طرف تھا۔

ان لوگوں نے کوریلا وغیرہ کو دیکھ لیا تھا۔ میرے رگ و پے میں سنسناہٹیں گونج رہی تھیں۔ دیکھنا اب یہ تھا کہ کوہارا اور کوریلا اس خطرناک صورت حالات میں کون سا قدم اٹھاتے ہیں۔ میری دھڑکتی نظریں کبھی جیپ کو دیکھنے لگتیں تو کبھی فضا میں معلق ہیلی کاپٹر کو...... تب ہی میں نے دیکھا کہ کوریلا ایک دم اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے سامنے آگئی۔

''چالاکی مت دکھاؤ...... سب سامنے آؤ...... یہ آخری موقع ہے...... ورنہ فائر کھول دیا جائے گا......''

ہیلی کاپٹر سے وہی شخص میگافون پر بولا...... اور ٹھیک اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری، میں دہل سا گیا۔ گولیاں جیپ کی اسی آڑ سے برسائی گئی تھیں، جدھر کوہارا اور اس کے دو ساتھی چھپے بیٹھے تھے۔

یہ یقیناً انہی کی حرکت ہوسکتی تھی اور اس میں بلاشبہ کوریلا کا کوئی دوش نہ تھا۔ بلکہ الٹا وہ اپنے سر پر ننگی ناچتی موت کے سامنے کھڑی تھی۔

نیچے سے ہیلی کاپٹر کی طرف برسٹ کے بعد دیگرے فائر کیے گئے تھے۔ میں نے ہیلی کاپٹر سے دو افراد کو رائفلوں سمیت چیختے ہوئے نیچے گرتے دیکھا۔ ایک تو زمین پر گرا تھا، جبکہ دوسرا اپشت کے بل جیپ کے بڈ کے آہنی راڈ پر

پڑا...... اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی، کیونکہ اس کا وجود کمان کی طرح مڑ گیا تھا، جبکہ پچھلا والا سر کے بل زمین پر گرا تھا۔

اسی وقت دوسرا برسٹ نیچے سے فائر کیا گیا تو اوپر والے مسلح آدمی نے ان پر بھی جوابی فائر کھول دیا۔ اس کی فائرنگ سے فوراً ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری ''گنتی'' غلط نہیں تھی۔ وہ تین ہی تھے پہلے، اب ایک رہ گیا تھا۔ میگا فون والا حلق کے بل مارے طیش کے چلایا تھا۔ اس کی آواز میگا فون پر بھی ابھری تھی، جو ہنوز اس کے ہاتھ میں ہی رہ گیا تھا۔

ادھر کوریلا نے خود کو بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ زمین پر لٹا دیا تھا اور پھر بہ سرعت کہنیوں اور گھٹنوں کے بل پر رینگتی ہوئی جیپ کے نیچے چلی گئی تھی۔ اس کی زندگی ابھی شاید باقی تھی جو اس طرح موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچی تھی۔

ہیلی کاپٹر نے حرکت کی۔ وہ ہوا میں ہی بیک ٹرن لے کر اوپر اٹھنے لگا، تو میں نے دیکھا، سے جی کوہارا کسی درندے کی طرح دہاڑتا ہوا جیپ کے عقب سے نکلا۔

''شوٹ کرو...... شوٹ کرو......''

اس کے ساتھ ہی وہ اور اس کے دونوں ساتھیوں نے تابڑ توڑ گولیاں برسانی شروع کر دیں۔

کئی گولیاں ہیلی کاپٹر کی باڈی پر لگیں اور شاید اس کے دم والے پنکھے پر بھی لگیں، پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کاپٹر فضا میں ڈگمگانے لگا اور گول گھومتے گھومتے پیچھے سے دھوئیں کی لکیر بھی چھوڑنے لگا۔ اس کے بعد وہ نہر پار والے کنارے پر ایک ساعت شکن دھماکے سے گرا اور اس میں آگ لگ گئی۔

کوہارا نے فتح کے نشے میں ایک زوردار اور جنگجوانہ سا نعرہ بلند کیا تھا کہ اسی وقت میں نے کوریلا کو جیپ کے نیچے سے نکلتے اور تیزی سے کوہارا کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کا حسین چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بھویں سکیڑ لیں اور اگلے ہی لمحے اس نے کوہارا کے قریب جا کر اس کے چہرے پر یکے بعد دیگرے دو تین تھپڑ جڑ دیے اور بپھرے ہوئے لہجے میں اس سے بولی۔

''جاہل، بے وقوف......! تمہیں اس طرح فائرنگ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں تو مرتے مرتے بچی ہوں۔ جب میں نے کہا تھا کہ انہیں میں باتوں کے ذریعے قابو کر لوں گی تو...... آہ!''

> ٹریفک سارجنٹ نے موٹر سائیکل پر ایک کار سوار خاتون کا تعاقب کر کے بڑی مشکل سے انہیں روکا اور چالان بک نکالتے ہوئے بولا۔ ''محترمہ آپ اسی میل فی گھنٹا کی رفتار سے جا رہی تھیں۔''
>
> خاتون بے پروائی سے بولی۔ ''تو پھر کیا ہوا؟ تم بھی تو اسی رفتار سے میرے پیچھے آ رہے تھے۔''
>
> مرجا گل، دوراہن کلاں سے

اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ سے جی کوہارا کے دائیں ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ کوریلا کے گال پر پڑا تھا اور وہ چند قدم پیچھے لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔

میں نے دیکھا سے جی کوہارا کا چہرہ مارے طیش و غیظ کے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

اس کے دونوں مسلح ساتھیوں نے زمین پر گری کوریلا کی طرف اپنی رائفلوں کا رخ کر دیا تھا۔ کوہارا کا شاید ابھی تک غصہ نہیں اترا تھا۔ وہ دانت پیستا ہوا کوریلا کی طرف بڑھا اور اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں اس کے بال دبوچ کر بیدردی سے پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا اور اس کے قریب اپنا گینڈے جیسا بھیانک منہ کر کے غرایا۔

''تو اپنی اوقات میں رہ کتیا! میری باس نہیں ہے تو...... میں جو مناسب سمجھوں گا وہی کروں گا۔ آئندہ اگر مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو تیری ادھر ہی مٹی پلید کر دوں گا، سمجھی تو......'' کہتے ہوئے اس نے اسے پرے دھکیل دیا۔

میرے لیے یہ صورت حال دلچسپی کا باعث بننے لگی تھی۔ میرے دشمن آپس میں ہی لڑ پڑے تھے۔ لیکن دیکھا جاتا تو کرنل بھوانی کے جہنم واصل ہونے اور بلوتلسی کے خاتمے کے بعد کوریلا کی شاید اپنی بھی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ بیکار ہو گئی تھی۔ وہ بہرحال را کے ایک ایڈوانس ونگ (بلوتلسی) کی ٹاپ ایجنٹ رہ چکی تھی اور اب بھی ان کی (را، کی) ساتھی ہی کہلاتی تھی۔

کوریلا کا حسین چہرہ احساس ذلت تلے مسخ ہو چکا تھا اور وہ کوہارا کو بڑی خونی نظروں سے گھورے جا رہی تھی۔

''مت بھولو کہ اس وقت تم بھی ایک طرح سے میرے ہی تابع ہو...... اس مہم میں جو میں بہتر سمجھوں گا کروں گا، تجھے کسی سے مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں

ہے۔'' کوہارا نے زروانی گروہ کے ساتھ دوبارہ اس سے کہا۔

''میں تمہاری تابعداری کے لیے تمہارے ساتھ نہیں ملی تھی......'' کوریلا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سخت لہجے میں کہا۔''ایک دیرینہ مشترکہ مشن کی وجہ سے ہم پلہ ساتھیوں کی حیثیت سے ہی ہم ایک دوسرے کے ساتھ شامل تھے۔''

''حیثیت!!'' کوہارا استہزائیہ لہجے میں بولا۔''کون سی حیثیت کی بات کر رہی ہو تم مس کوریلا؟ شہزی نے تم سب کی حیثیت زیرو کر ڈالی ہے۔ تمہارے چیف باس سمیت چندر ناتھ، شیام اور دیگر ٹاپ ایجنٹ اس کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں، تم بھی اس لیے بچ گئی ہو کہ یہاں میرے ساتھ موجود ہو......''

''بلیو تلسی جیسے کئی ونگ را کے پیٹ سے جنم لیتے رہیں گے...... اور لیتے رہے ہیں کوہارا!'' کوریلا نے جواب دیا۔ ''بلیو تلسی کے خاتمے کو تم یہ مت سمجھو کہ میرا عہدہ یا میری حیثیت بھی ختم ہو چکی ہے، میں اب بھی را کے ایک بڑے عہدے وار کی حیثیت رکھتی ہوں۔ مگر تمہارے گریٹ ماسٹر لولوش نے اب تک شہزی کا کیا بگاڑ لیا ہے؟ اس نے تمہیں بھی تو یہاں دھول چٹا دی ہے۔ اب تم لوگ بھی شہزی سے مقابلہ کرنے کے بجائے اس کے قیدی ساتھیوں کو چارہ بنانا چاہتے ہو...... اس بزدلانہ حرکت میں ہم دونوں شامل ہیں۔''

''گریٹ ماسٹر کی بات مت کرو......'' کوہارا اس کی طرف گھور کر بولا۔''تمہیں کیا معلوم کہ اس کے کیا مقاصد ہیں اور وہ کتنی بڑی ہستی ہے، گریٹ ماسٹر کا دائرۂ کار پوری دنیا میں مکڑی کے جال کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ اس کے کئی مقاصد ہیں، تم تو صرف ایک شہزی کو رو رہے ہو، جبکہ گریٹ ماسٹر لولوش اسے ایک حد سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا ہے، کیونکہ اسے معلوم ہے کہ ایک دن شہزی کچے دھاگے کی طرح اس کی طرف کھنچا چلا آئے گا...... اور تم سب منہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔ یہاں انڈیمان میں بھی میں صرف شہزی کے ساتھیوں کو یرغمال بنانے ہی نہیں بلکہ کسی اور اہم مشن پہ آیا ہوں......''

''مجھے اس کا پہلے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ تمہارا درحقیقت یہاں اصل مشن کچھ اور ہے......'' کوریلا نے فوراً زیرک لہجے میں کہا۔ کوہارا کے چہرے پر میں نے ایک رنگ سا بدلتے دیکھا۔

''خیر......'' اس نے کاندھے اچکائے...... ''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ لیکن اپنے مشترکہ مشن میں ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہنا چاہیے اور اس کے لیے ہمیں باہمی مشورے سے ہی آگے بڑھنا چاہیے۔''

''مجھے کسی کے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے مس کوریلا!'' سے جی کوہارا اکھڑ پن سے بولا۔''تم اگر میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو تمہیں اب ایک ماتحت بن کر میرے ساتھ رہنا ہوگا...... ورنہ اپنا راستہ بدل لو......'' اس نے آخر میں بڑی رکھائی سے کہا۔

''مائی فٹ!'' کوریلا نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے یہ ہرگز قبول نہیں، ساتھ ہوگا تو برابری کی بنیاد پر جیسا پہلے تھا، ورنہ نہیں۔ اس جزیرے میں ہم دونوں ہی اپنے بیرونی ساتھیوں کی مدد سے محروم ہیں، مگر میرا معاملہ اور ہے...... مجھے جیسے ہی اپنے ساتھیوں سے رابطے کا موقع ملا...... وہ یہاں پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائیں گے۔''

''ہم......!'' کوہارا نے ایک سنسناتی ہوئی ہنکاری خارج کی اور بولا۔''مت بھولو کہ برما کی سرحد بھی اس جزیرے سے زیادہ دور نہیں۔ خیر...... اپنا راستہ لو اور خبردار میرا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش مت کرنا۔''

کوریلا غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی جیپ کی طرف بڑھی۔ کوہارا نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ گن لیے اس کے راستے میں آگیا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟ مجھے جیپ سے اپنا سامان اتارنا ہے۔'' کوریلا نے قریب کھڑے کوہارا کی طرف دیکھا۔

''تم یہاں سے کچھ نہیں لے جا سکتیں......'' کوہارا نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

''یہ اچھا نہیں ہو رہا ہے مسٹر کوہارا......'' کوریلا کے لہجے میں تہدید تھی۔

''اچھا برا کرنا اب میرے ہاتھ میں ہے...... شکر کرو کہ میں تمہیں یہاں سے زندہ جانے دے رہا ہوں......'' کوہارا نے بھی پھنکارتے لہجے میں کہا اور کوریلا کے چہرے پہ ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

ٹھیک اسی وقت فضا میں ایک تیز نسوانی چیخ ابھری...... ''شہزی......''

میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔

کوریلا اور سے جی کوہارا بھی بُری طرح چونک اٹھے تھے۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

وادیٔ جنت نظیر کے سپوت... میدانِ جنگ میں سرخ رو ہونے والے جانباز کا کارنامہ

حسن و جمال کا ذکر ہو تو وادیِ کشمیر نگاہوں کے ساتھ دلوں کو بھی مسخر کر دیتی ہے... عرصہ دراز سے آزادی اور زندگی کے سہانے دنوں کی تڑپ میں شب و روز گزارنے والوں کی مسلسل جدوجہد کا دل گداز قصہ... آتشیں اسلحے کی گرج اور آہنی بوٹوں کی آہٹیں ان کے جسم و جاں پر ثبت تھیں... مگر سنگلاخ چٹانوں میں محبتوں کے پھول کھل رہے تھے... کچھ آنکھوں میں حالات بدل رہے تھے... خواب بن رہے تھے... اور بکھر کر ٹوٹ رہے تھے... انہی خوابوں... خواہشوں اور ارادوں کا نوحہ...

ڈرپوک

منظر امام

راستے میں ایک بپھرے ہوئے بیل کو دیکھ کر وہ رک گیا جبکہ درشن سنگھ اس بیل کے برابر سے گزرتا ہوا آگے پہنچ چکا تھا۔ وہ صفدر کو رکا ہوا دیکھ کر ہنسنے لگا۔

''ابے آجا صفدر، یہ کچھ نہیں کہے گا۔''

''یار، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' صفدر نے کہا۔

وہ زور زور سے تالیاں بجا بجا کر بولنے لگا۔

''ڈرپوک، ڈرپوک۔''

دوسرے بچے بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ یہ سب اسکول جا رہے تھے۔ ان کے اسکول کا نام گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول تھا۔

سرینگر کے اس اسکول کی بہت دھوم تھی۔ برسوں پہلے بھی یہاں کی تعلیم کا معیار بہت اچھا تھا اور آج بھی ہے۔ اسکول کے ساتھ ایک سڑک تھی اور اس سڑک پر آگے جا کر گورنمنٹ گرلز سیکنڈری اسکول تھا۔

بہت خوب صورت دن ہوتے تھے۔ اس اسکول میں

ہندو، مسلمان اور سکھ طالب علم سب ہی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ ٹیچرز میں بھی سب ہی تھے۔

قاعدہ یہ تھا کہ پانچ سال کے لیے ایک ہندو پرنسپل ہوتا اور پانچ سال کے لیے مسلمان۔ اس سال اس اسکول کے پرنسپل کا نام رمیش سری واستو تھا۔ وہ ایک کھلے دل کا انسان تھا۔ اس کے نزدیک اہمیت صرف علم کی تھی۔ ہندو یا مسلمان کی نہیں تھی۔

بہت رواں اردو بولتا تھا اور شاعری بھی کرتا تھا۔ اس کے لکھے ہوئے گیت کشمیر میں بہت مقبول تھے۔ صفدر کسی طرح جیل سے بچ بچا کر اس گروپ کے پاس پہنچ ہی گیا تھا۔

"یار تم اتنے ڈرپوک کیوں ہو؟" ورشن سنگھ نے پوچھا۔

"کیا کروں، مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔" صفدر نے جواب دیا۔

صفدر اور ورشن سنگھ کے درمیان بہت پرانی دوستی تھی۔ وہ دونوں تیسری کلاس سے ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور اب آٹھویں کلاس میں آ چکے تھے۔

ورشن ایک کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس کی رہائش سرینگر کے سب سے خوب صورت علاقے بولیوارڈ روڈ پر تھی۔

بولیوارڈ روڈ پر خوب صورت مکانات بنے ہوئے تھے۔ یہ روڈ مشہور ڈل جھیل کے ساتھ ساتھ دور تک لہراتی ہوئی چلی گئی تھی۔

جبکہ صفدر کی رہائش حاجی مسجد کے پاس تھی۔ اس طرف عام نوعیت کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ صفدر کے باپ نے صفدر کا داخلہ گورنمنٹ اسکول میں کروایا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس اسکول کی ساکھ بہت اچھی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حاجی مسجد سے وہاں آنا جانا آسان تھا۔

ورشن سنگھ بھی اسی اسکول میں تھا۔ حالانکہ اس کا باپ اگر چاہتا تو اس کا داخلہ سرینگر کے کسی پرائیویٹ اسکول میں کروا سکتا تھا لیکن اسے بتایا گیا تھا کہ اس اسکول میں استاد بہت اچھے ہوتے ہیں۔

ورشن سنگھ سے صفدر کی دوستی کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ ایک دن سورا اسپتال کے پاس کچھ لڑکوں نے صفدر کو کسی بات پر گھیر لیا۔

وہ صفدر کی پٹائی کر رہے تھے کہ ورشن سنگھ نے دیکھ لیا۔ صفدر اسی کی کلاس میں پڑھتا تھا۔ ورشن سنگھ نے صفدر کا ساتھ دیا اور ان لڑکوں سے بھڑ گیا۔ اس نے ذرا سی دیر میں ان لڑکوں کو مار کر بھگا دیا تھا۔

اس دن کے بعد سے دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست ہو گئے تھے۔ اس احسان کا بدلہ صفدر یوں دیا کرتا کہ وہ اپنے نوٹس ورشن کے حوالے کر دیتا۔

صفدر پڑھائی میں بہت ذہین تھا۔ اس کی اسی خصوصیات کی بنا پر اسکول کے استاد بھی اس کا خیال رکھتے تھے۔ وہ ایک دبلا پتلا تیکھے نقوش والا لڑکا تھا۔

اس میں ایک خرابی یہ تھی کہ وہ بہت ڈرپوک سا تھا۔ اگر کلاس کا یا اسکول کا کوئی لڑکا اس کو چھیڑتا یا اس کے ساتھ کوئی زیادتی کرتا تو وہ بلک کر رہ جاتا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اس کا جواب دے سکے۔

ورشن کبھی کبھی اس پر ناراض بھی ہو جاتا۔ "یار! اگر تم اسی طرح رہے نا تو زندگی بھر تمہاری ٹھکائی ہوتی رہے گی۔"

"تو کیا کروں، مجھ سے مار پیٹ نہیں ہوتی۔"

"بلاوجہ مار پیٹ کے لیے کون کہہ رہا ہے۔ کم از کم اپنے حق کے لیے تو لڑا کرو، کب تک لڑکوں کے آگے بھیگی بلی بنے رہو گے؟"

صفدر اس سے وعدہ کر لیتا کہ وہ آئندہ سے بہادر بننے کی کوشش کرے گا لیکن اس کی فطری بزدلی اس کے سامنے آ جاتی۔ ورشن نے بھی اس موضوع پر اس سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔

اسکول سے چھٹی کے بعد دونوں کسی باغ میں آ کر بیٹھ جاتے۔ ایک باغ تو ان کے اسکول کے قریب ہی تھا۔ گرلز اسکول کے برابر میں۔ بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے۔

ایک دن ورشن نے اس سے کہا۔ "یار صفدر! میں تو آج کل بادلوں میں اڑ رہا ہوں یار۔"

"وہ کیسے؟"

"یہ تو نہیں سمجھے گا۔" اس نے کہا۔ "گرلز اسکول کی ایک لڑکی مجھ پر مہربان ہو گئی ہے۔"

"ابے جا۔"

"سچ کہہ رہا ہوں یار، کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں اس کو، مسکرا مسکرا کر دیکھتی ہے۔"

"دیکھ ورشن! اسکول سے چھٹی کے بعد تو میری نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ ہم دونوں ساتھ رہتے ہیں پھر وہ لڑکی تجھے کیسے مل گئی؟"

"یار، وہ بھی بولیوارڈ روڈ پر رہتی ہے۔" ورشن نے بتایا۔ "جب چھٹی ہوتی ہے اور میں اپنے گھر کی طرف جاتا

ہوں تو چوہان کولڈ اسٹور پر میں رک جاتا ہوں۔ بول چیتا رہتا ہوں۔ اتنی دیر میں وہ بھی پہنچ جاتی ہے پھر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ مسکراتے رہتے ہیں۔ پیارے دوستی تو اسی طرح ہوتی ہے نا۔"

"اس سے بھی بات ہوئی؟"

"نہیں، بات تو نہیں ہوئی۔ لیکن بات بھی ہو جائے گی۔"

کئی دنوں کے بعد درشن نے خبر سنائی۔ "یار! اس سے بات ہو گئی ہے۔ دیپالی نام ہے اس کا۔ وہ بھی نویں میں آ گئی ہے۔ (یہ دونوں بھی نویں میں آ گئے تھے)

"چل مبارک ہو تجھے۔"

"دیکھ یہ بات کسی کو نہیں بتانا۔ تجھے اس لیے بتا دیا ہے کہ تو میرا پکا دوست ہے۔"

درشن اس کے بعد اسے روز آ کر بتانے لگا۔ ایک بار اس نے کہا۔ "یار، کل تم بھی میرے ساتھ چلنا۔"

"کہاں؟"

"وہیں، چوہان کولڈ اسٹور پر۔" درشن نے کہا۔ "دیپالی سے تیری ملاقات کروا دوں گا، تو بھی مل لینا اس سے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" صفدر نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا۔

چھٹی کے بعد صفدر، درشن کے ساتھ ہی بولیوارڈ روڈ پہنچ گیا۔ بولیوارڈ روڈ بہت زبردست جگہ تھی۔ ہر وقت چہل پہل رہا کرتی۔ سیاح بھی اس علاقے میں بہت دکھائی دیتے تھے۔ کیونکہ یہ روڈ ڈل جھیل کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس جھیل کے کشادہ سینے پر شکارے تیرتے رہتے تھے (شکارے خاص قسم کی کشتیوں کو کہتے ہیں۔ ان میں کمرے بنے ہوتے ہیں۔ ضرورت کی ہر چیز ہوتی ہے۔ سیاح شکارے کرائے پر لے کر کئی دنوں تک اس میں قیام کرتے ہیں) چوہان کولڈ اسٹور ایک مشہور جگہ تھی۔

دکان والے نے فٹ پاتھ پر کرسیاں اور میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ دن کے وقت کم لوگ ہوا کرتے ہیں لیکن شام سے رات دیر تک بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔

صفدر، درشن کے ساتھ پہلے درشن کے گھر گیا۔ وہ ان کے گھر کئی بار آ چکا تھا۔ درشن کی ماں اس کا بہت خیال رکھتی۔ دونوں نے پرنام کیا۔ درشن نے صفدر کا ہاتھ تھاما۔ "چل یار، دیر ہو رہی ہے۔"

"ارے یہ دونوں کچھ کھا پی تو لو۔" درشن کی ماں چلائی۔

"ابھی آتے ہیں ماما۔" درشن نے ہانک لگائی۔ "ایک کام سے جا رہے ہیں۔"

چوہان کولڈ اسٹور پر دیپالی پہلے سے موجود تھی۔ کشمیر کی خوب صورت کلی۔ جس کو دیکھ کر تازگی کا احساس ہونے لگا تھا۔

درشن نے دیپالی سے صفدر کا تعارف کروایا۔ "یہ میرا پکا دوست ہے صفدر نام ہے اِس کا۔"

"ہیلو۔" دیپالی نے مسکرا کر کہا۔

"ہیلو۔" صفدر اس سے زیادہ کچھ بول نہیں سکا۔

تینوں ایک ہی میز پر بیٹھ گئے۔ درشن نے ٹھنڈی بوتلیں منگوائی تھیں۔ موسم اس وقت بہت خوب صورت ہو گیا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل نمودار ہو گئے تھے۔

صفدر تم بھی تو کچھ بولو۔" دیپالی نے اسے مخاطب کیا۔ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"تم سے بات کرنے کے لیے درشن جو بیٹھا ہے۔" صفدر نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

درشن اور دیپالی دونوں ہنس پڑے، اسی وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔

☆☆☆

2005ء

سرینگر سے نکلنے والے روزنامہ نئی روشنی کے دفتر میں کچھ لوگ موجود تھے۔

ان کی یہ میٹنگ اخبار کے ایڈیٹر خرم حسین کے کمرے میں ہوا کرتی تھی۔ یہ روزمرہ کا معمول تھا، یہ چار پانچ آدمی اخبار کے دفتر میں جمع ہو جاتے۔ چائے چلتی، کبھی کبھی کھانا بھی ہو جاتا۔ پھر کشمیر کی اور ہندوستان کی صورتِ حال پر گفتگو ہونے لگتی۔

ان دنوں آزادی کی باتیں پھر زور و شور سے ہونے لگی تھیں۔ سرحد پار کے کشمیر کی صورتِ حال پر نظر رکھی جا رہی تھی۔ اس دفتر میں آنے والوں میں ایک نسیم آزاد تھا۔ ایک پرکاش مہرہ تھا۔ یہ ہندوستان کے ایک انگریزی اخبار کا نمائندہ تھا۔ جس کی تعیناتی سرینگر میں تھی۔ ایک حریت کانفرنس کا پُرجوش کارکن بہزاد کشمیری تھا۔ یہ ایک شاعر تھا۔ ایک یونیورسٹی آف کشمیر کا طالب علم حمید اللہ تھا۔ وہ کسی سبجیکٹ میں ماسٹرز کر رہا تھا۔

حمید اللہ کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ اس کے والد کسی زمانے میں کشمیر پارلیمنٹ کے رکن رہ چکے تھے۔ وہ

ایک ایسا نوجوان تھا جو بہت سلیقے اور نفاست کے ساتھ سگار پیتا اور اسی سلیقے اور نفاست کے ساتھ لباس کا استعمال کیا کرتا۔

پرکاش مہرہ کو کشمیر کی صورت حال پر ہمیشہ تشویش رہتی تھی۔ ''یار! بھارت سرکار نے تم لوگوں کے لیے اتنی فوج یہاں کیوں لگادی ہے؟''

''اس سوال کا جواب تو اپنی سرکار سے پوچھو۔'' نسیم آزاد کہا کرتا۔ ''شاید بھارت سرکار ہم کشمیریوں کو دہشت گرد سمجھتی ہے۔''

''پتا نہیں یہاں کی فضا اتنی زہر آلود کیوں ہوتی جارہی ہے۔'' بہزاد کشمیری ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہتا۔ ''ویسے میں نے ابھی ایک نظم لکھی ہے جو اسی موضوع پر لکھی ہے۔''

''جاتے ہوئے دیتے جانا۔'' خرم حسین نے کہا۔ ''ہم اگلے سنڈے کے ایڈیشن میں لگادیں گے۔''

''خرم صاحب! آپ بار بار اتنا رسک کیوں لیتے ہیں؟'' حمید اللہ نے پوچھا۔ ''یاد نہیں کہ پچھلی بار بھی اسی چکر میں اخبار پر چھاپا پڑ چکا ہے۔''

''وہ تو ہے، لیکن یہاں کی آواز بھی تو اوپر پہنچانی ضروری ہے۔''

''ایک بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر کشمیری چاہتے کیا ہو؟'' پرکاش مہرہ سب کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یار! تم اتنے دنوں سے کشمیر میں ہو۔ اب تک تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟'' نسیم آزاد نے کہا۔

''واقعی میں نہیں سمجھ سکا۔ خود دیکھو، بھارت سرکار نے کشمیریوں کو کتنی آسانیاں دے رکھی ہیں فرض کرو اگر آٹا دلی میں دس روپے کلو ہے تو یہاں پانچ روپے کلو ہے۔ اس طرح ہر چیز کا حساب لگالو۔ وہاں سے سستی ہے پھر اور کیا چاہیے؟''

''جینے کا حق چاہیے، پرکاش مہرہ صاحب۔'' نسیم آزاد نے کہا۔ ''کسی پرندے کو سونے کے پنجرے میں قید رکھ کر سونے کا نوالہ کھلاتے رہو تو کیا وہ خوش رہے گا؟''

''ہماری حکومت یہ کہتی ہے کہ کشمیر میں گڑبڑ پھیلانے والے اور جلسے جلوس نکالنے والے سرحد پار سے آتے ہیں۔''

''یہ تو حکومت کہتی ہے اور خود تم کیا کہتے ہو۔ تم تو خود اتنے دنوں سے سری نگر میں رہ رہے ہو۔ ابھی پچھلے دنوں درگاہ شریف کے پاس ایک دکان دار رمضان علی کو بھارتی فوجیوں نے گولی ماری تھی۔ تو کیا رمضان علی سرحد پار سے آیا تھا؟ وہ تو برسوں اور صدیوں سے یہاں آباد ہے۔''

اس دن بھی ان کے درمیان اسی قسم کی باتیں ہورہی تھیں کہ چپراسی نے آکر خرم حسین سے کہا۔ ''صاحب! کوئی لڑکی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔''

''لڑکی؟'' سب ہی متوجہ ہوگئے۔

''جی صاحب، وہ کہہ رہی ہے کہ ایڈیٹر صاحب سے ملنا ہے۔''

''بھیج دو اس کو۔'' خرم حسین نے کہا۔

کچھ دیر بعد ایک خوب صورت سی لڑکی کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل دبی ہوئی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی سب کو نمسکار کیا۔ جس سے یہ واضح ہوگیا کہ وہ ایک ہندو لڑکی ہے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' خرم نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی بیٹھ گئی۔ سب اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''میرا نام ساوتری ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اردو میں شاعری کرتی ہوں۔ کشمیر یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ ہوں۔''

''واہ، کیا تمہیں اتنی اردو آتی ہے کہ تم شاعری بھی کر سکو؟'' نسیم آزاد نے پوچھا۔

''ہاں، کیونکہ میرے پتا جی اردو کے استاد رہ چکے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''منوہر نام تھا ان کا۔ طوفان تخلص کرتے تھے۔''

''اوہ، تو تم منوہر سر کی بیٹی ہو۔'' خرم حسین نے پوچھا۔

''ہاں، کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟''

''بہت اچھی طرح۔ گورنمنٹ کالج میں وہ میرے استاد تھے۔''

''خرم صاحب! اگر یہ سر منوہر کی بیٹی ہے پھر تو یہ واقعی اچھی شاعرہ ہوگی۔'' پرکاش مہرہ نے کہا۔

''یہ تو ہے، بی بی تم اپنا کچھ کلام لے کر آئی ہو؟''

''جی ہاں، یہ فائل ہے اس میں دس پندرہ غزلیں اور سات آٹھ نظمیں ہیں۔'' ساوتری نے فائل خرم کی طرف بڑھادی۔ ''جو پسند آجائے وہ شائع کردیں۔''

حمید اللہ اس دوران میں ساوتری کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

ساوتری کی خواب آلود آنکھیں اسے اپنے دل کے کسی گوشے کو چھوتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ اس کی زلفیں

اپنے ازلی جھیل کے اوپر چھائے ہوئے بادلوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔

ساوتری نے بھی ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر بہزاد کشمیری کی طرف متوجہ ہوگئی جو اس کی شاعری کی فائل کا مطالعہ کر کر چکا تھا۔

''بی بی، تم بہت اچھی شاعرہ ہو۔'' بہزاد نے اس کی تعریف کی۔ ''بہت گہرائی ہے تمہاری شاعری میں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اردو زبان پر تمہاری دسترس بہت زبردست ہے۔''

''کیوں نہ ہو۔'' خرم حسین بول پڑا۔ ''بیٹی بھی تو سر منوہر کی ہے۔''

حمیداللہ نے ایک نظر ساوتری کی طرف دیکھا پھر اپنا سگار منہ سے لگا لیا۔ ساوتری اس کے حواسوں پر مسلط ہوتی جارہی تھی۔

☆☆☆

2005ء

شنکر اچاریہ کا مندر سیکڑوں فٹ کی بلندی پر بنا ہوا تھا۔

یہ ہندوؤں کا ایک مقدس مقام تھا۔ ہندوستان بھر سے یاتری یہاں کی یاترا کے لیے آیا کرتے۔ اوپر تک گاڑیاں بھی جایا کرتیں لیکن زیادہ تر یاتری ٹولیوں کی صورت میں بھجن گاتے ہوئے پیدل ہی اونچائی طے کرتے۔

ورشن اور اس کے کچھ دوستوں نے بھی اس مندر کے درشن کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ سارے دوست ہندو تھے اور اس کے اسکول کے تھے۔

ورشن، صفدر کو بھی اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہا تھا جبکہ اس کے دوست اسے منع کر رہے تھے۔

''یار! اسے کہاں لے جاؤ گے، وہ تو مسلمان ہے۔''

''تو کیا ہوا، وہ ایک بار مجھے حضرت بل کی درگاہ بھی لے گیا تھا۔''

''لیکن یہ بھی تو دیکھ کہ وہ ایک نمبر کا ڈرپوک ہے۔ اتنی بلندی پر آ کر اس کا تو دم نکل جائے گا۔''

''کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔''

ورشن نے جب صفدر سے بات کی تو وہ بھی پریشان ہوگیا۔ ''یار! مجھے اونچائی سے ڈر لگتا ہے۔''

''ڈرپوک آدمی، تم تو ہر چیز سے ڈرتے ہو۔'' ورشن جھنجھلا کر بولا۔ ''راستے میں کوئی جانور مل جائے تو تم اس سے ڈرتے ہو، کہیں سے بلاتے کی بھی آواز آئے تو ٹھیک کر بیٹھ

جاتے ہوئے۔'' پھر اس نے صفدر کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''چل نا یار، کچھ بھی نہیں ہوگا۔ پھر تیرا یار تیرے ساتھ ہے، تجھے کس بات کا ڈر ہے۔''

''ٹھیک ہے، لیکن پہلے میں اماں، ابا سے پوچھوں گا۔'' صفدر نے کہا۔

''ہاں ضرور پوچھ لو بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں، چاچا میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔''

صفدر کے باپ کی لال چوک کے پاس ایک دکان تھی۔

اس چوک سے کچھ فاصلے پر ہوٹل پیراڈائز کے ساتھ والی مارکیٹ میں اس کی کپڑوں کی دکان تھی۔

اس دکان میں مقامی کاریگروں کے ہاتھوں کی تیار کی ہوئی مصنوعات بھی فروخت ہوا کرتیں۔ اس دکان کا نام صفدر کے نام پر صفدر اسٹور رکھا گیا تھا۔

چھٹی ہو چکی تھی۔ ورشن سنگھ اور صفدر اسکول سے چلتے ہوئے سیدھے اسٹور پر آگئے۔

صفدر کا باپ صفدر کے ساتھ ورشن کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ''کہو بچو، پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت اچھی جارہی ہے چاچا۔'' ورشن نے کہا۔ پھر کچھ رک کر بولا۔ ''چاچا! ہم آپ سے ایک اجازت لینے آئے ہیں۔''

''ہاں کہو۔''

''چاچا! ہم صفدر کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔''

''کہاں؟''

''اچاریہ جی کے مندر۔'' ورشن نے بتایا۔ ''ہم چار پانچ دوست جارہے ہیں۔''

''بیٹا، مجھے تمہارے ساتھ بھیجنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اسے اپنے بھائی کی طرح چاہتے ہو لیکن بیٹا وہ راستہ بہت دشوار ہے۔ بہت چڑھائی چڑھنی ہوتی ہے۔ ایک بار میں خود بھی گیا تھا۔ میری تو حالت خراب ہوگئی تھی۔ تم کو تو معلوم ہے کہ یہ صفدر کتنا نازک ہے اس کو ذرا ذرا سی بات پر تو ڈر لگتا ہے۔''

''یہی تو بات ہے چاچا کہ میں اس کا ڈر نکالنے کے لیے اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔'' ورشن نے کہا۔ ''چاچا! میں تو اس کو ڈانٹتا رہتا ہوں، راستے میں اگر کوئی کتا آ کر کھڑا ہوجائے تو اس کی جان نکل جاتی ہے۔''

''یہی تو بات ہے بیٹا، اب خود سوچ لو۔''

''سوچ لیا ہے چاچا، کچھ نہیں ہوگا۔ میں اس کو بہادر بنا

کر رہوں گا اور اب تو خود یہ بھی چلنے کے لیے کہہ رہا ہے۔"

"کیوں صفدر؟" اس کے ابا نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں ابا، اب میں نے بھی ہمت کرلی ہے۔"

صفدر کا باپ مسکرا دیا۔ "چل ٹھیک ہے۔ درشن آیا ہے۔ اس لیے اجازت دے رہا ہوں، جاؤ چلے جاؤ۔ بس اپنا اور اپنے ساتھیوں کا خیال رکھنا۔"

تیسرے دن یہ لڑکے شنکر جی کی یاترا کے لیے روانہ ہو گئے۔

ان میں سے ہر ایک نے راستے کے لیے کھانے پینے کا سامان رکھ لیا تھا۔ صفدر کے لیے اس قسم کے سفر کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ اس سے پہلے اپنی خالہ سے ملنے سرینگر سے باہر جاتا رہا تھا لیکن اس سفر کی نوعیت الگ تھی، وہ سفر گاڑیوں کے ذریعے ہوا کرتا۔ ساتھ میں اماں ہوتیں، ابا ہوتے۔ خود پر کوئی ذمے داری نہیں ہوتی تھی۔

لیکن یہ سفر بہت مختلف تھا۔

ان سبھوں کے پاس چھڑیاں تھیں۔ مضبوط چکیلی لکڑیوں کی بنی ہوئی۔ پہاڑی علاقوں میں ایسی ہی چھڑیاں کام آتی ہیں۔ ان ہی کی مدد سے اونچائی پر جایا جا سکتا ہے۔

پورے راستے میں ہندو یاتریوں کی ٹولیاں تھیں جو بھجن گاتے ہوئے اوپر جا رہے تھے۔ صفدر اگر اکیلا ہوتا تو شاید تھک کر بے ہوش ہو کر گر پڑتا لیکن اس سفر میں درشن اور اس کے دوستوں نے صفدر کو سہارا دے رکھا تھا۔

وہ سب صفدر کی ہمت بڑھا رہے تھے۔

پہلے پڑاؤ تک شام ہو چکی تھی۔ اب آگے بڑھنا ٹھیک نہیں تھا۔ یاتریوں کی سیوا کے لیے ہر پڑاؤ پر آشرم بنائے گئے تھے۔

جن کو کمرے نہیں ملتے، وہ باہر برآمدے میں اپنے بستر بچھا لیا کرتے۔ رات بھر بھجن اور اشلوک پڑھنے کا سلسلہ جاری رہتا۔

صفدر اور درشن وغیرہ کو بھی برآمدے میں جگہ ملی تھی۔ بستر بچھا دیے گئے۔ کھانا کھا لیا گیا۔ یہاں پرساد بھی ملتا تھا۔ یاتریوں کے لیے مخیر ہندوؤں کی طرف سے کھانے پینے کا انتظام کیا جاتا تھا۔

صفدر بہت تھکا ہوا تھا۔

اس کا بدن بری طرح درد کر رہا تھا۔ وہ بستر پر گرتے ہی سو گیا۔ رات کے نہ جانے کس پہر درشن نے اسے جگا دیا۔ "او یار، شاباش اٹھ جا۔"

"کیا ہوا؟" صفدر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

درشن نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دھیرے سے بولا۔ "آ میرے ساتھ آ۔ ایک ضروری کام ہے۔"

درشن سنگھ اُسے آشرم کے پیچھے لے آیا تھا۔ اس طرف گہرا سناٹا اور تاریکی تھی۔ ہوا بہت سرد تھی۔ صفدر کے بدن پر کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ "بات کیا ہے یار، کیا چکر ہے؟"

"یار، وہ دیپالی مجھ سے ملنے کے لیے آرہی ہے۔" درشن سنگھ نے بتایا۔

"دیپالی یہاں کہاں سے آگئی؟"

"وہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ آئی ہوئی ہے۔ وہ دیکھ، وہ سامنے جو آشرم دکھائی دے رہی ہے، وہ لوگ اسی میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ موقع پا کر مجھ سے ملنے آرہی ہے۔"

"تجھے کیسے معلوم؟"

"ہمارا پروگرام پہلے سے سیٹ تھا یار، اب تو بحث مت کر۔ جب وہ آجائے تو تو دیوار کی دوسری طرف چلے جانا۔ تیرا کام صرف اتنا ہو گا کہ اگر کوئی اس طرف آتا دکھائی دے تو سیٹی بجا کر ہوشیار کر دینا۔"

"ابے جا، کیا مجھے صرف چوکیداری کے لیے لایا تھا۔" صفدر نے جھلا کر پوچھا۔

"تو دوست ہے نا پکا، وہ دیکھ وہ آرہی ہے۔"

اندھیرا تو تھا لیکن تاروں کی چھاؤں میں کسی کو آتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر بلندی سے نیچے کی طرف آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ قریب آگئی۔

وہ دیپالی ہی تھی۔ اس نے سردی سے بچنے کے لیے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ قریب آکر اس نے شرماتے ہوئے انداز میں صفدر کو پرنام کیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"اب جا یار۔" درشن سنگھ نے صفدر کو دھکا دیا۔

دیپالی نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ صفدر نے درشن سنگھ کی طرف دیکھا۔ "یار، تو تو جانتا ہے نا کہ مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔"

"ارے جا۔" درشن سنگھ نے کھسیا کر کہا۔

صفدر ہنستا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

2006ء

کسی ہنگامے اور شور سے صفدر کی آنکھ کھل گئی تھی۔

وہ اسکول سے آنے کے بعد کچھ دیر کے لیے سویا کرتا تھا۔ اس دن بھی وہ سویا ہوا تھا کہ اس نے کچھ لوگوں کا شور سنا۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔

محلے کے بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہ سب کسی بات پر غم اور غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ اس نے اپنے باپ کو دیکھا، وہ بھی ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ شاید وہ دکان بند کر کے جلدی واپس آگیا تھا۔

''کیا ہوا ابا؟'' صفدر اپنے باپ کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔

''تو کیوں اٹھ کر آگیا، جا اندر۔''

''بتاؤ نا ابا، کیا ہوا؟''

''بیٹا وہ بہزاد کشمیری صاحب ہیں نا، ان کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔'' صفدر کے باپ نے بتایا۔

وہ پورا محلہ مسلمانوں کا تھا۔ حاجی مسجد کے آس پاس اور اس کے اردگرد کے علاقے مسلمانوں کے تھے۔ صفدر صرف اتنا جانتا تھا کہ بہزاد کشمیری ایک شاعر ہیں اور اسی محلے میں رہتے ہیں۔

''ابا، بہزاد انکل تو اچھے آدمی ہیں۔'' صفدر نے کہا۔

بہزاد کشمیری کبھی کبھی صفدر کے باپ کے پاس آجاتا، دونوں بہت دیر تک گپ شپ کرتے رہتے۔ اسی لیے صفدر بہزاد کو انکل کہا کرتا تھا۔

''بتائیں نا ابا، پولیس انہیں کیوں لے گئی ہے؟''

''اچھا گھر چل بتاتا ہوں۔''

گھر پہنچ کر صفدر کے باپ نے بتایا۔ ''بہزاد نے ایک نظم لکھی ہے، بھارت سرکار کے خلاف۔ اس نظم میں آزادی کی بات کی گئی ہے۔ وہ نظم سرکار کو پسند نہیں آئی اسی لیے انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔''

''لیکن کیوں ابا، بہزاد انکل اتنا خطرناک کام کیوں کرتے ہیں کہ پولیس اٹھا کر لے جائے۔''

''بیٹا! یہ ایک طویل کہانی ہے۔ کشمیری مسلمان بظاہر آزاد ہیں۔ لیکن بھارت سرکار کے غلام ہیں۔ یہ کہانی ساٹھ ستر برسوں سے چل رہی ہے۔ بہت سے لوگ آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے رہے ہیں۔ بہت سے اس جرم میں مارے گئے ہیں اور بہت سے گرفتار بھی ہیں۔''

''اب کیا ہوگا؟'' صفدر کی ماں نے پوچھا۔ وہ بھی قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔

''کل جمعہ ہے۔ نماز کے بعد حضرت بل کی درگاہ سے اس کی گرفتاری کے خلاف جلوس نکالا جائے گا۔''

''نہیں ابا، تم مت جانا۔'' صفدر نے باپ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''ہاں ہاں۔'' صفدر کا باپ ہنس پڑا۔ ''میں نہیں جاؤں گا بلکہ میں دکان پر رہوں گا۔''

سری نگر میں سیاسی سرگرمیوں کے دو مراکز ہیں۔ حضرت بلؒ کی درگاہ یا لال چوک۔ لال چوک سری نگر کا مرکزی مقام ہے۔ یہاں خوب صورت عمارتیں ہیں جن کی بناوٹ برٹش اور مغل طرز کی ہیں۔ ماڈرن دکانیں ہیں۔ شہر کے کئی اچھے ہوٹلز اسی روڈ پر ہیں۔

کشمیر میں باٹا کی پرانی دکان اور کشمیری شال کی وسیع و عریض دکان بھی اسی لال چوک پر ہے۔ اسی روڈ پر فرازد ایک خوب صورت ریستوران ہے۔

یونیورسٹی کے لڑکے اور لڑکیاں یہاں کی کافی پینے کے لیے دور دور سے آتے ہیں۔ عام طور پر یہ ریستوران نوجوانوں سے بھرا رہتا ہے لیکن اس دن یہاں رش بہت کم تھا۔

حمید اللہ اور ساوتری ایک طرف بیٹھے ہوئے کافی پی رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے جیسے کسی گہری سوچ نے انہیں پریشان کر رکھا ہو۔

اخبار کے دفتر میں ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے بہت تیزی سے قریب آگئے تھے۔ ساوتری کو حمید اللہ کا رکھ رکھاؤ اور اس کی دانشمندانہ باتیں بہت پسند تھیں جبکہ حمید اللہ کو ساوتری کا وسیع الذہن ہونا، اس کی شاعری اور اس کی خوب صورت آنکھیں پسند تھیں۔

''حمید! آخر ہماری اس جنت میں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' ساوتری نے سوال کیا۔

''یہ سوال میں کئی بار خود اپنے آپ سے بھی کر چکا ہوں۔'' حمید اللہ نے کہا۔

''اور جواب کیا ملا؟''

''صرف ایک کہ انسان کو ہمیشہ سے اپنی طاقت کے اظہار کا شوق رہا ہے۔ چاہے کسی پر ظلم کرنا پڑے۔ چاہے کسی کی آزادی چھین لی جائے۔ چاہے اس کو برباد کر دیا جائے۔ اس کو اپنا شوق پورا کرنا ہے۔ فراز کا ایک شعر سن لو۔''

''فراز میرا بھی پسندیدہ شاعر ہے۔''

شعر یہ ہے کہ

امیرِ شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے

ساتھ، ہم پچھلے دروازے سے نکل سکتے ہیں۔‘‘

’’بہت اچھا شعر ہے۔‘‘ ساوتری نے ایک گہری سانس لی۔ ’’لیکن سرحد پار سے جو دراندازی ہو رہی ہے، اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟‘‘

’’ابھی تک یہی ثابت نہیں ہو سکا کہ یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ سرحد پار سے ہو رہا ہے یا خود یہاں کے لوگ ہیں؟‘‘

’’اگر یہاں کے بھی لوگ ہیں تو بھی تم اس کو کیا کہو گے؟‘‘

’’جبر کے خلاف جدوجہد۔ دیکھو ساوتری ہوتا یہ ہے کہ کبھی کبھی ایک تصویر کے دو بہت واضح پہلو ہوتے ہیں۔ ایک بھارت سرکار کا پوائنٹ آف ویو ہے۔ وہ اس تحریک کو بغاوت کا نام دے رہی ہے جبکہ یہاں کے لوگ اسے جدوجہد آزادی کہتے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی معاملہ ہے جب 1857ء میں ہوا تھا۔ ہندوستانیوں نے انگریزوں کے خلاف جو آواز اٹھائی، اسے بغاوت کا نام دیا گیا اور ہندوستانی اسے آزادی کی جدوجہد کہتے ہیں۔‘‘

’’تو پھر فیصلہ کیا ہو کہ کون غلط ہے اور کون صحیح ہے؟‘‘ ساوتری نے پوچھا۔

’’فیصلہ صدیوں کے بعد سامنے آتا ہے۔ تاریخ فیصلہ کرتی ہے۔‘‘

حمیداللہ کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ باہر سے ہنگاموں کی آوازیں آنے لگیں۔ بہت سے لوگوں کا شور تھا۔ ریستوران میں بیٹھے ہوئے لوگ باہر نکل آئے تھے۔ حمید بھی ان میں شامل تھا جبکہ ساوتری بیٹھی رہی تھی۔

کچھ دیر ہی گزری تھی کہ دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی دھوئیں کا ریلا ریستوران میں داخل ہو گیا۔ حمید سوں سوں کرتا ہوا اندر آ گیا۔

اس کے آنسو بری طرح بہہ رہے تھے۔ دوسروں کا بھی یہی حال تھا۔

’’کیا ہوا؟‘‘ ساوتری نے پوچھا۔

’’میں ذرا چہرے پر پانی مار لوں، پھر بتاتا ہوں۔‘‘ حمید بولتا ہوا واش روم میں گھس گیا۔

باہر آنسو گیس کی شیلنگ جاری تھی۔ لوگوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آنسو گیس نے خود ساوتری کی آنکھوں میں جلن پیدا کرنی شروع کر دی تھی۔

حمید واش روم سے واپس آ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے ساوتری کا ہاتھ تھام لیا۔ ’’چلو میرے

دونوں باہر نکل آئے۔ ہنگامہ سامنے والی سڑک پر رہ گیا تھا۔

بہت دور چلنے کے بعد ساوتری نے پوچھا۔ ’’کیا تھا یہ سب، کیوں ہوا تھا؟‘‘

’’بہزاد صاحب کی ایک نظم روزنامہ نئی روشنی میں چھپی ہے۔‘‘ حمیداللہ نے بتایا۔ ’’سرکار کو اس نظم کے تیور پسند نہیں آئے۔ اس لیے بہزاد صاحب کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ یہ جلوس ان ہی کی گرفتاری کے خلاف تھا لیکن پولیس نے اس پر شیلنگ کر دی۔‘‘

’’اوہ۔‘‘ ساوتری نے ایک گہری سانس لی۔ ’’کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا؟‘‘

’’ابھی تک تو نہیں ہوا لیکن اتنا ضرور اندازہ ہے کہ شاید اب یہ آگ بجھنے والی نہیں ہے۔ کھیل شروع ہو گیا ہے۔‘‘

☆☆☆

2010ء

اب بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔

بہزاد کشمیری کو کشمیر بدر کر دیا گیا تھا۔ صفدر اور درشن کالج میں پہنچ چکے تھے۔ ان کی پڑھائی کے آخری سال چل رہے تھے۔

دیپالی اور درشن ابھی تک ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔

صفدر کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب آ چکا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔

حمیداللہ اور ساوتری دہلی چلے گئے تھے۔ سنا یہ گیا تھا کہ دونوں نے شادی کر لی ہے۔ صفدر نے اپنے مرحوم باپ کی دکان سنبھال لی تھی اور درشن سنگھ کو فوج میں کمیشن مل گیا تھا۔

جانے سے ایک رات پہلے دونوں بہت دیر تک سرینگر کی گلیوں اور سڑکوں پر پیدل گھومتے رہے تھے۔ یہاں کے چپے چپے سے ان کی یادیں وابستہ تھیں۔

مغل گارڈن، شالیمار گھاٹ، نہ جانے کہاں کہاں، انہوں نے رمضان کے مشہور ہوٹل سے رمضان کی کشمیری چائے بھی پی تھی۔

امام حسین اسپتال کے سامنے سے گزرتے ہوئے صفدر جذباتی ہو گیا تھا۔ ’’یار، یہ وہی اسپتال ہے جہاں ہم اپنے ابا کو لے کر آئے تھے۔‘‘

’’ہاں یار، مجھے بھی چاچا کے جانے کا بہت دکھ ہے۔‘‘ درشن سنگھ نے کہا۔ ’’افسوس، میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

دہلی میں تھا۔"

"جانتا ہوں یار۔" صفدر نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "تو فوج میں آفیسر بننے گیا ہوا تھا۔"

"ابھی کہاں آفیسر، ابھی تو کئی سال لگیں گے، بہت سخت ٹریننگ ہوگی۔"

"ویسے ایک بات بتاؤں، تیرے بغیر مجھے یہاں بہت ڈر لگے گا۔" صفدر نے کہا۔ "تو میرے ساتھ تھا تو حوصلہ رہتا تھا۔"

"پھر وہی بات کی تو نے۔ ارے یار! اس طرح کب تک ڈرتا رہے گا۔ اب تو جوان ہو گیا ہے۔ جوانوں جیسی بات کیا کر۔"

"کچھ بھی ہو یار، تیری یاد آتی رہے گی۔"

"ہاں، وہ ایک دوسری بات ہے۔"

"اچھا یہ بتا، وہ پالی کا کیا ہوگا؟"

"اس کا کیا ہوگا، وہ میرا انتظار کرے گی۔" ورشن سنگھ نے بتایا۔ "اس کے ماں باپ سے بات ہو چکی ہے، ہماری منگنی ہو جائے گی۔"

"پھر تیرے چار پانچ بچے ہوں گے۔" صفدر نے کہا۔ "اور تو ان کا چاچا بن کے ان کو سیر کے لیے لے جایا کرے گا۔"

دونوں ہنس پڑے۔ زندگی کا سفر اس وقت بہت خوبصورت ہو جاتا ہے جب مستقبل کے راستے سامنے ہوں اور یادوں کے سائے تعاقب میں ہوں۔ انسان کی زندگی میں کتنے دوراہے آتے ہیں۔

ورشن سنگھ دوسری صبح دہلی کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

صفدر کے لیے اب زندگی صرف دکان تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ دکان جو اس کا باپ ورثے میں چھوڑ گیا تھا۔

اس دن بھی وہ اپنی دکان میں بیٹھا تھا کہ ایک لڑکی دکان میں داخل ہوئی اس کے ساتھ پانچ چھ برس کا ایک خوب صورت سا بچہ بھی تھا۔

وہ لڑکی بھی بہت خوب صورت تھی۔ اس نے حجاب لے رکھا تھا۔ جو یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ ایک مسلمان لڑکی ہے۔

"مجھے اپنے بھائی کے لیے کوئی تحفہ لینا ہے۔" لڑکی نے صفدر سے کہا۔

"اوہو، پوری بات بتائیں نا، بھائی کی سالگرہ کے لیے۔" بچہ چلا کر بولا۔ "آپ پوری بات بتایا کریں۔"

"اچھا اچھا، بھائی کی سالگرہ کا تحفہ چاہیے۔" لڑکی ہنس پڑی۔ "آپ کوئی خیال مت کیجیے گا، جنید بہت شرارتی ہے، دن بھر اسی قسم کی باتیں کرتا ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ شرارتی بچے ذہین بھی ہوتے ہیں۔ ہاں تو مسٹر یہ بتاؤ کیا چاہیے تحفے میں؟" صفدر نے اس بچے سے پوچھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں مسٹر نہیں ہوں۔ جنید ہوں۔" بچے نے کہا۔ "اور یہ میری باجی آئینہ ہیں۔" اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔

"بے وقوف، انہوں نے میرا نام نہیں پوچھا تھا۔" لڑکی جھلا کر بولی۔

"چلیں، کوئی بات نہیں۔" صفدر مسکرا دیا۔ "اس بہانے نام معلوم ہو گیا۔"

نہ جانے کس طرح اس نے ایسی بات کہہ دی تھی۔ آج تک کسی لڑکی سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ صرف یہ ساوتری تھی ورشن سنگھ کی دوست جو کبھی کبھی اس کی دکان کی طرف آجاتی۔ اس سے ڈھیر ساری باتیں ہوا کرتی تھیں۔

اب یہ لڑکی ملی تھی جو خود بھی بہت اچھی تھی اور جس کا چھوٹا شریر سا بھائی بھی اچھا تھا۔

"آپ اپنا نام تو بتائیں۔" جنید نے کہا۔ "آپ نے ہمارا نام تو معلوم کر لیا۔"

"اچھا بھائی، بتاتا ہوں۔" صفدر ہنس پڑا۔ "میرا نام صفدر ہے۔"

"میں آپ کو صفدر بھائی کہوں گا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔" صفدر نے ایک شوکیس میں رکھا ہوا ایک کھلونا ہیلی کاپٹر نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لو جنید میاں، یہ میری طرف سے تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔"

"ارے ایسا نہ کریں، یہ تو بہت مہنگا ہوگا۔" آئینہ نے کہا۔ "آپ اس کے پیسے بتا دیں۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تحفہ میں اپنے چھوٹے بھائی کو دے رہا ہوں۔"

"شکریہ صفدر بھائی۔"

"ہاں، ایک بات اور۔ یہ ہیلی کاپٹر ریموٹ کنٹرول سے اڑتا بھی ہے۔ ٹھہرو، میں اس کا ریموٹ بھی دیتا ہوں۔"

"واہ۔" جنید تالیاں بجانے لگا۔ "اب مزہ آئے گا۔ اب اس ہیلی کاپٹر سے میں بم برسا دوں گا۔"

''ہم برسا دیں گے، کس پر؟''
''فوجیوں پر۔'' جنید نے کہا۔
''خاموش رہو۔'' آئینہ نے ڈانٹ دیا۔ ''تم جہاں جاتے ہو، اسی قسم کی باتیں کرنے لگتے ہو۔''
ہر کسی کی زندگی میں اس قسم کا موقع ضرور آتا ہے۔ جب اسے زندگی کا یہ رنگ دلکش دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس کی رگوں میں ایک سرشاری کی لہری دوڑنے لگتی ہے۔
آئینہ کے آنے کے بعد صفدر نے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ پھر کئی بار اس کی دکان میں آئی۔ اور اب یہ دونوں ایک نامعلوم سے بندھن میں بندھتے چلے گئے۔
یہ محبت کا بندھن تھا۔ پیار کا بندھن تھا۔
وہ جب اس کے پاس آتی تو صفدر دکان کو کسی پڑوسی دکان دار کے حوالے کر کے فرازد یا کشمیر ہوٹل کی طرف نکل جاتا۔ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔
اکثر آئینہ کا بھائی جنید بھی ساتھ ہوا کرتا۔ صفدر کو بھی اس سے اُنسیت ہو گئی تھی۔ وہی اُنسیت جیسی چھوٹے بھائی سے ہوا کرتی ہے۔
جنید کو آئسکریم بہت پسند تھی۔ وہ صفدر سے اکثر آئسکریم کی فرمائش کرتا۔ صفدر اسے آئسکریم کھلا کر بہت خوشی محسوس کیا کرتا تھا۔
لیکن کشمیر کی زندگی میں سب کچھ ٹھیک نہیں تھا۔
آئینہ ایک سمجھ دار لڑکی تھی۔ وہ صفدر سے اس موضوع پر بات کیا کرتی۔ ''آخر ہمارا کیا مستقبل ہے؟''
''پتا نہیں۔ میں تو بہت مایوس ہو چکا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہنگامہ کرنے والوں کو کیا ملتا ہے۔ ہم اپنی مرضی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کشمیر کی حد تک ہم آزاد ہیں۔ زندگی گزر رہی ہے۔ پھر خواہ مخواہ یہ جلسے جلوسوں کا کیا فائدہ۔''
''صفدر، تم چونکہ آزادی کی زندگی اور غلامی کی زندگی میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے اس لیے ایسا کہہ رہے ہو۔''
''اور تم کیا جانو۔''
''میں جانتی ہوں۔ تم نے میرے دادا مولانا عنایت کیف کا نام سنا ہے۔''
''ارے، وہ...... وہ تمہارے دادا تھے۔''
''ہاں، وہ میرے دادا تھے اور تم جانتے ہو کہ بھارتی فوج نے انہیں کیسی بے دردی سے شہید کیا تھا۔''
''ہاں، جانتا ہوں میں لیکن انہیں جگہ جگہ تقریریں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''
''ضرورت تھی صفدر، تم نہیں جانتے کہ اس قسم کی جدوجہد کتنی قربانیاں مانگتی ہے۔ کیا تم نے وہ خبر پڑھی کہ دہلی کالج میں چند ہندو طالب علموں نے ہمارے کشمیری طالب علموں کو کس طرح بری طرح مارا ہے۔''
''ہاں، میں یہ بھی سن چکا ہوں۔''
''ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان بھی تھے اور کشمیری بھی۔ ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم اپنے کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ نہیں مانتے۔ اس لیے یہ آئے دن کی فوج کشی ہوتی رہتی ہے۔''
''آئینہ، تمہارے خیالات تو بہت باغیانہ قسم کے ہیں۔'' وہ کہا کرتا۔
''اب جو بھی سمجھ لو لیکن ہمیں بہت بڑا قدم اٹھانا ہے اور یہ قدم ہم خود ہی اٹھائیں گے۔''
صفدر حیرت سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو اس طرح پُرجوش ہو کر باتیں کر رہی تھی۔
''آئینہ، میں تمہیں ایک مشورہ دوں؟'' اس نے کہا۔
''ضرور دو۔''
''تم ایسی باتیں ہر جگہ مت کیا کرو، نہ جانے تمہارے آس پاس کس قسم کے لوگ گھوم رہے ہوں اور خدانخواستہ بھارتی ایجنسی کے عتاب میں آجاؤ۔''
''صفدر، افسوس ہے کہ تمہاری بزدلی نہیں جاتی۔ خود سوچو، اگر ہر کشمیری اسی خوف میں مبتلا ہے تو یہ جدوجہد کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تم نے خود دیکھ لیا کہ پوری دنیا نے بھارت کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور تو اور اسلامی ملکوں کا بھی یہی حال ہے۔ یو این او خاموش بیٹھا ہے۔ اسلامی ملکوں کی تنظیم او آئی سی کچھ نہیں کہتی، تو پھر ہم کیا کریں، بتاؤ......؟''
''تمہارا کیا خیال ہے کہ کشمیریوں کی یہ جدوجہد کامیاب ہو گی؟''
''ہاں۔'' آئینہ کے لہجے میں عزم تھا۔ ''ضرور کامیاب ہو گی۔ اس قسم کی جدوجہد کو زیادہ عرصے تک دبا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ قوموں کو اپنا مقام حاصل کرنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔''
ان کے درمیان اسی قسم کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ذہنی اختلاف کے باوجود دونوں کی محبت بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ انہیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ ان کے گھروں کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔

آئینہ کے ساتھ اس کا بھائی جنید بھی آجایا کرتا تھا۔ آئینہ کبھی کبھی جنید کو صفدر کی دکان ہی میں چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے چلی جاتی۔ اس دوران وہ صفدر کا دماغ کھاتا رہتا۔

صفدر کو اس سے اتنی انسیت ہو گئی تھی کہ اگر دو چار دنوں تک وہ آئینہ کے ساتھ نہیں آتا تو وہ خود اس کو دیکھنے کے لیے آئینہ کے گھر پہنچ جاتا۔

آئینہ کے گھر والوں نے صفدر کو مستقبل کے داماد کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے تھے۔

زندگی بہت سبک خرامی سے اپنی راہ پر گامزن تھی۔ صفدر کا خیال تھا کہ آئینہ بی اے سے فارغ ہو جائے تو پھر وہ اس کے گھر باقاعدہ شادی کا پیغام بھیج دے گا۔

☆☆☆

2016ء

درشن سنگھ اور صفدر ایک بار پھر سرینگر کی گلیوں میں بھٹکتے نظر آتے تھے۔

درشن سنگھ میجر بن کر سرینگر واپس آگیا تھا۔ اس کے آنے کے بعد پھر وہی روز و شب تھے۔ درشن سنگھ کی رہائش فوجی چھاؤنی میں تھی۔ لیکن وہ موقع نکال کر صفدر کی دکان کی طرف آجاتا تھا۔ وہ سادہ لباس میں اس کے پاس آیا کرتا تھا۔

کشمیر کے حالات اچانک ہی خراب ہو گئے تھے۔

بھارت سرکار کے مطابق باغیوں نے سر اٹھا لیا تھا۔ لال چوک سیاسی اکھاڑا بن کر رہ گیا تھا۔ روزانہ یہاں سے جلوس نکلا کرتے اور بھارتی تسلط کے خلاف آوازیں بلند کی جاتیں۔

درشن سنگھ صفدر سے کہا کرتا۔ ''یار، میں ایک بات بتاؤں۔ مجھے تیری طرف سے پریشانی بھی ہے اور اطمینان بھی۔''

''وہ کیوں؟''

''پریشانی تو اس بات کی ہے کہ تیری دکان لال چوک پر ہے جو اس وقت باغیوں کا گڑھ بنا ہوا ہے۔ اور اطمینان اس لیے کہ تو اتنا ڈرپوک ہے کہ ان چکروں میں پڑتا ہی نہیں ہوگا۔''

''ہاں یار، مجھے واقعی بہت ڈر لگتا ہے۔'' صفدر نے بتایا۔ ''اول تو میں اپنی دکان کھولتا ہی نہیں ہوں۔ اگر کھول بھی لوں تو جب اس قسم کے ہنگامے ہونے لگتے ہیں تو شٹر گرا کر اندر ہی بیٹھ جاتا ہوں۔''

اس پر درشن سنگھ بہت دیر تک ہنستا رہا۔ ''اسی لیے تو اطمینان ہے یار۔''

''یار، ایک بات بتا۔ یہ حالات اچانک اتنے کیوں خراب ہو گئے؟'' صفدر نے پوچھا۔

''یہ سب سرحد پار سے، پاکستان کی طرف سے ہو رہا ہے۔'' درشن کے لہجے میں شدید تنفر تھا۔ ''سرحد پار سے دہشت گرد آتے ہیں۔ یہاں کارروائیاں کرتے ہیں اور ہمارے یہ بے وقوف کشمیری بھی ان کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ لیکن سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بھارت سرکار نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب ان کو سبق سکھانے کے لیے اور بھی طاقت استعمال کرے گی۔ اب کوئی رعایت نہیں دی جائے گی۔''

صفدر خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا تھا۔

ان معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کی خواہش اور دعا اب صرف یہی رہ گئی تھی کہ اس کی دکان چلتی رہے اور آئینہ سے اس کی شادی ہو جائے۔

اس سال نومبر کی تاریخ شادی کے لیے مقرر ہو گئی تھی۔ صفدر ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ وہ اب جنید کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگا تھا۔

جنید جب اسے دولہا بھائی کہہ کر مخاطب کرتا تو صفدر کو بہت اچھا لگتا تھا۔

صفدر اسے لے کر ڈل جھیل کی طرف چلا جاتا تھا۔ یہ سرینگر کا ایسا علاقہ تھا، جہاں ہنگاموں کی گونج ذرا کم ہی سنائی دیتی تھی۔

باپ نہیں ماں

پارک میں ایک صاحب چہل قدمی کر رہے تھے کہ انہوں نے ایک جوان کو دیکھا جو چھوٹے بال اور نیلی جینز پہنے بیٹھا تھا۔ اس پر انہوں نے برابر والے شخص سے پوچھا۔ ''بھائی آپ کو اندازہ ہے، یہ لڑکا ہے یا لڑکی؟''

دوسرے نے جواب دیا۔ ''یہ لڑکی ہے اور یہ میری بیٹی ہے۔''

پہلے شخص نے اس بات پر معافی مانگی اور کہا۔ ''پہچاننے میں غلطی ہوئی کہ آپ اس لڑکی کے والد ہیں۔''

اس پر دوسرے شخص نے جواب دیا۔ ''میں اس لڑکی کا باپ نہیں ماں ہوں۔''

شاہ جہاں، کراچی

ایک بار جنید زور زور سے ہنستا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

''باجی، آج تو مزہ آگیا۔''

''کیوں، کیا ہوا؟''

''دولہا بھائی تو بہت ڈرپوک ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''راستے میں ایک بیل بیٹھا ہوا تھا۔ دولہا بھائی کی تو حالت ہی خراب ہوگئی۔ وہ اس کے پاس سے بھی نہیں گزر رہے تھے جبکہ میں اس کے برابر سے آرام سے گزر گیا تھا۔ ڈرپوک، ڈرپوک۔''

آئینہ مسکرا دی۔ ''ہاں بھائی، وہ ایسے ہی ہیں۔ شادی کے بعد تم ان کو ٹھیک کر دینا۔''

لیکن شادی سے بہت پہلے اگست کے مہینے میں حالات اچانک خراب ہوگئے۔

بھارتی فوجی اب آنسو گیس کی شیلنگ کے ساتھ ساتھ گولیاں بھی برسانے لگے تھے۔ سرکار نے کرفیو کا اعلان کر دیا تھا لیکن اس اعلان کے باوجود جلوس نکالے جاتے تھے۔

روزنامہ نئی روشنی کا ایڈیٹر خرم بھی گرفتار ہو گیا تھا۔

ہنگاموں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا تھا جو کسی طور پر رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

لال چوک کی دکانیں نامعلوم مدت کے لیے بند کر دی گئی تھیں۔ ان میں صفدر کی دکان بھی تھی۔

درشن سنگھ کی ذمے داریاں بڑھ گئی تھیں۔ اسے ہر حال میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ ان ہنگاموں کو سختی سے کچل دے۔ اس کے فوجیوں نے عوام پر پیلٹ گن کا استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔

پوری دنیا میں اس بربریت کے خلاف احتجاج شروع ہو گیا تھا۔ لیکن یہ سب زبانی ہمدردیاں تھیں۔ عملی طور پر کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا۔

صفدر اب گھر میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ ایک بار بھی کسی جلوس یا مظاہرے میں شریک نہیں ہوا تھا۔

ایک دن ایک بہت بری خبر سننے کو ملی۔

سخت کرفیو کے باوجود جلوس نکالا گیا۔ گولیاں چلیں۔ پیلٹ گن کا استعمال ہوا اور ننھا جنید شہید ہو گیا۔ اس کی شہادت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

دس بارہ برس کے بچے کی شہادت نے پوری دنیا کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ سرحد پار کے ٹی وی چینلز اپنی نشریات میں جنید کی شہادت کی خبریں دے رہے تھے۔

صفدر کسی نہ کسی طرح آئینہ کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں ایک مجمع لگا ہوا تھا۔ لوگ تعزیت کے لیے آ رہے تھے۔

آئینہ اسے دیکھتے ہی پھٹ پڑی تھی۔ ''معلوم ہے تمہیں، میرے بھائی کو کس نے مارا ہے۔ تمہارے دوست درشن سنگھ نے۔ اس نے فائر کیا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کیونکہ میں خود اس جلوس میں تھی۔''

صفدر خاموش رہ کر سنتا رہا۔

اس کے پورے بدن میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ ایک بہت بوجھل، گاڑھا اور تھکا دینے والا اندھیرا اس کے اعصاب پر طاری ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے جنازے میں شرکت نہیں کی۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔ وہ خاموشی سے اپنے گھر آ گیا۔ گھر کے باہر آرمی کی ایک گاڑی کھڑی تھی۔ درشن سنگھ اس سے ملنے آیا تھا۔

وہ کرفیو کے دوران کئی بار اس کے پاس آ چکا تھا۔ تاکہ اس کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو لا کر دے دے۔

صفدر کو دیکھتے ہی وہ تیزی سے اس کے پاس آ گیا۔ ''بے وقوف آدمی، تم اس وقت کہاں چلے گئے تھے؟''

صفدر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں درشن سنگھ کے اس ریوالور پر تھیں۔ جو اس کے پہلو سے لٹک رہا تھا اور اس سے پہلے کہ درشن سنگھ کچھ سمجھ سکتا، صفدر نے ایک جھٹکے سے وہ ریوالور اس کے ہولسٹر سے نکال لیا تھا۔ ایک ڈرپوک زندگی میں پہلی بار کوئی ایسا قدم اٹھا رہا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن کی خبریں بہت ہنگامہ خیز تھیں۔

صفدر نام کے ایک نوجوان نے اپنے پرانے دوست درشن سنگھ سے اس کا ریوالور چھین کر کئی گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔ میجر درشن سنگھ کے ساتھ آنے والے فوجیوں نے صفدر کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔ وادی میں ایک نئے ہنگامے کی ابتدا ہو گئی تھی۔

آئینہ نے یہ خبر سن کر اپنے سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔ ''میرا صفدر ڈرپوک نہیں تھا۔ نہیں تھا ڈرپوک، نہیں تھا ڈرپوک۔''

باہر گلی سے نعرہ تکبیر اور آزادی آزادی کے نعرے بلند ہو رہے تھے اور آئینہ روئے جا رہی تھی اور پورا کشمیر سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

صفدر کی شہادت پر...... اور بارہ سال کے جنید کی شہادت پر۔

اُس واقعے کے ٹھیک دو ماہ بعد ایموری وِلسن اپنے دیہاتی گھر سے دو گھنٹے کی ڈرائیو کر کے شہر میں قائم کتابوں کے سب سے بڑے اسٹور 'برنس اینڈ نوبل' پر پہنچا۔ اس نے اپنا پرانا فورڈ ایف - 150 ٹرک روڈ پار کھڑا کیا اور دکان کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

وِلسن کو شہری زندگی پسند نہ تھی۔ بھیڑ بھاڑ، روشنیاں، تارکول سے بنی سڑکیں اور ان پر تیزی سے دوڑتی گاڑیاں، فضا میں اُڑتے طیاروں کی گھن گھرج...... اسے یہ سب پنجھ

شکاری محبت

مختار آزاد

محبت بادِ نسیم کی طرح لطیف ہے... ہر شخص اس جذبے تلے خمیدہ ہو جاتا ہے... محبت سے لبریز دل عجز و انکساری کا پیکر ہوتے ہیں... انسان کا دل مدد کے لیے پکارتا ہے... انسانی روح نروان کے لیے التجائیں کرتی ہے... لیکن ہم ان التجاؤں کی پروا نہیں کرتے... کیونکہ نہ ہم سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں بلکہ اس شخص کو پاگل کہتے ہیں جو سنتا ہے اور سمجھتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کی محبتوں... عنایتوں اور حسرتوں کا فسانہ... جو لوگوں کی نظر میں بے وقوف اور پاگل تھا... ہر ایک کے نزدیک وہ بے مول اور بے مصرف تھا...

محبت کدہ میں مقید ایک شکستہ دل کی شکاری محبت کا احوال

سخت ناپسند تھا لیکن شہر جتنا بڑا تھا اور یہ سب کچھ شہری زندگی کا حصہ ٹھہرا۔ اگرچہ وہ مجبوری میں وہاں آ تو گیا لیکن پہنچتے ہی نکل بھاگنے کی جلدی تھی حالانکہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جو کرنے جا رہا ہے، اس کے لیے ابھی اسے ایک اور بڑے شہر کا رخ کرنا ہے، نہ جانے وہاں کب تک ٹھہرنا پڑے۔ بات اگر کوئی اور ہوتی تو شاید وہ اس جھمیلے میں نہیں پڑتا لیکن معاملہ محبت اور فرض کا تھا۔

باہر کے مقابلے میں اسٹور کے اندر کا ماحول خاصا روشن تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو اس کے چاروں طرف صرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ ولسن نے اس سے پہلے اپنی پوری زندگی میں بھی ایک ساتھ اتنی کتابیں نہیں دیکھی تھیں۔ وہ سب کو نظر انداز کرتا ہوا شیلف کی طرف بڑھا۔ اسے کسی خاص چیز کی تلاش تھی۔ کچھ ہی دیر میں مطلوبہ شیلف اس کے سامنے تھے۔ خانوں میں مختلف اقسام کے نقشے رکھے تھے۔ وہ اپنا مطلوبہ نقشہ ڈھونڈنے لگا۔ "بوسٹن اور اس کے مضافات" ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی اس نے نقشہ اٹھالیا۔ پرت در پرت، یہ نقشہ اتنا بڑا تھا کہ اسے کھول کر دیکھنے کے لیے ولسن کو اپنے دونوں بازو پھیلانے پڑے تھے۔ کچھ دیر تک نقشہ دیکھنے کے بعد اسے دوبارہ تہ کیا اور کاؤنٹر پر پہنچ کر قطار میں لگ کر سکون سے اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔

کاؤنٹر کلرک تقریباً بیس سال کی ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی گردن پر گلاب کے پھول کا ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ ٹی شرٹ اور نیلی جینز پہن رکھی تھی۔ جب ولسن کی باری آئی تو وہ آگے بڑھا اور نقشہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "میڈم..... میں یہ خریدنا چاہتا ہوں لیکن یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا یہ میری ضرورت کے لیے مناسب رہے گا؟"

کاؤنٹر کلرک مسکرائی اور سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ "معاف کیجیے گا، میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکی۔"

"لگتا ہے میں اپنی بات ٹھیک طرح سے سمجھا نہیں سکا۔" یہ کہہ کر ولسن نے لمحہ بھر سوچا اور پھر کاؤنٹر پر رکھے نقشے پر اپنی انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ "میرا مطلب ہے کہ یہ نقشہ مکمل تو ہے، کہنے سے مراد یہ ہے کہ اس میں وہاں کے ہر مقام اور ہر سڑک کی رہنمائی کی گئی ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ مکمل ہے۔" کاؤنٹر کلرک نے نقشے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "ویسے بھی اگر محسوس ہو کہ کسی مقام پر نقشہ مددگار نہیں تو تم گوگل میپ کی مدد تو لے ہی سکتے ہو، جو جاننا چاہو گے، فوراً پتا چل جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ "زیادہ فکر نہ کریں۔ اب انٹرنیٹ اور گوگل نے زندگی زیادہ آسان کر دی ہے۔"

"میرے خیال میں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" یہ کہتے ہوئے ولسن نے اپنا بٹوا نکالا۔ "لیکن بات یہ ہے کہ نہ تو میرے پاس کمپیوٹر ہے اور نہ ہی اسمارٹ فون۔ ویسے بھی میں ان چیزوں کا استعمال نہیں جانتا ہوں۔ البتہ نقشہ سمجھنا آتا ہے۔" یہ کہہ کر سوالیہ نگاہوں سے اس دیکھا۔

"صرف تین ڈالر....." لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس ڈیجیٹل دور میں بھی کیا کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے جو امریکا میں رہتا ہو لیکن کمپیوٹر سے نابلد ہو۔ اس نے سر جھٹک کر چہرے پر پڑتے بال ایک طرف کیے اور بقایا گن کر اس کی طرف بڑھائے۔ "میرے خیال میں آپ کے لیے یہ مددگار رہے گا۔"

"شکریہ....." ولسن نے رقم بٹوے میں رکھی اور نقشہ اٹھا کر دکان سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

ولسن نیو ہمپشائر کے نواحی قصبے لی ٹاؤن کے مضافات کی لیک ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتا تھا۔ تقریباً دو ماہ قبل وہ لی ہارڈ ویئر اسٹور پر کچھ واشر لینے رکا تھا تاکہ کچن کے نل سے پانی کا رساؤ روک سکے۔ اسٹور کے مالک جمی اسٹارک نے یہاں آنے پر اس کا خوش دلی سے شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ جمی نے نیلے رنگ کی بب والی جینز پہن رکھی تھی، جس کی سب سے اوپری جیب میں پین، پنسل اور فولڈنگ رولرز بھرے ہوئے تھے۔ جمی کے بڑے بڑے کانوں اور موٹی ناک کے اوپر سیاہ رنگ کی موٹی کمانی والی عینک دھری تھی۔ سیاہ اور موٹے بال کنگھی سے سائیڈ میں بنائے گئے تھے۔ اس کا وزن تین سو پونڈز سے زیادہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسٹور میں کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ اسی لیے اطمینان سے اسٹول پر بیٹھا رہتا اور جس چیز کی ضرورت پڑتی، ذرا سا زور لگا کر اسے دھکیلتا اور پہیوں والا اسٹول کسی گاڑی کی طرح چلتا ہوا مطلوبہ ریک تک اسے پہنچا دیتا تھا۔

ولسن نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ایک شیلف میں رکھے ڈبے سے چند واشر نکالے اور کاؤنٹر پر لا کر رکھے۔

جمی نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ "رساؤ روکنا ہے۔"

ولسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیک ہاؤس میں؟" جمی نے پوچھا۔ "وہ اب بھی وہیں ہے۔"

ولسن نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔

جمی نے واشر اور اسے لگانے میں مدد دینے والی گوند کی ایک ٹیوب کاغذ کے لفافے میں ڈالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تم اب تک کس طرح جینی کے ساتھ رہ رہے ہو۔''

''وہ میری بیوی ہے۔'' ولسن نے احتجاجی لہجے میں جواب دیا۔

جمی نے احتجاجی لب و لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لو...... دو ڈالر نوسینٹ ہوئے۔''

ولسن نے نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''ویسے یہ بات طے ہے کہ تم خود ہی زبردستی اس کے ساتھ چپکے ہوئے ہو ورنہ وہ تمہیں لات مار کر کب کا دور پھینک چکی ہے۔'' جمی اس کا ہم عمر اور اسکول کے زمانے کا دوست بھی تھا۔ اسی لیے ذرا بے تکلفی سے اس کی نجی زندگی پر بات کر رہا تھا۔

ولسن یہ بات درجنوں بار پہلے بھی کئی دوستوں کے منہ سے سن چکا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور جمی کی طرف دیکھا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ وہ صرف ایک وقفہ چاہتی ہے، اسے کچھ عرصہ تنہائی کی ضرورت ہے تاکہ کچھ سوچ سمجھ سکے۔'' ایک بار پھر وہ کسی کی وضاحت پیش کر رہا تھا۔ ''اس کے سوا اور کوئی بات نہیں۔ کسی نے کسی کو لات مار کر نہیں پھینکا ہے۔''

''لیکن اب تو اسے تم سے علیحدہ رہتے ہوئے بھی ایک سال ہونے کو آگیا ہے۔'' جمی نے کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ آج نہیں تو کل اس کا ذہن بدل جائے۔ وہ حقیقت کو تسلیم کرلے اور زندگی پھر پہلے جیسی ہوجائے۔'' ولسن کے لہجے سے خوش گمانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' جمی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''وہ ایسی عورت ہرگز نہیں جو یہ سوچ سکے کہ وہ غلطی پر تھی۔ اگر وہ کسی بات کو اپنی غلطی سمجھتی ہے تو صرف یہ کہ تم سے شادی کرکے اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔'' یہ کہہ کر جمی نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر کہنے لگا۔ ''ولسن...... تم بہت اچھے آدمی ہو لیکن بڑی آسانی سے بے وقوف بن جاتے ہو۔''

''جمی...... کیا کہہ رہے ہو تم؟'' ولسن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔

''برا مت منانا میرے دوست۔'' کاؤنٹر کے دوسری طرف کھڑے جمی نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''تم ہائی اسکول کی فٹ بال ٹیم میں سب سے نمایاں تھے۔ کاؤنٹی فٹ بال میں تم اسٹار رہے۔ تمہارا باپ بیمار لیکن بہت دولتمند تھا۔ یہی خاصیتیں جینی کے مفاد میں تھیں۔ اسی لیے اس نے تم پر ڈورے ڈالے۔ جانتی تھی کہ بیمار باپ آج مرا تو کل ساری جائیداد تمہارے ہاتھ لگے گی اور وہ کاؤنٹی کی سب سے دولتمند عورت بن جائے گی۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تو بعد میں پتا چلا کہ تمہارے مرحوم باپ نے ساری جائیداد وقف کردی تھی۔ بے چاری جینی اور اس کی تشنہ خواہشیں۔'' یہ کہہ کر وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی تو کیا کرے؟ اب وہ اپنی غلطی پر جھلائے گی تو۔''

''صرف جائیداد ہی نہیں، ڈیڈی تو سب کچھ خیرات کر گئے تھے۔ ہمارا گزارا تو اب پنشن پر ہے۔'' ولسن نے سادگی سے کہا۔ ''ویسے گزارے کے لیے یہ بھی کچھ کم رقم نہیں۔''

''ہاں...... لیکن صرف تمہارے لیے، جینی کے لیے تو یہ مونگ پھلی جتنی بھی نہیں۔'' یہ کہہ کر جمی نے کچھ توقف کیا۔ ''تمہارے باپ کے کیے کا بدلہ وہ تم سے لے رہی ہے۔ خود تو مزے سے لیک ہاؤس میں رہ رہی ہے اور تم پڑے ہوئے ہو اپنے باپ کے شکاری کاٹیج میں۔''

''میں نے تو کہہ دیا تھا کہ وہ جو کچھ لینا چاہتی ہے، لے سکتی ہے۔'' ولسن نے منمناتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے لہجے سے لگتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو کسی بات کا دوش دینے کو تیار ہی نہ تھا۔

''ہوسکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' جمی نے زیرلب کہا اور پھر اس کی طرف غور سے دیکھا۔ ''ویسے یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ تم اب تک اس کے شوہر ہو۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا طلاق اور آدھی پنشن کے کاغذات منہ پر مار کر اسے چلتا کیا ہوتا۔''

ولسن نے کاؤنٹر سے واشرز اور ٹیوب کا لفافہ اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا۔ ''یاد رکھنا، میں دوسروں جیسا انسان نہیں ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اسٹور سے باہر نکل آیا۔

مارکیٹ کے پارکنگ ایریا کے ایک کونے پر اب بھی چند پرانی وضع قطع کے پے فون قابلِ استعمال حالت میں تھے۔ ولسن چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا بوتھ پر پہنچا۔ سکہ ڈال کر اپنے گھر 'لیک ہاؤس' کا نمبر ملایا۔

''ہیلو......'' دوسری گھنٹی پر جینی نے فون اٹھایا۔

''ولسن بول رہا ہوں۔ واشر خرید لیے ہیں اور تقریباً بیس منٹ میں گھر پہنچتا ہوں۔''

''تم تھوڑی دیر بعد آنا۔'' دوسری طرف سے جینی نے

رکھائی سے جواب دیا۔ "میری اور ان کی بچیاں آئی ہوئی ہیں۔ ابھی میں ان کے ساتھ لنچ میں مصروف ہوں۔ اگلے دو گھنٹے تک تم یہاں مت آنا۔"

"جب تم گھر پر نہیں ہوگی، تب آ کر انہیں لگا جاؤں گا۔"

"پلیز ولسن......" وہ چلائی۔ "بات مت بڑھاؤ۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ تم میری غیر موجودگی میں گھر پر آؤ۔" اس کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی۔

ولسن کانوں سے فون لگائے کھڑا تھا۔ "رجسٹری میں میرا نام بھی ہے، اصولی طور پر وہ گھر اب بھی میرا ہے۔" زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے ریسیور کریڈل سے لٹکا دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا جیسے اپنے ہی گھر میں داخل ہونے سے روک کر جینی نے اس کی تذلیل کی ہے لیکن لحہ بھر میں ہی اس کا غصہ ہوا ہو گیا۔ "کوئی بات نہیں۔ قانونی طور پر گھر میرا ہی ہے لیکن میں کوئی جھنجھٹ پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ تم چاہتی ہو دو گھنٹے بعد تو پھر دو گھنٹے بعد ہی گھر پہنچوں گا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے ٹرک کی طرف بڑھ رہا تھا۔

لی ٹاؤن اور لیک ہاؤس میں ولسن کا بچپن، لڑکپن اور جوانی گزری تھی لیکن اب وہ اپنے گھر کی مخالف سمت میں ٹرک دوڑاتا ہوا میلوں دور اس جنگل کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں اس کے باپ نے درختوں سے گھرے علاقے میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا شکاری کاٹیج قائم کیا تھا۔ شکار کے دوران وہ وہیں پر ٹھہرتا تھا۔ گزشتہ ایک سال سے، جب سے جینی نے لیک ہاؤس پر قبضہ جمایا، تب سے وہی کاٹیج اس کا ٹھکانا تھا۔

اس کاٹیج میں پہلی بار وہ اپنے والد اور چچا کے ساتھ بارہ برس کی عمر میں آیا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی، جہاں اس نے گھر سے دور زندگی کی پہلی رات گزاری تھی۔ یہیں اس نے زندگی میں پہلی بار شراب چکھی۔ اس کے چچا نے پہلی بار شکار گاہ پہنچنے پر اسے ایک بڑا سا چاقو تحفے میں دیا تھا۔ اس چاقو سے پہلی بار اس نے اپنے شکار کیے گئے ہرن کو ذبح کیا تھا۔ برسوں بعد بھی وہ شکاری چاقو اس کے زیر استعمال تھا۔ اب وہ چاقو پھینک کر ہرن گرانے کا ماہر شکاری بن چکا تھا۔

کچے راستے پر ٹرک دوڑاتا ہوا وہ کاٹیج پہنچا اور ایک طرف کھڑا کر کے باہر نکلا۔ خزاں کا موسم تھا۔ برچ اور میپل کے سوکھے پتے اس کے پاؤں تلے چرمرا رہے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا کاٹیج میں پہنچا اور برآمدے میں پہنچ کر ... پاؤں پہنچ گیا۔ سردیوں کی آمد آمد تھی لیکن بارش اور برف باری ابھی دور تھی۔ برف باری اور بارش کے دوران جنگل کی کچی زمین کیچڑ سے بھر جاتی تھی۔

وہ خزاں کا ایک روشن اور خوشگوار دن تھا۔ خیالوں میں گم ولسن کو ایک سال پہلے کہے جینیفر کے الفاظ یاد آ رہے تھے: "میں یہ تو نہیں جانتی کہ چاہتی کیا ہوں لیکن فی الحال میں یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمہیں ہرگز نہیں چاہتی۔ ولسن تمہارے لیے اس وقت بہتر یہی ہے کہ سامان اٹھاؤ اور اپنے باپ کے شکاری کاٹیج میں چلے جاؤ اور وہیں پڑے رہو۔"

"واقعی...... کیا تم یہی کہہ رہی ہو۔" ولسن کو اچھی طرح یاد ہے کہ جینی کی بات سن کر اسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔

"کیا بکواس ہے......" جینی نے غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے کہا تھا۔ "میں وہی کہہ رہی ہوں، جو تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ میں سخت ناخوش ہوں اور ایسے میں بہتر یہی ہے کہ تم گھر سے فوراً کھسک لو۔"

"لیکن میری خوشی......؟ کبھی تم نے میری خوشی کے بارے میں سوچا ہے، اس کا کیا بنے گا؟" ولسن حسب عادت منمنایا تھا۔

"یہ تمہارا مسئلہ ہے، میری دردسری نہیں کہ اس پر بھی سوچتی پھروں۔" شوہر کا سوال سن کر وہ جلائے لہجے میں بولی تھی۔

جینی کا رویہ دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ کیا کہے، کیا نہ کہے۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھا، بیگ اٹھایا اور اپنے کپڑے، دوسرا ضروری سامان پیک کر کے کاٹیج میں آ گیا۔ اس بات کو بھی ایک سال ہو چکا، تب سے وہ اسی کاٹیج میں رہ رہا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو گھنٹے ہونے والے تھے، اسے لیک ہاؤس پہنچنا تھا۔

ولسن گھر کے اندر داخل ہوا تو اسے بیڈ روم سے جینی کے چلانے کی آواز سنائی دی۔ "تم سے کتنی بار کہا ہے کہ دستک دے کر اندر داخل ہوا کرو، میں ڈر جاتی ہوں مگر تم کہاں سمجھو گے۔ جب آؤ گے، اسی طرح منہ اٹھا کر، اونٹ کی طرح اندر بڑھتے چلے آؤ گے۔"

ولسن جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ "میں اچانک نہیں آیا ہوں۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ دو گھنٹے بعد آنا اور یہ بات تم پہلے سے ہی جانتی ہو۔ اس میں حیران کر دینے والی کیا بات

ہوگئی۔'' اس کی آواز تھوڑی اونچی تھی۔

''لعنت بھیجو...... اندر آؤ۔'' جینی کی آواز پھر سنائی دی۔ ''ابھی میں تم سے بحث کے موڈ میں نہیں ہوں اور نہ ہی جھگڑنا چاہتی ہوں...... چلو، سیدھے طرح کچن میں چلے جاؤ۔''

ولسن خاموشی سے آگے بڑھا اور کچن میں داخل ہوگیا۔ جینی نے شکایت کی تھی کہ کچن کے نلکے سے پانی رس رہا ہے۔ اسے ٹھیک کرنے کے لیے اس نے دوپہر کو جی کے اسٹور سے واشر خریدے تھے۔ کچن کے ٹائلز چمک رہے تھے۔ اس نے پرانا اخبار فرش پر بچھا کر اپنا ٹول کٹ بیگ اُس پر رکھا۔ پانے وغیرہ نکالے۔ اس کی کوشش تھی کہ کچن کے چمچماتے فرش پر کوئی داغ دھبا نہ پڑے ورنہ جینی کو بھڑکنے کا ایک اور موقع مل سکتا تھا۔

''ہائے......''

ولسن اپنا کام کر رہا تھا کہ عقب سے آواز سنائی دی، وہ مڑا۔ لیونگ روم میں کھڑی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی ولسن کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا بالکل اُسی انداز میں جیسے کئی سال پہلے، پہلی بار اُسے دیکھ کر دھڑکا تھا۔ اُس نے سیاہ رنگ کے شارٹ ٹائٹس، سفید ٹی شرٹ، پاؤں میں ربر کے بوٹ شوز پہن رکھے تھے۔ سفید بیس بال کیپ سے اس کے سنہری بالوں کی پونی ٹیل نکل رہی تھی۔ ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک تھی۔ کولون کی مہک لیونگ روم سے کچن تک آرہی تھی۔

''میں کشتی رانی کے لیے جارہی ہوں، تم بھی چلو۔''

ولسن کے لیے یہ غیر متوقع پیشکش تھی۔ اس نے اوزار ایک طرف رکھے اور خاموشی سے آگے بڑھا۔ وہ گھر کے سامنے چھوٹا سا لان عبور کر کے جھیل کنارے بنے اپنے بوٹ ہاؤس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لان، جھیل اور گھر کے درمیان حد فاصل تھا۔

جینی نے بوٹ ہاؤس کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ ایک کونے میں ربر کی پیڈل کشتی رکھی تھی۔ ولسن نے ہینڈل سے پکڑ کر کھینچا اور وہ دونوں جھیل کی طرف بڑھنے لگے۔ جینی نے کشتی پانی میں داخل کی تو ولسن اسے سیدھا پکڑے کھڑا رہا۔ جینی کے بیٹھتے ہی وہ بھی اچھل کر بیٹھا۔ کشتی ڈگمگائی لیکن فوراً سنبھل گئی۔ جینی اور وہ پیڈل چلاتے ہوئے جھیل میں آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ولسن بیوی کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کشتی میں رکھی لائف جیکٹ کافی پیچھے گھاس پر پڑی ہوئی تھی۔ پانی میں کشتی ڈالتے ہوئے وہ نہ جانے کیسے باہر گر گئی تھی۔

''تم کتنا آگے تک جاسکتے ہو؟'' جینی نے خاموشی توڑی۔

''جتنا آگے تک جانا چاہوں۔'' ولسن نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

''اوہ...... کیا بات ہے۔'' یہ کہتے ہوئے جینی نے سن گلاسز ٹھیک کیے۔

''جینی......'' ولسن نے آہستگی سے پکارا۔

''کیا بات ہے۔'' وہ بدستور سن گلاسز کی کمانیوں کو کانوں پر ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

''تم کیا سمجھتی ہو...... کیا واقعی میں بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح انسان ہوں۔'' ولسن کے لہجے سے بے یقینی جھلک رہی تھی۔

یہ سنتے ہی جینی کے لبوں پہ ایک مسکراہٹ ابھری لیکن اگلے ہی لمحے غائب ہوگئی۔ اس نے شوہر کی طرف گردن موڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں سن گلاسز کے پیچھے پوشیدہ تھیں۔ لمحہ بھر وہ ولسن کو دیکھتی رہی اور پھر منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً...... جتنا سمجھتے ہو، اس سے کہیں زیادہ بڑے احمق ہو۔''

''اوہ......''

''سنو......'' جینی نے گردن موڑے بغیر کہا۔ ''فریج میں دودھ ختم ہوگیا، چند ایک دوسری چیزیں بھی نہیں ہیں۔ کیا تم واپس جانے سے پہلے اسٹور جاکر سارا سودا لادو گے؟''

''کیوں نہیں......'' ولسن نے خوش دلی سے کہنا شروع کیا۔ ''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جانے سے پہلے سب کچھ لادوں گا۔ تب تک سوچ لینا کہ گھر میں اور کیا کچھ ختم ہوچکا ہے۔'' اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ جینی کا یوں مخاطب کرنا اس کے لیے جیسے کوئی بہت بڑی خوشی کی بات ہو۔

ولیم جھیل قصبے کی ایک بڑی جھیل تھی جو کافی آگے جاکر دو حصوں میں بٹ جاتی تھی۔ اس کی گہرائی کافی تھی۔ شمالی حصے پر پانی کا دباؤ بہت زیادہ رہتا تھا۔ پانی قریب میں بہتے دریا سے نکلنے والی ایک قدرتی نہر کے ذریعے شمالی جھیل میں داخل ہوتا تھا۔ شمالی حصے میں چٹانیں، پانی کے دباؤ اور گہرائی کی وجہ سے بہت کم لوگ اس طرف جاتے تھے۔ زیادہ تر وہی اُس طرف جاتے جنہیں گہرے پانیوں میں تیرنے یا سرفنگ کرنے کا شوق ہوتا تھا۔ کشتی رانی کے شوقین عام طور پر جھیل کے جنوبی حصے کی طرف ہی جاتے

تھے۔ وہاں جھیل کافی چوڑی، گہری اور پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ ہفتہ وار تعطیل کے دوران کافی رش رہتا تھا لیکن عام دنوں میں کم لوگ ہی جھیل کی سیر کو آتے تھے۔ ان دونوں کی کشتی بھی جنوب کی سمت بڑے سکون سے بہہ رہی تھی۔

دونوں آہستہ آہستہ پیڈل چلاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ولسن کو ناراض بیوی کا غیر متوقع ساتھ اچھا لگ رہا تھا۔ اسی دوران اُس کے ذہن میں ماضی کی کھڑکی کھل گئی۔ اُس کا شکوہ دل دہلا گیا تھا۔ جینی کہہ رہی تھی۔ ''بس اب میں اس حالت میں مزید گزارا نہیں کرسکتی، ایسی روکھی پھیکی اور خالی ہاتھ زندگی گزارنا میرا خواب نہیں تھا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو میری جان لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ہمیں پریشانی کیا ہے۔'' ولسن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ''آنٹی ہمارے سارے بل ادا کردیتی ہیں۔ اضافی طور پر بھی میں اِدھر اُدھر کچھ کام کاج کر کے دو پیسے کما لیتا ہوں۔ اچھی طرح تو گزارا ہو رہا ہے۔''

''تو تمہارا خیال ہے کہ میں نے تمہاری اس مزدوری سے حاصل ہونے والے دو ٹکوں کی خاطر شادی کی تھی۔'' وہ شوہر پر سخت بگڑ رہی تھی۔ ''میں بہت کچھ چاہتی ہوں لیکن ولسن...... تم وہ سب کچھ مجھے نہیں دے سکتے، جس کی مجھے ضرورت ہے۔''

''لیکن جینی...... میں تم سے پیار کرتا ہوں، تمہارا خیال رکھتا ہوں۔''

''نہیں......'' جینی نے طیش کے عالم میں بھنا کر کہا تھا۔ ''اگر تم مجھ سے واقعی محبت کرنے والے ہوتے تو اپنے باپ سے اُس کی وصیت پر بات کرتے، جو ہمارا حق ہے، وہ لے کر رہتے۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو پھر اپنے باپ سے وہ دولت حاصل کرلو جو ہمارا حق ہے، جس کی شاید تمہیں تو نہیں البتہ مجھے اشد ضرورت ہے۔''

ولسن نے بیوی کے طعنے تشنے سن کر کچھ نہ کہا لیکن دل میں فیصلہ کرچکا تھا کہ وہ دولت کے لیے کبھی اپنے باپ کے سامنے تن کر کھڑا نہیں ہوگا۔ حقیقت میں وہ اپنے باپ کے سامنے کبھی کچھ بولنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا تھا۔ تب بھی جب وہ زندہ تھا اور اب بھی، جب اسے دنیا سے گزرے ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصہ بیت چکا تھا۔

ولسن خیالوں میں گم تھا کہ کہیں دور سے آتی اسکی جیٹ کشتی کے انجن کی آواز اسے حقیقت کی دنیا میں واپس لے آئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ دونوں کافی آگے تک نکل آئے تھے۔ اسے لگا کہ یہ ایک سے زیادہ کشتیوں کے انجن کی آوازیں تھیں۔ کچھ دیر میں انجن کا شور قریب آنے لگا تو ولسن نے تیزی سے کشتی کا رخ موڑا۔ وہ کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ جینی کو بھی احساس ہوگیا تھا لیکن اس نے سر جھٹک دیا۔ وہ ایک اچھی تیراک تھی۔ اسے لگتا تھا کہ پانی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

جھیل کے اس حصے میں اسکی جیٹ کشتیاں چلانے کی ممانعت تھی۔ اس سے گہرے پانی میں بنتے بھنور دوسروں کے لیے جان لیوا ثابت ہوسکتے تھے۔ اسی لیے ولسن گھبرا گیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں دونوں اسکی جیٹ کشتیاں سامنے آگئیں۔ ایک گہرے نیلے رنگ کی تھی، دوسری سفید، جس پر زرد رنگ کی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ دونوں بہت تیز رفتاری سے دائرے کی شکل میں گھوم رہی تھیں۔ ہر ایک کشتی پر ایک ایک ڈرائیور موجود تھا۔ دونوں جوان تھے اور بہت زور زور سے چلاتے جا رہے تھے۔ ان کی آواز انجنوں کے شور میں دب رہی تھی۔ ان میں سے ایک نوجوان کو اس نے اچھی طرح دیکھ لیا۔ اس کے بال گھونگریالے اور جسم کسرتی تھا۔ وہ نیلی والی کشتی چلا رہا تھا۔ جس تیزی سے وہ دونوں دائرے کی شکل میں کشتیاں گھما رہے تھے، اس سے جھیل کے ٹھہرے پانی میں طوفان آگیا۔ تیزی سے لہریں بننے لگی تھیں، دائرے کی شکل میں بھنور اٹھنے لگے تھے۔ پانی میں تلاطم سے ان کی چھوٹی سی فائبر گلاس پیڈل کشتی تیزی سے اِدھر اُدھر ڈول رہی تھی۔ ولسن بڑی کوششوں سے توازن برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جینی بھی سمجھ چکی تھی کہ خطرہ سر پر ہے۔ دونوں نے تیزی سے پیڈل گھمانے شروع کردیے تاکہ کسی نہ کسی طرح کنارے تک پہنچ جائیں۔ اسی دوران ان منچلوں کی کشتیوں نے رخ بدلا اور تیزی سے سامنے کی طرف سے ان کی جانب بڑھیں۔ ان دونوں کشتیوں کی رفتار اتنی تیز تھی کہ پانی میں مچی ہلچل اور تیز ہوگئی۔ اُن کی چھوٹی کشتی بری طرح ڈول رہی تھی۔ وہ دونوں کشتیاں تیزی سے سامنے آرہی تھیں۔ جینی اور ولسن دونوں کے ہوش اڑ چکے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں اسکی جیٹ کشتیاں برابر برابر تیرتی ہوئی تیزی سے ان کی طرف بڑھیں۔ دو کشتیوں کے بیچ اٹھنے والی لہروں نے ان کی کشتی کا توازن بگاڑ دیا۔ اگلے ہی لمحے ان کی کشتی الٹ گئی، وہ دونوں پانی میں گر رہے تھے۔ ستم یہ ہوا کہ گرتے ہوئے نیلی کشتی جینی کے سر سے ٹکرائی۔ اس سے

آگے وہ ولسن نہ دیکھ سکا۔ وہ خود پانی میں تھا۔

اگرچہ وہ اچھی تیراک تھی لیکن جن غیر یقینی حالات میں وہ گری، جس طرح اسکی جیٹ کشتیوں سے پانی میں بھونچال آیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ جس طرح کشتی اُس کے سر سے ٹکرائی تھی، اس نے جینی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ایک تو ٹکر سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی، دوسرا یہ کہ گرتے ہی بھنور میں پھنس گئی۔ ولسن نے جب سر اوپر اٹھایا، تب سطح آب پر دور دور تک نہ اسکی جیٹ کشتیاں تھیں اور نہ ہی جینیفر کا کوئی نام و نشان تھا۔

''جینی..... جینی۔'' ولسن ہذیانی انداز میں چلّا رہا تھا۔

اسی دوران جینی سطح آب پر نمودار ہوئی۔ پانی پر تیرتے اس کے سنہرے بال سورج کے باعث روپہلی کرنوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ولسن تیزی سے آگے بڑھا لیکن اگلے ہی لمحے وہ پھر بھنور میں پھنس کر نیچے جا چکی تھی۔ تقریباً دس منٹ تک ولسن اسے ڈھونڈتا رہا اور جب پانی میں ٹھہراؤ آنے لگا تو ایک بار پھر وہ سطح پر ابھری۔ ولسن تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ اس کا ہاتھ جینی کی کمر پر پڑا۔ گرفت سخت ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ اسے تھامے ہوئے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کافی دور، ان کی پیڈل کشتی پانی پر الٹی تیر رہی تھی۔

جھیل کے ٹھنڈے پانی سے ولسن کے بازو شل ہو رہے تھے۔ اسی دوران کنارے سے کچھ کشتیاں ان کی طرف تیزی سے بڑھنے لگیں۔ اُن میں ولسن کے ہمسائے اور کنارے پر سن باتھ لیتے لوگ تھے۔ کئی لوگوں نے حادثہ ہوتے دیکھ لیا تھا۔

جب جینی کو کنارے پر پہنچایا گیا تو اس کی سانسیں رک رک کر چل رہی تھیں۔ اسکی جیٹ کی ٹکر سے اُس کے سر کا پچھلا حصہ بری طرح زخمی ہوا تھا۔ اسے ہسپتال منتقل کیا ہی جا رہا تھا کہ وہ راستے میں ہی دم توڑ گئی۔

تین دن بعد ولسن لیک ہاؤس کے اپنے بیڈروم میں الماری کھولے کھڑا تھا۔ وہ تدفین کے لیے سوٹ نکال رہا تھا۔ سیاہ ماتمی سوٹ اس نے صرف تین بار پہنا تھا۔ انکل جان، ماں اور باپ کی تدفین کے وقت۔ چوتھی بار وہ چہیتی بیوی کے لیے ماتمی لباس پہننے جا رہا تھا۔

جینی کی آخری رسومات سینٹ پیٹرک چرچ میں انجام دی گئیں، جس میں قصبے کے چند عام لوگ اور اُس کے بعض دوست شریک تھے۔ تدفین کے بعد امریکن ہال میں مرحومہ کو خراج تحسین پیش کرنے کا پروگرام تھا۔ ہال کے باہر قائم بار میں مہمانوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام بھی تھا۔

تقریب شروع ہونے سے قبل ولسن بار میں بیٹھا تھا۔ مہمانوں کے لیے فری ڈرنکس اور سینڈوچز کا انتظام تھا۔ وہ بیئر کا آدھا بھرا گلاس تھامے افسردہ بیٹھا تھا۔

اسی دوران پولیس چیف بوبی میکن اندر داخل ہوا اور سیدھا اُس کے پاس پہنچا۔ ''میرے دوست ولسن.....'' اس نے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میری خواہش تھی کہ اس موقع پر تمہیں کوئی اچھی خبر دیتا لیکن افسوس کہ ایسی کوئی خبر میرے پاس نہیں۔''

''جانتا ہوں.....'' ولسن نے افسردگی سے جواب دیا۔

بوبی، ولسن کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اُس سے عمر میں تقریباً پانچ سال بڑا اور چھریرے جسم کا مالک تھا۔ اس کے سر کے بال گہرے سرخ تھے۔ وہ گہرے نیلے رنگ کی پولیس یونیفارم میں تھا اور شرٹ کے کندھے پر دونوں جانب دو سنہری اسٹار جگمگا رہے تھے۔ بوبی شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ اس کی بیوی ایریم قصبے میں ایک آرائشی سامان بیچنے والی دکان چلاتی تھی۔

''وہ لڑکے کہیں باہر کے تھے۔'' بوبی نے کہنا شروع کیا۔ ''یہاں کوئی ایسا نہیں جسے اس طرح کے لڑکوں کے بارے میں کچھ علم ہو اور نہ اُس طرح کی اسکی جیٹ کشتیاں پہلے جھیل پر دیکھی گئی تھیں۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ ''حیرت ہے کہ کنارے پر اکثر سن باتھ لینے والے بیٹھے رہتے ہیں لیکن کسی نے بھی انہیں اسکی جیٹ پانی میں اتارتے نہیں دیکھا۔''

ولسن کچھ دیر تک اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا اور پھر سرد آہ بھری۔ ''افسوس کہ اُن کی ایک حرکت نے میرا سب کچھ ختم کر دیا۔''

''البتہ ایک بات اچھی ہے۔''

ولسن نے چہرہ اٹھا کر بوبی کو دیکھا۔

''سب کا اندازہ ہے کہ وہ بوسٹن کے ہی رہنے والے ہیں۔ ہم نے ہائی وے، پیٹرول پمپس، موٹیل اور ہوٹل والوں کو خبردار کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ کہیں سے کوئی سراغ مل جائے۔'' بوبی نے امید افزا لہجے میں کہا۔ ''ویسے بھی وہ بڑی کشتیاں گاڑی کے پیچھے باندھ کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ کوئی تو ایسا ملے گا، جسے وہ دونوں یاد ہوں گے۔''

''سننے میں اچھا لگا۔'' ولسن نے مسکرانے کی کوشش کی۔

بوبی نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''تم فکر مت کرو، وہ جلد ہماری تحویل میں ہوں گے۔''

میں خود اس کیس کو دیکھ رہا ہوں۔"

ولسن نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ "تم کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہے، ویسے مجھے اس بارے میں زیادہ پریشانی نہیں۔ امید ہے تم انہیں جلد ڈھونڈ نکالو گے۔ مجھے پولیس پر بھروسا ہے۔"

بوبی اس بات پر مسکرا دیا۔ "ہمت رکھو، سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

اسی دوران ولسن کو اندر کچھ گھٹن محسوس ہونے لگی۔ وہ بوبی کو سوری کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔ لان میں کچھ جاننے والے سگریٹ نوشی کررہے تھے۔ ان میں ہارڈ ویئر اسٹور والا جمی اسٹارک، جینی کی سہیلی کا دوست باب جانسن، تدفین مرکز کا ٹرینٹ کیج اور چند دوسرے لوگ شامل تھے۔

ٹرینٹ ہائی اسکول کے بارہ برسوں کے دوران ولسن کا کلاس فیلو رہا تھا۔ اسے باہر آتا دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھا۔

"تم نے تدفین کے انتظامات بہت عمدگی سے کیے ہیں۔" ولسن نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے ستائشی لہجے میں کہا۔

"بہت افسوس ہے کہ مجھے یہ سب کچھ اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑا۔" ٹرینٹ نے نہایت افسردہ لہجے میں کہا۔ "ابھی وہ جوان تھی، اسے دنیا میں بہت زیادہ دیر تک رہنا چاہیے تھا، مگر......" اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

دوسرے لوگ بھی ان کے قریب آگئے تھے۔ سب سر ہلا کر ٹرینٹ کی تائید کررہے تھے۔ ولسن ان کے ساتھ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور پھر ہال کی طرف بڑھنے لگا۔ ٹرینٹ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اندر تعزیتی تقریب شروع ہونے والی تھی۔

ٹرینٹ نے بھی جینی کی یاد میں بہت عمدگی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ آخر میں ولسن مہمانوں کا شکریہ ادا کرکے اسٹیج سے نیچے اترنے لگا تو ٹرینٹ نے اسے روکا۔

"میں جانتا ہوں تمہیں مُردوں کے بارے میں کچھ کہنا اچھا نہیں لگتا لیکن جینی تمہاری بیوی تھی۔ اس کے بارے میں تمہیں کچھ زیادہ کہنا چاہیے تھا۔" یہ کہہ کر اس نے توقف کیا۔ "بہرحال، دعا ہے کہ تمہاری نئی زندگی اچھی رہے۔"

یہ سنتے ہی ولسن چونک گیا۔ "اس آخری جملے سے تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔" اس کے لہجے سے ناراضی عیاں تھی۔

ٹرینٹ نے وہاں کھڑے دوسرے لوگوں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے ان کی تائید حاصل کرنا چاہ رہا ہو۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ تم بہت اچھے انسان ہو ولسن اور شاید اسی لیے بہت سادہ لوح بھی......" یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا۔ "وہ ساری زندگی تمہاری سادگی کا فائدہ اٹھاتی رہی ہے اور جیسا وہ چاہتی تھی تم ویسا ہی کرتے رہے۔" وہ بات بنانے کی کوشش کررہا تھا۔

"معلوم نہیں تم کیا بکے جارہے ہو۔" ولسن جھلا گیا۔

"میں ایسا ویسا کچھ نہیں جانتا۔ بس ایک بات بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ میری بیوی تھی۔" اس نے شہادت کی انگلی سے سامنے لگی جینی کی تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ٹرینٹ مسکرایا اور اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ "بچپن کا دوست ہوں، سب اچھی طرح جانتا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم اب ایک نئی زندگی کے بارے میں سوچو۔ اس بار تمہیں اچھی طرح سوچ سمجھ کر بیوی کا انتخاب کرنے کی ضرورت ہوگی۔"

ولسن نے لمحہ بھر کو اسے غور سے دیکھا اور پھر غیر متوقع طور پر ایک زوردار گھونسا اس کے منہ پر جڑ دیا۔ اگلے ہی لمحے ٹرینٹ فرش پر پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ مزید بدمزگی ہوتی، چند لوگ بیچ بچاؤ کے لیے دوڑے۔ دو تین لوگوں نے ٹرینٹ کو فرش سے اٹھا کر سیدھا کھڑا کیا۔

دو لوگ ولسن کو بازو سے پکڑ کر دوسری طرف لے جارہے تھے لیکن وہ ایک جھٹکے سے پلٹا اور ٹرینٹ کے قریب آکر بولا۔ "تمہاری نیک تمناؤں اور مفید مشوروں کا شکریہ۔" اس کے لہجے سے غصہ جھلک رہا تھا۔

☆☆☆

جینی کی موت کو کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ ولسن اب تک صدمے میں تھا۔ اس حادثے کے بعد چاہتا تو لیک ہاؤس لوٹ جاتا مگر اب وہاں جانے کو اس کا دل ہی نہیں کرتا تھا۔ بدستور کاٹیج میں مقیم تھا۔ جینی کا غم بھلانے کے لیے اس نے خود کو مصروف کرنا چاہا، جلد ہی اسے قصبے کے نواحی جنگل کے ساتھ واقع پال اسٹیک کے فارم ہاؤس پر ملازمت مل گئی۔ اسے جنگل کے سوکھے درختوں کو کاٹ کر تنوں کو چار چار فٹ کے ٹکڑوں میں کاٹنے کا کام ملا تھا۔ پال جنگلات کا ایک بڑا ٹھیکیدار تھا اور ٹمبر سپلائی کا کاروبار کرتا تھا۔ ولسن کو کڑی جسمانی محنت کا معاوضہ بھی بہت اچھا ملتا تھا۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ دن بھر کی سخت مشقت کے نتیجے میں اسے رات کو بہت اچھی نیند آنے لگی تھی۔ جلد ہی اسے لگا کہ وہ جینی

کے صدمے سے نکل کر اور بہت کچھ سوچنے کے قابل ہو گیا ہے۔ چار پانچ ہفتوں تک اس کا کام جاری رہا، اس دوران وہ کسی حد تک خود کو بیوی کی موت کے صدمے سے باہر نکال چکا تھا۔

اس عرصے کے دوران پال کے فون نمبر پر ہی ہر دوسرے تیسرے روز اسے بوبی کا فون ملتا۔ ہر بار وہ ایک ہی بات دہراتا تھا۔ ''کیس پر کام جاری ہے لیکن اب تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔'' ہر بار وہ پُرامید ہوتا کہ جلد ہی حادثے کے ملزمان کا پتا چل جائے گا۔

شروع شروع میں بوبی کا فون آنے کی خبر ملتی تو وہ دھڑکتے دل کے ساتھ یہ سوچتے ہوئے ریسیور تھامتا کہ کوئی اچھی خبر ہوگی لیکن اب وہ پولیس کی طرف سے بھی ناامید ہوتا جا رہا تھا۔

جینی کی موت کو ڈیڑھ ماہ گزر جانے کے بعد بھی ملزمان لاپتا تھے۔ اس دوران بوبی کے بیان میں بھی ایک بات کا اضافہ ہو گیا تھا۔ پچھلے دو ہفتوں کے دوران جہاں وہ ولسن کو پولیس کی ناکامی کی خبر دیتا، وہیں یہ بھی اضافہ کر دیتا کہ ''دیکھو ولسن...... کسی بھی قتل کے بعد اگلے اڑتالیس گھنٹے قاتلوں تک پہنچنے کے لیے اہم ہوتے ہیں۔''

ہر بار ولسن بھی اسے ایک ہی جواب دیتا۔ ''جانتا ہوں، میں نے اخباروں میں ایسا پڑھ رکھا ہے۔''

اُس دن بھی بوبی اور ولسن کے درمیان اسی طرح کے جملوں کا تبادلہ ہوا۔ ''اب بھی دیکھو......'' بوبی اسے فون پر سمجھا رہا تھا۔ ''اڑتالیس گھنٹے تو کب کے گزر چکے لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری، تلاش جاری ہے۔ میں تمہیں زیادہ خوش فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا۔ پولیس ملزمان تک پہنچنے کی سر توڑ کوشش کر رہی لیکن پھر بھی......'' اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''میں جانتا ہوں چیف......'' ولسن نے جواب دیا۔

''اس بار بھی ہمیں ایک نئے گواہ کا پتا چلا ہے، پولیس اس پر کام کر رہی ہے لیکن مجھے علم نہیں کہ آیا اس گواہ کے بیان کی روشنی میں ہم اُن تک پہنچ سکیں گے یا نہیں۔'' اتنا کہہ کر بوبی نے کچھ توقف کیا۔ ''لیکن ہمیں امید کا دامن ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

ولسن ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

''دیکھو یہ قتل کا کیس ہے۔'' بوبی نے گفتگو میں اس کی عدم دلچسپی کو محسوس کر لیا تھا۔ ''بات صرف ان دو لڑکوں کو پکڑنے کی نہیں، جن میں سے ایک نے جینی کو ٹکر ماری تھی۔

> ## قیمت
>
> جب عورت تم سے محبت کرتی ہے تو تم اس کے شوہر بن جاتے ہو۔
>
> جب کچھ عورتیں تم سے محبت کرتی ہیں تو تم ماچو قسم کے آدمی بن جاتے ہو۔
>
> جب بہت ساری عورتیں تم سے محبت کرتی ہیں تو تم عاشق بن جاتے ہو۔
>
> جب سیکڑوں عورتیں تم سے محبت کرتی ہیں تو تم ایکٹر بن جاتے ہو۔
>
> جب ہزاروں عورتیں تم سے محبت کرتی ہیں تو تم ملک کے بڑے لیڈر بن جاتے ہو۔
>
> اور جب ساری دنیا کی عورتیں تم سے محبت کرتی ہیں تو تم آدمی نہیں ہوتے یا تو تم ہیرا، سونا یا ڈالر ہوتے ہو۔
>
> ام سلمٰی کی باتیں آزاد کشمیر سے

ہمیں ملزمان پکڑنے کے بعد عدالت میں یہ ثابت بھی کرنا ہوگا کہ جس اسکیٹ بورڈ نے جینی کو ٹکر ماری، وہ کشتی یہی نوجوان چلا رہے تھے۔ ہمیں قتل کی وجہ کو عدالت میں ثابت کرنا ہوتا ہے، وکیل صفائی کے سوالوں کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' ولسن نے بیزاری سے جواب دیا۔

''اب سمجھے نا......'' بوبی نے چہک کر کہا۔ ''اسی لیے ہم کیس کی تفتیش شروع سے ہی ایسی کرتے ہیں کہ کوئی خامی یا کمزوری نہ رہے۔''

ولسن نے ریسیور کو کانوں سے دور کر دیا۔ اسے بوبی کا لہجہ سانپ کے پھنکارنے جیسا لگ رہا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو اس نے ریسیور دوبارہ کانوں سے لگایا۔ ''آپ کی محنت قابلِ تعریف ہے سراغ ملے تو بتانا۔'' یہ کہہ کر اس نے لائن کاٹ دی۔

جینی کی موت کے بعد وہ قاتلوں کی گرفتاری کے لیے بوبی سے ڈھیروں امیدیں لگائے بیٹھا تھا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ شاید ہی پولیس قاتل نوجوانوں کو پکڑ پائے گی۔

اسے بولی کے فون آنے سے بھی چڑ ہونے لگی تھی۔ آخر اس رات کافی کچھ سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کرلیا کہ کس طرح ملزمان تک پہنچا جائے۔

اگلے دن صبح سویرے اس نے ایک فون کیا اور دو گھنٹوں بعد جنگل سے سیدھا ٹاؤن ہال پہنچا۔ ٹاؤن کلرک پام گیریسن کمال مہربانی سے پیش آئی۔ اس نے نہ صرف اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی بلکہ لیک ہاؤسنگ سوسائٹی کا نقشہ اور سروے ریکارڈ کی کاپی بھی بغیر کوئی فیس وصول کیے اسے دے دی۔ اس پر وہ مہربان خاتون کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھا۔ وہاں سے سیدھا اپنے گھر لیک ہاؤس پہنچا۔ جینی کی تدفین کے بعد وہ پہلی مرتبہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو لمحہ بھر کے لیے اس کے پاؤں جہاں تھے، وہیں جم گئے۔ گھر کے اندر اب تک اُس کے تابوت سے اٹھنے والی مہک باقی تھی۔ ایک بار پھر اسے اپنی بیوی شدت سے یاد آئی۔

وہ الٹے قدموں گھر سے نکل آیا۔ نقشہ اور سروے ریکارڈ کی کاپی والا لفافہ اب تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جھیل کی طرف بڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بنچ پر بیٹھا سامنے تک رہا تھا۔

بڑی رونق تھی۔ جھیل میں مچھلیاں پکڑنے کے شوقین لوگوں کی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ کچھ لوگ کنارے پر نہا رہے تھے، کچھ سن باتھ میں مصروف تھے۔ سامنے سے گزرتی ایک کشتی میں سوار جوڑے نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔ سب خوش گوار دن کے مزے لے رہے تھے۔

ولسن کافی دیر تک ماضی کی یادوں میں گم رہا۔ آخر اس نے سر جھٹکا اور کاغذات نکال کر ان کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ غور سے علاقے کے نقشے اور سروے رپورٹ کا مطالعہ کرتا رہا۔ سروے میں جھیل کے کنارے آباد لوگوں کے نام اور ان کے گھروں کے پلاٹ نمبر درج تھے۔ زیادہ تر لوگوں کو وہ جانتا تھا۔ اس نے نہایت غور سے کئی بار سروے رپورٹس اور ان پر درج لوگوں کے نام پڑھے۔ کچھ ناموں کو تو وہ اچھی طرح جانتا تھا البتہ بہت سارے لوگ اُس کے لیے اجنبی تھے۔

ایک بار، دو بار، تین بار...... آخر اس نے سروے رپورٹ اور نقشہ لپیٹ کر واپس لفافے میں رکھا۔ وہ جو کرنا چاہتا تھا، سروے رپورٹ کے مطالعے کے دوران اُس بارے میں اپنے دل میں سب کچھ طے کر چکا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور واپس لیک ہاؤس کی طرف بڑھنے لگا۔ گھر پہنچ کر اس نے تدفین کے سلسلے میں استعمال کیا گیا سامان اور دیگر متعلقہ کاٹھ کباڑ جمع کیا اور جنگل میں لے جا کر پھینک دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر میں ایسا کچھ بھی باقی رہے، جو اُسے بیوی کی موت یاد دلا سکے۔ جینی کو مردہ تصور کرنا، اس کے لیے جان نکال دینے کے مترادف تھا۔

ولسن نے سروے رپورٹ کی مدد سے ایک فہرست تیار کی اور پھر اگلے دو ہفتوں تک وہ وسیع و عریض جھیل کنارے واقع گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتا رہا۔ وہ ہر دروازے پر جاتا۔ دستک دیتا اور صرف ایک ہی بات کہتا تھا: ''میرا نام ایموز ولسن ہے، میں لیک ہاؤس 104 میں رہتا ہوں۔ دو مہینے پہلے دو بڑی اسکی جیٹ کشتیوں نے میری بیوی کو ٹکر مار کر جھیل کے اندر قتل کر دیا تھا۔ کیا آپ کو ان کشتی والوں کے بارے میں کچھ علم ہے۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ اُس دن آپ نے کیا کچھ دیکھا تھا۔ اگر آپ اس حوالے سے کچھ بھی جانتے ہیں تو پلیز میری مدد کیجیے۔''

اس صبر آزما مہم کے دوران اسے لوگوں کی ڈھیروں ہمدردیاں ملیں، لنچ میں مصروف کچھ لوگوں نے ولسن کی آمد پر ناگواری سے منہ بھی بنایا۔ پاؤڈرمل روڈ کی رہائشی، سنہرے بالوں والی مطلقہ حسین خاتون نے اسے ڈنر کی پیشکش کرتے ہوئے یہ تک کہا کہ ''تم واقعی ایک بہت اچھے مرد ہو لیکن افسوس میرے پاس ایسا کچھ نہیں جو تمہارے لیے مددگار ثابت ہو سکے۔''

اس مہم کے دوران ولسن کو صرف ایک شخص ایسا ملا، جس کی بات اس کے لیے کچھ حوصلہ افزا تھی۔ ایب کوشین اُس حادثے والے دن جھیل میں کشتی رانی کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا جب وہ اپنی کشتی لے کر جھیل کی طرف جا رہا تھا تو اس نے دو نوجوانوں کو دیکھا جن کی سیاہ شیورلیٹ جیپ کے پیچھے بندھے ٹرالر پر دو اسکی جیٹ کشتیاں لدی تھیں۔ اُس جیپ پر بوسٹن کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ ایب کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ دونوں جیپ سے باہر تھے اور عجیب طرح کی اوچھی حرکتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کی طرف بھی سوفٹ ڈرنک کا خالی کین اچھالا تھا لیکن وہ جھگڑا مول لینے کے بجائے انہیں نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ایب نے ولسن سے بڑی معذرت کی کہ اس کے سوا، وہ اُن کے بارے میں کچھ اور نہیں جانتا۔

ولسن پال اسٹیک کے پاس بدستور کام کر رہا تھا۔ جب سے اس نے جینی کو ٹکر مارنے والے نوجوانوں کی تلاش شروع کی تھی، تب سے اس نے کام کرنے کے وقت میں کچھ

فرق آ گیا تھا لیکن پھر بھی پال اس سے بہت خوش تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اب تک جتنے لوگ اس کے پاس کام کرتے رہے ہیں، ان میں سب سے عمدہ انسان ولسن ہے۔ وہ بیوی کے قاتلوں کی تلاش کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی پوری ذمے داری سے کررہا تھا۔ ولسن نے کام نمٹانے کے لیے منہ اندھیرے آنا شروع کردیا تھا۔ اس طرح بارہ ایک بجے تک وہ اپنے سارے دن کا کام مکمل کر کے قاتلوں کی تلاش میں جُت جاتا تھا۔

اگرچہ ولسن کی تلاش جاری تھی لیکن اسے کوئی کارآمد بات پتا نہ چل سکی۔ آخر ایک دن اُسے رالف موران مل گیا۔ وہ ..... کاٹیج میں رہتا تھا۔ یہ اس کی تلاش کا پندرھواں دن تھا۔ رالف نہایت شفیق اور ریٹائرڈ شخص تھا۔ ملازمت سے فراغت کے بعد وہ قدرتی نظاروں کی فوٹوگرافی کرتا تھا۔ یہ اس کے بچپن کا شوق تھا۔ جب ولسن نے اس کے در پہ دستک دی تو وہ اُس سے بہت محبت کے ساتھ پیش آیا۔ اسے کاٹیج کے اندر لے گیا۔ اندر کا نظارہ دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ فطرت سے محبت کرنے والے بوڑھے نے اسے رہائش کے لیے کیوں منتخب کیا ہوگا۔ سامنے کی بڑی سی کھڑکی سے جھیل کا دلکش نظارہ نگاہوں کے سامنے تھا۔

''بیٹھو.....'' گھنی داڑھی اور سنہرے بالوں والے رالف نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''شاید میں ان لڑکوں کے بارے میں کچھ جانتا ہوں۔''

یہ سن کر ولسن کو لگا کہ شاید اس کی محنت ٹھکانے لگ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر بیک وقت تاسف اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ ''تم نے انہیں کہاں پر دیکھا تھا؟'' کچھ توقف کے بعد اس نے سوال کیا۔

رالف نے دونوں بازو سینے پر باندھے اور گہری سانس لے کر کہا۔ ''انہیں جھیل پر نہیں دیکھا تھا۔''

''کیا مطلب.....'' ولسن کچھ سمجھ نہیں سکا۔

''جس دن یہ حادثہ ہوا، میں پیٹ اسٹور گیا تھا گھر کا سامان لینے۔'' رالف نے سر ہلاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''وہیں پر انہیں دیکھا، اس وقت وہ اسٹور کے برابر والے پیٹرول پمپ سے اپنی جیٹ کشتیوں کے انجن میں پیٹرول بھروا رہے تھے۔ انہیں دیکھنے اور یاد رہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ خوامخواہ اونچی آواز میں چیخ چلا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو مذاق میں گالیاں دے رہے تھے۔ ان کا رویہ اتنا خراب تھا کہ لمحہ بھر کو تو میں نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

''اوہ..... تو اس وقت پیٹ اسٹور کھلا ہوا تھا۔'' ولسن نے جلدی سے کہا۔ ''تم نے یہ بات پولیس چیف بوبی میکن کو بتائی تھی؟''

''اُس دن تو نہیں.....'' رالف نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''ہاں اس حادثے کے دوسرے دن میں اُس کے پاس گیا اور ساری بات بتادی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ پولیس اس معاملے کو نہایت توجہ سے دیکھ رہی ہے۔''

ولسن نے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔ ''میں تمہارا مقروض ہوں رالف..... اس کے عوض اگر اس پورے موسم سرما کے دوران میں تمہارے ڈرائیو وے کی صفائی کردیا کروں تو.....''

''کیا مطلب.....'' وہ یہ پیشکش سن کر حیران نظر آرہا تھا۔ ''تمہیں ایسا کچھ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''یقیناً، میں یہ کرسکتا ہوں اور ضرور کروں گا۔'' ولسن نے پُرجوش لہجے میں جواب دیا۔ رالف نے اسے کافی کی پیشکش کی لیکن اسے جانے کی جلدی تھی۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے کاٹیج سے باہر نکل آیا۔

شام ڈھل چکی تھی جب وہ سڑک نمبر سولہ پر، پیٹ جنرل اسٹور کے سامنے اپنا فورڈ ٹرک پارک کررہا تھا۔ اسٹور کے برابر ایک قطار میں چار پیٹرول پمپ بنے تھے۔ انہی میں سے ایک پر رالف نے اُن دونوں نوجوانوں کو پیٹرول بھرواتے دیکھا تھا۔ ولسن کو یقین تھا کہ اُن لڑکوں نے ضرور پیٹ اسٹور سے خریداری کی ہوگی۔ اسٹور پر سوڈا، بیئر، چپس، جوس اور اس طرح کی دیگر تمام اشیا دستیاب تھیں، جن کی جھیل پر جانے والے سیاحوں کو عام طور پر ضرورت پڑتی تھی۔

ولسن نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ یہ وقت عام طور پر دکانوں کے بند ہونے کا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور سڑک کے کنارے کنارے چلتا ہوا اسٹور پر پہنچا۔ وہ اندر داخل ہوا اور سیدھا کاؤنٹر پر گیا۔

''ارے تم.....'' حساب کتاب میں مشغول اسٹور کے مالک پیٹ ایرک نے اس پر نظر پڑتے ہی گرمجوشی سے کہا۔ ''تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کافی دنوں بعد نظر آئے، کیسے ہو؟'' پیٹ ولسن کا ہم عمر ہی تھا لیکن وہ کافی موٹا ہوچکا تھا۔ ہمیشہ نیلی شرٹ اور بلیک جینز میں ملبوس رہتا تھا۔ شرٹ کی بائیں جیب پر ''پیٹ اسٹور'' کڑھا ہوا تھا۔

''بالکل ٹھیک.....'' ولسن نے سائیڈ کارنر پر رکھے گلاس ڈور فریج کا دروازہ کھول کر کولڈ ڈرنک نکالتے ہوئے

کہا۔ ''اگر تمہاری مصروفیات اجازت دیں تو میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ڈالر کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ''ایک چپس پیکٹ بھی۔''

''کیوں نہیں......'' پیٹ نے ریزگاری اس کی طرف بڑھائی۔ ''ویسے بھی یہ دکان بند کرنے کا وقت ہے، مجھے گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کاؤنٹر سے باہر نکل آیا۔

''اگر اس بارے میں بوبی میکن تم سے کچھ تفتیش کر چکا ہے تو مجھے اُس پر کوئی حیرت نہیں ہوگی۔'' ولسن نے بات شروع کی۔ ''میں بھی کچھ ایسی ہی مدد لینے کے واسطے آیا ہوں۔''

''ہاں...... پولیس اور سراغرساں نے مجھ سے ملاقات کر کے کہا تھا کہ اگر اس معاملے میں کچھ جانتا ہوں تو انہیں بتاؤں، لیکن معذرت چاہتا ہوں میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔''

''مجھے وقت دینے کا شکریہ دوست۔'' یہ کہہ کر ولسن مڑا اور اسنیک کارنرز کی طرف بڑھا۔ ''تمہارے پاس پستے، بادام اور موٹے چپس ہیں۔'' وہ غور سے اسنیک شیلف پر رکھی چیزیں دیکھ رہا تھا۔ ''وہ لڑکے جس قماش کے تھے، انہیں برات کو ڈرنک کرتے ہوئے ایسی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہوگی۔''

پیٹ پلٹا اور اسنیکس کارنرز کے شیلف کا بغور جائزہ لینے لگا۔ ایک منٹ بعد وہ اُس کی طرف مڑا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمارے اسٹور میں اس طرح کی چیزیں موجود رہتی ہیں۔''

ولسن کچھ کہے بنا آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ پیٹ پلٹتا، ایک زوردار کِک اس کی کمر پر ماری۔ وہ سنبھل نہ سکا اور دھم سے فرش پر گر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، اس نے ایک اور کِک ماری۔ اس کے منہ سے تکلیف دہ کراہ ابھری۔ ولسن تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ لاک کیا۔ 'اوپن' کا نشان پلٹا 'کلوزڈ'...... اسٹور کی زیادہ تر روشنیاں پہلے ہی بند تھیں۔ اس نے ایک کے سوا ساری روشنیاں بند کیں اور دوبارہ پیٹ کی طرف آیا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کمر پر ایک اور کِک پڑی۔ وہ پھر فرش پر چت پڑا تھا۔ ولسن اسے کھینچ کر شیلف کی آڑ میں لے آیا اور سینے پر چڑھ کر اس کے منہ پر دو تین مکے مارے۔ پیٹ نڈھال ہو چکا تھا۔

''میں یہ سب کچھ مجبوری میں کر رہا ہوں پیٹ......'' ولسن بدستور اس کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا۔ ''تم میرے اتنے شناسا ہو گئے تھے یا دوست تھے بیوی کے قتل پر تم نے مجھے افسوس کا کارڈ بھی بھیجا تھا۔ لیکن......'' یہ کہتے ہوئے وہ سینے سے اترا اور اس کے برابر فرش پر بیٹھ گیا۔ ''اگر تم خود بتا دیتے تو اچھا تھا لیکن......'' یہ کہہ کر اس نے بے حال پیٹ کو اٹھنے کے لیے سہارا دینے کی خاطر ہاتھ بڑھایا۔ ''اُن دونوں نے میری بیوی کی جان لینے سے پہلے پیٹرول بھروایا تھا، دکان سے خریداری بھی کی ہوگی۔ اب بتاؤ وہ دونوں کون تھے؟''

پیٹ فرش پر بیٹھا کراہ رہا تھا۔ گھونسوں نے اس کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔ وہ اپنے گالوں کو سہلا رہا تھا۔

''چپ رہنے سے کام نہیں چلے گا۔'' وہ کچھ نہ بولا تو ولسن نے غصے سے کہا۔ ''اب تمہیں بتانا پڑے گا، وہ سب کچھ جو تم اُن دونوں کے بارے میں جانتے ہو...... بولو۔'' اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

پیٹ نے نفی میں سر ہلانے کی کوشش کی تو اس کے گال پر زوردار طمانچہ پڑا۔ ''مارو مت......'' وہ بھرائی آواز میں چلّایا۔ ''بتاتا ہوں۔''

ولسن کے چہرے پر مسکراہٹ طاری تھی۔

''ان کے پاس پیسے کم پڑ گئے تھے۔'' پیٹ نے بھرائی آواز میں آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ''انہوں نے کافی خریداری کر لی تھی۔ ان کی حرکتیں بڑی عجیب تھیں۔ وہ بالکل جنونی لگ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے بہت نشے میں ہوں۔''

''اور کچھ......'' ولسن نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''ان کا اسٹیٹ لاٹری کا ٹکٹ لگا تھا۔ میں نے ہی انہیں پانچ ہزار ڈالر کی انعامی رقم ادا کی تھی۔'' کاؤنٹر کے برابر اسٹیٹ لاٹری کا اشتہار بھی لگا ہوا ہے۔

''اور ادائیگی......'' ولسن نے گھورا۔ ''کیش یا چیک؟''

''کیش......''

''یہ بات تم نے پولیس سے کیوں چھپائی؟''

''جاتے ہوئے وہ میری طرف آئے تھے۔ منہ بند کرنے کے لیے دو ہزار ڈالر مجھے دیے تھے۔'' پیٹ نے بھرائی آواز میں جواب دیا۔

''لعنت ہے تم پر......'' ولسن نے نفرت سے کہا۔ ''تمہیں شرم نہیں آئی یہ کرتے ہوئے۔''

وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنے وکیل سے بات کی ہے۔ وکیل کا کہنا ہے کہ یہ صرف ایک حادثہ ہے، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ پیٹ اپنی حرکت کی صفائی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اٹھو اور مجھے لاٹری کا ریکارڈ کی تفصیل اور ان کا پتا دو۔'' یہ کہہ کر ولسن نے اس کی طرف غصے سے دیکھا۔ ''انعامی لاٹری ٹکٹ والے کا پتا تمہارے ریکارڈ میں تو ضرور ہوگا۔ اس کے بغیر تو ادائیگی نہیں ہوسکتی تھی۔''

پیٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کا سہارا لیتے ہوئے اٹھا اور کاؤنٹر کی طرف جاکر الماری کھولی اور کچھ دیر بعد وہ رجسٹر سے دیکھ کر، پتا لکھ کر ولسن کے حوالے کررہا تھا۔ ''پلیز...... پولیس کے سامنے میرا نام مت لینا۔'' وہ گڑگڑایا۔

''بےفکر رہو......'' ولسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''یہاں جو کچھ ہوا، اسے بھول جاؤ۔ میں بھی بھلا دوں گا۔ ولسن کا لہجہ دوستانہ تھا۔'' پولیس کو بھی اس بارے میں کچھ نہ بتانا اور مجھ سے خوفزدہ ہونے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔'' یہ کہہ کر ولسن نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''جو کچھ ہوا، وہ ایک حادثہ تھا تو یہاں جو کچھ ہوا، اسے بھی ایک اتفاق ہی سمجھو۔''

پیٹ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اب مطمئن نظر آرہا تھا۔

پیٹ اسٹور سے نکلنے کے بعد ولسن سیدھا شہر پہنچا، برنس اینڈ نوبل بک اسٹور سے بوسٹن کا نقشہ خریدا اور ہائی وے پر تیزی سے ٹرک دوڑانے لگا۔ اس کی منزل بوسٹن، یہاں سے صرف دو گھنٹوں کے فاصلے پر تھی۔ رات ہوچکی تھی جب وہ چیلسی پہنچا۔ اس کے باوجود شہر کی سڑکوں پر کافی چہل پہل تھی۔ جگہ جگہ ٹریفک اتنی جام تھی کہ بمشکل گاڑیاں بیس کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے آگے کھسک رہی تھیں۔ ولسن کو شدید غصہ آرہا تھا۔ وہ اس طرح کی بھیڑ بھاڑ سے ناآشنا تھا۔ پارکنگ کی تلاش میں بھی اسے کافی بھٹکنا پڑا، آخر اسے ایک جگہ نظر آگئی۔ وہ فائر ہائیڈرینٹ تھا۔ وہاں گاڑی کھڑی کرنا غیر قانونی تھا لیکن ولسن نے وہیں ایک طرف کر کے ٹرک پارک کردیا۔ پورے شہر میں اسے پارکنگ کے لیے یہی ایک خالی جگہ نظر آئی تھی۔

چیلسی کی سڑکوں پر کافی دیر کی خواری کے بعد آخر اسے مطلوبہ سڑک مل گئی۔ اسی سڑک پر واقع کسی ایک گھر میں نوٹی کوزا اور رہتا تھا۔ نوٹی کشتی والے دو نوجوانوں میں سے ایک تھا۔ پیٹ کے بیان سے تصدیق ہوچکی تھی کہ نوٹی کی کشتی ہی جینی سے ٹکرائی تھی۔ ولسن آگے بڑھنے لگا۔ تمام گھر دو منزلہ اور ایک ہی وضع قطع کے بنے تھے۔ ... کے آگے او پے کی ایک بار... وہ گھر کافی چھوٹے لگتے تھے ... میں رہنے کے عادی ولسن کو حیرت تھی کہ وہ بےشمار ان گھروں میں کس طرح شہر کے لوگ گزارا کرلیتے ہیں۔ اسے اب سمجھ آرہا تھا کہ گیراج سے عاری ان گھروں کی وجہ سے ہی چیلسی کی سڑکوں پر پارکنگ کی گنجائش ختم ہوچکی تھی۔ وہ اپنے مطلوبہ گھر کی تلاش میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مطلوبہ گھر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ پلٹا اور واپس اس طرف جانے لگا، جہاں اس نے اپنا ٹرک پارک کیا تھا۔

کچھ دیر بعد ولسن دوبارہ نوٹی کے گھر والی سڑک پر تھا۔ ایک کلب سے کچھ آگے اسے سڑک کنارے ٹرک کھڑا کرنے کی گنجائش مل گئی۔ اب کام کرنے کا وقت آچکا تھا۔

باہر ٹھنڈ بڑھ چکی تھی۔ اس نے جیکٹ کی زپ بند کی۔ اس کی کمر سے شکاری چاقو بندھا تھا۔ جیکٹ کی جیب میں اعشاریہ بائیس کی بھری ہوئی پستول بھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ چیلسی میں اسلحہ لے کر گھومنا غیر قانونی تھا لیکن اس وقت اسے کسی بات کی پروا نہ تھی۔ وہ صرف نوٹی کو انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔

نیولی اسٹریٹ نمبر 10 پر آگے بڑھتا ہوا وہ مطلوبہ گھر تک پہنچا۔ سڑک پر گاڑیاں آجارہی تھیں۔ گھروں سے ٹی وی اور میوزک کی آوازیں آرہی تھیں۔ آدھی رات کے باوجود شہر کے ان گھروں میں زندگی پورے جوبن پر محسوس ہورہی تھی۔ وہ آگے بڑھتا ہوا گلی کے کونے پر گیا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا، گھروں کے عقبی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ سڑک کی نسبت اس تنگ گلی میں سناٹا تھا۔ لکڑی کی باڑ باندھ کر گھروں کے عقبی حصے کو دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہر باڑ پر گھر کا نمبر درج تھا۔ مطلوبہ مکان پر پہنچ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دور تک کوئی نہ تھا۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور اگلے ہی لمحے وہ اندر تھا۔

عقبی حصے میں اندھیرا تھا۔ اس نے ٹارچ نکالی۔ دو اسکی جیٹ کشتیاں کھڑی تھیں۔ لمحہ بھر میں پہچان گیا۔ یہ دونوں وہی تھیں، جنہیں اس نے جھیل میں دیکھا تھا: ایک گہرے نیلے رنگ کی تھی، دوسری سفید، جس پر زرد رنگ کی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔

ولسن کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں جینی کا چہرہ ابھرا اور پھر...... اس کی مٹھیاں بھنچنے لگیں۔ وہ جلد از جلد اپنے انتقام کی آگ سرد کرنا چاہتا تھا۔

اسی دوران آواز گونجی ... ''کون ہو تم؟''

ولسن کا ہاتھ تیزی سے جیکٹ کے اندر گیا۔ پستول کے دستے پر اس کی گرفت سخت ہو چکی تھی۔ سیفٹی لاک کھل چکا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ جگہ تیز روشنی میں نہا رہی تھی۔ ہر چیز بالکل صاف تھی۔ گھر کے عقبی دروازے پر ایک شخص کھڑا تھا۔ ''کون ہو تم؟'' وہ چلّایا۔

وہ شخص تیزی سے آگے بڑھا اور ولسن کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ولسن کے عقب میں باڑ اور سامنے وہ شخص کھڑا تھا۔ اب نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا اور نہ ہی ایک قدم آگے بڑھانے کی گنجائش تھی۔

''کیا ہوا......'' اگلے لمحے کئی آوازوں نے بیک وقت کہا اور پھر لوگ دوڑتے ہوئے باہر نکلے۔

ولسن چونک گیا۔ اس کے اندازے سے زیادہ لوگ گھر میں موجود تھے۔ شاید کوئی پارٹی چل رہی تھی۔ وہاں پانچ مرد اور تین عورتیں کھڑی تھیں۔ ولسن غور سے ان کے چہرے دیکھنے لگا۔ انہی کے درمیان ایک چہرہ شناسا لگا۔ وہ کشتی والا نوجوان تھا۔ نیلی کشتی وہی چلا رہا تھا۔ وہی اس کی جیٹ جس کی ٹکر جینی کی موت کی وجہ بنی تھی۔

''کون ہو تم......'' یہ وہی نوجوان تھا۔ ''یہاں کیسے آئے، کیا کر رہے تھے؟'' اسے تنہا سمجھ کر وہ شیر ہوئے جا رہا تھا۔

''وہ ذرا میں......'' ولسن نے ہچکچاتے ہوئے بائیں ہاتھ کی چھنگلی انگلی اوپر اٹھائی۔ ''بس اسی لیے......''

ایک قہقہہ گونجا۔ ''کرس، ٹونی...... سنا تم نے۔'' لمبی ناک والے نوجوان نے باقی ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس بن بلائے مہمان کو ذرا لگ گئی تھی۔''

ٹونی اس شخص کے بالکل برابر کھڑا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ وہ اتنا قریب تھا کہ ولسن اس کی سانسوں سے اٹھنے والی بیئر اور لہسن کی بُو کے بھبکے تک محسوس کر رہا تھا۔

''کون ہو تم......'' اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ اپنی ٹنکی خالی کرنے کے لیے میرے گھر کے صحن میں گھس آئے۔''

''کوئی بات نہیں...... میں چلا جاتا ہوں۔'' ولسن نے دبے لہجے میں جواب دیا۔

''میرے ہی صحن میں کیوں؟'' ٹونی نے دانت کچکچاتے ہوئے منکا تانا۔

''یہاں اندھیرا تھا نا......'' ولسن نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''میں ذرا شرمیلا سا انسان ہوں نا۔''

یہ سنتے ہی وہاں کھڑی عورتیں زور سے ہنس پڑیں۔

''بہت ہو گئی بکواس......'' ٹونی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ذرا سا پیچھے دھکیلا۔ ''سچ سچ بتاؤ تمہیں کس نے بھیجا ہے۔ ڈیمن برادرز...... انہوں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔''

''میں کسی ڈیمن کو نہیں جانتا۔'' ولسن منمنایا۔ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ ٹونی جان دار ہے۔ اس کے کسرتی بازو دیکھ کر اسے یقین تھا کہ اس کے دو چار گھونسے ہی کافی ہوں گے۔ ویسے بھی وہ کئی لوگوں میں گھر چکا تھا۔ اسے جان چھڑانے کی فکر تھی۔ ''میں نیو ہیمپشائر کا رہنے والا ہوں...... پلیز جانے بھی دو۔''

یہ سنتے ہی وہاں کھڑے ایک شخص نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''ابے او گھس بیٹھیے...... تو پھر تو یہاں چیلسی میں کیا کر رہا ہے۔'' ٹونی طیش میں آ چکا تھا۔

''راستہ بھول گیا ہوں، اندھیرا ہے نا۔'' ولسن نے بات بنائی۔

''سام، پال، ہیرٹ...... آگے آؤ اور اس کو بتاؤ کہ جب کوئی ہمارے صحن میں اپنے گردوں کی بھری ٹنکی خالی کرتا ہے تو چیلسی والے اس کا کیا حشر کرتے ہیں۔''

یہ سنتے ہی ولسن نے گہری سانس لی۔ جبڑوں کو مضبوطی سے بھینچ لیا۔ یقین تھا کہ اب کسی بھی وقت اس پر لاتوں اور گھونسوں کی برسات ہونے ہی والی ہے۔ وہ پٹنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔

کافی دیر بعد ولسن اپنے ٹرک کے اندر بیٹھا تھا۔ لائٹس بند تھیں لیکن انجن چل رہا تھا۔ ولسن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ہیٹر کی حدت سے سکون محسوس ہو رہا تھا۔ کافی دیر بعد اسے راحت ملی۔ سب نے مل کر اسے بری طرح پیٹا تھا لیکن خوش قسمتی سے نہ کوئی ہڈی ٹوٹی تھی اور نہ ہی خون نکلا تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ لوگ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ اس نے انجن بند کیا، دروازے لاک کیے اور وہیں سمٹ سمٹا کر سو گیا۔

اگلی صبح آنکھ کھلی تو زندگی کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے کام کاج کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ولسن نے ٹرک اسٹارٹ کیا اور آگے بڑھا۔ کچھ دیر بعد اس نے نیولی اسٹریٹ نمبر 10 کے سامنے ایک مناسب مقام ریستوران کے سامنے ٹرک پارک کیا۔ ناشتے کے علاوہ

اب اسے صرف مناسب وقت کا انتظار کرنا تھا۔

ولسن بچپن سے شکاری تھا۔ ہرن کا شکار اس کا پسندیدہ کھیل تھا۔ یہ تو طے ہوگیا تھا کہ جینی جس کی کشتی سے موت کا شکار ہوئی وہ اسے ٹونی ہی چلا رہا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ ایسے آوارہ شخص سے تنہا نمٹنا مشکل ہے۔ وہ شکاری تھا۔ اب وہ ہرن اور انسان کے شکار کے لیے ایک جیسی تکنیک کے استعمال پر غور کررہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ انسان اور ہرن، دونوں کے شکار میں کچھ خاص فرق نہیں۔ دونوں کے لیے گھات لگانا، شکار کو گھیرنا، مناسب موقع کا انتظار اور بالکل ٹھیک وقت پر بندوق چلانا اہم تھا۔ اسے یقین تھا کہ جانوروں کے جنگل میں شکار کا یہ اصول شہر کے جنگل میں انسان کے شکار پر بھی پورا اترے گا۔

ولسن کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ انسان اور ہرن کے شکار میں ایک فرق ہے۔ ہرن کا شکار کرنے کے لیے اس کے سونگھنے کی حس سے خود کو بچانا پڑتا ہے لیکن انسان دشمن کی بو نہیں سونگھ سکتا۔ ہرن خود کو جھاڑیوں میں چھپا سکتا ہے لیکن شکار انسان ہو تو اسے ہجوم میں بھی بہ آسانی شناخت کیا جاسکتا ہے۔ وہ شکار کے لیے تیار تھا۔ بس موقع ملنے کی دیر تھی۔ وہ انسانوں کے جنگل سے خالی ہاتھ لوٹنے کا روادار نہ تھا۔ ویسے بھی معاملہ محبت کی موت کا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ ریستوران سے نکلا اور ٹرک اسٹارٹ کرکے اس سڑک پر آگیا، جہاں ٹونی کا گھر تھا۔ اس نے گھر سے تھوڑا آگے اس طرح ٹرک کھڑا کیا کہ بیک ویو مرر سے گھر پر نظر رکھ سکے۔ تقریباً بیس منٹ کے انتظار کے بعد ٹونی باہر نکلا۔ برابر کے دروازے پر ایک عورت کھڑی تھی۔ چند منٹ تک وہ اس سے باتیں کرتا رہا اور پھر باڑ عبور کرکے سڑک پر آیا، جہاں اس کی سیاہ شیورلیٹ جیپ کھڑی تھی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔ چند لمحوں کے فرق سے ولسن نے بھی ٹرک آگے بڑھایا۔ سیاہ شیورلیٹ اس کے سامنے تھی۔

سڑک پر ٹریفک زیادہ تھی۔ وہ ٹونی کی جیپ سے دو گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ رکھ کر تعاقب کررہا تھا۔ کئی چوراہے عبور کرکے وہ نسبتاً ایک خالی سڑک پر نکل آیا۔ خاصا آگے جانے کے بعد وہ دائیں مڑا اور ایک شاپنگ مال کے سامنے پہنچ گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ پارکنگ میں دو چار گاڑیاں ہی کھڑی تھیں۔ ٹونی نے جہاں گاڑی پارک کی وہ جگہ ایک اوٹ میں تھی۔ ولسن نے تیزی سے ٹرک آگے بڑھایا اور ڈرائیونگ سائیڈ کے ساتھ اس طرح کھڑا کردیا کہ ٹونی دروازہ نہ کھول سکے۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر کسی سے موبائل فون پر باتیں کررہا تھا۔ ولسن کو موقع مل گیا۔ وہ اترا اور خود کو اس کی نگاہوں سے بچاتا ہوا باہر نکلا۔

ٹونی نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن ٹرک کی وجہ سے اتر نہ پایا۔ موبائل فون جیب میں رکھتے ہوئے وہ برابر کے دروازے سے باہر نکلا۔ اس کے اترتے ہی ولسن تیزی سے سامنے آیا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ٹونی ٹھٹک گیا۔ وہ اسے پہچان چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، ایک زوردار مکا اس کے منہ پر پڑا اور پھر ولسن نے تابڑتوڑ لاتوں اور گھونسوں کی برسات کردی۔ کچھ ہی دیر میں ٹونی زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ ولسن نے چوڑے ٹیپ سے اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیے تھے۔ منہ میں کپڑے کا گولا بنا کر ٹھونسا اور پھر سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ ولسن طاقتور آدمی تھا۔ وہ ٹونی کو کالر سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ٹرک کے سامنے لایا اور ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے پسنجر کیبن میں ٹھونس دیا اور اوپر سے ترپال ڈال دی۔ کچھ دیر بعد ولسن چیلسی کے ٹریفک جام سے نکل کر نیو ہمپشائر جانے والے راستے پر سفر کررہا تھا۔

وہ گرینائٹ اسٹیٹ سے تقریباً دس منٹ کی دوری پر تھا۔ جب ولسن نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ٹونی کے منہ پر سے ترپال اٹھائی اور اس کے منہ میں پھنسا کپڑے کا گولا کھینچ کر باہر نکالا۔

ٹونی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''تم ڈیمن برادرز کے آدمی ہو نا، اسی کے لیے کام کرتے ہو؟'' اس کا لہجہ گھبرایا ہوا تھا۔

''بکواس مت کرو......'' ولسن نے ڈانٹا۔ ''میں نے کل رات ہی کہہ دیا تھا کہ اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔''

''تم وہی ہو نا جسے کل رات ہم نے پیٹا تھا۔'' ٹونی خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔

''صرف پیٹا ہی نہیں بلکہ بری طرح پیٹا تھا۔'' ولسن نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''تو کیا اب تم اپنی اس غلطی پر معافی مانگنے والے ہو؟''

ٹونی خاموش رہا۔

''ویسے میں تمہارے گھر کے صحن میں گردوں کا بوجھ ہلکا کرنے نہیں آیا تھا۔'' یہ کہہ کر ولسن نے قہقہہ لگایا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا......'' ٹونی چونکا۔ ''تو پھر کیوں آئے تھے؟''

''تمہاری اگی جیٹ کشتیاں دیکھنے کے لیے؟ لیکن تمہارا ان سے کیا تعلق......'' ٹونی بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

''حیرت ہے......'' ولسن نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اب بھی تم میں یہ سوال کرنے کی ہمت باقی ہے۔''

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔''

''تو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' یہ کہہ کر ولسن طنزیہ انداز میں ہنس دیا۔ ''میرا نام ایموز ولسن ہے، میں نیوہمپشائر کا رہنے والا ہوں اور چیلسی میں تمہاری اگی جیٹ کشتیاں دیکھنے کے لیے آیا تھا۔''

ٹونی کا خون خشک ہو رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے گردن اٹھانے کی کوشش کی اور ہچکچاتے ہوئے نہایت احتیاط سے کہنے لگا۔ ''کیا تم پولیس والے ہو؟''

''نہیں......'' ولسن نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''میں صرف ایک شوہر ہوں، اپنی بیوی سے بے انتہا پیار کرنے والا سادہ لوح شوہر۔''

ٹرک تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ راستہ ولسن کا جانا پہچانا تھا۔ ٹرک کے کیبن میں دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ ٹونی کی سمجھ میں سارا معاملہ آچکا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے گردن اوپر اٹھائی۔ ''دیکھو مسٹر......'' اس نے ولسن کو مخاطب کیا۔ ''جو کچھ ہوا، وہ ایک حادثہ تھا، جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔''

ولسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں ونڈ اسکرین پر جمی تھیں۔

''میں مانتا ہوں کے جائے حادثہ سے فرار ہونا سنگین جرم ہے لیکن......'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ ''میں ڈر گیا تھا...... پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو ہوا صرف حادثہ تھا اور کچھ نہیں۔ میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔''

ولسن نے لحہ بھر کو پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر نفرت کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے گردن موڑی اور سامنے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے خاموشی توڑی۔ ''تم نے میری بیوی کی کشتی الٹائی، یہ دیکھ کر تم خوشی سے چلائے بھی تھے۔ اس کے بعد جائے وقوع سے فرار ہوئے۔ وہاں سے بھاگ کر پیٹ ٹوٹیلر کے پاس پہنچے۔ اسے دو ہزار ڈالر دیے منہ بند کرنے کے لیے۔ کیا یہ سب اضطراری تھا۔ تم نے سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا۔ یہ تمہارے لیے ایڈونچر تھا۔ حادثہ نہیں تھا۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا۔ ''اب بتاؤ تم اور ہنسے تھے؟''

ٹونی نے کسمسا کر اپنے ہاتھ پاؤں کی بندشیں ڈھیلی کرنے کی کوشش کی۔ ناکام ہو کر اس نے ولسن کو مخاطب کیا۔ ''اب تم کیا کرنے جا رہے ہو؟'' اس کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

''تم نے میری بیوی کو قتل کیا ہے، اب سوچو تمہارے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔'' ولسن نے سپاٹ اور دھمکی آمیز لہجے میں جواب دیا۔

وہ قصبے سے ابھی آدھا گھنٹے کی دوری پر تھے۔ ٹونی کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ اس نے جان بچانے کی کوشش کی۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم کوئی بیچ کا راستہ نکال لیں...... میرا مطلب ہے اس معاملے پر کوئی مفاہمت کر لیں، کوئی معاہدہ کر لیں۔''

ولسن نے مڑ کر اسے دیکھا اور ہنکارا بھر کر کہا۔ ''اوکے...... تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

''میرا مطلب ہے کوئی تلافی...... جیسے تم کچھ رقم لو اور پھر تم تمہارے اور میں اپنے رستے...... معاملہ ختم۔''

''سننے میں اچھا لگ رہا ہے۔'' ولسن نے مسکرایا۔ ''تمہارے خیال میں کتنی رقم ہونی چاہیے؟''

''پہلے تم بتاؤ۔'' اسے آمادہ دیکھ کر ٹونی کی جان میں جان آئی۔ اس کا اعتماد بحال ہونا شروع ہو گیا تھا۔

''ہرگز نہیں......'' ولسن نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ ''پیشکش میں نے نہیں تم نے کی ہے۔ اگر تم سنجیدہ ہو تو سیدھی طرح رقم بتاؤ ورنہ میرے ساتھ یہ کھیل مت کھیلو۔''

''میں بالکل سنجیدہ ہوں۔'' اس کے خاموش ہوتے ہی ٹونی نے جلدی سے کہا۔ ''میں یہ معاملہ حل کرنا چاہتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں رقم بتاؤں اور تم اسے اپنی بے عزتی نہ سمجھ لو۔''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے۔''

ٹونی چالاک نوجوان تھا۔ ولسن سے گفتگو کے دوران وہ اس کی سادہ لوحی کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اس نے معاملہ طے کرنے کے لیے نئی چال چلی۔ ''وہ کیا نام ہے تمہارے قصبے کے اسٹور والے کا......''

''پیٹ ٹوٹیلر......'' ولسن نے لقمہ دیا۔

''ہاں ہاں وہی...... وہ کہہ رہا تھا کہ تمہاری بیوی تو بڑی تیز طرار عورت تھی۔ اس نے تو تمہارا ناطقہ بند کر رکھا

تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ اس نے تو تمہاری ساری آمدنی اپنے قبضے میں کرلی تھی اور تم محنت مزدوری پر گزارا کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ اس نے تو تمہیں لیک ہاؤس سے بھی نکال باہر کر رکھا تھا۔ تم تو اس کے لیے صرف استعمال کی ایک چیز تھے اور کچھ نہیں لیکن تم اس کی محبت میں میری جان لینے پر تلے بیٹھے ہو...... واہ ری یکطرفہ محبت۔''

ولسن کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے ونڈ اسکرین کی طرف دیکھتا رہا۔

''اسی لیے میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ ایسی بیوی کے لیے تم خود کو کیوں مجرم بناتے ہو، جس نے کئی مردوں کے ساتھ تعلقات بنا رکھے تھے۔'' اس کی خاموشی سے ٹونی کو شہ مل گئی تھی۔ ''میں تو کہتا ہوں، کہیں گاڑی روکو۔ ہم کسی حل پر پہنچتے ہیں۔ تم بھی خوش، میری بھی جان چھوٹے۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''بولو...... کیا کہتے ہو؟''

ولسن نے کچھ کہنے کے بجائے اسپیڈومیٹر پر نظر ڈالی۔ وہ ٹریفک پولیس کی طے شدہ رفتار کے اندر گاڑی چلا رہا تھا۔ چالیس کلومیٹر فی گھنٹا۔ اسے پہنچنے کی جلدی تھی لیکن وہ جذباتی ہوکر گاڑی کی رفتار نہیں بڑھانا چاہتا تھا۔ ایسا کرتا تو ممکن تھا کہ ٹریفک پولیس اسے روکتی۔ اس طرح خوامخواہ ٹونی کے نظر آنے کا بھی خطرہ تھا۔ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

''تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔'' اسے خاموش دیکھ کر ٹونی نے کہا۔

''تم نے قابل جواب بات کی بھی نہیں۔'' ولسن کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''تم تو میری مرحومہ بیوی کی برائی کر رہے تھے۔ اب اس بات کا کیا جواب دوں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا۔ ''جینی جیسی بھی تھی، قانون اور خدا کے حکم کے عین مطابق وہ میری بیوی تھی اور میں اس سے بہت محبت کرتا تھا۔''

''سوری......'' ٹونی نے گڑبڑا کر کہا۔ اسے لگا کہ چال اُلٹا گلے پڑ رہی ہے۔

ولسن معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں، میں اتنا جانتا ہوں کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔''

ٹونی پریشان ہوگیا۔ اسے لگا کہ وہ آسانی سے جان چھوڑنے والا نہیں۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ اس کا دماغ تیزی سے چل رہا تھا۔

''وہ میری ذمے داری تھی اور میں اپنی ذمے داریوں سے منہ چھپانے والا نہیں ہوں۔'' ولسن نے اپنا شروع کیا۔

ہوم ورک نہیں کیا

پانچویں جماعت کی لڑکی اسکول کے بعد گھر آئی اور اپنی ماں سے کہا۔ ''اماں مجھے آج اسکول میں ٹیچر نے سزا دی، بینچ پر کھڑے ہونے کی جبکہ میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔''

اس پر ماں نے کہا۔ ''یہ تو بہت غلط بات ہے، میں تمہاری ٹیچر سے کل ملوں گی اور بات کروں گی مگر یہ تو بتاؤ کہ تم نے کیا کام نہیں کیا جس کی سزا تم کو ملی۔''

''جی مما میں نے اپنا اسکول کا کام ہوم ورک کل گھر پر نہیں کیا تھا۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

تین باتیں

انسان کی تباہی تین باتوں میں ہے۔

1- توبہ کی امید پہ گناہ کرنا۔

2- زندگی کی امید پہ توبہ کرنا۔

3- توبہ کیے بغیر رحمت کی امید رکھنا۔

اللہ کو تین کام سب سے زیادہ پسند ہیں۔

1- اس کی تعریف کرنا۔

2- اس سے استغفار کرنا۔

3- نبی پاکؐ پر درود بھیجنا۔

تین باتوں کو ہمیشہ یاد رکھو

1- کوئی نصیحت کرے تو۔

2- کوئی احسان کرے تو۔

3- اور موت کو۔

ہنسئے

ایک لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا۔

''سنا ہے تم نے اپنے منگیتر سے منگنی توڑ دی ہے کیوں؟''

سہیلی: ''اس لیے کہ اس کے اور میرے خیالات میں بہت فرق ہے۔''

لڑکی: ''تو کیا تم نے وہ انگوٹھی بھی واپس کردی جو اس نے تمہیں دی تھی؟''

سہیلی: ''جی نہیں میرے خیالات لڑکے کے بارے میں تبدیل ہوئے تھے انگوٹھی کے بارے میں نہیں۔''

مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری، لاہور

"اس کے ساتھ ظلم ہوا ہے اور اب یہ میری ذمے داری ہے کہ اسے انصاف دلاؤں۔" یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر کو پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر زور سے ہنس پڑا۔ "جو کام اتنے دنوں میں پولیس نہ کرسکی، میں نے کر دکھایا۔ تمہاری سزا سے جینی کی روح کو بھی سکون مل جائے گا۔"

"عجیب انسان ہو۔" ٹونی نے آہستہ سے کہا۔

"چپ چاپ پڑے رہو۔ اب اگر بکواس کی تو تمہیں یہیں ٹرک کے نیچے ڈال کر کچل دوں گا۔" ولسن کے چہرے سے غصہ جھلک رہا تھا۔

ٹونی نے گہری سانس لے کر سر سیٹ کے ساتھ ٹکا دیا۔

ولسن سڑک سے اتر کر کچے میں ٹرک چلا رہا تھا۔ کافی جھٹکے لگ رہے تھے۔ کئی بار ٹونی بھی اچھل پڑا۔ ایک بار تو اس کے منہ سے زوردار کراہ بھی نکلی تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔

ٹونی کو کچھ نہیں آرہا تھا کیا کرے۔ اسے یہ یقین ہوگیا تھا کہ ولسن کو باتوں سے پٹانا ممکن نہیں۔ کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے خاموشی توڑی۔ "دیکھو مسٹر......" اس نے جان بچانے کے لیے ایک نئی چال چلی۔

ولسن نے لمحہ بھر کو مڑ کر پیچھے دیکھا اور پھر نظریں سامنے جمادیں۔

"جو کچھ ہوا، میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ مجھے اپنے کیے کی سزا ملے گی اور سزا قانون دے گا۔" ٹونی نے جان بخشی کے لیے قانون کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ "بہتر ہے کہ تم مجھے کسی پولیس اسٹیشن لے چلو۔ میں گرفتاری دے دوں گا۔ جو کچھ کیا، اسے قبول بھی کرلوں گا۔ باقی کام تم بھی پولیس اور عدالت پر چھوڑ دو۔ تمہاری بیوی کو عدالت سے انصاف مل جائے گا۔"

"اس کا نام جینی تھا۔" ولسن نے سرد اور بے تاثر لہجے میں کہا۔

"اوکے...... اس طرح عدالت سے جینی کو انصاف مل جائے گا اور مجھے قانون کے مطابق سزا۔" یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "میں اپنی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ تم بھی یہی چاہتے ہو تو پھر کیا سوچ رہے ہو۔ پولیس کو فون کردیا مجھے پولیس اسٹیشن لے چلو۔"

ولسن کچھ سوچتے ہوئے ٹرک چلاتا رہا۔ تقریباً ایک منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے زبان کھولی۔ "جو پیشکش اب کررہے ہو، اس میں تمہاری چال نظر آتی ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں بولنا شروع کیا۔ "میں تمہیں پولیس کے پاس لے جاؤں اور وہاں جاکر تم یہ بیان دو کہ میں تمہیں چالاکی سے اغوا کرکے لارہا ہوں۔ تم اپنا جرم ماننے سے انکاری ہوجاؤ تو پھر......" یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ "اس طرح تو تم الٹا مجھے مصیبت میں پھنسادو گے اور خود نکل لو گے۔ شاید تم یہی کرنا چاہتے ہو چالاک نوجوان۔" ولسن طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

"ایسی بات نہیں......" ٹونی نے خجالت بھرے لہجے میں کہا۔

"اوکے......" ولسن نے جواب دیا۔ "مان لیا، تم نے گرفتاری دے دی، جرم قبول کرلیا پھر بھی مجھے تمہیں سزا دلوانے کے لیے ایک وکیل کرنا پڑے گا، بھاری فیس دینا ہوگی۔ کام کاج چھوڑ چھاڑ کر عدالتوں کے پھیرے لگانا پڑیں گے۔ یہ میرے بس کی بات نہیں۔"

"تو پھر......" ٹونی بہت پریشان نظر آرہا تھا۔

"عدالت میں پہنچے تو میرے لیے مشکل ہوگی۔" ولسن نے کہنا شروع کیا۔ "یہ ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ اسکی جیٹ تم چلارہے تھے۔ ویسے بھی یہ کیسے ثابت کروں گا کہ وہ تم ہی تھے۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا۔ "عدالت سے تو کوئی معمولی وکیل بھی تمہیں بچالے گا۔ جینی کو انصاف کیسے مل سکے گا؟"

ٹونی کو اس کی باتوں سے خطرے کی بو محسوس ہورہی تھی۔ وہ جتنا سادہ نظر آتا تھا، اس سے کہیں زیادہ ذہین ثابت ہورہا تھا۔ ٹونی نے جان بچانے کے لیے ایک اور کوشش کی۔ وہ اسے منانا چاہتا تھا۔ "دیکھو مسٹر......" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں اسے پکارا۔ "جو ہوا، وہ ایک حادثہ تھا۔ پلیز...... میری بات کا یقین کرو۔ میرا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ ویسے بھی مجھے جینی کی جان لے کر کیا ملتا۔ میں تو اسے جانتا تک نہ تھا۔"

"وہ ایک حادثہ نہیں تھا۔" ولسن نے اونچی آواز میں کہا۔ "بچہ بچہ یہ بات جانتا ہے کہ جہاں یہ حادثہ ہوا، وہاں اسکی جیٹ چلانے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر تم جھیل کنارے انتظامیہ کا ہدایت نامہ دیکھ لیتے تو آج میری بیوی زندہ ہوتی۔" یہ کہہ کر اس نے ٹونی پر ایک نظر ڈالی۔ "میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔ یہ میری ذمے داری ہے اور میں خود اپنی ذمے داری پوری کروں گا۔" اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

ٹونی کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اب اسے لگ رہا تھا کہ جب تک ٹرک چل رہا ہے، اس کی سانسیں بھی چل رہی ہیں۔ جہاں ٹرک رکا، وہیں اس کی آتی جاتی سانسیں بھی رک جائیں گی۔ "یہ ٹھیک نہیں ہے مسٹر......" ٹونی نے

ٹونی گھگھیائی زبان سے کہا۔

''ہاں...... شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو، یہ منصفانہ بات نہیں لیکن میرے لیے یہی درست طریقہ ہے۔''

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔ پندرہ منٹ بعد وہ جنگل میں ایک صاف ستھرے قطعۂ اراضی پر ٹرک پارک کر رہا تھا۔ یہ جنگل پال کی ملکیت تھی اور ولسن یہیں پر کام کرتا تھا۔ وہ اترا اور دوسری طرف جا کر دروازہ کھولا۔

''تیار ہو جاؤ...... ہم پہنچ چکے۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹونی کے دونوں کندھوں میں ہاتھ ڈال کر گھسیٹا اور نیچے زمین پر بٹھا دیا۔

ٹونی سخت پریشان تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ''تم کیا کرنے جا رہے ہو؟'' وہ منمنایا۔

''انصاف کرنے......'' یہ کہتے ہوئے اس نے بیلچہ اٹھایا۔ ''اپنے گناہوں کی معافی مانگنا شروع کر دو۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور نفاست سے کھودے گئے گڑھے کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ تقریباً ساڑھے چار فٹ گہرا اور ڈھائی فٹ چوڑا تھا۔ یہ گڑھا اس نے سوکھے پتوں سے قدرتی کھاد تیار کرنے کے لیے کھودا تھا مگر اب وہ ٹونی کی قبر بننے والا تھا۔

تین چار منٹ بعد وہ ٹونی کی طرف پلٹا۔ اور اسے گھسیٹتے ہوئے گڑھے کی طرف لے جانے لگا۔

ٹونی کی سمجھ میں ساری بات آچکی تھی۔ وہ چلایا۔ ''خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔''

وہ بری طرح گڑگڑا رہا تھا لیکن ولسن پر اس کی منت سماجت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے کھینچا تانی کر کے ٹونی کو گڑھے میں پھینکا۔

وہ اُکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹی ہوئی تھیں۔ ''تم مجھے زندہ دفن کرنے جا رہے ہو؟''

ولسن نے اثبات میں سر ہلایا اور بیلچہ اٹھا کر مٹی اندر پھینکی۔

''پلیز...... مت کرو، ایسا مت کرو...... پلیز پلیز...... پولیس کو بلا کر مجھے ان کے حوالے کر دو۔''

ولسن پر چیخ و پکار کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے پھر مٹی پھینکی۔ ٹونی کا چہرہ مٹی میں لتھڑ گیا تھا۔

''خدا کے لیے مسٹر...... میری بات سن لو، پلیز میری بات سن لو۔''

ولسن مذہبی قسم کا آدمی تھا۔ خدا کا واسطہ دینے پر اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ گڑھے کے کنارے پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ''بولو...... کیا کہنا چاہتے ہو۔''

نرم رویہ دیکھ کر ٹونی کے دل میں جان بخشی کی امید اک بار پھر جاگ اٹھی۔ ''مجھے مار کر تمہیں جینی تو واپس نہیں ملے گی......''

''انصاف تو مل جائے گا۔'' ولسن نے تیزی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''پلیز...... مجھے چھوڑ دو۔''

''ممکن نہیں۔''

''دیکھو میں مجرم ضرور ہوں مگر سب کچھ ایک حادثہ تھا لیکن تم جرم کرنے جا رہے ہو۔''

''مجھے کوئی پروا نہیں۔'' ولسن نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''پلیز میری بات سن لو......''

''جو تم نے ابھی کہا، یہی باتیں کئی گھنٹوں سے سن رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ولسن نے بیلچہ اٹھایا۔

''میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں، سن لو...... پلیز۔'' ٹونی گڑگڑا رہا تھا۔

''او کے......'' ولسن ایک بار پھر گھٹنوں کے بل پر گڑھے کے کنارے بیٹھا تھا۔

''مجھے چیلسی جانے دو، وہاں میری گرل فرینڈ ہے۔ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ٹونی کی آواز بھرا گئی۔ ''تم مجھے مار دو گے تو میرا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی یتیم ہو جائے گا۔'' وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ تمہارا مجرم ہوں...... میں ایک برا آدمی ہوں لیکن پلیز...... ذرا حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر ہچکیاں لیتا رہا۔

ولسن بے تاثر لہجے کے ساتھ اس کی باتیں سن رہا تھا۔

''تم خود بیوی کے بنا زندگی گزار رہے ہو۔ تم یہ تکلیف جانتے ہو اور اب کیا تم یہ چاہو گے کہ تمہاری طرح کی تکلیف، تمہاری وجہ سے مونیکا کو بھی اٹھانا پڑے...... کیا تم چاہو گے کہ میرا بچہ باپ کے بغیر اس دنیا میں پروان چڑھے...... خدا کے لیے اپنے فیصلے پر نظرثانی کرو۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے تم ایک اچھے انسان لگتے ہو۔''

یہ سنتے ہی ولسن مسکرا دیا۔ ٹونی کی تلاش کے دوران ملنے والی ادھیڑ عمر کی حسین مطلقہ عورت یاد آگئی۔ ولسن کی بپتا سن کر اس نے بڑے پیار سے کہا تھا۔ ''تم ایک اچھے انسان ہو۔'' وہ سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ اس کے اندر موجود ہمدرد انسان انسانیت کے ناتے کچھ سوچ رہا تھا۔

سوچ بچار میں مصروف ولسن کو دیکھ کر ٹونی کے دل میں بچ جانے کی امید توانا ہونے لگی۔ ''پلیز...... مجھے زندہ چھوڑ

دو۔'' وہ ایک بار پھر گڑگڑانے لگا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تو ایک اچھا انسان بننے کی پوری کوشش کروں گا...... سب غلط حرکتیں چھوڑ دوں گا۔ مجھے میرے ہونے والے بچے کی قسم...... تمہاری طرح اچھا انسان بننے کی کوشش کروں گا۔''

کافی دیر بعد ولسن اپنی سوچ سے باہر آیا اور گڑھے میں جھانکا۔ ''تمہیں اپنے کیے پر شرمندگی ہے؟''

''ہاں ہاں......'' ٹونی نے بڑے جوش سے جواب دیا۔ ''مجھے اپنے کیے پر بہت ندامت ہے...... پلیز میری غلطی معاف کر دو۔ خدا بھی میری غلطی معاف کر دے گا۔''

''اور جو کچھ میں نے کیا......''

''وعدہ کرتا ہوں، اس بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔'' ٹونی نے جوشیلے انداز میں جواب دیا۔ ''تم مجھے بخش دو۔ میں پولیس کے پاس جاؤں گا۔ جینی کے ساتھ جو ہوا، اس کا اعتراف کرلوں گا۔ خود کو سزا سے بچانے کی کوشش بھی نہیں کروں گا...... میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''واقعی......'' ولسن نے اسے دیکھا۔

''ہاں، ہاں ہاں...... پلیز میرے بچے کو پیدائش سے پہلے یتیم نہ ہونے دو۔'' ٹونی ایک بار پھر جذباتی ہو رہا تھا۔

ولسن خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر بعد اس نے گڑھے میں جھانکا۔ ''اگر تم خود کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے تو بچ جاؤ گے۔''

''شکریہ......'' جان بچنے کی خوشی میں ٹونی چلایا۔

ولسن کھڑا ہوا اور گڑھے سے دو قدم دور ہو کر اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالا۔ اس کی نظریں گڑھے پر جمی تھیں۔

ٹونی کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے لیکن جان بچانے کے لیے اس نے سر توڑ کوششیں شروع کر دیں۔ تقریباً پندرہ منٹ کی کوششوں کے بعد وہ خود کو کسی طرح باہر نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ گڑھے کے کنارے پڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔

ولسن آگے بڑھا اور اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں شکاری چاقو تھا۔

''خدا کا شکر ہے، تم نے میری بات سمجھ لی۔ تم عظیم انسان ہو، کسی دیوتا کی طرح...... عظیم دیوتا۔'' موت کے منہ سے زندہ نکل آنے پر وہ خوشی سے جیسے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

ولسن نے کچھ نہ کہا۔ پہلے اس کے پاؤں کی بندشیں کاٹیں اور پھر ہاتھوں کی۔ ٹونی آزاد ہو چکا تھا۔ ولسن برابر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے شکاری چاقو کمر سے بندھی پیٹی میں اُڑس لیا۔ پستول ایک بار پھر اس کے ہاتھ میں تھا۔

اچانک ٹونی کسی بندر کی طرح اچھلا۔ ولسن کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس نے زوردار گھونسا مارا۔ ولسن لڑکھڑایا۔ اس دوران ٹونی نے اس کے ہاتھوں سے پستول چھین لیا اور خباثت بھرے انداز میں قہقہہ لگایا۔ ''کون سی مونیکا...... کون سا بچہ...... تم تو واقعی احمق ہو۔''

ولسن نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ٹونی کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا دیکھ کر وہ پریشان ہوگیا تھا۔

''بہت تنگ کیا ہے تم نے مجھے۔'' ٹونی نے پستول اس کے سینے کی طرف تانا۔ ''بڑی منتیں کرائی ہیں تم نے۔ اب تمہاری باری ہے۔''

''سوری ٹونی......'' ولسن پُر اعتماد نظر آ رہا تھا۔ ''تمہاری بات پر اعتبار کرنا غلطی تھی لیکن اس سے تمہارا اصل روپ سامنے آگیا۔''

''بے وقوف انسان......'' ٹونی شیطانی انداز میں مسکرایا۔ ''زندگی کی بھیک مانگو گے یا......''

''نہیں مانگوں گا۔'' ولسن نے اس کی بات کاٹی۔

''اوکے...... جیسا تم چاہو۔'' یہ کہتے ہوئے ٹونی نے لبلبی دبائی۔ ٹھک کی ایک آواز آئی مگر گولی نہ چلی۔ وہ گھبرا گیا۔ اس نے دوبارہ لبلبی دبائی۔ اس بار بھی گولی نہ چلی۔

''احمق انسان......'' ولسن نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ ''بہت سارے لوگ مجھے احمق کہتے ہیں لیکن اپنی عقلمندی بھی تو دیکھو......'' یہ کہتے ہوئے اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ میں گولیوں سے بھرا میگزین تھا۔

ٹونی کا چہرہ فق ہوگیا۔ اس کا رنگ زرد پڑ رہا تھا۔ ''پلیز......'' اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر گلا خشک ہو چکا تھا۔

اسی دوران ولسن نے تیزی سے کمر کی پیٹی میں اُڑسا شکاری چاقو نکالا اور بڑی مہارت کے ساتھ اسے نوک سے پکڑ کر اچھالا۔ چشم زدن میں چاقو ٹونی کی گردن میں دستے تک پیوست ہو چکا تھا۔ خون بھل بھل کر کے اُبل رہا تھا۔ وہ تڑپتا ہوا دم توڑ رہا تھا۔

ولسن اسی طرح چاقو سے ہرن کا بھی شکار کرتا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ وہ ہرن کو بچنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ یہاں اس نے ٹونی کو زندہ رہنے کا ایک موقع ضرور دیا تھا...... ولسن احمق تھا، خدا ترس یا محبت کا مارا۔ اس اعتراف کا موقع نہ جینی کو قدرت نے دیا اور نہ ہی ٹونی کو مل سکا۔

سراغ رساں گریسی اور سراغ رساں برنیڈن جائے واردات پر پہنچے تو ان کی ملاقات ایک پٹرول آفیسر سے ہوئی جو اس دیہی مکان کے بیرونی احاطے میں موجود تھا۔

''کیا معاملہ ہے؟'' سراغ رساں گریسی نے پٹرول آفیسر سے دریافت کیا۔

''برتھا ولیز نامی خاتون نے 911 پر فون پر یہ رپورٹ درج کرائی ہے کہ اس کے پڑوسی کے بیٹے نے اتفاقی طور پر گولی چلا کر اس کے شوہر کو ہلاک کر دیا ہے۔'' پٹرول آفیسر نے بتایا۔

''شوہر کا نام کیا ہے؟'' سراغ رساں گریسی نے پوچھا۔

''پیٹرک ولیز۔''

''کیا کسی نے ابھی تک اس لڑکے سے بات کی ہے جس نے اتفاقی طور پر گولی چلائی تھی؟''

''نہیں۔ ہم اسے اور اس کی ماں کو تھانے لے گئے تھے اور تم لوگوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔''

گریسی نے اپنے ساتھی سراغ رساں برنیڈن کی جانب

گھاؤ

سلیم انور

چاہتیں... وصلِ جاں کے ساتھ ساتھ ایسے گھاؤ دیتی ہیں کہ تڑپ و جلن کی چنگاریاں چین نہیں لینے دیتیں... ایسے ہی تڑپا دینے والے لمحات کی نذر ہو جانے والا ملالِ زندگی...

ایک ہی وار سے پلٹ جانے والی دل کی بازی کا دردناک انجام

دیکھا اور بولی۔ ”کیا مسز ویلز سے پوچھ گچھ کا آغاز کرنا چاہو گے؟“

”یقیناً۔“

گریسی اور برینڈن مکان میں داخل ہو گئے جہاں مسز برتھا ویلز ایک صوفے پر بیٹھی ہلکی آواز میں رو رہی تھی۔

”میڈم، ہم جانتے ہیں یہ آپ کے لیے ایک مشکل وقت ہے۔“ گریسی نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ہمیں آپ سے کچھ سوالات پوچھنا ضروری ہیں۔ یہ ہمارے معمول کا حصہ ہوتا ہے۔“

برتھا ویلز نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا اور ایک چھوٹے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔

”کیا آپ بتائیں گی کہ کیا ہوا تھا؟“

”پیٹرک ہمیشہ کی طرح گھوڑوں کو دانہ ڈالنے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ جب وہ شام کے ہلکے کھانے کے لیے واپس نہیں آیا تو میں نے اسے خود بلانے کا فیصلہ کیا۔ تب میں نے اسے باہر مردہ پڑا پایا۔ اس کے سر میں گولی لگی تھی۔“ یہ کہہ کر برتھا نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

سراغ رساں گریسی نے اپنا ہاتھ برتھا کے کاندھے پر رکھ دیا اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم نے اس کی سانسیں بحال کرنے کی کوشش میں اسے ہلایا جلایا تھا؟ اس کے جسم کو حرکت دی تھی یا اسے ہاتھ لگایا تھا؟“

”نہیں۔ میں ڈر گئی تھی۔ میں نے جیسے ہی اسے باہر فرش پر پڑے ہوئے دیکھا تھا، میں دوڑ کر واپس گھر میں چلی گئی تھی اور فوراً ہی 911 پر فون کر دیا تھا۔“ برتھا ویلز نے بتایا۔

”آپ نے 911 کے آپریٹر کو فون پر یہ بتا دیا تھا کہ آپ کے پڑوسی کے بیٹے نے پیٹرک کو گولی ماردی ہے۔ آپ نے یہ خیال کیوں کیا کہ آپ کے شوہر کو پڑوسی کے بیٹے نے گولی ماری ہے؟“

”وہ لڑکا ہمیشہ اپنی گن سے اطراف میں گولیاں چلاتا رہتا ہے۔ پیٹرک بارہا اسے شوٹنگ کرنے سے منع کرتا رہا ہے کیونکہ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں وہ ہمارے گھوڑوں کو زخمی یا ہلاک نہ کر دے۔ لیکن وہ ہماری سنتا ہی نہیں تھا۔“ برتھا ویلز نے بتایا۔

”اس کے پاس کس قسم کی گن ہے؟“ سراغ رساں برینڈن نے پوچھا۔

”بائیس بور کی رائفل۔“

برتھا سے انٹرویو کرنے کے بعد سراغ رساں گریسی اور سراغ رساں برینڈن پیٹرک ویلز کی لاش کا جائزہ لینے کے لیے باڑے کی طرف چلے گئے۔ وہاں پیٹرک ویلز کی لاش چت لیٹی پڑی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”اگر مجھے پتا نہ ہوتا کہ یہ مر چکا ہے تو میں یہی سمجھتا کہ یہ سو رہا ہے۔“ سراغ رساں برینڈن نے کہا۔

پھر اس نے مختلف زاویوں سے لاش کی تصویریں اتاریں اور اس کے بعد سراغ رساں گریسی کے ساتھ مل کر لاش کو پلٹ دیا۔

پیٹرک کے سر کے عقبی حصے میں ایک چھوٹا سا سوراخ موجود تھا۔ ”یقینی طور پر یہ ایک چھوٹی کیلیبر کی گولی کا زخم ہے۔“

”گولی کے داخل ہونے کا نشان تو ہے لیکن گولی دوسری جانب سے باہر نہیں نکلی کیونکہ سر میں اور کوئی دوسرا زخم نہیں ہے۔“ گریسی نے بلند آواز سے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ”یہ زخم بائیس بور کی رائفل سے چلائی گئی گولی کے نشان سے موافقت رکھتا ہے۔“

”چلو تھانے چل کر اس لڑکے سے بات کرتے ہیں۔“

جب وہ دونوں سراغ رساں اپنی کار کی جانب بڑھ رہے تھے تو گریسی چلتے چلتے اچانک رک گئی اور برینڈن کا بازو تھامتے ہوئے بولی۔ ”ایک منٹ ٹھہر جاؤ، یہ کام اس لڑکے کا نہیں ہے۔“

”اس لڑکے کا نہیں ہے؟“

”نہیں۔“

”تو پھر کس کا ہے؟“ برینڈن نے حیرانی سے پوچھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ گریسی نے جواب دیا اور برتھا ویلز کے گھر کی جانب واپس چل پڑی۔ برینڈن بھی اس کے پیچھے چل دیا۔

سراغ رساں گریسی، برتھا ویلز کے گھر میں داخل ہونے کے بعد سیدھی اس غم زدہ خاتون کے پاس پہنچ گئی اور اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”مسز ویلز! کیا آپ نے آج کوئی گن فائر کی ہے؟“

اس سوال پر برتھا ویلز کے چہرے کا رنگ ہلکا پھیکا پڑ گیا۔ ”ایکسکیوز می؟“ اس نے قدرے چونکتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ نے آج کسی گن سے فائر کیا ہے؟“ گریسی نے دہرایا۔

”کیا تم مجھ پر اپنے شوہر کو شوٹ کرنے کا الزام لگا رہی ہو؟“ برتھا نے قدرے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”یقینی طور پر نہیں۔ بس پوچھ رہی ہوں۔ آپ کو معلوم ہوگا یہ ہمارے رسمی اور معمول کے سوالات ہوتے ہیں۔“

برتھا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں۔ میں نے آج کسی گن سے کوئی فائر نہیں کیا۔“

اگر آپ برا نہ منائیں تو کیا میں فائر کے ذرات کے ٹیسٹ کے لیے آپ کے ہاتھوں پر پھریری پھیر سکتی ہوں؟"

"وہ کیوں؟"

"یہ ہماری معمول کی کارروائی کا حصہ ہے، میڈم۔" سراغ رساں برینڈن نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہم آپ کے ہاتھ پر روئی کی ایک پھریری پھیریں گے اور اسے کیمیائی محلول کی ایک ٹیوب میں ڈال دیں گے۔ اگر آپ نے آج کوئی گن فائر کی ہوگی تو یہ پھریری کیمیکل کے ساتھ ردِعمل ظاہر کر دے گی اور محلول کی رنگت تبدیل ہو جائے گی۔ یقیناً چونکہ آپ نے کسی گن سے کوئی فائر نہیں کیا ہے اس لیے محلول کا رنگ تبدیل نہیں ہوگا۔"

برتھا ولیز نے قدرے تذبذب کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

گریسی گن شاٹ ریزی ڈیو کٹ لینے کے لیے اپنی کار کی طرف چلی گئی۔ کٹ لانے کے بعد اس نے برتھا کے ہاتھوں پر روئی کی پھریری پھیری اور اس پھریری کو کیمیائی محلول کی ٹیوب میں ڈبو دیا۔

برینڈن، گریسی کے پیچھے کھڑا تجسس نظروں سے کیمیائی محلول کی ٹیوب کو دیکھ رہا تھا۔

پھر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا کیونکہ محلول کی رنگت تبدیل ہو رہی تھی۔ ٹیسٹ سے ثابت ہو گیا کہ برتھا ولیز نے گن سے فائر کیا تھا۔

"اب مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔" سراغ رساں گریسی نے کہا۔ "یہ بتائیں آپ نے اپنے شوہر کو کیوں قتل کیا؟"

"تمہیں مجھ پر یہ الزام لگانے کی جرأت کیسے ہوئی؟" برتھا ولیز نے طیش میں آکر کہا۔ "تمہیں معلوم نہیں کہ میں اپنے شوہر سے کتنی محبت کرتی تھی۔"

سراغ رساں گریسی پر برتھا کی برہمی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔ "یہ ڈھونگ اب ختم کرو۔ ہم نے جو ثابت کرنا تھا وہ ثابت کر چکے۔ ہمیں یہ معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی کہ کیا یہ قتل تم نے کیا ہے، ہم بس یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم نے یہ قتل کیوں کیا ہے؟"

برتھا ولیز ایک طویل وقفے کے لیے خاموش رہی۔ پھر بالآخر اس کی تیوریوں کے بل مدھم پڑ گئے اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

دونوں سراغ رسانوں نے اپنی بھرپور توجہ برتھا ولیز پر مرکوز کر دی جس نے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی اور اعترافِ جرم کرنے جا رہی تھی۔

"اس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اس کی انٹرنیٹ پر کسی عورت سے شناسائی ہو گئی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اس عورت سے محبت کرنے لگا ہے اور اس کی خاطر وہ مجھے چھوڑ کر جا رہا ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ یہ گھاؤ کسی عورت کے لیے کتنا تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے؟ یہ سن کر میں بس پاگل ہو گئی تھی۔"

"گن کہاں ہے؟"

"وہ میں نے مکان کے نیچے چھپا دی تھی۔ وہ پیٹرک کی رائفل ہے۔" برتھا نے بتایا۔

سراغ رساں کے اشارے پر ڈپٹی پٹرول آفیسر نے برتھا ولیز کو ہتھکڑیاں پہنا دیں اور اسکواڈ کار کی عقبی نشست پر بٹھا دیا۔ برتھا نے گریسی کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا۔

"کیا کسی چیز کی ضرورت ہے؟" گریسی نے پوچھا۔

"آخرکار تمہیں یہ کیونکر خیال آیا کہ یہ قتل میں نے کیا ہے؟" برتھا نے اپنا تجسس مٹانے کے لیے سوال کیا۔

یہ سن کر سراغ رساں گریسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ بولی۔ "ہمیں اسی کام کی تنخواہ دی جاتی ہے۔"

برتھا کے استفسار پر گریسی نے بتایا کہ اس نے ان کے دریافت کرنے پر یہ کہا تھا کہ اسے پیٹرک گھر سے باہر فرش پر مردہ پڑا ہوا دکھائی دیا تھا اور اس کے سر میں گولی لگی ہوئی تھی۔ جب ان دونوں سراغ رسانوں نے پیٹرک کی لاش دیکھی تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہا ہے۔ جب تک انہوں نے لاش کو پلٹا نہیں تھا اس وقت تک انہیں یہ پتا نہیں چلا تھا کہ پیٹرک کے سر کے عقبی حصے میں گولی کے زخم کا نشان ہے۔ برتھا نے ان سے کہا تھا کہ اس نے لاش کو چھوا بھی نہیں تھا اور لاش دیکھتے ہی گھر کے اندر دوڑ گئی تھی اور 911 پر فون کر دیا تھا۔

سراغ رساں گریسی نے برتھا کے اسی بیان کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دیر نہیں لگائی کہ برتھا کے علم میں یہ بات کہ پیٹرک کے سر میں گولی لگی ہوئی ہے، اسی صورت میں آسکتی تھی کہ گولی اسی نے ماری ہو۔ پیٹرک کی لاش کو چھوئے بغیر دور سے دیکھنے پر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے سر میں پشت کی جانب گولی لگی ہے کیونکہ وہ دیکھنے میں سویا ہوا لگ رہا تھا۔

برتھا سراغ رساں گریسی کی ذہانت کی قائل ہو گئی اور اس نے مکمل خاموشی اختیار کر لی۔ پولیس کی اسکواڈ کار اسے لے کر پولیس اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گئی۔

بنیاد

سرور اکرام

شک و یقین ہی وہ حدِ فاصل ہے... جو روح کو گمراہ اور دل کو افسردہ کرنے والے شک... اور من کی دنیا کو انبساط سے لبریز کر دینے والے یقین کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کرتی ہے... یہ سحر انگیز لرزشوں کا آغاز ہے... جو محبت کرنے والوں کو کیف و سُرور کی دنیا سے نکال کر خوابوں اور ابہام کی دنیا میں لے جاتا ہے... انجام سے بے خبر جہاں دیدہ وروں کا انوکھا سفر... جو اپنی ذات اور نئی کھلنے والی کونپلوں کو ایسی بنیاد دینا چاہتے تھے... جو کبھی زوال اور تخریب سے اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے... غم زدہ دلوں... انسان کی بے بسی... زمین کی گہرائی میں چھپی ، شمن اور خدا کی ہمہ گیر قدرت پر غور کرتی... سوچتی تحریر کے دل گداز تانے بانے...

معاشرے سے منسلک کہی ان کہی کسائیوں کا بیاں
ایک نئے انداز فکر کے روپ سروپ میں

کرم داد کے سامنے زمین بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ساری زمین زمیندار نواز کی تھی۔ ان زمینوں پر ہر وقت فصلیں لہلہاتی رہتیں۔ وہ کسی بھی کھیت کے درمیان کھڑے ہوکر جب چاروں طرف نگاہ ڈالتا تو اسے دور دور تک زمیندار نواز کی پرچھائیاں ہی دکھائی دیتیں۔

وہ سوچا کرتا کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ کسی ایک آدمی کے پاس اتنی زمین آجاتی ہے اور کسی کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یا پھر بس اتنا ہوتا ہے کہ وہ اپنا چھوٹا سا کچا مکان بنا سکے۔ جہاں پاؤں پھیلانے کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔

اس کے خواب بھی کچھ ایسے ہی ہوا کرتے۔ وہ دیکھتا کہ وہ ایک گھوڑے پر سوار قیمتی پوشاک پہنے بڑی شان سے چلا جارہا ہے۔

گھوڑے کے دائیں بائیں ایک ایک آدمی ساتھ دوڑ رہے ہیں۔ وہ بُری طرح تھک چکے ہیں۔ پیاس سے ان کی زبانیں باہر نکل آئی ہیں۔

ان کی حالت پر ترس کھا کر کرم داد اپنا گھوڑا روک لیتا ہے۔ وہ دونوں نڈھال ہوکر زمین پر گر جاتے ہیں۔ کرم داد گھوڑے کے بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر ان کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ ''لو، پانی پی لو۔ ابھی اور آگے جانا ہے۔''

''سرکار! اب کتنی زمینیں رہ گئی ہیں؟'' ان میں سے ایک آدمی پانی کا گھونٹ لے کر پوچھتا ہے۔

''ابھی تو اتنی ہی اور ہیں۔'' کرم داد ایک شان کے ساتھ بتاتا ہے۔

پھر اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ اس قسم کا خواب مہینے میں کئی بار دیکھتا اور ہر بار زمین۔ زمین جو دور دور تک پھیلی ہوتی ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا، زمیندار نواز کے پاس بھی بہت زمین تھی، دور تک پھیلی ہوئی۔ وہ بھی بہت تھا۔ دور تک پھیلا ہوا۔ ایک طرف کھڑے ہوجاؤ تو دوسری طرف نگاہ نہیں جاتی تھی۔ اس نے ایک بار زمیندار نواز سے درخواست بھی کی تھی۔

''سرکار! میں آپ کا پرانا نمک خوار ہوں۔ میں نے برسوں آپ کی اور آپ کے والد کی خدمت کی ہے۔''

''تو پھر اب کیا چاہتے ہو؟''

''سرکار، وہ جو بلند ٹیکری ہے۔ اس کے آس پاس کی زمین بنجر پڑی ہوئی ہے۔ اگر وہ زمین مجھے مل جائے تو میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

''دیکھو کرم داد۔'' نواز نے کہا۔ ''یہ جو زمین ہوتی ہے نا، یہ ہم زمینداروں کی عزت ہوتی ہے۔ ہماری شان

ہوتی ہے۔ ہماری پگڑی اسی لیے اونچی رہتی ہے کہ ہمارے پاس زمین ہے۔ چاہے وہ بنجر ہی کیوں نہ ہو۔ جس کے پاس جتنی زیادہ زمین ہوتی ہے، اس کی اتنی ہی عزت ہوتی ہے۔ تم کیا چاہتے ہو کہ ہم اپنی عزت تمہارے ہاتھ میں دے دیں؟"

"میں یہ تو نہیں کہتا سرکار، آپ کی بخشش کے بعد بھی نام تو آپ ہی کا رہے گا نا۔"

"کیسی باتیں کرر ہے ہو۔ میرا نام کیسے رہے گا۔ آج نہیں تو کل تمہاری نسلیں یہ بھول جائیں گی کہ یہ زمین کسی زمیندار نواز نے دی تھی۔ پھر تو تم ہی کو زمیندار سمجھا جائے گا۔"

کرم داو نے اس کے بعد نواز سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اس کی خواہش اس کے وجود میں سلگتی رہی تھی۔ کسی طرح بھی ہو۔ وہ زمین کا مالک بن جائے۔ چاہے کتنی ہی بنجر اور چھوٹی زمین کیوں نہ ہو۔

اس کا باپ بھی زمیندار نواز کا مزارع تھا۔ لیکن اس نے کبھی اتنی شدت سے زمین کی خواہش نہیں کی تھی یا اگر خواہش ہوگی بھی تو اپنے دل میں چھپائے رکھتا تھا۔ اس نے کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

باپ کی موت کے بعد کرم داو اکیلا رہ گیا۔ اس کی ماں کا انتقال تو بہت پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا، اسی لیے اس کا ساتھ دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان ہو چکی تھی۔

ایک بار اس کی دور کی ایک خالہ نے آ کر اس سے کہا۔ "کرما، تو اپنا گھر کیوں نہیں بسا لیتا۔ کب تک اکیلا رہے گا؟"

"خالہ، تم ہی بتاؤ میں کس برتے پر اپنا گھر بساؤں۔ میرے پاس ہے کیا۔ ایک معمولی سا مزارع ہوں۔ کون مجھ سے شادی کرے گی۔"

"تو اس کی فکر چھوڑ۔ تو بس تیار ہو جا تو میں تیری شادی کروا دوں۔"

"خالہ کس سے شادی کرواؤ گی؟ کون ہے؟"

"ہے ایک۔ بہت دنوں سے میری نظر میں ہے۔ دوسرے گاؤں کی ہے اور بہت سوہنی ہے۔ بہت خوب صورت۔ اگر تو راضی ہو تو تیری بات ڈال دوں۔"

"خالہ میں تو ایک غریب آدمی ہوں۔"

"ارے تو وہ لوگ کون سا زمیندار لگے ہوئے ہیں۔ وہ بھی غریب ہیں اور شاید تجھ سے بھی زیادہ غریب ہوں گے۔ تو بس ہاں کر دے۔"

"میں تو ہاں کر دوں خالہ...... لیکن یہ بتا کیا لڑکی والے مان جائیں گے؟"

"کیوں نہیں مانیں گے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں نے ان سے تیرے لیے بات بھی کر رکھی ہے۔"

"چلو خالہ، اگر ایسا ہے تو پھر میں تیار ہوں۔"

اس رات اس نے پھر وہی خواب دیکھا۔ لیکن اس بار اس خواب میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ

گھوڑے پر اس کے پیچھے اس کی دلہن بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اگرچہ کرم داد کو اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن احساس ہو رہا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے بیٹھا ہے اور وہ اس کی دلہن ہی ہے۔

☆☆☆

پروفیسر منور کالج جانے کی تیاری کر چکا تھا اور اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ رہا تھا۔

اس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر اداسی اور تھکن تھی۔ اب سے پہلے آنکھوں میں جو چمک ہوا کرتی تھی وہ بھی اب کہیں غائب ہو چکی تھی بلکہ آنکھوں کے اردگرد جھریاں نمودار ہونے لگی تھیں۔

منور نام تھا اس کا۔ پروفیسر منور۔ معاشرے میں اس کی عزت تھی۔ وہ ایک بڑے کالج میں پڑھایا کرتا۔ سب کچھ تھا اس کے پاس۔

اس کا گھر اگرچہ شاندار نہ سہی۔ لیکن اس کا اپنا تھا جو اس کا باپ ورثے میں اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ گھر میں شاندار فرنیچر تھا۔ ایک گاڑی بھی تھی۔ لیکن ان سب کے باوجود اس کی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا بھی تھا۔

اس کی زندگی میں کبھی کسی حسن کا گزر نہیں ہوا تھا۔ کبھی کسی کی خوب صورت زلفیں اس کے شانوں پر نہیں بکھری تھیں۔ کبھی کسی کے لمس کا احساس نہیں ہوا تھا۔

ایک بنجر میدان کی طرح زندگی تھی۔ ایسا میدان جس میں کیکٹس وغیرہ کے خشک پودے تو بے شمار ہوں لیکن پھولوں کا کوئی پودا نہیں تھا۔

اس ویرانی... کی وجہ صرف یہی تھی کہ اس نے کبھی صنفِ مخالف کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ پڑھائی میں مصروف رہتا۔ اس کو ادھر ادھر سوچنے اور دیکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

اور جب پڑھائی سے فارغ ہو کر اپنے آپ کو اچھی طرح آئینے میں دیکھا تو احساس ہوا کہ بہت وقت نکل چکا ہے۔ اب اس کی زندگی میں ایسی باتوں کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اب کوئی اس کی طرف میٹھی اور مہربان نگاہوں سے نہیں دیکھے گا۔ سب ختم ہو چکا ہے۔ منور اب اپنے دل کو مار چکا تھا۔

اس نے ایک بار پھر اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ پھر وہ آئینے پر الوداعی نگاہ ڈالتا ہوا فلیٹ سے باہر آ گیا۔

کالج میں کچھ عجیب سی صورتِ حال تھی۔ جیسے اسٹوڈنٹس پریشان گھوم رہے ہوں۔ ایک جگہ اسے کچھ پولیس والے بھی دکھائی دیے۔

برآمدے میں ہی اس کا جونیئر اس کے پاس آ گیا۔

''سر! آج آپ کیوں آ گئے؟''

''خیریت تو ہے سرفراز، کیا ہوا ہے کالج میں؟''

''وہی جس کا خطرہ تھا۔ دونوں یونینز میں آج زور کا جھگڑا ہوا ہے۔ کئی طالب علم بری طرح زخمی ہوئے ہیں۔ ان کو اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔''

''لعنت ہو۔'' منور غصے سے بولا۔ ''خدا جانے تعلیمی اداروں میں ایسی غنڈا گردی کب تک ہوتی رہے گی۔ دوسرا اسٹاف کہاں ہے؟''

''اسٹاف روم میں ہے سر۔ پرنسپل صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ذرا ساتھیوں سے مل لوں۔ پھر دیکھتا ہوں کیا کر سکتے ہیں۔''

اس نے اسٹاف روم کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اس کا جونیئر بھی اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اسٹاف روم میں اس کے ساتھی موجود تھے۔ وہ سب ہی پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

اس کو دیکھ کر ایک سینئر پروفیسر نے آواز لگائی۔ ''یہ لو منور صاحب بھی آ گئے۔ اڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔''

''میرا خیال ہے کہ مسٹر منور کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کالج میں کیسی گڑبڑ چل رہی ہے۔'' رضوی نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ بھی ایک لیکچرر تھا۔

''ہاں یار، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ سب کیا ہے۔ تعلیمی اداروں میں جنگ و جدل کہاں سے آ گیا۔ لوگ کیوں ایک دوسرے کو مارنے لگے ہیں۔ وہ کتابوں کی محبت کیا ہوئی۔ وہ طالب علموں کا رات گئے تک ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گروپ اسٹڈی کرنا، یہ سب کہاں ہے؟''

پروفیسر منیر نے کہا۔ ''اور الزام ہم پر آتا ہے کہ ہم صحیح تعلیم نہیں دے رہے۔''

''کہاں سے دیں صحیح تعلیم و تربیت۔'' پروفیسر منور کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ ''خود سوچو، ایک طالب علم ہمارے پاس صرف تین چار گھنٹے گزارتا ہے۔ اس کے بعد وہ گھر چلا جاتا ہے۔ پھر اس کے گھر کا ماحول، محلے کا ماحول اور دوستوں کی صحبتیں۔ یہ سب اس پر پوری طرح اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔

اچانک ایک لڑکا دوڑتا ہوا اسٹاف روم میں داخل ہو گیا۔

"بچائیں سر بچائیں۔" اس نے چیختے ہوئے کہا۔ "وہ سب مجھے مار دیں گے۔"

پروفیسر منور کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ کچھ اور لڑکے بھی اندر گھس آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور بیلٹ تھے۔

پہلے آنے والا لڑکا سہم کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بڑی طرح کانپ رہا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" پروفیسر منور نے گرج کر کہا۔ "جاؤ، باہر نکلو تم سب۔"

"سر پلیز، یہ آپ کا معاملہ نہیں ہے۔" ایک لڑکا اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ اس کے تیور جارحانہ ہو رہے تھے۔ "آپ ان کو باہر نکال دیں۔ پھر کمرا اندر سے بند کر دیجیے گا۔ کوئی اس طرف نہیں آئے گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ہمارے پاس پناہ کے لیے آیا ہے۔ تم لوگ باہر جاؤ، ورنہ تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔ تمہیں ہمیشہ کے لیے معطل کر دیا جائے گا۔ تم کہیں بھی تعلیم حاصل نہیں کر سکو گے۔ تمہارا پورا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے سر۔" وہ لڑکا غصے سے پھنکارا۔ "دیکھتے ہیں آپ لوگ کب تک اس کی حفاظت کرتے ہیں۔"

وہ سب پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے ساتھ دوسرے لڑکے بھی نکل گئے تھے جبکہ خوف زدہ لڑکا دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" منور نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ لڑکا سہما ہوا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے اعصاب اب تک اس کے قابو میں نہیں آئے تھے۔ اس دوران دوسرے بالکل خاموش رہے تھے۔

منور کے جونیئر نے اس کے پاس آ کر دھیرے سے کہا۔ "سر! یہ آپ نے کیوں مخالفت لے لی۔ وہ سب شرپسند قسم کے لڑکے ہیں۔ وہ آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔"

"لیکن یہ بھی تو ہمارا اسٹوڈنٹ ہے شاکر صاحب۔" منور نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ "خود سوچیں، اس کو کوئی نقصان پہنچا تو کیا ہمارا ضمیر ہمیں معاف کرے گا کہ ہمارے پاس پناہ کے لیے کوئی آیا اور ہم نے شرپسندوں سے خوف زدہ ہو کر اسے باہر نکال دیا۔

اس دوران وہ لڑکا بھی اٹھ کر منور کے پاس آ گیا۔ "سر! بہتر یہی ہے کہ میں باہر چلا جاؤں۔ اب جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا سر۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ پر کوئی آنچ آئے۔"

"نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ میں پولیس کو فون کر رہا ہوں۔"

"پولیس تو آئی ہوئی ہے سر۔" منور کے جونیئر نے کہا۔

"تو پھر آؤ۔ میں تمہیں ساتھ لیے چلتا ہوں۔" منور نے اس لڑکے کی طرف دیکھا۔

"نہیں پروفیسر! اس وقت لڑکے بپھرے ہوئے ہیں۔ وہ آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔" ایک لیکچرر نے کہا۔

"یہاں سے نکلنا تو ہے یار۔" منور نے کہا۔ پھر اس لڑکے سے مخاطب ہوا۔ "چلو میرے ساتھ۔ گھبراؤ نہیں۔"

دونوں اسٹاف روم سے باہر آ گئے سامنے کی طرف اب کوئی لڑکا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"بس چپ چاپ نکل چلو۔" منور نے اس لڑکے سے کہا۔ دونوں تیزی سے اس طرف بڑھ گئے۔ جہاں منور نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی۔

☆☆☆

میرا اس کہانی میں کیا کردار ہے۔

کوئی کردار نہیں ہے۔ یعنی میں کوئی کردار نہیں ہوں بلکہ وقت ہوں جو ان کرداروں کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں ایک مؤرخ ہوں۔ میں نے ہزاروں لاکھوں کرداروں کے ساتھ وقت گزارا ہے اور ان کی کہانیاں لکھی ہیں۔

کیسے کیسے انوکھے کردار اس دنیا میں آئے اور چلے گئے۔ انسان کا پورا عروج و زوال میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

انسان نے انسان کو کس طرح تباہ کیا ہے۔ کیسے کیسے فسادات ہوتے رہے ہیں۔ کیسے کیسے ظالم اور بے رحم کردار سامنے آئے۔ انہوں نے انسانوں پر کتنے ظلم کیے۔ گلی کوچوں میں بچوں، عورتوں اور مردوں کی لاشیں میں نے دیکھی ہیں۔

لیکن میں تو صرف دیکھنے کے لیے تخلیق کیا گیا ہوں۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ صرف افسوس کر سکتا ہوں۔ کسی کی مدد

بھی نہیں کرسکتا یا کسی ظالم کا ہاتھ بھی نہیں روک سکتا۔

میں اس کہانی کے کرداروں کو بھی بس دیکھ رہا ہوں اور دیکھتا چلا جارہا ہوں۔ اس کہانی میں بھی میرا کردار کچھ نہیں ہے۔ صرف اتنا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں اور دیکھتا جارہا ہوں۔

☆☆☆

وہ پولیس کا ایک اعلیٰ عہدیدار تھا۔

کمال خان نام تھا اس کا۔ اس کی کوالٹی یہ تھی کہ اس نے کبھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ اس کی بے رحمی پورے ڈپارٹمنٹ میں مشہور تھی۔

مجرم تو خیر اس کی صورت دیکھ کر کانپ ہی جاتے تھے۔ شریفوں کا بھی یہی حال ہوا کرتا۔ اس کا طریقہ واردات یہ تھا کہ وہ اصل مجرم کو پکڑنے سے زیادہ اس کے گھر والوں کو پکڑنے میں دلچسپی رکھا کرتا۔ اس طرح اس کو اچھے خاصے پیسے مل جاتے تھے۔

کمال خان نے شادی نہیں کی تھی اور اس نے کبھی شادی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ کسی مجرم کے گھر کی خواتین کو مجبور کر کے اپنا مطلب نکال لیا کرتا۔

دو تین بار اس کو معطل بھی کیا جاچکا تھا۔ لیکن اس کی صحت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا کرتا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ کچھ پریشان اور الجھا ہوا تھا۔

بہت معمولی سی وجہ تھی۔

نہ جانے اس میں ایسی کیا کمزوری آگئی تھی یا اس کے دل میں کیا بات آگئی تھی کہ وہ پیچھے ہٹ آیا تھا۔ اس نے پہلی بار ایسی کمزوری دکھائی تھی۔

ہوا یہ کہ تفتیش کے سلسلے میں وہ ایک مجرم کے گھر گیا تھا۔ مجرم تو نہیں مل سکا تھا لیکن اس کی بہن اسے دکھائی دے گئی۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ انتہائی طرح دار۔ کمال خان اس کو دیکھ کر پھڑک اٹھا تھا۔ اس نے اس بات پر دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا کہ اصل مجرم اس وقت گھر پر نہیں ہے۔

''محترمہ، یا تو دس منٹ کے اندر اپنے بھائی کو حاضر کرو۔ ورنہ میں تم کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔'' وہ اپنی رعونت زدہ آواز میں بولا۔

''وہ کس خوشی میں پولیس آفیسر صاحب؟'' لڑکی نے بہت ہی تیکھے انداز میں پوچھا۔

''میرا یہی طریقہ کار ہے۔'' کمال خان نے کہا۔ ''جب مجرم نہیں ملتا تو میں اس کے گھر کے کسی بندے کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ پوری طرح ہوم ورک کر کے یہاں نہیں آئے ہیں۔'' لڑکی نے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' کمال خان غرایا۔

''مطلب یہ ہے کہ میں ہائی کورٹ کی وکیل ہوں۔ اور وہ سارے قوانین جانتی ہوں جن کے آپ نے نام بھی نہیں سنے ہوں گے۔ آپ نے اس قسم کی کوئی بھی حرکت کی تو پورا ہائی کورٹ آپ کی جان کو آجائے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ واپس لوٹ جائیں اور اصل مجرم کو پکڑنے کی کوشش کریں۔''

''میں دیکھ لوں گا تم کو۔'' کمال خان غرایا۔

''یہ آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے۔''

کمال خان پھر اس گھر میں نہیں رکا۔ وہ پھنکارتا ہوا واپس چلا گیا تھا۔ پہلی بار اسے ایسی ناکامی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کے تیکھے تیور اس کے دل میں اتر کر رہ گئے تھے۔ پولیس آفیسر ہونے کے ناتے اسے اپنی کمزور پوزیشن کا اندازہ ہو گیا تھا۔

لیکن وہ آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ تھانے آکر اس نے اپنے ایک خاص بندے صابر کو بلایا۔ صابر پہلے بھی اس کے لیے اس قسم کے کئی کام کر چکا تھا۔

''جی سرکار کیسے یاد کیا؟'' صابر نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ کمال خان دل ہی دل میں کھول کر رہ گیا۔ اسے صابر کی ایسی حرکتیں ہمیشہ ناگوار گزرتی تھیں لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ صابر کے پاس اس کے بہت سے راز ہیں۔ اگر اس نے زبان کھول دی تو کمال خان کو اپنی نوکری بچانی مشکل ہو جائے گی۔

''صابر! ایک لڑکی کو قابو میں کرنا ہے۔'' کمال خان نے کہا۔ ''اس کا بھائی ایک مجرم ہے۔''

''پھر تو آپ کے لیے کیا مشکل ہے سرکار۔ جب چاہیں اسے اٹھا کر لے آئیں۔ یہ تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' صابر اپنی ایک آنکھ دبا کر بولا۔

''لیکن اس لڑکی کے ساتھ اتنا آسان نہیں ہے۔ وہ ہائی کورٹ کی وکیل ہے اور سارے قاعدے قوانین جانتی ہے۔''

''پھر تو وہ ٹیڑھی کھیر ہوئی سرکار۔ جانے دیں کسی اور کو دیکھ لیں۔''

"بکواس مت کرو۔ میں اس سے ہار نہیں مان سکتا۔ سیدھی انگلی سے کام نہیں نکلے گا تو انگلی ٹیڑھی کرنی پڑے گی۔"

"تو پھر بتائیں، میں کیا کروں۔"

"میں تمہیں اس کا پورا ایڈریس سمجھا رہا ہوں۔ تم ذرا اس کے بارے میں پوری چھان بین کر کے مجھے بتاؤ۔" کمال خان نے کہا۔ "اور یہ لو۔" اس نے چند نوٹ صابر کی طرف بڑھا دیے۔ "یہ بہت خاص کام ہے۔ کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے۔"

"بے فکر رہیں سرکار۔" صابر نے نوٹ جیب میں رکھ لیے۔ "پہلے بھی تو آپ کی خدمت کرتا رہا ہوں۔"

دو دن کے بعد ہی صابر نے پوری رپورٹ لا کر دے دی تھی۔ "سرکار اس لڑکی کا نام عینی ہے اور وہ واقعی ہائی کورٹ کی وکیل ہے اور بہت ہی دھانسو قسم کی وکیل ہے۔"

"ابے یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔" کمال خان نے کہا۔ "اس کے علاوہ کیا معلوم کیا ہے تو نے۔"

"وہی تو بتا رہا ہوں سرکار۔ اب ایک ایسی خبر بھی سن لیں جس کو سن کر آپ خوش ہو جائیں گے۔ اس لڑکی کا بہت زبردست معاشقہ چل رہا ہے۔"

"ہاں، یہ کام کی بات بتائی ہے تو نے۔ کس سے معاشقہ چل رہا ہے؟"

"اب یہ نہ پوچھیں سرکار۔ خوامخواہ آپ کو جھٹکا لگ جائے گا۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے۔ مجھے کیوں جھٹکا لگے گا؟"

"اس لیے کہ اس کا معاشقہ آپ کے چھوٹے بھائی ابرار خان سے چل رہا ہے۔" صابر نے جیسے بم پھاڑ دیا تھا۔

☆☆☆

شیرازی نے بس یونہی کسی محفل میں اپنی ایک دریافت کا ذکر کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کی زندگی عذاب ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ ایک سائنس داں تھا۔ اس کا سبجیکٹ نیوکلیئر فزکس تھا۔ اس نے غیر ممالک سے اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کی تھیں۔

اس نے اپنے گھر میں ایک لیبارٹری بنا رکھی تھی جہاں وہ تجربات کیا کرتا۔ ایک تجربے کے دوران اس نے ایک ایسے مادے کو دریافت کر لیا تھا جو تباہ کن ہتھیار بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا اور اہم بات یہ تھی کہ اس کا حصول بہت آسان تھا۔

دو مختلف عناصر کو یکجا کر کے وہ دھات بنائی جا سکتی تھی اور اس دھات سے تباہ کرنے والے ہتھیار بنا دیے جاتے اور اس کا پروسیس بھی بہت آسان تھا۔

لیکن اس نے اپنی اس دریافت کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔ اس نے وہ پورا فارمولا پہلے اپنی ایک ڈائری میں درج کیا۔ اس کے بعد اس فارمولے کو اپنے ذہن میں محفوظ کر کے ڈائری پھاڑ دی تھی۔ وہ ایک امن پسند انسان تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اگر یہ فارمولا عام ہو گیا تو ہوس پرست حکمرانوں کی رعونت میں اضافہ ہو جائے گا۔ وہ بھیانک قوت حاصل کر کے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس دنیا میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں گے۔ ہر طرف آگ اور خون کی بارش ہونے لگے گی۔

اس کا نظریہ بقول ساحر کے یہ تھا۔

"جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے۔ جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی، بھوک اور احتیاج کل دے گی"

اس لیے اس نے اپنی اس دریافت کے راز کو اپنے سینے میں ہی چھپا کر رکھا تھا۔ بس اس دن ایک محفل میں نادانستگی میں اس کے منہ سے یہ نکل گیا تھا۔

وہ تقریب ایک وزیر کی بیٹی کی شادی کی تقریب تھی۔ اس میں اعلیٰ سول افسران کے ساتھ فوجی افسران بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ غیر ملکی سفارت کار بھی تھے۔ یہ ایک ہائی فائی قسم کی تقریب تھی۔

شیرازی خود بھی ایک معزز شخصیت تھی۔ اسی لیے اس شادی میں وہ بھی مدعو تھا۔ سب لوگ اس سے مل رہے تھے۔ اسی دوران نہ جانے کس طرح اس نے اپنی دریافت کا ذکر کر دیا۔

اس وقت تو کچھ نہیں ہوا لیکن بعد میں اس کی زندگی عذاب ہوتی چلی گئی۔

وہ ایک اکیلا آدمی تھا۔ اس نے شادی کی تھی لیکن بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ دو بیٹیاں تھیں اور وہ دونوں بھی شادی کے بعد ملک سے باہر جا چکی تھیں۔

اس تقریب کے تیسرے دن اس کے پاس کسی کا فون آیا۔ کوئی مقامی آدمی تھا جو اس سے ملنا چاہتا تھا۔

"آپ سے ملاقات بہت ضروری ہے شیرازی صاحب، بات یہ ہے کہ میں کسی اور کے لیے فون کر رہا ہوں۔ اسے آپ سے ملاقات کرنی ہے۔"

"جس کو ملاقات کرنی ہے، وہ کون ہے؟"

"یہ میں فون پر نہیں بتا سکتا۔" اس نے کہا۔ "آپ مجھے صرف پانچ منٹ دیں۔"

"ٹھیک ہے۔" شیرازی نے کچھ سوچ کر ہامی بھر لی۔ "آ جاؤ۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"میرا نام شفیق ہے۔"

"او کے، گیٹ پر تمہارا نام بھیج دیتا ہوں۔ لیکن پندرہ بیس منٹ کے اندر آ جاؤ۔ ورنہ میں مصروف ہو جاؤں گا۔"

وہ آدمی بیس منٹ کے بعد اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کنجی آنکھوں والا ایک ایسا آدمی تھا جو دیکھنے ہی سے شاطر قسم کا معلوم ہوتا تھا۔

"ہاں جلدی بتاؤ، کون ہے وہ؟"

"شیرازی صاحب، وہ ایک بڑے ملک کا سفیر ہے۔" شفیق نے بتایا۔

"بڑے ملک کے سفیر کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا؟"

"شیرازی صاحب! آپ اس سے مل لیں تو آپ کو سب معلوم ہو جائے گا اور یہ ملاقات خاموشی سے ہوٹل ڈی لکس میں ہوگی۔"

"اوہ، تو کوئی پُراسرار معاملہ ہے۔" شیرازی نے ایک گہری سانس لی۔

"پُراسرار تو نہیں۔ لیکن خفیہ معاملہ ضرور ہے۔" اس نے کہا۔

"تمہارا اس سفارت خانے سے کیا تعلق ہے؟" شیرازی نے پوچھا۔

"میں ان کے لیے کام کرتا رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "بہر حال آپ ان معاملات کو چھوڑ دیں۔ آپ ملنے کا وقت بتا دیں۔"

شیرازی کو ایک کرید سی لگ گئی تھی۔ بیرون ملک کا ایک سفیر اس سے کیوں ملنا چاہتا۔ "ٹھیک ہے۔" اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ "اس کو بتا دو، میں اس ملاقات کے لیے تیار ہوں۔"

ہوٹل ڈی لکس کے ایک کمرے میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ پیٹرن نام تھا اس کا۔ شیرازی اس سے شادی کی تقریب میں بھی مل چکا تھا۔

"میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ مجھ سے اس طرح ملاقات کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟" شیرازی نے پوچھا۔

"شیرازی صاحب، میں براہِ راست مطلب پر آ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "ہم آپ کو دس لاکھ ڈالرز کی آفر دے رہے ہیں۔"

"دس لاکھ ڈالرز! وہ کیوں؟"

"وہ آپ نے اس رات اپنے جس فارمولے کا ذکر کیا تھا۔ ہمارا ملک اس میں انٹرسٹڈ ہے۔ دس لاکھ ڈالرز کے ساتھ ساتھ آپ کو فوری طور پر ہمارے ملک کی نیشنلٹی بھی مل جائے گی۔ آپ چاہیں تو کل ہی یہاں سے فلائی کر سکتے ہیں۔"

"محترم! آپ کی اس آفر کا شکریہ۔ لیکن کیوں؟ میں پوچھ تو سکتا ہوں نا کہ آپ کے ملک کو اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

"امنِ عالم کے لیے مسٹر شیرازی۔ بہت سامنے کی بات ہے۔ ہمارا جو مخالف کیمپ ہے اس کے پاس بھی تقریباً ویسے ہی ہتھیار ہیں جیسے ہمارے پاس ہیں۔ اس لیے ہمارے پاس کوئی ایسا ہتھیار ہونا چاہیے جو ان پر ہماری دہشت طاری کر دے اور وہ کسی قسم کی جنگ کا سوچ بھی نہ سکیں اور امنِ عالم کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔"

"معاف کیجیے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس مہلک ہتھیار کو حاصل کر لینے کے بعد آپ کا ملک اقوامِ عالم کا چوہدری بن بیٹھے۔"

"اچھا چلیں، آفر بیس لاکھ ڈالرز کی ہے۔"

"ایک ارب ڈالرز بھی نہیں۔" شیرازی نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنا فارمولا اپنے ملک کے حوالے کر رہے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔ کیونکہ مجھے کسی پر اعتبار نہیں ہے۔ طاقت پا کر ہمارے حکمرانوں کا بھی دماغ خراب ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر کیا کریں گے؟"

"فارمولے کو ضائع کر دوں گا۔ ذہن سے فراموش کر دوں گا۔ بھول جاؤں گا اس کو۔"

"آپ کی مرضی مسٹر شیرازی۔" اب سفیر کا لہجہ بہت خشک تھا۔ "ہماری ملاقات ختم ہوئی۔ لیکن یہ آفر برقرار ہے۔"

☆☆☆

کیا زندگی تھی اس کی؟

جیسے کسی کو ہمیشہ کے لیے کڑی دھوپ میں رکھا جائے اور دور دور تک کسی سائے کا امکان بھی نہ ہو۔ راحت نے کچھ ایسی ہی زندگی گزاری تھی۔

وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ خوب صورت

اور ذہین۔ لیکن کیا فائدہ ایسی خوب صورتی اور ذہانت کا۔ وہ اکثر سوچا کرتی۔ نہ جانے کس ستم ظریف نے اس کا نام راحت رکھ دیا تھا جبکہ اس کی زندگی میں راحت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

راحت کے بجائے اس کا نام اذیت یا مصیبت ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ اس کی زندگی اذیت اور مصیبت ہی میں گزری تھی۔

اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے اصل ماں باپ کون تھے، کہاں تھے۔ اس نے ایک ایسے گھرانے میں پرورش پائی تھی جنہوں نے ازراہِ ہمدردی اسے راستے سے اس وقت اٹھالیا تھا جب وہ بھٹکتی پھر رہی تھی۔

اسے بس ہلکا ہلکا سا یاد ہے کہ وہ اس وقت شاید تین سال کی تھی۔ تین سال کی ایک چھوٹی سی بچی جو ایک مارکیٹ میں کھڑی رو رہی تھی۔

سلیم اور اس کی بیوی نے ایک چھوٹی بچی کو روتا دیکھ کر گود میں اٹھالیا جو اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئی تھی۔ وہ بہت دیر تک مارکیٹ میں اس کے والدین کو تلاش کرتے رہے۔

اس کا نام دریافت کیا تو اس نے اپنا نام راحت بتایا تھا۔ ہاں باپ کا نام وہ واضح طور پر نہیں بتا پائی تھی۔ بہرحال وہ دونوں اسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے اخبارات میں راحت کی تصویریں بھی شائع کروائی گئیں لیکن راحت کے والدین کا پتا نہیں چل سکا۔

راحت نے ان ہی کے گھر میں پرورش پانی شروع کردی۔ کیونکہ یہ دونوں اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ انہوں نے اسے ایڈاپٹ کرلیا۔

اس کی تعلیم و تربیت شروع ہوگئی۔ وہ ایک خوب صورت بچی تھی۔ بڑی ہوئی تو اور بھی اچھی لگنے لگی۔

سب کچھ ٹھیک تھا لیکن اس دنیا میں سب کچھ اتنی آسانی سے ٹھیک کہاں ہوتا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی خرابی نکل ہی آتی ہے۔

راحت کے لیے یہ خرابی نکل آئی کہ انگلینڈ سے سلیم کا بھائی اپنی بیوی اور دو بیٹیوں کے ساتھ پاکستان آگیا۔

ان لوگوں کو بھی راحت کی پوری ہسٹری معلوم تھی۔ وہ لوگ پاکستان منتقل ہو کر اپنا کاروبار سیٹ کرنا چاہتے تھے۔

راحت اب جوان ہوچکی تھی۔ جو بھی دیکھتا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اس کی دوستی فرخ سے تھی۔ اسے بچپن کی محبت کہا جاسکتا ہے۔ فرخ اسکول میں بھی اس کے ساتھ تھا اور اب کالج میں بھی دونوں ایک ساتھ تھے۔

فرخ بھی ایک اسمارٹ اور مہذب نوجوان تھا۔ راحت کی زندگی میں گڑبڑ اور پریشانی کی ابتدا اسی دن سے ہوئی۔ جب فرخ کے ماں باپ رشتہ لے کر راحت کے گھر آئے۔

سلیم کے بھائی کی بیوی راشدہ نے جب فرخ کو دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اس کی دونوں بیٹیاں ابھی تک کنواری تھیں۔

اس وقت چائے کا دور چل رہا تھا۔ سب بہت خوش تھے۔ میز پر طرح طرح کے لوازمات سجے ہوئے تھے۔ فرخ کی ماں نے شامی کباب ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''شامی کباب بہت لذیذ ہیں۔''

''یہ سب راحت بیٹی نے بنائے ہیں۔'' سلیم کی بیوی نے کہا۔

''واقعی آپ نے اپنی بیٹی کو بہت اچھی تربیت دی ہے۔''

اور یہی وہ موقع تھا جس کا راشدہ کو انتظار تھا۔ ''جی ہاں، اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے۔ ورنہ کون آج کے زمانے میں ایک بے سہارا لڑکی پر دھیان دیتا ہے۔''

''بے سہارا لڑکی!'' فرخ کے گھر والے چونک پڑے۔

''بھابی!'' راشدہ نے سلیم کی بیوی کو دیکھا۔ ''بھابی! آپ نے ان لوگوں کو یہ نہیں بتایا ہے کہ راحت آپ کو کہاں سے ملی تھی اور اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے بلکہ سرے سے کوئی بیک گراؤنڈ ہی نہیں ہے۔''

''راشدہ، تمہیں اس وقت یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی؟'' سلیم کے بھائی علیم نے غصے سے اپنی بیوی کو دیکھا۔ بہرحال یہ کہانی اسی وقت ختم ہوگئی۔

فرخ کے گھر والے اٹھ کر چلے گئے تھے کیونکہ وہ کسی ایسی لڑکی کو اپنے گھر کی بہو نہیں بنا سکتے تھے جس کا کوئی بیک گراؤنڈ ہی نہ ہو۔

راحت کی زندگی کی یہ پہلی ناکامی تھی۔ اس کے بعد ناکامیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ راشدہ نے ایسا چکر چلایا تھا کہ راحت کو اس گھر سے نکلنا پڑ گیا۔

سلیم نے اسے ایک ہاسٹل میں داخل کرا دیا تھا جہاں وہ اکیلی زندگی گزارنے لگی تھی۔ اس نے ایک دو بار فرخ سے رابطے کی بھی کوشش کی لیکن اس نے بتا دیا کہ وہ اپنے

ماں باپ کی وجہ سے مجبور ہے۔ وہ تمہیں اپنے گھر میں نہیں لانا چاہتے۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی شادی راشدہ کی بیٹی عاصمہ سے طے ہو گئی ہے۔ اس خبر کو سن کر راحت بہت دیر تک روتی رہی تھی۔

اس نے ساری رات بے چینی میں گزاری۔ دوسری صبح سلیم معمول کے مطابق جب دفتر جاتے ہوئے اس سے ملنے کے لیے آیا تو اس نے کہہ دیا۔ ''ابو، میری ایک درخواست ہے۔ آپ مان لیں گے نا؟''

''ہاں کہو بیٹا۔''

''وہ درخواست یہ ہے کہ اب میں اپنا بار خود ہی اٹھاؤں گی۔'' اس نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ آپ میرے ہاسٹل وغیرہ کی فیس نہ دیا کریں۔''

''بے وقوف ہو تم۔ یہ سب کیسے کر سکو گی؟''

''سب ہو جائے گا۔ میں نے کل ہی ایک جگہ ملازمت کی بات کر لی ہے۔''

سلیم نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ اس کی بھتیجی کی شادی فرخ سے طے پا گئی ہے۔

☆☆☆

کرم داد کی تو قسمت کھل گئی تھی۔

اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اتنی خوب صورت لڑکی دلہن بن کر اس کے گھر میں آ جائے گی۔ اس کی بیوی گوری واقعی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اب کرم داد کی اُجاڑ زندگی میں بہار آ گئی تھی۔

ایک دن کرم داد اسے اس ٹیکری کی طرف لے گیا جس کے آس پاس کی زمینیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ یہ بنجر زمینیں تھیں۔

''دیکھ گوری!'' اس نے اپنی نئی نویلی دلہن سے کہا۔ ''یہ جو زمینیں دیکھ رہی ہے نا، یہ سب میرے زمیندار کی ہیں۔''

''اچھا، ویسے اس کے پاس اور بھی تو زمینیں ہوں گی؟'' گوری نے پوچھا۔

''ہاں بہت ہیں۔ لیکن یہ خالی پڑی ہوئی ہیں۔ میں نے ایک بار زمیندار سے یہ زمینیں مانگی تھیں لیکن اس نے دینے سے انکار کر دیا۔''

''تو بھی بالکل کملا ہے۔ خود سوچ اس بنجر زمین کو لے کر کیا کرتا؟''

''بہت کچھ کر سکتا تھا۔ کسان کے ہاتھ پاؤں سلامت ہونے چاہئیں پھر وہ پتھروں سے بھی پانی نکال لیتا ہے۔''

''لیکن زمیندار نے تو منع کر دیا تھا نا۔''

''میں پھر اس کے پاس جاؤں گا۔'' کرم داد نے کہا۔ ''اس سے کہوں گا کہ اب وہ میری بات مان لے۔ کیونکہ اب مجھ پر بہت ذمے داریاں ہو گئی ہیں۔ میں نے شادی کر لی ہے۔ وہ مہربانی کر دے گا تو ہم دونوں میاں بیوی رات دن محنت کر کے اس زمین کو سونا بنا دیں گے۔''

زمیندار نواز نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے کرم داد کو کڑی نگاہوں سے دیکھا۔ ''کیوں کرم داد، میں نے سنا ہے تو نے شادی کر لی ہے؟''

''جی سرکار، کب تک اکیلا رہتا۔''

''اچھا کیا تو نے۔ لیکن تو نے گاؤں کی ایک ریت توڑی ہے۔ ایک رواج توڑا ہے۔''

کرم داد نے گردن جھکا لی۔

''تجھے معلوم ہے نا کہ جس کی بھی شادی ہوتی ہے، وہ میرے سامنے سلام کے لیے اپنی بیوی کو لے کر آتا ہے۔''

''جی سرکار، بھول ہو گئی۔''

''یہ صرف بھول نہیں ہے کرم داد، یہ گستاخی ہے۔ اچھا اب جا۔ اور مٹھائی اور بیوی کو لے کر میرے پاس آ جا۔''

''ابھی لایا سرکار، ابھی لایا۔'' کرم داد نہال ہو گیا۔ ایک امید بندھ گئی تھی کہ اب شاید نواز اس کی بات مان لے۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ گوری سے کہے گا کہ وہ نواز سے بات کرے۔

گوری، نواز کے پاس جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''رہنے دے کرم داد۔ ہمارے پاس جتنا ہے اتنا ہی بہت ہے۔''

''تو نہیں جانتی گوری، زمین رکھنے والوں کی کیا شان ہوتی ہے۔ دوسرے اس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ پورے گاؤں میں تیری عزت ہو گی۔ کیونکہ تیرے پاس زمین ہو گی۔ بس دعا کر نواز مان لے۔''

نواز تو کرم داد کی بیوی کو دیکھتے ہی پھڑک اٹھا تھا۔ لیکن اس نے اپنے تاثرات ظاہر نہیں کیے اور ہزار کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

پھر اس سے پہلے کہ کرم داد یا اس کی بیوی کچھ بولتی۔ اس نے خود ہی کہا۔ ''ہاں کرم داد، یاد آیا تم نے ایک بار مجھ سے ٹیکری والی زمین کی بات کی تھی نا۔''

''جی سرکار۔''

''ابھی، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہارے نام کر ہی دوں۔ تم غریب آدمی ہو، تمہارا بھلا ہو جائے گا۔''

کرم داد اپنی خوشی پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ باقاعدہ خوشی سے لرزنے سا لگا تھا۔

''کل آجانا۔ میں منشی کو بُلا لوں گا۔ لکھا پڑھی کے بعد زمین تمہارے حوالے ہو جائے گی۔ اس کے بعد تمہاری مرضی تم اس کے ساتھ جو بھی کرو۔''

گھر واپسی پہنچ کر کرم داد خوشی سے گوری سے لپٹ پڑا۔ ''ارے میں جانتا تھا کہ تو بڑی خوش نصیب ہے۔ دیکھا، ابھی ہم نے بات بھی نہیں کی تھی اور زمیندار نے زمین ہمارے حوالے کردی۔''

''کرم داد، نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا۔'' گوری دھیرے سے بولی۔

''وہ کیوں؟''

''تو نے زمیندار کو نہیں دیکھا۔ وہ کس طرح مجھے گھور رہا تھا۔ جیسے کھا جائے گا۔''

''ارے یہ سب تیرا وہم ہے اور جہاں تک دیکھنے کا سوال ہے تو بنانے والے نے تجھے ایسا ہی بنایا ہے کہ جو دیکھے وہ دیکھتا رہ جائے۔''

☆☆☆

پروفیسر منور اس لڑکے کو نکال لایا تھا۔

اس لڑکے کا نام امجد تھا۔ امجد حسین۔ تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ وہ پروفیسر کا بار بار شکریہ ادا کیے جا رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم کچھ دنوں تک کالج نہیں آنا۔'' منور نے کہا۔ ''دو چار دنوں کے بعد معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

''یس سر، میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' امجد نے کہا۔

پھر دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ پروفیسر منور گاڑی چلاتا رہا۔ ایک محلے میں پہنچ کر امجد نے کہا۔ ''بس سر، گاڑی یہیں روک دیں۔''

''گھر کہاں ہے تمہارا؟'' منور نے پوچھا۔

''وہ سامنے والا ہے سر۔'' امجد نے اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ، خدا حافظ۔''

''نو سر، آپ کو اس طرح تو نہیں جانے دوں گا۔ آپ میرے ساتھ چلیں گے سر۔ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے۔''

''بے وقوف مت بنو۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ تم میرے اسٹوڈنٹ ہو۔ تم کو بچانا میرا فرض تھا۔''

''میں اوروں کا بھی تو اسٹوڈنٹ ہوں سر، لیکن کسی نے میری حمایت میں آواز بھی نہیں نکالی۔ صرف آپ ہی تھے جو ان کے سامنے ڈٹ گئے۔ نہیں سر، پلیز۔''

''اچھا، اچھا، تم گھر والوں کو بتاؤ۔ میں گاڑی پارک کر کے آتا ہوں۔''

امجد نے اپنے گھر والوں کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ اسی لیے جب پروفیسر منور کے لیے دروازہ کھولا گیا تو وہاں موجود لوگوں کی آنکھوں میں تشکر کے احساسات تھے۔

امجد کے ماں باپ اور اس کی بہن پروفیسر منور کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نہیں تھک رہے تھے۔ اور یہاں پروفیسر کو ایسا لگا جیسے اسے یا تو اس گھر میں آنا ہی نہیں چاہیے تھا یا بہت پہلے آنا چاہیے تھا۔

کیونکہ امجد کی بہن اتنی ہی خوب صورت لڑکی تھی۔ لیکن شاید خوب صورتی اس کے پورے سراپا میں نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں تھی۔ بولتی اور جادو جگاتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ ایسی آنکھیں پروفیسر نے پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ وہ ان آنکھوں کے سحر میں کھو کر رہ گیا تھا۔

اس لڑکی کا نام فائزہ تھا۔ بی اے کی طالبہ تھی اور پروفیسر سے عمر میں بہت چھوٹی تھی۔ پروفیسر کے سامنے کھانے پینے کی چیزوں کے ڈھیر لگے تھے لیکن وہ صرف ایک بسکٹ لے کر چائے کی چسکیاں لیتا رہا تھا۔

پروفیسر کچھ دیر بیٹھ کر ان سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ چلتے وقت لڑکی نے اس سے کہا۔ ''سر! کیا ہم امید رکھیں کہ آپ دوبارہ ہمارے یہاں آئیں گے۔''

پروفیسر کا دل چاہا کہ... کہہ دے کہ یہاں سے جانے ہی کا دل نہیں چاہ رہا۔

''کیوں نہیں۔'' پروفیسر مسکرا کر بولا۔ ''امجد میاں کے ساتھ دوبارہ آجاؤں گا۔''

گھر واپس آ کر پروفیسر بہت دیر تک اس لڑکی کے تصور میں کھویا رہا۔ اس کی آنکھیں اسے اپنے گھیرے میں لیے ہوئی تھیں۔

پروفیسر کی زندگی میں ایسا لمحہ کبھی نہیں آیا تھا۔ اس کی زندگی ایک بنجر زمین کی طرح تھی اور اب بنجر زمین میں اچانک ایک پھول دکھائی دے گیا تھا۔

حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ پھول اس کے لیے ہرگز نہیں ہے۔ وہ پھول اس کے ایک شاگرد کی بہن کے روپ میں ہے۔ ایک تو اس سے رشتہ ہی احترام کا ہے

اور دوسرے یہ کہ وہ اس سے عمر میں بہت بڑا تھا۔

اس کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ اس کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دے لیکن وہ ایسا نہیں کرسکا۔ جب بھی اس لڑکی کی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے آتی وہ بے چین ہو کر رہ جاتا۔

کالج میں ہونے والا ہنگامہ بھی اب ختم ہو گیا تھا۔ زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ ایک دن امجد نے اسٹاف روم میں اس کے پاس آ کر کہا۔ ''سر! میرے گھر والے آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں۔''

''اچھا۔'' پروفیسر مسکرا دیا۔ ''ان کو میرا سلام کہنا۔''

''تو سر، صرف سلام سے کام نہیں چلے گا۔ کل آپ کو ہمارے یہاں ڈنر پر آنا ہے۔''

''کوئی خاص بات؟''

''کوئی خاص تو نہیں ہے سر۔ کل میری بہن فائزہ کا برتھ ڈے ہے۔''

''ارے بھائی میں برتھ ڈے میں آ کر کیا کروں گا۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''یہ ایک فیملی گیدرنگ ہوتی ہے۔''

''تو سر۔ ابو نے بہت تاکید سے کہا ہے۔ آپ تو ہمارے لیے سب سے زیادہ محترم ہیں سر۔''

''اچھا، اچھا بھائی، آ جاؤں گا میں۔''

پروفیسر کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ صرف اس لیے کہ وہ ایک بار پھر اس لڑکی سے ملاقات کرنے والا تھا۔ جس کے تصور نے اسے کئی دنوں سے بے قرار کر رکھا تھا۔

☆☆☆
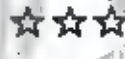
کمال خان کے لیے اس کا چھوٹا بھائی ابرار بہت اہم تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی ابرار سے بہت محبت کرتا تھا۔ والدین کی موت بہت پہلے ہو گئی تھی۔ کمال ہی نے ابرار کی پرورش کی تھی۔ اس کو ماں اور باپ بن کر پالا تھا۔ ابرار اب یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اور وہ خود ایک بڑا پولیس آفیسر تھا۔

اور اب اسے یہ سننے کو ملا تھا کہ اس نے جس لڑکی سے اپنی توہین محسوس کی تھی، وہ لڑکی اس کے چھوٹے بھائی ابرار کی محبت تھی۔

دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ یعنی دونوں کی خوشیاں ایک دوسرے سے وابستہ تھیں۔ وہ الجھنوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اگر وہ بھائی کی خاطر اس لڑکی کو چھوڑ دیتا ہے تو اس کی خلش اسے پریشان رکھے گی۔ اور اگر وہ اس لڑکی کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا ہے تو پھر بھائی کی محبت اسے چین نہیں لینے دے گی۔ ایسی الجھن اس کے ساتھ کبھی نہیں ہوئی ہو گی۔

پھر اس نے ایک منصوبہ بنا ہی لیا۔ یہ بہت سیدھا سادہ منصوبہ تھا۔ وہ اگر فوری اشتعال میں آ کر اس لڑکی کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا یا وہ لڑکی کہیں غائب ہو جاتی تو اس کے گھر والے اس کے خلاف ہنگامہ بھی کھڑا کر سکتے تھے۔

منصوبہ یہ تھا کہ وہ اس لڑکی اور اس کے گھر والوں کو اپنے اعتماد میں لے گا۔ ان پر یہ ظاہر کرے گا کہ جب سے اسے معلوم ہوا ہے کہ وہ لڑکی اس کے چھوٹے بھائی ابرار کی پسند ہے۔ تب سے وہ اپنے دل میں شرمندگی محسوس کر رہا ہے۔

وہ ایک بڑا بھائی بن کر اس کے پاس آیا ہے۔ اس کے بعد جب حالات نارمل ہو جاتے تو پھر اس لڑکی کو غائب کروا دیتا۔

پھر ابرار کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے اور پریشان رہنے کی ایکٹنگ کرتا۔ اس کے بعد اس لڑکی کی کہانی اس طرح ختم کر دی جاتی کہ پھر اس کا کہیں پتا ہی نہیں چلتا۔

ابرار بھی کچھ دنوں تک رو دھو کر چپ ہو جاتا۔ یہ ایک مکمل منصوبہ تھا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر اس کی پلاننگ کی تھی۔

اسی وقت اس کے ماتحت نے آ کر اسے ایک خبر سنائی۔ یہ ایسی خبر تھی جس کو سن کر اسے اپنی پلاننگ کی کامیابی کا یقین ہو گیا تھا۔

وہ مجرم پکڑا گیا تھا جس کی بہن ہائی کورٹ کی وکیل تھی اور جس نے کمال کی توہین کی تھی اور ویسے بھی اس کا جرم کوئی اتنا خاص نہیں تھا۔ وہ چوری کے موبائل فروخت کیا کرتا تھا۔

''بلاؤ اس کو۔'' کمال نے ماتحت سے کہا۔

لڑکے کو اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کی عمر اٹھارہ یا انیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ کمال کے سامنے آ کر وہ بری طرح کانپنے لگا تھا۔

''تم جانتے ہو کہ میں کیسا پولیس آفیسر ہوں؟'' کمال نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''یس..... یس سر۔''

''میں تو بڑے بڑے پھنے خاں سے بھی سچ اگلوا لیتا ہوں۔'' کمال نے کہا۔ ''لیکن تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں اگر آئندہ میں نے تمہیں اس قسم کے کسی کیس میں دھر لیا تو پھر تمہاری کھال کھینچ لوں گا۔''

''تو کیا آ...... آپ مجھے چھوڑ رہے ہیں؟''

''ہاں، چھوڑ رہا ہوں تم کو۔ میرے ساتھ چلو۔''

اس لڑکے کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ کمال اسے اس کے گھر لے آیا تھا۔ لڑکے کی بہن نے بڑی حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھا تھا۔ ''یہ...... یہ آپ کے پاس......''

''ہاں، تمہارے یہ برخوردار بھائی پکڑ لیے گئے ہیں۔ چوری کے موبائل بیچنے کا شوق ہے ان کو۔ میں اگر چاہوں تو ان کے خلاف ایک لمبا کیس بنا سکتا ہوں لیکن تمہارا خیال کر کے چھوڑ رہا ہوں۔''

''میرا خیال کر کے؟''

''ہاں، تم سے میرا ایک طرح کا رشتہ بھی نکل آیا ہے۔'' کمال خان مسکرایا۔ ''شاید ابرار نے تم کو نہ بتایا ہو۔''

''ابرار، وہ...... آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟''

''اس لیے کہ وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔'' کمال خان نے کہا۔ ''اور اب اپنے بھائی کو سمجھاؤ کہ یہ ایک اچھی فیملی کا لڑکا ہے۔ اس قسم کے چکروں میں نہ پڑے۔''

☆☆☆

پروفیسر شیرازی نے ایک حاکمِ اعلیٰ سے ملاقات کا وقت مانگا۔

شیرازی چونکہ خود ایک بہت بڑا آدمی تھا۔ پورا ملک اس کا قدرداں تھا۔ اسی لیے فوراً ہی ملاقات کا وقت دے دیا گیا تھا۔

اس وقت ایک پُرآسائش کمرے میں وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے میز پر نفیس پیالیوں میں چائے رکھی ہوئی تھی۔

''حکومت آپ کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار ہے پروفیسر صاحب۔'' حاکمِ اعلیٰ نے کہا۔ ''لیکن مسئلہ کیا ہے۔ ہمیں اب تک پتا نہیں چل سکا۔''

''جناب، مسئلہ یہ ہے کہ میری جان کو خطرہ ہے۔ مجھ پر ایک بار حملہ بھی ہو چکا ہے۔''

''اوہ، تو آپ کی سیکیورٹی بڑھا دی جاتی ہے فوراً۔ لیکن اچانک ایسا کیوں ہونے لگا۔''

''میری اپنی ایک حماقت کی وجہ سے۔''

''پلیز، کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ کیسی حماقت، تاکہ میں بھی کلیئر ہو جاؤں۔''

پروفیسر نے کچھ سوچ کر اسے اپنی اس دریافت کے بارے میں بتا دیا۔ حاکمِ اعلیٰ کے قہقہے ہوا ہو گئے تھے۔

''شیرازی صاحب یہ تو بہت زبردست دریافت ہے۔''

امریکن، فرنچ اور انگلش

جنگ عظیم دوئم کے زمانے میں امریکن سپاہی فرانس کے ریلوے اسٹیشن پر ریل میں بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا مگر ٹرین بالکل ہی بھری ہوئی تھی۔ سوائے ایک ڈبے میں فرنچ بڑی بی بیٹھی تھی اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر اس کا چھوٹا سا کتا ایک سیٹ پر بیٹھا تھا۔ امریکن سپاہی جنگ کے میدان سے واپس آیا تھا اور کافی تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ اس نے بڑی بی کو بہت ہی اخلاق سے درخواست کی کہ مجھے اس سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت دے دیں۔

فرنچ عورت نے سپاہی کو دیکھا اور کہا۔ ''تم امریکن بہت ہی بدتمیز ہوتے ہو، کیا تم نہیں دیکھ رہے اس پر میری پیاری کتیا بیٹھی ہے۔''

سپاہی کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔ چلو کہیں اور جگہ ڈھونڈتے ہیں مگر پوری ٹرین کا چکر لگانے کے بعد کوئی جگہ حاصل نہ کر سکا اور واپس پھر بڑی بی کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک بار پھر درخواست کی کہ مجھے یہاں بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔ اس پر بڑی بی نے پھر امریکن کی بےعزتی کی۔ اس پر امریکن سپاہی نے کچھ نہیں کہا اور جھک کر چھوٹے کتے کو اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس پر بڑی بی نے شور مچانا شروع کر دیا لوگوں سے مدد کے لیے کہا۔

کچھ فاصلے پر ایک انگریز بیٹھا تھا۔ اس نے امریکن سپاہی کو کہا۔ ''جناب آپ کو پتا ہے آپ امریکن ہر کام غلط کرتے ہیں مثلاً کھانا کھانے کے وقت فورک غلط ہاتھ میں پکڑتے ہیں۔ گاڑی غلط چلاتے ہو اور اب دیکھو تم کو بڑی بی کو پھینکنا چاہیے تھا، اس کی جگہ کتے کو پھینک دیا۔''

امریکا سے جاوید کاظمی کا تجزیہ

بہت زبردست۔ اب آپ فوری طور پر اپنی اس دریافت کو حکومت کے حوالے کر دیں۔

''حکومت کے حوالے، وہ کیوں؟''

''کیا مطلب ہے آپ کا۔'' حاکم اعلیٰ سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ ''شیرازی صاحب! آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہمیں اس سے کتنا فائدہ ہوگا۔''

''سر! آپ جس فائدے کی بات کر رہے ہیں، وہ سوائے طاقت کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف یہ دکھانا ہے کہ ہمارے پاس اتنی تباہ کن طاقت ہے کہ ہم تمہیں برباد کر سکتے ہیں۔ کیونکہ حکمرانوں کا یہی شیوہ رہا ہے۔ مجھے انسان پر بھروسا نہیں رہا۔ ہتھیار ہاتھ میں آتے ہی اس کے اندر کا درندہ جاگ اٹھتا ہے۔''

''شیرازی صاحب! یہ آپ اچھا نہیں کر رہے۔''

''نو سر، میں اپنے ملک کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا کی بھلائی کے لیے یہ سب کر رہا ہوں۔ میں تو اس منحوس گھڑی کو کوس رہا ہوں جب میں نے وہ فارمولا دریافت کر لیا تھا اور اس وقت کو گالیاں دے رہا ہوں جب نہ جانے کس طرح ایک تقریب میں، میں نے یہ بات کہہ دی تھی۔ سوری سر، میں وہ فارمولا کسی کو نہیں دے سکتا۔ چاہے وہ اپنا ہی ملک کیوں نہ ہو۔''

ملاقات انتہائی ناخوشگوار ماحول میں ختم ہو گئی۔

اس دن شیرازی نے بہت خاموشی کے ساتھ اپنا مکان چھوڑ دیا۔ اپنا شہر چھوڑ دیا۔ ایجنسی اور دوسرے ادارے اسے تلاش کرتے رہ گئے۔ لیکن اس کا کہیں پتا نہیں چل سکا تھا۔

☆☆☆

راحت کی زندگی اب ایک جگہ پر آ کر رک گئی تھی۔

صبح آفس جانا، شام کے وقت واپس آ کر اپنے کمرے میں بند ہو جانا۔ ہاسٹل کا ماحول بہت غنیمت اور محفوظ تھا۔

یہاں اس کے لیے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ صرف عورتیں ہی تھیں۔ ہاسٹل کی نگراں سے لے کر کام کرنے والیوں تک، یہاں آ کر اسے ایک سکون سا ملا تھا۔

ایک دن دفتر سے واپس آتے ہوئے اس کے ساتھ ایک اتفاق ہو گیا۔ ایسا اتفاق جو فلموں اور کہانیوں میں ہوا کرتا ہے اور کبھی کبھی عام زندگی میں بھی ہو جاتا ہے۔ ایک نوجوان اپنی بائیک سے اسے ٹکر مار کر بھاگ نکلا تھا۔

راحت کو اگرچہ زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ لیکن وہ خوف زدہ ہو کر گر پڑی تھی۔

اسی وقت ایک نوجوان اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی اپنی بائیک سے اترا تھا۔ اس نے بہت مہذب لہجے میں اس کی خیریت دریافت کی۔ ''آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ میں کچھ فاصلے پر تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ کم بخت آپ کو مار کر بھاگ لیا تھا۔''

''جی، شکریہ۔ میں ٹھیک ہوں۔'' راحت نے کہا۔ ''اس اچانک حادثے نے پریشان کر دیا ہے۔ باقی سب ٹھیک ہے۔''

اس نے آگے چلنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے چلا نہیں گیا۔ وہ نوجوان پھر اس کے پاس آیا۔ ''نہیں، آپ ٹھیک نہیں ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کے پیروں میں تکلیف معلوم ہوتی ہے۔ میری بات مانیں، سامنے ڈاکٹر کا کلینک ہے وہاں چلی جائیں۔ بلکہ میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔''

''میں چلی جاؤں گی۔ آپ تکلیف نہ کریں۔''

''پلیز۔ اعتبار کریں مجھ پر۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ آپ کو اس حال میں دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے۔ بیٹھ جائیں بائیک پر، سامنے ہی تو ہے۔''

راحت کو وہ ایک مہذب نوجوان محسوس ہوا تھا۔ اس کا لہجہ بہت شائستہ تھا۔ شرافت تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس پر اعتماد کر لے۔

وہ اس کے ساتھ کلینک گئی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے بتایا۔ ''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مسلز میں چوٹ آئی ہے۔ ایک دو دن آرام کر لیں۔ برابر میں میڈیکل اسٹور ہے۔ دوائیں لے لیں۔''

راحت کو یہ سب کچھ بہت عجیب سا اور اپنا اپنا بھی لگ رہا تھا۔ اسی نوجوان نے اس کی فیس بھی ادا کی تھی اور دوائیں بھی لے کر دی تھیں۔

راحت انکار ہی کرتی رہ گئی تھی لیکن اس نوجوان کے اصرار میں اتنا خلوص تھا کہ وہ مزید انکار نہیں کر سکی تھی۔

''چلیں یہ بتائیں آپ کو جانا کہاں ہے؟'' دوائی لانے کے بعد اس نے پوچھا۔

''نہیں، میں چلی جاؤں گی۔''

''پھر وہی ضد۔ چلیں بیٹھ جائیں اور پتا بتائیں۔''

راحت نے اسے اپنے ہاسٹل کا پتا سمجھا دیا۔ راستے بھر وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ کتنا فرق تھا اس میں جو اسے ٹکر مار کر بھاگ گیا تھا اور ایک یہ تھا کہ اس کی

تکلیف دیکھ کر اس کے پاس آ گیا تھا۔ اسے سہارا دیا۔ اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آیا اور ہاسٹل تک پہنچا دیا۔ ہاسٹل کے پاس اتر کر راحت نے اس کا شکریہ کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید آپ مجھے بداخلاق سمجھ رہے ہوں کہ میں آپ سے اندر آنے کے لیے بھی نہیں کہہ رہی۔ لیکن یہ میری مجبوری ہے۔ کیونکہ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ گرلز ہاسٹل ہے۔''

''جی ہاں، وہ میں جانتا ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''آپ کیسے جانتے ہیں۔ باہر تو کوئی بورڈ بھی نہیں لگا ہے؟''

''یہ میں اس طرح جانتا ہوں کہ یہاں میڈم قدسیہ ہوتی ہیں۔''

''جی ہاں، وہ ہماری نگراں ہیں۔ یعنی یہ سمجھ لیں کہ یہ ہاسٹل وہی چلا رہی ہیں۔''

''میڈم قدسیہ میری سگی ممانی ہیں۔'' نوجوان نے بتایا۔

''اوہ، یہ تو عجیب اتفاق ہے۔''

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ زندگی میں اس قسم کے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں۔ میرا نام شاہ جہاں ہے۔ ویسے تو کوئی بادشاہت نہیں ہے میری۔ اور نہ ہی میری کوئی ممتاز محل ہے جس کے لیے تاج محل بنوانے کا ارادہ کروں۔ اس کے باوجود شاہ جہاں ہوں۔ اچھا خدا حافظ، چلتا ہوں۔''

اس نے اپنی بائیک اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔

ہاسٹل میں داخل ہوئی تو اسے لنگڑاتے دیکھ کر اور لڑکیاں بھی اس کے پاس آ گئی تھیں۔

''کیا ہوا راحت؟ خیریت تو ہے۔''

اس نے اپنے ایکسیڈنٹ کے بارے میں سب کو بتا دیا تھا۔

میڈم نے جب اس کی خیریت دریافت کی تو اس نے بتاتے ہوئے کہا۔ ''میڈم! خدا بھلا کرے۔ اس شریف نوجوان کا۔ وہ مجھے سامنے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ پھر یہاں تک پہنچا کر گیا ہے۔''

''ہاں، ہاں، اس معاشرے میں ایسے اچھے لوگ بھی ہیں۔''

''میڈم! آپ بھی اس کو جانتی ہیں۔ شاہ جہاں نام ہے اس کا۔''

''شاہ جہاں تو میرے بھانجے کا نام ہے۔''

''جی میڈم، اس نے یہی بتایا تھا۔''

''شاہ جہاں اچھا لڑکا ہے۔ دوسروں سے بہت مختلف۔ خیر تم اپنا خیال رکھو۔ اور دو چار دنوں کے لیے اپنے دفتر سے چھٹی کر لو۔''

''جی میڈم، یہ تو کرنا ہی ہوگا۔''

شاہ جہاں سے اس کی پھر ملاقات ہوئی۔ اس بار وہ ہاسٹل کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ راحت جیسے ہی گیٹ سے باہر آئی۔ وہ اپنی بائیک لہراتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ ''آئیں میڈم، میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔''

''ارے آپ۔'' راحت اسے دیکھ کر خوش بھی ہوئی تھی اور حیران بھی تھی۔

''جی ہاں میں۔ اور میں اس وقت کوئی بہانہ نہیں کروں گا کہ میں ادھر سے گزر رہا تھا یا سامنے کسی دوست سے ملنے آیا تھا یا ممانی سے کوئی کام پڑ گیا تھا جی نہیں۔ ایسی کوئی کہانی نہیں سناؤں گا۔''

''پھر کیا کہیں گے؟''

''صرف یہ کہ میں یہاں صرف اور صرف تمہیں دیکھنے کے لیے آیا تھا۔''

راحت کے چہرے پر شرم کا رنگ دوڑ گیا تھا۔

☆☆☆

گھوڑے پر بیٹھ کر اپنی زمینوں کو دیکھتے جانا، دیکھتے جانا، یہ خواب کتنا دلکش تھا اور اب تو اس خواب کی تعبیر کے امکانات بھی پیدا ہونے لگے تھے۔ لیکن اس کی بیوی گوری کو نہ جانے کیوں ڈر لگا رہتا تھا۔

''نہیں، ہمیں زمیندار کو انکار کر دینا چاہیے۔''

''لیکن کیوں، وہ اتنی مہربانی کر رہا ہے۔ ہم اس کی رعایا ہیں۔ اس نے ہمارے حال پر رحم کیا ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔''

''کرما، یا تو تو سمجھ نہیں رہا یا جان بوجھ کر سمجھنا نہیں چاہ رہا۔ خود سوچ، اس نے یہ رحم اس وقت کیوں نہیں کیا جب تو اس کے پاس چل کر گیا تھا۔ کیونکہ اس وقت میں تیرے ساتھ نہیں تھی۔ اتنی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ یاد رکھ اگر میں ایک بار اس کے پاس پہنچ گئی نا تو پھر میرے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہے گا۔''

''گوری، یہ سب تو وقت سے پہلے کی باتیں کر رہی ہے۔'' کرم داد نے کہا۔ ''ابھی اس نے تیری تو کوئی بات ہی نہیں کی۔ ابھی تو صرف زمین دینے کی بات کی ہے۔''

''اور اگر اس نے میری بات کر دی تو پھر تو کیا کرے گا؟'' گوری نے پوچھا۔

"پھر میں اس پر لعنت بھیج کر چلا آؤں گا۔" کرم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں بھی دیکھ لیتی ہوں۔ تو کہاں تک اپنی بات پر اڑا رہتا ہے۔"

کرم داد دوسرے دن زمیندار کی حویلی کی طرف جاتے ہوئے مایوس بھی تھا اور پُرامید بھی۔ ہوسکتا ہے گوری کی باتیں، اس کے اندیشے سب غلط ہوں۔ یا ہوسکتا ہے کہ وہ سب کچھ ہو جو گوری نے کہا تھا۔ تو پھر...... پھر کیا ہونے والا تھا۔

زمیندار نے جس وقت اسے بُلایا تھا، وہ ٹھیک اسی وقت پہنچ گیا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ زمینوں کا حساب کتاب رکھنے والا منشی پہلے سے وہاں موجود تھا۔ زمیندار اسے کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

کرم داد سلام کر کے بہت ادب سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد زمیندار نے منشی سے کچھ کہا۔ وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد زمیندار نے کرم داد کی طرف دیکھا۔ "مبارک ہو تجھے، تو بھی زمینوں کا مالک بننے جا رہا ہے۔ میں نے منشی سے کاغذات تیار کروالیے ہیں۔"

"آپ کی مہربانی۔" کرم داد نے انکساری سے گردن جھکادی۔

"اور ہاں، تیری بیوی کہاں ہے؟" زمیندار نے پوچھا۔

"وہ...... وہ تو گھر پر ہے سرکار۔" کرم داد نے دھڑکتے دل کے ساتھ بتایا۔ اس وقت اس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔

"کیوں، اس کو گھر پر کیوں چھوڑ آیا۔ جا اس کو لے کر آجا۔"

"سرکار! ایسے معاملات میں عورت کا کیا کام؟" کرم داد نے کہا۔ "وہ آکر کیا کرے گی؟"

"مجھ سے بحث مت کر۔ میں تیرا کیا اچار ڈالوں گا۔ جا اس کو لے کر آ۔ پھر زمین کے کاغذات پر انگوٹھے لگا دینا۔"

گوری کے سارے اندیشے سچ ثابت ہوئے تھے۔ زمیندار، زمین کے بدلے زن کا مطالبہ کر رہا تھا اور وہ بھی اس زن کا جس کے بغیر کرم داد زندہ نہیں رہ پاتا۔ جو اس کی دھڑکنوں میں سمائی ہوئی تھی۔ جو اس کی زندگی کی پہلی سچی خوشی تھی۔

"اب جا بھی، سوچ کیا رہا ہے۔" زمیندار نے کہا۔

"اچھا سرکار، میں لے کر آتا ہوں۔" کرم داد نے کہا۔

اس کے بعد ان دونوں میاں بیوی کا کوئی پتا نہیں چلا۔ وہ دونوں غائب ہوگئے تھے۔ تلملائے ہوئے زمیندار نے ان دونوں کو تلاش کروانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن وہ کہیں نہیں تھے۔

☆☆☆

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ یا کچھ اور۔ پروفیسر منور بہت اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ عقل یہ کہتی تھی کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے.... انتہائی غلط ہے۔ جبکہ دل سے آواز آتی تھی کہ نہیں۔ جو کچھ بھی ہے، سب ٹھیک ہے۔ محبت ایک طاقت ور جذبہ ہے اور انسان کو اس طاقت کے آگے سرینڈر کر جانا چاہیے۔

اس نے دل کی بات مان کر خود کو سرینڈر کر دیا تھا۔ وہ فائزہ کے عشق میں پاگل ہو رہا تھا۔

امجد اسے فائزہ کی برتھ ڈے پر بُلا کر لے گیا تھا۔ پروفیسر منور نے اس کے لیے خوب صورت تحائف خرید لیے تھے۔

اس دن فائزہ نے جن مہربان نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا اور پوری تقریب کے دوران جس والہانہ طور پر اس کے اردگرد منڈلاتی رہی تھی وہ پروفیسر منور کو سرشار کر دینے کے لیے کافی تھا۔

پھر ان کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اس کی سبیل بھی خود فائزہ ہی نے نکالی تھی۔

ایک دن امجد نے اس سے کہا تھا۔ "سر! فائزہ آپ سے انگلش پڑھنا چاہتی ہے۔"

"کیوں، کیا اس کے کالج میں انگلش نہیں پڑھائی جارہی؟"

"پڑھاتے تو ہیں سر لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں ہے۔ یہ اس کا موبائل نمبر ہے سر، آپ خود ہی اس سے بات کر لیں۔"

امجد نے فائزہ کا موبائل نمبر دے دیا۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان فون پر باتیں ہونے لگیں اور پروفیسر منور کو اندازہ ہوا کہ جتنا وہ بے قرار تھا، اس سے کہیں زیادہ خود فائزہ بے قرار تھی۔

فائزہ نے ملنے کا ایک راستہ بھی نکال لیا۔ اس نے کہا۔ "منور صاحب! آپ میرے یہاں پڑھانے کے لیے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

نہ آیا کریں بلکہ میں خود آجایا کروں گی۔"

"لیکن تم کس طرح آیا کرو گی؟"

"بہت آسانی سے۔ بھائی مجھے اپنی بائیک پر آپ کے یہاں ڈراپ کر دیا کرے گا۔ پھر واپس لے جایا کرے گا۔"

"فائزہ یہ بتاؤ، کیا یہ اچھا لگے گا؟"

"کیوں نہیں، اس میں کیا برائی ہے؟" فائزہ نے کہا۔

اس وقت تو پروفیسر نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن دوسری شام جب وہ اپنے طے شدہ وقت پر آئی تو پروفیسر نے اس سے پوچھا۔ "فائزہ ایک بات بتاؤ، آخر تم نے مجھ میں ایسی کون سی بات دیکھ لی ہے کہ اس طرح مجھ سے ملنے کا راستہ نکال لیا ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی سر۔" فائزہ نے ایک بے خودی کے عالم میں کہا۔ "نہ جانے وہ کون سی طاقت ہے جو مجھے آپ کی طرف کھینچ کر لے آئی ہے۔"

اس وقت پروفیسر کو ایک بہت پرانی بات یاد آگئی۔ جس کی سچائی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بات یہ تھی کہ لڑکیاں امربیل کی طرح ہوتی ہیں اور جو بھی قریب کا درخت یا کوئی سہارا نظر آجائے وہ اسے سے لپٹ جاتی ہیں۔

فائزہ بھی امربیل تھی اور اسے پروفیسر منور کی صورت میں پہلی بار ایک ستون مل گیا تھا۔ اس لیے وہ اس کے قریب ہو گئی تھی۔

وہ روزانہ اس کے پاس آنے لگی۔

فائزہ نے پروفیسر منور جیسے سنجیدہ آدمی کو مدہوش کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ جب سامنے آتی تو وہ کسی بچے کی طرح ہو جاتا۔

برسوں کے بعد اس پر ایسی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔

برسوں کے بعد اس نے خوشیاں دیکھی تھیں۔ وہ خوشیاں جو زندگی میں کسی کے رنگین آنچل اور کسی کے جسم کی خوشبو سے پیدا ہوتی ہیں۔

ایک روز فائزہ اس کے پاس آئی تو وہ کسی اور ہی موڈ میں تھی۔ "پروفیسر! ہم باہر چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے پروفیسر کہا کرتی تھی۔

"باہر کہاں؟"

"کہیں بھی۔ ساحل کی طرف۔ کچھ دیر بیٹھ کر واپس آجائیں گے۔"

"فائزہ، امجد لینے کے لیے آجائے گا۔"

"وہ نہیں آئے گا پروفیسر، میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ آج بہت کام ہے۔ دیر ہو جائے گی۔ پروفیسر صاحب گھر پہنچا دیں گے۔"

"یعنی پورا انتظام کر کے آئی ہو۔"

"ہاں۔" وہ ہنس پڑی۔ "پورا انتظام۔"

لیکن ساحل کی طرف جانا انہیں راس نہیں آسکا۔ وہ اس وقت ایک بے خودی کے عالم میں پروفیسر کے شانے سے اپنا سر لگائے بیٹھی تھی کہ کچھ لڑکے اس طرف آنکلے۔

بدقسمتی یہ تھی کہ یہ وہ لڑکے تھے جن کے چنگل سے پروفیسر نے امجد کو نکالا تھا۔ انہوں نے جب پروفیسر اور فائزہ کو دیکھا تو ٹھٹک گئے۔

پروفیسر بڑی مشکلوں سے لڑکھڑاتے قدموں فائزہ کو لے کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے فائزہ کو بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیا۔ اس کے بعد وہ کہیں غائب ہو گیا۔ اس کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔ پورے کالج میں یہ داستان پھیل چکی تھی۔

پروفیسر کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے؟

☆☆☆

کمال خان نے اس مجرم لڑکے کے گھر میں اپنی ایک حیثیت بنالی تھی۔ وہ بہت مکاری اور پلاننگ کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔

اس لڑکے کی بہن جویریہ کو بھی اب اس پر اعتماد ہو گیا تھا۔ وہ کمال خان سے بے تکلفی سے باتیں بھی کرنے لگی تھی۔

کمال خان نے اپنی شاطرانہ چالوں سے جویریہ کے بھائی کو اس کیس سے نکال لیا تھا۔ پورا گھر اس کا مشکور تھا۔ اس نے وہاں یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ ایک اصول پسند پولیس آفیسر ہے اور اس کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا جاتا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔ کیونکہ اس کی اصول پسندی کی وجہ سے اس کے محکمے کے کچھ لوگ اس کو پسند نہیں کرتے۔

وہ اکثر شام کے وقت ان کے گھر پہنچ جاتا۔ شام کی چائے پینے کے بعد کچھ گپ شپ کر کے واپس چلا جاتا۔ اس نے ایک بار پورے گھر کو ہوٹل میں کھانے کی دعوت بھی دی تھی۔ بہانہ یہ تھا کہ آج اس کی سالگرہ ہے جبکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

جب اس نے محسوس کر لیا کہ جویریہ کو اس پر اچھا

خاصا بھروسا ہو گیا ہے تو اس نے اپنے خاص بندے صابر کو بلا لیا۔
اس نے یہ پلاننگ پولیس آفس میں نہیں کی تھی۔ بلکہ صابر کو اپنے گھر لے آیا تھا۔
''ہاں، اب تمہاری کاریگری دیکھنے کا موقع آیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اطمینان رکھو، ٹھیک ٹھاک پیسے مل جائیں گے۔''
''پیسے کون دے گا، محکمہ؟''
''ارے نہیں۔ یہ میرا ذاتی کام ہے۔ میں خود اپنی جیب سے دوں گا۔''
''پھر تو ٹھیک ہے۔ کیونکہ محکمے کے چکر میں تو خواری ہوتی ہے۔''
''لیکن سوچ لے۔ کام بہت ہوشیاری اور خاموشی سے ہونا ہے۔''
''میں تو تابعدار ہوں جی۔ آپ بتائیں، کیا کرنا ہے؟''
''اغوا۔'' کمال خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ''اغوا تو سمجھتا ہے نا؟''
''سرکار، زندگی ان ہی کاموں میں گزاری ہے۔ کس کا اغوا کرنا ہے؟''
''خود میرا۔'' کمال خان نے بتایا۔
''کیا؟'' صابر اچھل پڑا تھا۔ ''کیسی بات کرتے ہیں سر جی، آپ کا اغوا؟''
''ہاں یار اور میرے ساتھ وہ لڑکی بھی ہوگی۔ وہی ہائی کورٹ والی۔''
''سرکار، آپ مجھے بہت بڑی مصیبت میں ڈال دیں گے۔ آپ دونوں کا اغوا تو چھپا نہیں رہے گا۔ میرے گلے پڑ جائے گا۔ ایک تو ایک پولیس آفیسر، پھر ہائی کورٹ کی ایک وکیل۔ سرکار، میں تو بے موت مارا جاؤں گا۔ کوئی اور کام لے لیں۔ اس چکر میں نہ ڈالیں۔''
''بے وقوف، تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔'' کمال خان نے کہا۔ ''میں تو خود ہی تم سے یہ کہہ رہا ہوں۔ کون تم پر ہاتھ ڈالے گا اور کون بتائے گا کہ ہم دونوں کو اغوا کس نے کیا ہے؟''
''آپ نہیں تو بعد میں وہ لڑکی تو بتا دے گی نا۔''
''اگر وہ زندہ رہ گئی تو۔'' کمال خان کی ہنسی بہت بے رحمانہ تھی۔ ''یاد رکھنا، میں اپنی توہین کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔''
''پلاننگ کیا ہے سر جی۔'' صابر نے پوچھا۔
''بہت سیدھی سی پلاننگ ہے۔ ہائی وے پر ٹول پلازا سے کچھ فاصلے پر ایک پولیس چوکی بنی ہوئی ہے۔ جو بالکل خالی پڑی ہوئی ہے۔ اس کے ارد گرد جھاڑیاں ہیں۔ وہاں پہنچ کر میری گاڑی خراب ہو جائے گی۔ میری بات سمجھ رہے ہونا۔''
''جی ہاں۔ آپ اپنی گاڑی کو وہاں پہنچ کر خراب کر لیں گے۔''
''شاباش اور تم اپنے بندوں کے ساتھ انہی جھاڑیوں میں چھپے ہوگے پھر جب میں گاڑی سے اتر کر اپنی گاڑی ٹھیک کرنے لگ جاؤں تو تم سب جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آ جانا۔ یاد رکھنا، ذرا بھی محسوس نہ ہو کہ یہ سب پلاننگ سے ہو رہا ہے۔ تم ڈرامے میں رنگ بھرنے کے لیے میری گاڑی پر گولی بھی چلا سکتے ہو۔ توڑ دینا شیشے۔ اس کے بعد کام آسان ہو جائے گا۔ میں تو خوف زدہ ہونے کی ایکٹنگ کروں گا لیکن وہ لڑکی واقعی خوف زدہ ہو جائے گی۔ پھر تم ہم دونوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر اسی گاڑی میں اڈا نمبر دو کی طرف لے جانا۔ وہ جو آگے جا کر اسی راستے پر ہے۔''
''جی سرکار، وہ بھی میرا دیکھا ہوا ہے۔'' صابر نے کہا۔ ''آپ کو یاد ہوگا میں کئی بار آپ کے کہنے پر کچھ بندوں کو وہاں لے جا چکا ہوں۔''
''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' کمال خان نے ہاتھ ہلایا۔ ''اب تم جاؤ اور میرے فون کا انتظار کرو۔ اور ہاں.....'' اس نے کچھ نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے۔ ''یہ رکھ لو۔ تم کو اور بھی بہت کچھ مل جائے گا۔''
سوال یہ تھا کہ جویریہ سے کیسے بات کی جائے۔ ویسے تو وہ پورے گھر سے بے تکلف ہو چکا تھا۔ جویریہ بھی اس سے ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی تھی۔ لیکن کیا ضروری تھا کہ وہ کمال خان کے کہنے پر اس کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نکل ہی جائے۔
صابر سے اپنی گفتگو کے تیسرے دن جب وہ اور جویریہ شام کی چائے پی رہے تھے۔ اس نے بڑے سلیقے سے اپنی بات شروع کی۔ ''میں نہیں جانتا کہ میری طرف سے تمہارا دل صاف ہوا ہے کہ نہیں کیونکہ میرا رویہ ہی ایسا تھا کہ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ اسی قدر ناراض ہوتا جس قدر تم ہوئی تھیں۔''
''ارے نہیں کمال صاحب، اب جانے دیں اس بات کو۔ اب تو آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ مجھ سے

اور میرے بھائی سے بلکہ ہمارے پورے گھر سے کتنے مخلص ہیں۔

''ارے بھائی، میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ تمہارا بھائی سیدھے راستے پر آجائے۔ دوستوں کی صحبتوں نے اسے بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ اتنی اچھی فیملی کا لڑکا نہ جانے کن راہوں پر چل نکلا ہے۔''

''مہربانی ہے آپ کی......''

''خیر چھوڑو اس بات کو۔ مجھے شرمندہ نہ کرو۔ ہاں یاد آیا میں نے ہائی وے پر ایک فارم ہاؤس کا سودا کیا ہے۔ بہت خوب صورت بنا ہوا ہے۔''

''کمال صاحب، کیا آپ کے پاس اتنے پیسے آگئے کہ ایک فارم ہاؤس خرید لیں؟''

کمال خان ڈھٹائی سے ہنس پڑا۔ ''ہاں، لیکن اتنے پیسے اچانک نہیں آئے۔ اس کے لیے برسوں سے پلاننگ کر رہا ہوں۔ فارم ہاؤس میرا خواب تھا۔ جو اب پورا ہوا ہے۔ کیا آپ میری خوشیوں میں شریک ہوں گی؟''

''کیوں نہیں، چلتی ہوں آپ کے ساتھ، کب چلنا ہے۔''

کمال خان کو ایسا لگا جیسے وہ خود بھی اس بات کے لیے تیار بیٹھی ہو کہ کب کمال خان کی طرف سے آفر آئے اور وہ اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو جائے۔''

''تو پھر کل شام کو نکلتے ہیں۔'' کمال خان نے کہا۔ ''میں آپ کو گھر سے لے لوں گا اور......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''جی کمال صاحب فرمائیں، اور کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' جویریہ نے پوچھا۔

''وہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کا اس طرح میرے ساتھ جانا کچھ عجیب سا لگے گا۔ نہ جانے آپ کے گھر والے کیا خیال کریں؟''

''کیا ضرورت ہے گھر والوں کو بتانے کی۔'' جویریہ نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ ''کمال صاحب! یہ میرا اور آپ کا نجی معاملہ ہے۔ اس میں ہر ایک کو انوالو کرنا اچھا نہیں لگے گا۔''

''بالکل درست، میں بھی یہی کہنے والا تھا۔'' کمال خان نہال ہو گیا.... ''تو کل میں آجاؤں گا بلکہ احتیاطاً وہ جو سپر اسٹور ہے آپ کے گھر سے کچھ فاصلے پر، میں وہاں انتظار کروں گا۔''

دوسری شام کو ہائی وے کی طرف سفر شروع ہو گیا۔

کمال خان بہت خوش اور پرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ یہ سارے مرحلے بہت آسان ثابت ہوئے تھے۔

اس نے...... ایک ملازم کو بھیج کر اپنے اس خفیہ اڈے کی صفائی ستھرائی کروا دی تھی جہاں اب کچھ دنوں کے لیے جویریہ کو رہنا تھا اور کمال خان کو اس کے سارے کس بل نکال دینے تھے۔

جب وہ ٹول پلازا سے آگے نکل آئے تب جویریہ نے پوچھا۔ ''کمال صاحب! اب آپ کا فارم ہاؤس کتنی دور رہ گیا ہے؟''

''بس وہ سامنے جو پولیس چوکی دیکھ رہی ہیں نا، اس کے ساتھ ہی راستہ اندر کو جاتا ہے۔''

پولیس چوکی کے قریب جھاڑیوں کے پاس پہنچ کر کمال خان کی گاڑی میں پلاننگ کے مطابق کوئی خرابی پیدا ہو گئی۔ کمال خان نے گاڑی روک دی تھی۔

''کیا ہو گیا کمال صاحب؟''

''پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ تم پریشان نہ ہو، میں ابھی دیکھ لیتا ہوں۔''

کمال خان گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ اس وقت جویریہ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ اسی دوران پولیس چوکی کے قریب کی جھاڑیوں سے اچانک کچھ لوگ باہر نکل آئے۔

کمال خان نے ان میں سے کچھ کو پہچان لیا تھا۔ وہ اس کے اعلیٰ افسران تھے اور ان کے ساتھ دیگر پولیس والے بھی تھے۔

کمال خان کچھ دیر کے لیے گنگ رہ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ صابر نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اس نے فوری طور پر ایک فیصلہ کر لیا۔ اسے گرفتاری نہیں دینی تھی۔ فرار ہو جانا تھا۔ اس وقت وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ بعد میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔

اس سازش میں وہ لڑکی جویریہ بھی شامل تھی۔ اسی لیے وہ اتنے اطمینان سے اس کے ساتھ یہاں تک چلی آئی تھی۔ کمال خان نے اچانک ایک طرف دوڑ لگا دی۔

اس نے آوازیں سنیں۔ ''کمال رک جاؤ۔ رک جاؤ کمال خان۔'' لیکن وہ میدان میں دوڑتا چلا گیا۔

اس وقت اندھیرا بھی اتر آیا تھا۔ اسی لیے فی الحال اسے تعاقب کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ وہ دوڑتا چلا گیا۔ اس کے بعد کمال خان کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔ وہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

پروفیسر شیرازی اپنے آپ کو بچا کر لے آیا تھا۔ کہاں لے آیا تھا۔ اس کا اسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بس اسے اتنا احساس تھا کہ یہ ایک اجنبی جگہ ہے۔ چاروں طرف پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ درمیان میں کٹورا نما ایک وادی ہے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اسے یہاں تک کون لے کر آیا ہے۔ وہ تو اپنے شہر میں تھا۔ اپنے مکان میں تھا۔ اس نے اعلیٰ حکام سے ملاقات کے بعد یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ خود کو اور اپنے فارمولے کو محفوظ رکھنے کے لیے کچھ دنوں کے لیے کہیں روپوش ہوجائے گا۔

اس ملک میں اس کے کئی دوست تھے۔ جہاں وہ ایک طویل عرصے تک رہ سکتا ہے۔ خود اسی شہر میں اس کا ایک دوست عارف بھی تھا۔ جو ایک بڑا بزنس مین تھا۔ پروفیسر شیرازی کو اس پر پورا بھروسا تھا۔ اس نے عارف سے فون پر رابطے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اسے اندازہ تھا کہ حکومت کی طرف سے اس کی کال ٹریس ہورہی ہوگی۔

اس نے گاڑی نکالی اور خود ہی ڈرائیو کرتا ہوا اپنے دوست کے مکان کی طرف چل پڑا۔ لیکن وہاں تک پہنچنے سے پہلے اس کی گاڑی ایک جگہ رک گئی۔

وہ بے بسی کے عالم میں گاڑی سے اُتر آیا۔ اس وقت اسے کسی کی مدد کی ضرورت تھی۔

"کیا ہوا پروفیسر صاحب۔" کوئی شخص اس کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

پروفیسر نے خوف زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی اجنبی تھا۔ پُراسرار سا۔

"پروفیسر صاحب! جہاں آپ کی گاڑی خراب ہوئی ہے۔ یہ جگہ آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔"

"تم کون ہو؟"

"آپ اپنے آپ پر دھیان دیں شیرازی صاحب۔ کچھ لوگ آپ کی گاڑی کا تعاقب کررہے ہیں۔" اس نے کہا۔ "اس وقت بھی ان کی گاڑی آپ سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہے۔"

اس نے جس انداز سے یہ بات کی تھی، اس سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ غلط بیانی نہیں کررہا۔

"شیرازی صاحب! میں آپ کا ہمدرد ہوں۔" اس نے کہا۔ "اور آپ پوری دنیا کے لیے جو جنگ لڑرہے ہیں، میں اس میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ آئیں میرے ساتھ، میری گاڑی میں بیٹھ جائیں۔" اس نے ایک گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بند شیشوں والی گاڑی تھی۔ شیرازی اس وقت اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ اس نے مزید کچھ جاننے اور دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ اس نے اپنا بریف کیس لیا اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ گاڑی کے اندر ایک عجیب میٹھی سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس بو نے اس کے ذہن کو دھندلانا شروع کردیا تھا اور جب اسے ہوش آیا تو وہ اس وادی میں موجود تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ اسے یہاں کون لے کر آیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو گھاس کے ایک میدان میں پا رہا تھا۔ وہ جہاں کھڑا تھا اس سے کچھ فاصلے پر لکڑی کا ایک کیبن بھی بنا ہوا تھا۔

وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسی کیبن کی طرف چل پڑا۔ کیبن سے باہر ایک آدمی دکھائی دے گیا۔ اس آدمی کے بدن پر ایسے کپڑے تھے جو عام طور پر دیہات اور گاؤں کے لوگ پہنا کرتے ہیں۔ وہ آدمی اسے دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا۔

اس نے فوراً ایک لکڑی اٹھالی تھی۔ جیسے اگر شیرازی اس کے قریب پہنچا تو وہ اسے ماردے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بولتا ہی جارہا تھا۔ "نہیں نہیں...... ہمارے پاس نہیں آنا۔ بھاگ جاؤ ورنہ جان سے ماردوں گا۔ بھاگو یہاں سے۔"

"خدا کے بندے، میں خود یہاں پریشان ہوکر آیا ہوں۔" شیرازی نے پکار کر کہا۔ "مجھے بتاؤ یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ مجھے خود نہیں معلوم۔" اس آدمی نے کہا۔

"تم یہاں کس طرح آئے ہو؟" شیرازی نے پوچھا۔

اس آدمی نے لکڑی ایک طرف پھینک دی۔ شاید اسے شیرازی سے اب خطرہ نہیں رہا تھا۔ وہ شیرازی کے پاس آگیا۔ لیکن اب بھی وہ محتاط دکھائی دے رہا تھا۔

"صاحب! ہم دونوں میاں بیوی چلے جارہے تھے کہ ایک آدمی مل گیا۔ وہ ہم دونوں کو اپنے ساتھ لے آیا لیکن نہیں، ہم دونوں پر کچھ ہوگیا تھا۔ شاید ہم بے ہوش ہوگئے تھے۔ جب ہوش آیا تو ہم یہاں اس کیبن کے پاس پڑے

ہوئے تھے۔

''تمہاری بیوی کہاں ہے؟''

''وہ اندر کیبن میں ہے۔'' اس نے بتایا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' شیرازی نے پوچھا۔

''کرم داد۔ اور میری بیوی کا نام گوری ہے۔ ویسے تم کون ہو صاحب، تم یہاں کیسے آگئے؟''

''میرا نام شیرازی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں ایک سائنس داں ہوں۔''

''یہ کیا ہوتا ہے صاحب؟''

''یہ تم نہیں سمجھو گے کرم داد۔'' شیرازی مسکرا دیا۔ ''اس وقت ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم یہاں کیسے آگئے؟ کون لے کر آیا ہے اور کیوں لایا ہے۔ یہ جگہ کون سی ہے۔ اور ہم کو اگر یہاں رہنا پڑا تو ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کیا ہوگا؟''

''اس کیبن میں کھانے پینے کا بہت سا سامان بھرا ہوا ہے صاحب۔'' کرم داد نے بتایا۔

''کمال ہے۔'' شیرازی بڑبڑایا۔

اتنی دیر میں کرم داد کی بیوی گوری بھی کیبن سے باہر آگئی تھی۔ شیرازی اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے ایسی حسین عورتیں کم ہی دیکھی ہوں گی۔

''یہ میری بیوی ہے جی، اور یہ نیک بخت یہ کہہ رہی ہے کہ اب ہم کو یہاں سے کہیں نہیں جانا۔ قسمت ہم کو بہت اچھی جگہ لے آئی ہے۔ یہاں ہر طرف سکون ہے۔ کسی کا خوف نہیں ہے کوئی پریشان کرنے والا نہیں ہے۔''

''واقعی جگہ تو بہت اچھی ہے۔'' شیرازی نے اس کی تائید کی۔ ''لیکن میرے اور تم دونوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے۔ ہم جس طرح یہاں آئے ہیں۔ وہ بالکل ان نیچرل ہے۔ جیسے کسی نے جادو کے زور سے ہمیں یہاں پہنچا دیا ہے۔ ہمیں مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔''

''یہی تو ہم دونوں بھی سوچتے رہتے ہیں۔'' کرم داد نے کہا۔

''یہ بتاؤ، تم دونوں کو یہاں آئے ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں؟'' شیرازی نے پوچھا۔

''دو دن ہو گئے ہیں صاحب۔ اور ان دو دنوں میں آپ پہلے آدمی دکھائی دیے ہیں۔'' کرم داد نے بتایا۔

☆☆☆

راحت کے لیے زندگی اچانک ہی خوب صورت ہو گئی تھی۔

شاہ جہاں اس کی بنجر زندگی میں بہار بن کر آ گیا تھا۔ اس سے پہلے راحت کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ کسی کا قرب کیا ہوتا ہے اور کسی کی توجہ کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔

شام کے وقت دونوں کی ملاقات ہوتی۔ شاہ جہاں اسے اس کے دفتر سے پک کر لیتا تھا پھر دونوں لانگ ڈرائیو پر نکل جاتے۔ گھومتے پھرتے، ہوٹل میں کھانا کھاتے اور رات آٹھ بجے تک شاہ جہاں اسے ہاسٹل پہنچا دیتا۔

راحت نے شاہ جہاں کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''شاہ جہاں صاحب! یہاں ہر ایک کا کوئی نہ کوئی بیک گراؤنڈ ضرور ہوتا ہے۔ گھر ہوتا ہے۔ والدین ہوتے ہیں۔ بھائی ہیں اور رشتے دار ہوتے ہیں لیکن میرا کوئی بیک گراؤنڈ نہیں ہے۔ میں خلا کی پیداوار ہوں۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق پڑتا ہے۔'' راحت نے کہا۔ ''یہ معاشرہ ہم جیسوں کو اپنے لیے قبول نہیں کرتا۔ ہمیں عجیب سی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔''

''فکر نہ کرو، میرے گھر والے ایسی باتوں کی پروا نہیں کریں گے۔''

''پتا نہیں۔'' راحت اداس ہو گئی تھی۔

''بے وقوف لڑکی۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے بنیاد نہیں رکھ دی ہو گی۔'' شاہ جہاں نے کہا۔ ''میں نے اپنی امی کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ اس رشتے کے لیے تیار ہیں۔ وہ ایک بالکل مختلف مزاج کی خاتون ہیں۔ ان کے لیے کسی کے بیک گراؤنڈ وغیرہ کی اہمیت نہیں ہے۔ وہ تو تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ کل شام کو چائے تمہیں امی کے ساتھ پینی ہے۔''

''اور تمہارے ابو؟'' راحت نے پوچھا۔ ''ان کا کیا ہو گا؟''

''کچھ نہیں ہو گا۔ وہ کبھی امی کے خلاف نہیں جاتے۔'' شاہ جہاں نے کہا۔ ''اب کل تم خوب اچھی طرح تیار رہنا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

''کیا تم ہاسٹل آؤ گے؟''

''نہیں، وہیں سپر اسٹور کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔'' شاہ جہاں نے کہا۔

لیکن دوسری شام شاہ جہاں انتظار کرتا رہ گیا۔ لیکن وہ نہیں آئی۔ وہ اپنے ہاسٹل میں بھی نہیں تھی۔ میڈم نے پولیس میں رپورٹ درج کروادی تھی لیکن پولیس بھی راحت کو تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی۔ وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اب یہاں سے پھر میرا کردار شروع ہوتا ہے۔

میں اپنے بارے میں بتا چکا ہوں کہ میں وقت ہوں۔ تاریخ ہوں۔ میں صرف گزرتے ہوئے واقعات کا چشم دید گواہ ہو سکتا ہوں۔ ان واقعات کے دھارے کو روک دینے یا ان کو بدل دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

میں نے ان کرداروں کو دیکھا۔ یہ سب علامتی کردار تھے۔ لیکن زندگی کے قریب۔ بلکہ زندگی کے مختلف چہرے تھے۔

کرم داد، اور اس کی بیوی گوری، کرم داد کا مسئلہ زمین تھا۔ اس نے زندگی بھر زمینوں کے خواب دیکھے تھے۔ حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی زمینیں اور وہ ان زمینوں کے درمیان کسی بادشاہ کی شان سے گزرتا ہوا۔

دوسرا کردار پروفیسر منور کا تھا۔ ایک پڑھا لکھا سلجھا ہوا شخص۔ لیکن اس سلجھے ہوئے شخص میں ایک احساسِ محرومی تھا کہ اس کی پوری زندگی میں کسی کے لمس کا احساس نہیں جاگا تھا۔

کوئی اس کے قریب نہیں آیا تھا۔ اس نے صرف پڑھا تھا کہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔ یہ رنگوں والی تصویر وہ آج تک دیکھ نہیں پایا تھا۔ ایک زن اس کی زندگی میں آئی مگر اس کے ساتھ بدنامیاں بھی چلی آئیں۔ اس کا مسئلہ زن تھا۔

اس کہانی کا ایک اور کردار کمال خان بھی ہے۔ ایک پولیس آفیسر۔ جس کے لیے زن کی بھی اہمیت تھی لیکن اس سے زیادہ اسے زر کی حاجت تھی۔ کسی طرح بھی ہو۔ پیسے بنائے جائیں۔ دھونس سے۔ دھڑلے سے۔ ظلم کر کے۔ سازش کر کے۔ لیکن آخری معرکہ یا آخری مہم اسے بھگتنی پڑ گئی۔ اسے فرار ہونا پڑا۔

پھر شیرازی تھا۔ ایک ایسا سائنس داں جس نے

اتفاق سے ایک جادوئی فارمولا دریافت کرلیا تھا لیکن وہ اپنی سرشت میں ایک نیک انسان تھا۔ اسی لیے اس فارمولے کو کسی کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔

پھر راحت تھی۔ ایک تنہا لڑکی۔ جسے زندگی میں پہلی بار کسی کی محبت اور توجہ حاصل ہوئی تھی اور جو اپنی خوشیوں کی منزل کے قریب پہنچنے والی تھی کہ وقت نے اسے کہیں اور پہنچا دیا تھا۔

☆☆☆

اب یہ سارے کردار کسی ایک جگہ جمع ہو گئے۔

ایسی وادی میں جہاں ہر طرف سکون تھا جہاں پھلوں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ جہاں پانی کی ایک نہر دوڑ رہی تھی۔ جہاں بے شمار خوب صورت رنگوں والے پرندے تھے۔

اس وقت وہ سب لکڑی کے اس کیبن میں بیٹھے ہوئے صورت حال پر غور کررہے تھے۔

ان سب کو کوئی انجانی طاقت گھیر کر کہاں لے آئی تھی۔

کرم داد! اس کی بیوی گوری، پروفیسر منور، کمال خان، راحت، سائنس دان شیرازی۔ وہ سب وہاں جمع تھے۔

ان سب نے اپنے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہ سب مختلف حالات میں گھرے ہوئے تھے۔ پھر پُراسرار حالات میں یہاں تک پہنچ چکے تھے۔

''آپ لوگ جانتے ہیں۔ مجھے کیسا لگ رہا ہے۔'' کمال خان نے کہا۔ ''پتا نہیں، آپ لوگوں نے ٹی وی کا وہ پروگرام دیکھا ہے یا نہیں، بگ باس۔ اس میں یہی ہوتا ہے کہ مختلف لوگوں کو ایک مکان میں رکھ دیا جاتا ہے اور انہیں اس مکان میں کئی دن گزارنے ہوتے ہیں۔ اس دوران یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کے رویے کیسے تھے۔ ان کا انداز کیسا تھا۔ تو ہم سب کو بھی کسی بگ باس نے یہاں لا کر رکھ دیا ہے۔''

''لیکن دی بگ باس کون ہوسکتا ہے؟'' منور نے پوچھا۔

''یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔'' کمال خان نے کہا۔ ''اور یہ بھی نہیں معلوم کہ یہاں کب تک رہنا ہوگا۔''

''کیوں نا ہم پہاڑ کی دوسری طرف جانے کی کوشش کریں۔'' راحت نے تجویز پیش کی۔ ''شاید اس طرف کوئی آبادی ہو اور ہمارے اس سوال کا جواب مل سکے۔''

''مجھے تو یہ سب کچھ بہت پُراسرار سا لگ رہا ہے۔'' منور نے کہا۔ ''جیسے ہم کہانیوں کی دنیا میں ہوں اور خواب دیکھ رہے ہوں۔''

''ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ جس نے یہ کھیل رچایا ہے جو ہمیں یہاں تک لایا ہے، اس کا مقصد کیا ہے۔ وہ کیا چاہتا

ابتدا تو انتہا

پہلی سے تیسری میں طالب علم خوب محنت سے پڑھائی کرتا ہے امتحان پاس کرنے کے لیے۔ چوتھی سے چھٹی جماعت میں پہنچنے کے بعد کہتا ہے۔ ''سوالات بہت مشکل تھے اس لیے میں نے حل نہیں کیے۔''

ساتویں سے دسویں تک پہنچنے پر کہتا ہے۔ ''میں نے صرف وہ سوالات یاد کیے جو ضروری تھے امتحان کے لیے۔''

اور گیارھویں میں پہنچنے پر کہتا ہے۔ ''میں نے صرف چار سبق یاد کیے ہیں جو پاس کرنے کے لیے کافی تھے۔''

اور بارھویں جماعت میں ساتھیوں سے پوچھتا ہے۔ ''کون سا امتحان ہے کل؟'' اور کالج پہنچنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے سوال کرتا ہے ''کم سے کم تم لوگ اتنا تو بتا دیتے کہ آج امتحان ہونے والا ہے۔ میرے پاس تو آج بال پین تک نہیں۔''

سچا عاشق

جیک نے اپنی گرل فرینڈ سے کہا۔ ''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' جس نے ایک دن پہلے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا۔ ''اگر تم نے مجھ سے فوراً شادی نہیں کی تو میں دریا پر جاؤں گا اور برف میں سوراخ بناؤں گا اور اس میں کود کر اپنی جان دے دوں گا۔''

''گرمی کے مہینے میں تو دریا میں برف نہیں ہوتی اور برف گرنے میں آٹھ ماہ باقی ہیں۔'' جیک کی گرل فرینڈ نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے۔ میں آٹھ ماہ انتظار کرلیتا ہوں برف جمنے تک۔'' جیک نے جواب دیا۔

بنوں سے ہمایوں سعید کی ثابت قدمی

ہے۔ ان سب نے یہ سب کیوں کیا ہے؟"

گوری نے چائے کی پیالیاں ان کے سامنے لا کر رکھ دیں۔ اس کیبن میں چائے کا پورا سامان موجود تھا۔ باری باری سب ہی آئے تھے اور کسی کو بھی اس وقت تک کھانے پینے کی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے گوری؟'' راحت نے اس سے پوچھا۔ ''تمہیں یہاں کوئی ڈر نہیں لگ رہا؟''

''میں تو بس ایک بات جانتی ہوں۔'' گوری نے کہا۔ ''جہاں کرم داد ہے، میں وہاں خوش ہوں چاہے وہ کوئی بھی جگہ ہو۔''

''واہ!'' شیرازی نے تعریف کی۔ ''ہماری خواتین کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ وفادار، محبت کرنے والی جس کی پوری کائنات اس کا شوہر ہوتی ہے۔''

دروازے پر دستک ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی ایک آدمی اندر آ گیا۔ وہ طویل قامت شخص تھا۔ اس نے ایک لانبا سا چسٹر پہن رکھا تھا۔ سر پر فلیٹ ہیٹ تھا۔

''اوہ، یہ تم ہی ہو نا۔ جو مجھے یہاں تک لایا ہے؟'' شیرازی نے کہا۔

''ہاں جی، یہی تو ہم دونوں کو بھی لایا ہے۔'' گوری نے کہا۔

''اوئے، تم نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔'' کمال خان غصے سے کھڑا ہو گیا تھا۔ ''کون ہو تم؟''

''بیٹھ جاؤ آفیسر صاحب! اس آدمی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یہ آپ کا پولیس اسٹیشن نہیں ہے۔ یہ ہمارا علاقہ ہے۔ میری مرضی کے بغیر تم زندگی بھر نکل نہیں سکتے۔''

''پھر بھی پتا تو چلے کہ یہ سب کیا ہے؟'' شیرازی نے کہا۔

''ہاں، یہ بتا سکتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ اس کی آواز میں ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ تھا۔

''تو بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟''

''بات صرف اتنی ہے کہ مجھے مختلف کرداروں کو دیکھنے اور پرکھنے کا شوق ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں انسانی رویوں پر سائنسی انداز سے ریسرچ کر رہا ہوں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کس کی جین میں ایسی کون سی بات رہ جاتی ہے کہ اس کا کردار دوسرے سے مختلف ہو جاتا ہے۔''

''تو تم سائنس داں ہو۔'' شیرازی نے پوچھا۔

''ہاں، کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔'' اس نے کہا۔ ''کیوں ایک آدمی کی خواہش دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ حالانکہ ہر ایک تخلیق کا انداز ایک ہی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ بدل کیوں جاتا ہے۔''

''یہ تو نظامِ فطرت ہے۔'' منور نے کہا۔

''وہی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ اب جیسے یہ کرم داد ہے۔ اس کی خواہش زمین حاصل کرنے کی ہے۔ اس کے نزدیک کسی انسان کی معراج یہی ہے کہ اس کے پاس لمبی چوڑی زمینیں ہوں۔ یہ ایک رویہ ہے زندگی کو دیکھنے کا۔ دوسری طرف اس کی بیوی ہے۔ اس کے لیے شوہر کی سلامتی سب کچھ ہے۔ اسے زمین وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے مزاج میں یہ بات کہاں سے آ گئی۔''

سب اس کی طرف دیکھتے رہے۔ ان سب کو اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کلاس روم میں ہوں اور کوئی پروفیسر انہیں لیکچر دے رہا ہو۔

''اب آ جاتے ہیں کمال خان کی طرف۔''

''پہلے یہ بتاؤ کہ ہم سب کے نام اور ہماری خواہشوں سے کیسے واقف ہو؟'' کمال خان نے پوچھا۔

''اس لیے کہ تم سب بہت دنوں سے میری آبزرویشن میں ہو۔'' اس نے بتایا۔ ''میرے آدمی تمہاری نگرانی کرتے رہے ہیں۔ ہر لمحہ تم سامنے رہے ہو۔ اسی لیے میں نے عین اس وقت تمہیں غائب کروا دیا جس وقت تم مصیبت میں پھنسنے والے تھے۔ صرف اس لیے کہ تم میں سے اگر کوئی ضائع ہو جاتا تو میرا تجربہ ادھورا رہ جاتا۔''

''نام کیا ہے تمہارا؟'' منور نے پوچھا۔

''نام کو چھوڑو۔ میرے تجربے کی اہمیت پر غور کرو۔ اب جیسے تم ہو۔ تمہارا مسئلہ زمین نہیں ہے بلکہ تمہارا مسئلہ ہے زن۔ کیونکہ تم زندگی میں اس قسم کی خوشی کے لیے ترستے رہے ہو۔ اس لیے تمہاری محرومی تمہارے مزاج اور تمہاری فطرت کا حصہ بن گئی ہے۔ تمہارے جینیٹک کوڈ میں اگر تبدیلی کر دی جائے تو پھر تمہاری یہ خواہش ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔''

''اور میرا کیا مسئلہ ہے؟'' کمال خان نے پوچھا۔

''تمہارا مسئلہ ہے زر، یعنی پیسا۔ تم پیسوں کے لیے پاگل ہو اور اسے حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر سکتے ہو۔ اور کرتے رہے ہو۔ تمہاری جین کی ساخت میں پیسوں سے محبت شامل ہے۔''

''اور میں، میرے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟'' شیرازی

نے پوچھا۔

"تمہارا مسئلہ ذرا مختلف ہے۔" اس نے کہا۔ "تمہارے مزاج میں انسان سے محبت کی جو کیمسٹری ہے وہ اوروں سے مختلف ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا میاتی خرابی ہی تو ہے۔"

"یوں تمہارے نزدیک ہر قسم کا انسانی جذبہ گلینڈز کی تبدیلی سے تبدیل ہوسکتا ہے؟"

"بالکل، شیرازی صاحب۔ تم بالکل صحیح نتیجے پر پہنچے ہو۔ میں نے یہی تجربہ کرنے کے لیے مختلف مزاج اور کردار کے لوگوں کو یہاں جمع کیا ہے۔"

"لیکن میں...... میں کس کھاتے میں آتی ہوں؟" راحت نے پوچھا۔ "میرا تو کسی جذبے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔"

"اسی لیے تمہارا معاملہ سب سے دلچسپ ہوگا۔" اس نے کہا۔ "یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا خارجی عوامل ایسے ہوتے ہیں کہ وہ انسان کی فطرت کو بدل کر رکھ دیں۔"

"تمہارے اس جائزے کے بعد کیا ہوگا۔" پروفیسر منور نے پوچھا۔

"جائزے کے بعد نہیں۔ تجربے کے بعد۔" اس نے کہا۔ "تم کو زن کی خواہش ہے۔ لیکن تم زمین کے لیے بے قرار ہو گے۔ کمال خان کی دلچسپی زر سے ختم ہوجائے گی۔ کرم داد کو زن میں دلچسپی ہوجائے گی۔"

"یہ ناممکن ہے۔" کمال خان بول اٹھا۔

"تم اس کی تصدیق ڈاکٹر شیرازی سے کرسکتے ہو۔" اس نے کہا۔ "جینیٹک کوڈ کی تبدیلی کے بعد کیا ہوسکتا ہے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شیرازی نے تائید کی۔ "اگر ایسا ممکن ہوجائے تو انسان کی فطرت تبدیل ہوسکتی ہے۔"

"لیکن ہم تمہیں اس کی اجازت کیوں دینے لگے؟" پروفیسر منور نے کہا۔

"مجھے تم لوگوں پر تجربات کرنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "تم سب کے سب میرے اختیار میں ہو۔ میں اس کیبن میں اکیلا نہیں آیا ہوں۔ اس کیبن سے باہر میرے مسلح بندے موجود ہیں۔ چاہو تو جھانک کر دیکھ سکتے ہو۔"

"صاحب جی، میں کیوں آگئی ہوں یہاں۔" گوری بول پڑی۔ "میرا تو ان چکروں سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔"

"جی۔" "تمہیں اس لیے لایا گیا ہے کہ یہ دیکھا جاسکے کہ کسی عورت میں شوہر سے وفاداری اور اس سے محبت کے جینٹک عناصر کہاں سے ہوتے ہیں۔ یہ بات اس کے ذہن میں کہاں سے آجاتی ہے کہ اسے ایک آدمی کا ساری زندگی وفادار بن کر رہنا ہے۔ اسی لیے تمہارا معاملہ بھی دلچسپ ہوگا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وفاداری کو بے وفائی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔" پروفیسر منور نے پوچھا۔

"سو فیصد۔" اس نے کہا۔ "انسان کی پوری نیچر بدلی جاسکتی ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ اس طرح تم انسانیت کی خدمت کرو گے۔" شیرازی نے پوچھا۔

"ہوسکتا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں انسان کو سمجھنے کی کوشش کررہا ہوں۔ ابھی تک تین بہت طاقتور جذبے

سامنے آ رہے ہیں۔ یعنی زر، زمین اور زن۔ اور یہ سارے فتنے انہی جذبوں کی بدولت ہیں۔ باقی جذبوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ دشمنی، انتقام، نفرت، بدلے، حسد وغیرہ۔ ان سارے منفی جذبوں کے پیچھے ان ہی تینوں کی کارفرمائیاں ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ تو انسان کی تخلیق کے ساتھ... ہی وجود میں آ گئے تھے۔''

''ہاں، فساد کی جڑ یہی تینوں ہیں اور میں اپنی جینٹک سرجری کے ذریعے ان جذبوں کو نکال پھینکوں گا۔ پوری انسانی ہسٹری بدل کر رہ جائے گی۔''

''چلو مان لیا کہ ایسا ہو گیا پھر میں کس جذبے کی گنتی میں آؤں گی۔'' راحت نے پوچھا۔

''تمہارا اور کرم واد کی بیوی کا معاملہ دوسرا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں تم میں زر یعنی پیسوں کی محبت بھر دوں گا جو اب تک نہیں ہے۔ اور کرم واد کی بیوی کو زمین کی محبت میں مبتلا کر دوں گا۔''

''دیکھو، ہم تمہیں آسانی سے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔'' کمال خان نے کہا۔

''اس دنیا میں مجبوروں کا حکم نہیں چلتا۔ تم سب اس وقت مجبور ہو۔''

پھر خاموشی چھا گئی۔ سب ہی سوچ رہے تھے کہ وہ کس پاگل کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔

''اب تم لوگ آرام کرو۔ کل میرے آدمی تمہیں میری لیبارٹری کی طرف لے آئیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''جو ان پہاڑوں کے دوسری طرف ہے اور یاد رکھنا۔ تم لوگ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش مت کرنا۔ ان پہاڑوں کے درمیان ایک ایسا قبیلہ آباد ہے جو ہماری زبان بھی نہیں سمجھتا۔ جو اس وادی سے نکلنے کی کوشش کرنے والوں کو مار ڈالتا ہے۔''

''اگر وہ لوگ تمہاری زبان نہیں سمجھتے تو پھر تم انہیں کیسے ہینڈل کرتے ہو؟'' کمال خان نے پوچھا۔

''میں انہیں بالکل بھی ہینڈل نہیں کرتا۔ ہم یہاں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ ان کو ہماری ہوا بھی نہیں لگنے پائے۔ فی الحال تم لوگ آرام کرلو۔''

وہ پُراسرار آدمی جس طرح آیا تھا اسی طرح کیبن سے باہر نکل گیا۔ کمال خان دوڑتا ہوا کیبن کے دروازے تک آیا تھا۔

اس آدمی نے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ ان کے ساتھ بہت سے مسلح افراد تھے جو اسے اپنی حفاظت میں لے کر چل رہے تھے۔

☆☆☆

اسی رات ان لوگوں نے وہاں سے فرار کا منصوبہ بنا لیا تھا۔

ان کو اکسانے والا پروفیسر منور تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ اپنے شہر میں بدنام ہو گیا تھا لیکن اس کی تعلیمی قابلیت اس کے ساتھ تھی۔ وہ کسی اور شہر میں جا کر قسمت آزمائی کر سکتا تھا۔

کرم واد نے بھی یہی سوچا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ زمیندار اس کا دشمن بن گیا تھا۔ وہ اس کی بیوی گوری کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا لیکن خدا کی زمین بہت بڑی تھی۔ دونوں میاں بیوی کہیں اور جا کر زندگی گزار سکتے تھے۔

شیرازی نے بھی اپنی سوچ بدل لی تھی۔ دنیا کی طاقتیں اسلحے کے ڈھیر لگاتی جا رہی تھیں۔ کمزور ملکوں کو ہر طرف سے دبایا جا رہا تھا۔ یو این او میں ان کی کوئی آواز نہیں تھی۔ اگر وہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھاتے تو اس آواز کو ویٹو کر دیا جاتا تھا۔ خود اس کے اپنے ملک کو ہر طرف سے خطرات لاحق تھے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایسے میں اس کا فارمولا ملک کے کتنے کام آ سکتا تھا۔

اس کا ملک بارگیننگ پوزیشن میں آ جاتا۔ اس نے اپنے فارمولے سے اپنے ملک کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ الٹا فرار ہو گیا تھا۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ واپس جا کر اپنا فارمولا اپنے ملک کے اعلیٰ سول اور فوجی حکام کے حوالے کر دے گا۔

اسی طرح کی سوچ کمال خان کی بھی تھی۔ وہ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ اسے کچھ سزا ہو جائے گی۔ اس کے بعد تو آزاد ہو جائے گا۔

راحت بھی یہی سوچ رہی تھی۔ حالانکہ باہر کی زندگی اس کے لیے بہت تلخ تھی۔ لیکن اس ماحول کی گھٹن سے تو نجات مل جاتی۔ یہاں تو ایک عجیب طرح کی دہشت طاری تھی اور وہ پاگل سائنس داں نہ جانے کیسے تجربات کرنے جا رہا تھا۔ شاید چیر پھاڑ کرے گا۔

نہیں۔ وہ یہ سب برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے یہاں سے جانا تھا۔ اس لیے اس نے بھی سب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

طے یہ پایا تھا کہ وہ سب رات ہی میں نکل لیں گے۔ حالانکہ انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ کتنی دور کا

سفر کرنا ہے۔

لیکن اتنا ضرور یقین تھا کہ ان پہاڑوں کی دوسری طرف کوئی نہ کوئی آبادی ضرور ہوگی۔ جس کی مدد سے وہ اپنے شہر پہنچ جائیں گے۔

کمال خان نے کیبن سے باہر نکل کر اس بات کا جائزہ لیا تھا کہ کہیں ان کی نگہبانی تو نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے واپس آکر یہ خبر سنادی۔

''ہم آسانی سے نکل سکتے ہیں۔ آس پاس کوئی نہیں ہے۔ شاید وہ سمجھتا ہے کہ ہم یہاں سے فرار کی کوشش نہیں کریں گے۔''

ان کے پاس سامان نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اسی لیے وہ سب یونہی نکل پڑے۔ سامنے پہاڑیاں نظر آرہی تھیں لیکن وہ اتنی بلند نہیں تھیں کہ عبور نہ ہوسکیں۔

آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ پہاڑیوں کے دامن میں تھے۔ پہاڑیاں اتنی بلند نہیں تھیں لیکن اسی وقت کچھ ہوا۔

کچھ لوگ نہ جانے کس طرف سے نکل آئے۔ انہوں نے ان سب کو گھیر لیا تھا۔ وہ سب کے سب جدید ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے پیٹرومیکس بھی اٹھا رکھے تھے جن کی روشنیوں میں ان کے چہرے واضح ہوگئے تھے۔ وہ سب پہاڑی علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ ان کے نقوش یہی بتا رہے تھے۔

ان میں سے ایک آدمی آگے بڑھا۔ اس نے ان لوگوں سے کچھ کہا۔ لیکن جو زبان بول رہا تھا وہ ان میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

''بھائی، ہم تمہاری زبان نہیں سمجھتے۔'' پروفیسر منور بلند آواز میں بولا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو، کون ہو تم لوگ؟''

لیکن اس بار بھی جواب میں جو زبان سننے کو ملی وہ ان کے سروں سے گزر گئی تھی۔ پھر اس آدمی نے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ ان کے ہتھیاروں کے رخ ان کی طرف ہوگئے اور پہاڑیوں کی فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔

ذرا سی دیر میں کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

ایک کرم داد تھا جس کی خواہش زمین کے حصول کی تھی جو صرف زمینوں کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ایک اس کی بیوی گوری تھی جس کے لیے زندگی یہی تھی کہ اپنے شوہر کا ساتھ دیا جائے۔

ایک پروفیسر منور تھا جس کی زندگی میں کبھی زن کا گزر نہیں تھا۔ جو کسی کی زلفوں کی چھاؤں کے لیے زندگی بھر ترستا رہا تھا۔

ایک سائنس داں شیرازی تھا، جس نے انسانیت کو بچانے کی کوشش کی تھی۔

ایک کمال خان تھا جس کے لیے سب سے بڑی معراج یہی تھی کہ کسی طرح زر حاصل کیا جائے اور ایک راحت تھی جس کے لیے زندگی کا ہونا یا نہ ہونا ایک جیسا تھا۔

یہ مختلف کیفیات تھیں۔ مختلف مزاج اور مختلف کردار کے لوگ تھے اور ان سب کا انجام ایک ہی جیسا ہوا تھا۔

یہ سب ایسے لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے جن کا کرائے ٹیریا سب سے الگ تھا۔ اور وہ تھا زبان۔ یہ سب زر، زمین اور زن کے چکر میں نہیں مارے گئے تھے بلکہ زبان کی خاطر مارے گئے تھے۔

نہ جانے انسانی جینز میں یہ زبان کی بنیاد پر نفرت کہاں سے اور کب سے شامل ہوگئی تھی۔

☆☆☆

میں وقت ہوں۔ آپ مجھے تاریخ بھی سمجھ سکتے ہیں۔

میں نے ان کرداروں کو دیکھا۔ ان کے آس پاس منڈلاتا رہا۔ ان پر گزرنے والے ہر واقعے کا مشاہدہ کیا۔

میں نے دیکھا کہ حالات کس طرح انسان پر اثرانداز ہوکر انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

یہ سارے کردار علامتی ہیں۔

لیکن ہر علامت ایک سچائی ہے۔ کیا آپ کے اردگرد پروفیسر منور، کرم داد، گوری، کمال خان، سائنس داں شیرازی اور راحت نہیں ہیں۔

اگر ہیں تو یقین کریں کہ یہ سب جس ماحول اور جس فضا میں پرورش پا رہے ہیں اس ماحول میں زبان کی بنیاد پر دشمنی کا زہر گھلا ہوا ہے۔

وہ سانس بھی لیتے ہیں تو دشمنی ہر سانس کے ساتھ واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر آج بھی ایسے حالات پر قابو نہیں پایا گیا تو ہر ایک کا وہی حشر ہوگا جو ان کرداروں کا ہوا تھا۔

مذہب کے رشتے ختم ہو چکے ہیں۔ بھائی چارے کی فضا دم توڑ چکی ہے۔ مفاہمت کے اصول ایک طرف رکھ دیے گئے ہیں۔

اگر زندہ ہے تو صرف وہ بنیاد جس پر کسی اور کی زبان سے نفرت کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ کہانی فرضی اور علامتی ہو۔ یہ کردار فرضی اور علامتی ہوں لیکن بنیاد فرضی اور علامتی نہیں ہے۔ وہی سب کچھ ہو رہا ہے جو اس کہانی میں ظاہر کیا گیا ہے۔

بے غرض

کبیر عباسی

رشتوں اور ناتوں کی عمارت اعتماد اور اعتبار پر استوار ہوتی ہے... اس کی بنیادیں تبھی مضبوطی اختیار کرتی ہیں... بداعتمادی اور دھوکا سازی پلوں میں عمارت کو مسمار کر کے رکھ دیتی ہے... کہتے ہیں کہ تلاش و جستجو میں انسان پوری عمر گنوا سکتا ہے... مگر صرف ایک دن... بلکہ ایک لمحہ ہی کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے... ہر شخص کی زندگی میں کوئی ایک دن ایسا ضرور آتا ہے جب وہ اپنی ذات کا عرفان اور دوسرے کے بہتان کی حقیقت جان لیتا ہے... اعتماد اور اعتبار کسی مچھلی کی طرح ندی کی سطح پر نہیں بہتا بلکہ اسے گہرائیوں میں جا کے تلاش کرنا پڑتا ہے... سرورق کے صفحات کی زینت بننے والی کہانی کے اتار چڑھاؤ... صحبتِ دوستاں کے میخانوں میں لبریز ہو جانے والے پیمانوں کی بہروپ سازیاں...

خودغرضی و بے غرضی کے کھیل میں ہونے والے خسارے کا حساب......

حسنات امجد نے اشارے پر گاڑی روکی ہی تھی کہ ایک چھوٹی سی بچی وائپر اور اسپرے بوتل اٹھائے اس کی گاڑی کی طرف لپکی۔ وہ شیشے پر صابن والا پانی اسپرے کر کے وائپر سے صاف کرنے لگی۔ حسنات عام طور پر اس طرح زبردستی ونڈ اسکرین صاف کرنے والے بچوں کو دس، بیس روپے دے کر جان چھڑا لیتا تھا۔ مگر اس وقت وہ سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ اس نے شیشہ نیچے کیا اور دھاڑ کے بولا۔ ''دفع ہو جاؤ۔''

بھی گھبرا کے پیچھے ہٹ گئی۔ ساتھ کھڑے موٹر سائیکل سوار نے اسے ملامتی نظروں سے دیکھا۔ اس نے بھی دل میں شرمندگی محسوس کی۔ اسی لمحے اشارہ کھل گیا اور اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

حسنات کا آج کا دن بہت سخت گزر رہا تھا۔ وہ ایک بینک کی کارپوریٹ برانچ کا منیجر تھا۔ اس نے شہر کی ایک معروف یونیورسٹی سے بینکنگ اینڈ فنانس میں ایم بی اے کیا تھا۔ اس یونیورسٹی سے فارغ التحصیل طلبہ کو مارکیٹ میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ حسنات تو گولڈ میڈلسٹ تھا۔ اسے آخری سمیسٹر کا رزلٹ آنے سے پہلے ہی ملک کے صفِ اول کے بینکوں میں سے ایک بینک کی طرف سے آفر آگئی تھی جو اس نے اپنے والد سے مشورے کے بعد قبول کرلی۔

اس کے والد بزنس مین تھے۔ اس کا بڑا بھائی ایم بی اے کرکے ان کے ساتھ ہی شریک ہوگیا تھا۔ اب والد کی مرضی تھی کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہی بزنس میں شامل ہوجائے مگر حسنات کا رجحان بزنس سے زیادہ بینکنگ کی طرف تھا۔ اس نے والد سے کہا۔ ”بزنس تو میں کسی بھی وقت جوائن کرسکتا ہوں اس سے پہلے میں کچھ وقت بینکنگ کو دینا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی بینکنگ کا تجربہ بعد میں بزنس میں میرے کام آئے گا۔“

والد صاحب اس کے دلائل سے مطمئن ہوئے تھے یا نہیں، اس کے اطمینان کے لیے یہ بات کافی تھی کہ انہوں نے اسے بینک جوائن کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

ویسے بھی انہیں اپنی اولاد کی زندگیوں میں مداخلت کی عادت نہیں تھی۔ ان کو اپنی اولاد کے فیصلوں پر کم ہی اعتراض ہوتا تھا۔

حسنات تین ماہ کی ٹریننگ کے بعد برانچ منیجر کے عہدے پر فائز ہوگیا۔ پانچ سال کے قلیل عرصے میں ہی اس کی ٹرانسفر اسی شہر کی کارپوریٹ برانچ میں کردی گئی۔ اس دوران میں اس کی کارکردگی سے بینک کی انتظامیہ بہت متاثر ہوئی تھی۔ اس کی شخصیت بھی انتہائی متاثر کن تھی۔ بات چیت کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ جب اپنے مخصوص انداز میں کسی کو بھی قائل کرنے کی کوشش کرتا تو مدِمقابل کو اپنی ہار تسلیم کرنا ہی پڑتی تھی۔ اس کی اسی صلاحیت کی بدولت اسے اتنی جلدی کارپوریٹ برانچ کی مینجمنٹ مل گئی تھی۔

آج اس کی برانچ کا ایک کیشئر اچانک ہی جاب چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ پیون نے صبح ہی صبح اسے اس کا استعفا پہنچا دیا تھا۔ اس کے استفسار پر پیون بس اتنا ہی بتاسکا کہ صبح صبح علی صاحب آکے اسے یہ پرچہ دے گئے تھے۔ انہوں نے اسے پرچہ دیتے وقت بس اتنا ہی کہا تھا کہ یہ پرچہ حسنات صاحب کو دے دینا۔

یوں اچانک جاب چھوڑنا بینکنگ کے قوانین کے خلاف تھا۔ اس نے علی کا نمبر ملایا مگر وہ بند جارہا تھا۔ اسی دوران میں بینک میں رش بڑھنا شروع ہوگیا اور وہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

آج کے دن رش معمول سے زیادہ رہا تھا۔ شام کو وہ کلوزنگ کرنے لگا تو کیش ہی برابر نہیں ہورہا تھا۔ ایک کیشئر نیا تھا رش کی وجہ سے اس نے کافی غلطیاں کردی تھیں۔ یہ مسئلہ اسے ہی حل کرنا تھا۔ کافی دیر کی مغزماری کے بعد وہ کیش بیلنس کرسکا۔ اس وجہ سے آج وہ سخت جھنجلایا ہوا تھا۔

اچانک اس کے سیل کی بیپ بجنے لگی۔ روڈ پر رش اتنا زیادہ تھا کہ اسے سیل کی اسکرین کی طرف دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ ویسے بھی اسے ڈرائیونگ کے دوران میں موبائل کے استعمال سے چڑ تھی۔ موٹروے پر ہونے کی وجہ سے گاڑیوں کی رفتار کافی زیادہ تھی۔ سیل کی رنگ ٹون اسے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برستی محسوس ہورہی تھی۔ مگر کال کرنے والا بھی بڑا مستقل مزاج لگ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے غصے اور جھنجلاہٹ پر قابو پایا۔ تین کالز کے بعد آخرکار اس کا سیل خاموش ہوگیا۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔

وہ گیٹ سے گاڑی اندر داخل کررہا تھا کہ سیل پھر بجنے لگا۔ اس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کرکے سیل فون جیب سے نکالا۔ یہ اس کی منگیتر فرحین کی کال تھی۔

فرحین انتہائی پرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ اس کی سیاہ زلفوں اور آنکھوں میں ایسا سحر تھا جو کسی کو بھی متاثر کرسکتا تھا۔ حسنات بھی اس کی انہی آنکھوں پر مرمٹا تھا۔ اس سے اس کی منگنی کو چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ وہ اس کی کزن تھی۔ فرحین سے منگنی اس کی رضامندی سے ہوئی تھی۔ مگر اب وہ کئی بار اس فیصلے پر پچھتانے لگا تھا۔ وجہ فرحین کی وقت بے وقت کالز تھیں۔ بڑی مشکل سے وہ اسے سمجھانے میں کامیاب ہوا کہ وہ اسے بینکنگ آورز میں کال نہ کیا کرے۔ اس کے بعد اکثر وہ جوں ہی گھر پہنچتا اس کی کال آجاتی۔ وہ روزانہ ایک جیسے موضوعات پر اس سے باتیں کرکر کے تنگ آچکا تھا۔ اس کے مزاج میں رومانس کا عنصر کافی کم تھا جبکہ فرحین حد درجہ جذباتی تھی۔ وہ اس کی اس عادت سے اکثر چڑ جاتا تھا۔

اس نے بادل ناخواستہ کال ریسیو کر کے سیل کان سے لگایا۔

”ہیلو۔“ اس کے لہجے سے بیزاری صاف محسوس کی جاسکتی تھی جسے اس نے چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

”ہو گئے فریش؟“ دوسری طرف سے فرحین کی چہکتی ہوئی آواز ابھری۔

”ابھی تو میں گھر کے اندر داخل ہوا ہوں، گاڑی سے بھی نہیں اترا۔“ اس نے اکتائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”اتنا لیٹ؟“ دوسری طرف سے حیرت میں ڈوبی فرحین کی آواز اسے مزید جھنجلاہٹ میں مبتلا کر گئی۔

”کام کرتا رہا ہوں بینک میں، کوئی تفریح نہیں کر رہا تھا۔“ اس بار اس کے لہجے سے واضح طور پر ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے، تم فریش ہو جاؤ میں بعد میں کال کر لوں گی۔“ فرحین نے اس کا انداز دیکھ کے اس کی اس وقت جان چھوڑنا مناسب سمجھا۔

حسنات نے بھی اتنی جلدی جان چھٹنے پہ شکر ادا کیا اور اوکے کہہ کے کال کاٹ دی۔

وہ گاڑی سے باہر نکلا تو قریبی مسجد میں عشا کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ نماز تو جمعے ہی کی پڑھتا تھا۔ مگر اپنے گھر کے پاس ہونے والی اس اذان کی آواز جب بھی اس کے کانوں میں پڑتی تھی، وہ سارے کام چھوڑ کے اذان سننے لگتا تھا۔ موذن کی آواز بھی بے پناہ خوبصورت اور دل کو چھو لینے والی تھی۔ اذان دینے کا انداز بھی انتہائی متاثر کن تھا۔ اس انداز میں پورے شہر میں کوئی اذان سنائی نہیں دیتی تھی۔

اذان سن کے اس نے دعا پڑھی اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی، اس نے فریج کھول کے سیب نکالا اور مزے سے کھانے لگا۔

وہ اپنے کمرے میں آ کے بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ گیٹ پر کال بیل کی آواز سنائی دی۔ اس کا بیڈروم دوسری منزل پر تھا۔ اس کے کمرے کی ایک کھڑکی باہر گلی میں کھلتی تھی۔ اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کے نیچے جھانکا۔

چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ اس کا سب سے قریبی دوست انور اندر آ رہا تھا۔ حسنات اس وقت بہت تھکا ہوا تھا مگر انور کو دیکھ کے اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ وہ انتہائی خوش لگ رہا تھا۔ حسنات اس کی کمپنی بہت انجوائے کرتا تھا۔ وہ سیدھا اس کے بیڈروم میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی حسنات کو کسی گڑبڑ کا اندازہ ہوا۔ ہمیشہ ہنستا مسکراتا چہرہ اس وقت بالکل ست اور اترا ہوا لگ رہا تھا۔

وہ اندر آتے ہی بولا۔ ”میں تمہیں کال کرتا رہا ہوں تم نے کال کیوں نہیں ریسیو کی؟“

”کال......؟ مجھے تو تمہاری کوئی کال نہیں ملی۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

”موبائل ادھر دکھاؤ۔“ اس نے یہ کہتے ہی بیڈ پر پڑا موبائل اٹھا لیا۔ ”یہ دیکھو تین مسڈ کالز۔“ اس نے موبائل اس کی طرف بڑھایا۔

مسڈ کالز دیکھ کے اسے یاد آیا کہ جب وہ گاڑی میں تھا تو اس کا موبائل بج رہا تھا۔ بعد میں فرحین کی کال سن کے اس نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ پہلے بھی وہی کال کر رہی ہو گی اس لیے اس نے مسڈ کالز چیک ہی نہیں کی تھیں۔

”اوہ سوری، میں گاڑی میں تھا تو ٹریفک کے شور کی وجہ سے سیل کی آواز ہی نہیں سن سکا۔“ اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

”اچھا یہ گولیاں کسی اور کو دینا فی الحال اس بحث کو چھوڑو۔ میں اس وقت بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں۔ تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔“ وہ تحکمانہ انداز میں بولا۔

”لیکن کدھر؟ ابھی تو میں آفس سے گھر پہنچا ہوں۔ ابھی کپڑے تک چینج نہیں کیے۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔

انور نے اس کے تھری پیس سوٹ اور جوتوں پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ ”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”ٹھیک ہے بھئی، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں مگر کچھ پتا تو چلے کہ آخر جانا کہاں ہے؟“ کچھ ہی دیر پہلے فرحین سے صرف فون پر بات کرتے ہوئے جھنجلایا ہوا حسنات اس وقت نہ صرف انتہائی نرمی سے بات کر رہا تھا بلکہ سخت تھکاوٹ کے باوجود وہ اس کے ساتھ چلنے پر بھی رضامند ہو گیا تھا۔

”حسنات، مجھ سے...... مجھ سے ایک قتل ہو گیا ہے اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ وہ رکتے رکتے بولا تو حسنات اس کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت تھی۔

☆☆☆

حسنات اور انور کی دوستی دیکھ کے ہر کوئی حیران ہوتا تھا۔ ان میں کوئی بھی تو قدر مشترک نہیں تھی۔ انور چھوٹے سے قد اور انتہائی دبلی پتلی جسامت کا مالک تھا۔ اس کا زرد اور مدقوق سا چہرہ دیکھ کے اس پر کوئی دوسری نظر ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے مقابلے میں حسنات کی شخصیت انتہائی شاندار تھی۔ وہ اونچے لمبے قد کے ساتھ کسرتی جسم کا مالک تھا۔ اس کے چمک دار اور پُر اعتماد چہرے پر ایک بار نظر ڈال کر ہٹانا مشکل ہو جاتا تھا۔

ان دونوں کی شخصیت میں یہ واحد فرق نہیں تھا۔ ان کے مزاج، تعلیم اور معاشی حیثیت میں بھی نمایاں فرق تھا۔ انور بولتا تھا تو اسے روکنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ ہر ایک پہ طنز کے تیر چلاتا۔ اس بات سے قطع نظر کے اگلا بندہ اس کے طنز سے لطف کشید کر رہا ہے یا اسے غصہ آ رہا ہے۔ وہ ہر ایک سے مذاق کرتا اور کوئی ہنسے نہ ہنسے وہ خود ہی اپنی بات کے جواب میں بلند و بالا قہقہے لگاتا۔ اکثر لوگ اس کی اس عادت سے نالاں رہتے مگر حسنات کو اس کا یوں ہنستا ہنساتا بہت پسند تھا۔ وہ بمشکل گریجویشن کر کے اکاؤنٹ آفس میں کلرک بھرتی ہو گیا تھا۔

اس کے مقابلے میں حسنات سب سے انتہائی مہذب انداز میں پیش آتا۔ وہ بلا ضرورت بالکل نہیں بولتا تھا۔ وہ کسی سے مذاق بھی کرتا تو تہذیب کے دائرے میں رہ کر ہی کرتا تھا، اس کی کوشش ہوتی تھی کہ کبھی کوئی اس سے ناراض نہ ہو۔ پڑھائی میں بھی وہ شروع سے بہت اچھا تھا مگر اتنے تفاوت کے باوجود وہ دونوں بہت اچھے دوست تھے۔ اور اس دوستی کا تعلق ان کے بچپن سے قائم تھا۔

وہ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ میٹرک تک ایک ہی اسکول میں پڑھے تھے۔ اس اسکول کا شمار شہر کے چند اچھے اور مہنگے پرائیویٹ اسکولز میں ہوتا تھا۔ انور کی ماں اس اسکول میں ٹیچر تھی جس کی وجہ سے اسے وہاں داخلہ مل گیا تھا ورنہ ان کی معاشی حیثیت اتنی نہیں تھی کہ وہ یہ اسکول افورڈ کر سکتا۔ اس کا باپ کوئی خاص کام دھندا نہیں کرتا تھا۔ ان کا گھر ماں کی جاب سے ہی چلتا تھا۔

حسنات کے ابو اس وقت بھی بزنس کر رہے تھے گو کہ اس وقت وہ اتنے بڑے بزنس مین نہیں تھے مگر ان کا شمار خوشحال لوگوں میں کیا جا سکتا تھا۔ وہ شروع سے ہی کلاس میں ایک ہی ڈیسک پر بیٹھتے تھے۔ انور کو گھر سے معمولی سا جیب خرچ ملتا۔ جبکہ حسنات کی جیب پیسوں سے بھری رہتی۔ وہ کھانے پینے کی جو چیز بھی خریدتا، اسے ساتھ ضرور شریک کرتا۔ انور کا قد کاٹھ اس سے کچھ چھوٹا تھا۔ اس لیے جب اس کے کپڑے اسے چھوٹے ہو جاتے تو انور کی ماں وہ کپڑے ان سے لے جاتی۔ البتہ تہواروں کے موقع پر حسنات اپنی ماں سے ضد کر کے انور کے لیے بھی ویسے ہی کپڑے بنواتا جیسے وہ اپنے لیے بنواتا تھا۔ وہ دونوں ایک جیسے کپڑے پہن کے پورا دن اتراتے پھرتے۔

ان دنوں وہ پانچویں کلاس میں تھے۔ بریک کے وقت وہ کینٹین سے چیزیں خریدنے کے لیے لائن میں لگے ہوئے تھے۔ اب انور اکثر اس سے چیز لینے کے بجائے پیسے ہی لے لیا کرتا تھا تاکہ وہ اپنی مرضی کی چیزیں خرید سکے۔ اس وقت بھی اس نے حسنات سے پیسے لیے اور قطار توڑ کے آگے کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک لڑکے نے اسے لائن میں گھسنے ہی نہیں دیا۔ اس نے زبردستی لائن میں گھسنے کی کوشش کی تو اس لڑکے نے اسے زور سے دھکا مارا۔ وہ خاصا دبلا پتلا کمزور تھا۔ کافی دور جا کے گرا۔ اسے چوٹ تو نہیں لگی مگر وہ اٹھ کے رونے لگا۔ حسنات یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ کس طرح انور نے زبردستی لائن میں گھسنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے اس چیز کی بھی پروا نہیں کی اور آ کے اس لڑکے کو لائن سے باہر کھینچ لیا۔ باہر کھینچ کے اس نے اس پر تابڑ توڑ مکوں کی بارش کر دی۔ اس لڑکے کو پٹتا دیکھ کے انور کو بھی جوش چڑھ گیا۔ وہ بھی آ کر اس لڑکے کی پٹائی کرنے لگا۔

کچھ بڑے لڑکوں نے انہیں چھڑایا اور انہیں آفس میں ایڈمن کے پاس لے گئے۔ یہ آپس میں لڑ رہے تھے، بڑے دو لڑکوں میں سے ایک نے ایڈمن کو بتایا اور واپس چلے گئے۔ وہ لڑکا روتے روتے ایڈمن کو بتانے لگا کہ ان دونوں نے مجھے مارا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

”کن دونوں نے؟“ ایڈمن نے حیرت سے سامنے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کا سوال سن کے لڑکے نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ حسنات اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے اس لڑکے کی آنکھوں میں حیرت دیکھی۔ اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو خود بھی حیران رہ گیا۔ وہ اِدھر اکیلا تھا۔ انور موقع دیکھ کے کھسک گیا تھا۔

خیر ایڈمن نے ان دونوں کے بیانات سنے۔ اس لڑکے کو انور کا نام نہیں معلوم تھا۔ حسنات انور کے یوں کھسک جانے پہ حیران تھا مگر ...... اس کے باوجود اس نے انور کا نام نہیں لیا۔

"آپ لوگوں کے والدین کو آپ کی اس حرکت کے بارے میں، میں انفارم کرتا ہوں مگر آئندہ اب اس قسم کی حرکت کی تو میں دونوں کو اسکول سے نکال دوں گا۔" آخر میں ایڈمن نے انہیں دھمکایا۔ حسنات کو اس چیز کی بہت فکر رہتی تھی کہ اس کے والدین تک اس کی کسی قسم کی شکایت نہ پہنچے۔ اس نے آج تک بھی کسی کو شکایت کا موقع دیا بھی نہیں تھا مگر آج لگ رہا تھا کہ اس کی اپنے والدین کے سامنے سبکی ہونے والی ہے۔

وہ باہر نکلا تو انور اسے اس بلڈنگ کے کونے میں ہی بیٹھا مل گیا۔ اس نے اپنا پاؤں پکڑا ہوا تھا۔

حسنات کے ساتھ دوسرا لڑکا اسے معاندانہ نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا تو وہ جھٹ سے بولا۔ "میرے پاؤں میں موچ آگئی تھی۔ مجھ سے چلا ہی نہیں جارہا تھا۔ اس لیے میں ادھر ہی رک گیا۔" اس کے لہجے میں معصومیت تھی۔

حسنات اس کے پاؤں کے بارے میں فکرمند ہو گیا۔ "اوہ، یہ تو بڑا مسئلہ ہوگیا۔ تم ادھر ہی رکو۔ میں کسی کو بلا کے لاتا ہوں۔" وہ پلٹنے ہی لگا تھا کہ انور جلدی سے بولا۔

"نہیں، نہیں..... میں نے پاؤں کو جھٹکا دیا ہے، یہ اب کافی بہتر ہوگیا ہے۔ میں چل سکتا ہوں۔" وہ یہ کہتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی چال میں معمولی سی لنگڑاہٹ تھی جو کلاس تک پہنچتے پہنچتے ٹھیک ہو چکی تھی۔ اب اس کے لبوں پر ایک عیاری سی مسکراہٹ تھی مگر حسنات کی نظر نہ اس کی چال پر پڑی تھی اور نہ ہی اس کی مسکراہٹ پہ۔

☆☆☆

انور فطرتاً خودغرض تھا اور بھی کئی مواقع ایسے آئے جب اس نے خود کو کسی مشکل میں دیکھا تو حسنات کو پھنسا دیا۔ حسنات اس پر اندھا اعتماد کرتا تھا اس لیے اسے بھی اندازہ ہو ہی نہیں سکا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ دونوں میٹرک میں تھے۔ وہ اکٹھے کاریڈور سے گزر رہے تھے۔ سامنے سے ایک لڑکی آرہی تھی۔ وہ انتہائی حسین اور طرح دار سی لڑکی تھی۔ انور اس سے دوستی کا خواہش مند تھا مگر گھبراتا بھی تھا کہ اگر اس نے جواب میں کچھ الٹا سیدھا کہہ دیا تو اس کے لیے مسئلہ بن سکتا ہے۔ اس مسئلے کا حل اس نے نکال لیا تھا۔ آج اس کے پاس ایک لو لیٹر تھا۔ لڑکی ان کی کلاس فیلو تھی مگر اس کا سیکشن الگ تھا اس لیے اس سے ان کی کوئی خاص ہیلو ہائے نہیں تھی۔ حسنات کو تو اس کا نام تک معلوم نہیں تھا۔ وہ حسنات کو لگاوٹ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی مگر حسنات کو کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ اپنی ہی دھن میں مگن چل رہا تھا۔

لڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے انور نے وہ لیٹر اس کے ہاتھ میں پکڑانے کی کوشش کی۔ لڑکی نے ہاتھ نہیں کھولا۔ وہ ادھر ہی گر گیا۔

لڑکی نے جھک کے لیٹر اٹھا لیا۔ لیٹر اٹھا کے اس نے انور کو غصے سے دیکھا۔ "تمہاری یہ جرأت....."

وہ آگے کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ انور جلدی سے بولا۔ "یہ حسنات کی طرف سے تمہارے لیے ہے۔" حسنات کو اس سب کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی، وہ آگے بڑھ گیا۔ لڑکی حسنات کا نام سن کے مسکرائی اور لیٹر لے کے چلی گئی۔

انور نے اپنا پسینہ خشک کیا۔ اس کی توقع کے مطابق لڑکی کا رویہ جارحانہ ہی تھا۔ مگر اس نے حسنات کا نام لے کر بروقت اپنی جان بچالی تھی۔ ورنہ آج سارے اسکول نے اس کا تماشا دیکھنا تھا۔ یہ لڑکی پہلے بھی ایک لڑکے کی طرف سے ایسی حرکت پہ اسے سکول سے نکلوا چکی تھی۔

لیٹر میں اس نے اپنے نام کے بجائے فقط "تمہارا عاشق" کا لقب استعمال کیا تھا۔ اگلے دن اس لڑکی نے لیٹر کا جواب انور کو ہی دیا تھا۔ اس نے جواب میں محبت کا اظہار کیا تھا۔ لیٹر میں لڑکی نے حسنات اور اپنا نام بھی لکھا تھا۔ انور نے اسی طرح دو چار خط اسے اپنی طرف سے لکھے اور ان میں حسنات کا نام استعمال کیا۔ لڑکی نے اسے جواب بھی دیے۔ حسنات اس سارے معاملے سے بے خبر تھا۔ اب انور کے منصوبے کا اگلا مرحلہ شروع ہونے کا وقت آگیا تھا۔

وہ لڑکی سے ملا اور اسے بتایا کہ وہ خط اس نے اپنی طرف سے لکھے تھے، حسنات کو اس سب کے متعلق علم ہی نہیں تھا۔ لڑکی نے غصہ دکھانے کی کوشش کی تو انور نے وہ خط اسکول انتظامیہ کو دکھا دینے کی دھمکی دے دی۔ لڑکی کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے اسے یہ سب حسنات کو بتانے سے بھی منع کر دیا تھا۔ وہ اسی طرح اسے بلیک میل کر کے اس سے ملتا رہا۔ گو کہ لڑکی نے اسے ایک حد سے آگے نہیں گزرنے نہیں دیا تھا۔ مگر انور کو اس کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ جو فائدہ اس نے لڑکی سے اٹھایا یہ بھی اس کی توقع سے زیادہ ہی تھا۔

اسکول کے بعد لڑکی کا اس سے رابطہ ختم ہو گیا۔ اسے اس کے گھر کا پتا نہیں تھا ورنہ وہ اس کا پیچھا آسانی سے نہ چھوڑتا۔

اسکول کے بعد ان دونوں نے الگ الگ کالج میں داخلہ لے لیا۔ انور کے نمبر کم تھے اس لیے وہ اس کالج میں

میرٹ پر ہی نہیں آسکا تھا جس میں حسنات نے داخلہ لیا تھا۔ ورنہ حسنات اس کا خرچہ تک اٹھانے کے لیے تیار تھا۔ وہ کالج کے بعد تقریباً روز ہی ملتے تھے۔

حسنات کے والد نے اس دوران میں ایک پوش علاقے میں نیا گھر لے لیا تھا اور وہ اُدھر شفٹ ہو گئے۔ وہ گھر ان کے پرانے محلے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ انور اکثر اُدھر بھی ان کے گھر آنے لگا۔ حسنات کے گھر والوں کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ انہوں نے حسنات کو سمجھانے کی کوشش کی کہ انور اچھا لڑکا نہیں ہے، وہ اس سے دوستی ختم کر دے مگر حسنات نے کسی کی ایک نہیں سنی۔ اس کے کافی دوستوں نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ انور اس سے مخلص نہیں وہ بس اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کر رہا ہے مگر حسنات الٹا ان دوستوں سے جھگڑنے لگتا۔

انور نے گریجویشن کے بعد کالج چھوڑ دیا۔ اس نے چند کمپیوٹر کورسز کیے۔ اور اب وہ کوئی نوکری تلاش کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے حسنات سے بات کی کہ وہ اپنے والد سے کہہ کر اسے اپنی فرم میں کوئی نوکری دلوا دے۔

حسنات سفارش کا قائل نہیں تھا۔ وہ سب کچھ اپنی محنت سے حاصل کرنے پر یقین رکھتا تھا مگر دوستی میں اپنے مزاج سے ہٹ کر اس نے اپنے والد سے بات کی مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

کچھ ماہ بعد اکاؤنٹ آفس میں کلرکوں کی نوکریاں آئیں، یہ نوکری رشوت یا سفارش کے بغیر مل ہی نہیں سکتی تھی۔ انور نے ایک بار پھر حسنات سے بات کی، اس کے ایک چچا اکاؤنٹ آفس میں ہی ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اس جاب پر کلرک کی تعیناتی کا اختیار انہی کے پاس تھا۔ وہ انتہائی کرپٹ قسم کے آدمی تھے اس لیے حسنات کے والد سے ان کی بنتی ہی نہیں تھی۔ حسنات یہ بات تو جانتا تھا کہ اس کے والد اور ان کے چچا کے تعلقات زیادہ اچھے نہیں مگر وہ اس کی وجہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے اپنے چچا سے انور کے متعلق خود بات کی۔ انہوں نے اس کی بات مان لی اور انور کو جاب مل گئی۔

اس کے چچا نے اس کے والد کو جتا دیا کہ وہ تو رشوت یا سفارش کے خلاف تھے مگر ان کے بیٹے نے اپنے دوست کی سفارش ان سے کی ہے۔ حسنات کے والد کو بہت برا لگا، انہوں نے حسنات کو اچھی خاصی ڈانٹ پلائی۔ زندگی میں پہلی بار حسنات کو یوں والد صاحب کی طرف سے ڈانٹ پڑی تھی۔ مگر اس کا دوست خوش تھا اس لیے وہ بھی یہ ڈانٹ پی گیا۔

☆☆☆

”خدا کے لیے یار، اس وقت میں بہت تھکا ہوا ہوں، اس وقت میں تمہارے کسی مذاق کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“ حسنات نے اس کے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ اکثر اس سے عملی قسم کے مذاق بھی کرتا رہتا تھا۔ اس لیے اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔

”میں مذاق نہیں کر رہا۔ تم بس یہ بتاؤ کہ میری مدد کرو گے یا نہیں۔“ انور اپنے انداز سے کافی سنجیدہ لگ رہا تھا۔ حسنات نے زندگی میں پہلی بار اسے اتنا فکر مند اور سنجیدہ دیکھا تھا۔ اسے یقین آنے لگا کہ وہ واقعی سچ کہہ رہا ہے۔

”اچھا! کیسے ہوا یہ سب اور تمہیں میری کیا مدد چاہیے؟“

”کیسے ہوا کا جواب لمبا ہے یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی بس اتنا سمجھ لو کہ یہ سب حادثاتی طور پر ہوا، میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔ اب اصل مسئلہ لاش کو ٹھکانے لگانے کا ہے۔ اس میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟ دیکھو مجھے کہیں پھنسا نہ دینا۔“

”تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں۔“ انور نے شکوہ کیا۔ ”مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی دوست تو وہ ہوتا ہے جو مصیبت میں کام آتا ہے، تم میری مدد کرنے کے بجائے الٹا مجھ پر ہی شک کر رہے ہو۔“

حسنات کا دل اس کا شکوہ سن کے پسیج گیا۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں بے چارگی تھی۔ ”میں تم پر شک نہیں کر رہا۔ تم جانتے ہو کہ میں نے اس طرح کا کام کبھی نہیں کیا۔ میں بس اپنے تحفظات کا اظہار کر رہا تھا۔ اب تم بتا بھی دو کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”اوہو بھئی، تم جانتے ہو میرے پاس گاڑی نہیں۔“ وہ جھنجلایا۔ ”لاش کو شہر سے باہر جو نالا بہہ رہا ہے اس میں پھینکنا ہے۔ تم میرے ساتھ چلو ہم تمہاری گاڑی میں لاش لے جا کے اُدھر پھینک دیں گے۔ اب بس بحث چھوڑو اور جلدی چلو۔ اس سے پہلے کہ لاش کوئی اور دیکھ لے۔“ وہ بہت بے تاب لگ رہا تھا۔

”اچھا میں کپڑے تو چینج کر لوں؟“

”ہاں کر لو مگر جلدی کرو پلیز۔“

وہ واش روم میں گھس گیا۔ انور کے ذہن میں ساری فلم چلنے لگی۔

☆☆☆

انور نے اکاؤنٹ آفس میں نوکری کی ہی اس لیے تھی کہ ادھر اوپر کی کمائی بہت تھی۔ اسے ابھی نوکری کرتے ایک دو سال ہی ہوئے تھے مگر اس نے رشوت لینے کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ اکاؤنٹ آفس میں اوپر سے نیچے تک تقریباً سارا ہی عملہ رشوت خور تھا۔ وہ اوپر والوں کو ان کا حصہ پہنچا دیتا تھا۔ اس لیے سب اس سے خوش تھے۔ آفس میں رشوت کھلے عام چلتی تھی اس لیے وہ کوئی خاص احتیاط بھی نہیں کرتے تھے۔ چند دن پہلے اس کے پاس ایک آدمی آیا۔ اس نے ایک غیر قانونی بل پاس کرانا تھا۔ اس نے بل کی آدھی رقم کی پیشکش اسے کی تو اس نے چند دن میں ہی بل پاس کرا دیا۔

وہ شخص اگلی بار آیا تو اس کا چیک انور کے پاس تھا۔ اس شخص نے اس کا شکریہ ادا کیا اور طے شدہ رقم اس کے حوالے کر دی۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ وہ ساری کارروائی کے دوران بالکل خاموش رہا تھا۔ انور رقم لے کر بہت خوش تھا۔ لیکن اس کی اس خوشی کا عرصہ تھوڑا ہی رہا۔

وہ شام کو اپنے آفس سے چھٹی کرنے ہی لگا تھا کہ اس کے نمبر پر ایک اجنبی نمبر سے کال آئی۔ اس شخص نے اسے اپنا نام ندیم بتایا۔ اور کہا کہ وہ ایک قریبی ریسٹورینٹ میں اس کا انتظار کر رہا ہے۔ انور نے اس سے کافی پوچھا کہ وہ کام بتائے مگر اس نے یہی کہا کہ کام بہت ضروری اور انور کے فائدے کا ہی ہے اور وہ ملنے پر ہی اسے بتائے گا۔

انور کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کئی لوگ اس سے آفس میں ملنے کے بجائے باہر ہی ڈیل کیا کرتے تھے۔ وہ اسے بھی کوئی متوقع ''گاہک'' ہی سمجھا۔ وہ خوشی خوشی ریسٹورینٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس شخص کو دیکھا تو جانا پہچانا سا لگا۔ مگر وہ اسے فوری طور پر یاد نہیں آسکا کہ اس نے اسے کہاں دیکھا ہے۔

وہ اسے ایک کیبن میں لے گیا۔ وہ اُدھر بیٹھے ہی تھے کہ ویٹر ان کے سر پر آکھڑا ہوا۔ اس نے انور سے پوچھے بغیر کولڈ ڈرنکس کا آرڈر کر دیا۔

ویٹر کے جانے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا۔ ''اپنے سیل کا بلیوٹوتھ تو آن کرو۔ میں تمہیں کوئی چیز بھیجنا چاہتا ہوں۔''

انور حیران تو ہوا مگر اس نے بلیوٹوتھ آن کر دیا۔ اس شخص نے اسے ایک ویڈیو سینڈ کی۔ وہ ویڈیو پلے کرنے والا تھا کہ ندیم بولا۔ ''ٹھہرو ویٹر کو آرڈر سرو کرنے دو اس کے بعد سکون سے ویڈیو دیکھنا۔''

ویٹر کے جانے کے بعد ندیم سکون سے بیٹھ کے کولڈ ڈرنک کی چسکیاں لینے لگا۔ انور نے ویڈیو پلے کی۔ جوں جوں وہ ویڈیو دیکھتا جا رہا تھا، اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے بڑھتے جا رہے تھے۔ ویڈیو دیکھنے کے بعد وہ بولا تو اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

''تمہارے کرتوتوں کا ثبوت۔'' وہ شخص سکون سے کولڈ ڈرنک کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔

ویڈیو میں دن کے وقت جب وہ اس شخص سے رشوت لے رہا تھا تو اس وقت کا سارا منظر محفوظ تھا۔ ویڈیو میں جو باتیں انہوں نے کی تھیں وہ واضح طور پر ریکارڈ تھیں۔ مگر ویڈیو میں چہرہ صرف اسی کا نظر آرہا تھا۔ یہ اس کے خلاف واضح ثبوت تھا۔ اب اس نے ندیم کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو دن کے وقت آنے والے شخص کے ساتھ آیا تھا۔ لیکن اس نے ویڈیو کیسے بنائی تھی، انور اس بات سے حیران تھا۔

''تم نے یہ ویڈیو کیسے بنائی؟'' اس نے پہلے اپنی یہی الجھن سلجھانے کی کوشش کی۔

''کیسے بنائی کو چھوڑو، کیوں بنائی یہ پوچھو۔'' اس کا اطمینان دیدنی تھا۔ وہ اس وقت انور کی حالت سے خوب لطف اٹھا رہا تھا۔

''اچھا یہی بتا دو کیوں بنائی؟'' اس نے اپنی پیشانی سے پسینہ خشک کیا۔

''تم یہ کولڈ ڈرنک تو ختم کرو۔'' ندیم نے کولڈ ڈرنک کی طرف اشارہ کیا۔

انور کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے کولڈ ڈرنک اٹھائی اور غٹا غٹ پینے لگا۔

ندیم سکون سے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

وہ کولڈ ڈرنک ختم کر چکا تو ندیم نے ایک کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

اس کارڈ سے لگ رہا تھا کہ ندیم ایک معروف نیوز چینل کا رپورٹر ہے۔

گویا ندیم صرف بلیک میلر نہیں بلکہ ''نیم چڑھا کریلا'' تھا۔ انور کی حالت جو کولڈ ڈرنک پی کر کچھ بہتر ہوئی تھی پھر سے پتلی ہو گئی۔

''کیا خیال ہے یہ ویڈیو چینل پہ چلا دی جائے؟'' اس نے اطمینان سے سوال کیا۔

"تو کیا تم مجھ سے پوچھ کے یہ چلاؤ گے؟" انور کو اس وقت کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"ظاہر ہے بھئی، تم سے پوچھ کر ہی چلانی ہے۔ اسی لیے تو تمہیں "زحمت" دی ہے۔" اس نے "زحمت" پر زور دیا۔

"میں تو ظاہر ہے یہی کہوں گا کہ یہ ویڈیو چینل پر کیا کسی کے سامنے بھی نہیں چلنی چاہیے۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"مشورہ تو تم نے بہت اچھا دیا ہے مگر وہ کیا ہے کہ میں مفت مشورہ نہیں لیتا۔ تمہیں اس مشورے کے ساتھ مشورہ فیس بھی دینی ہوگی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"کتنی فیس ہے تمہاری؟" انور نے ہمیشہ یہ سوال سنا ہی تھا۔ آج پہلی بار وہ یہ سوال کر رہا تھا تو اس کی جان جا رہی تھی۔

"جتنا بڑا مشورہ اتنی بڑی فیس۔" وہ پھر سکون سے بولا تھا۔

"پھر بھی کتنی فیس تم لو گے؟"

"بھئی تم نے اتنا بڑا مشورہ دیا ہے میرے خیال میں یہ مشورہ پانچ لاکھ کا تو ہوگا ہی۔"

پانچ لاکھ کا سن کے انور کی تو جان ہی نکل گئی' اتنی تو اس نے سال بھر میں شاید کمائی نہیں کی تھی۔

خیر کچھ دیر کی بحث و تمحیص کے بعد سودا تین لاکھ میں ڈن ہو گیا۔ انور نے پچاس ہزار تو اسے اسی وقت دے دیے تھے۔ یہ وہی پچاس ہزار تھے جو اس نے دن کے وقت وصول کیے تھے۔ باقی رقم کے لیے اس نے ندیم سے ایک ہفتے کا وقت لے لیا تھا۔

گھر جا کے اسے احساس ہوا کہ وہ بہت بری طرح پھنس گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ندیم اس سے ایک بار ہی رقم لے کے اسے چھوڑ دیتا وہ بعد میں بھی اسے پھر تنگ کر سکتا تھا۔ اس نے سوچ بچار کے بعد اس سے چھٹکارے کا منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے میں بھی اس کے اکثر منصوبوں کی طرح حسنات کا کندھا استعمال ہوتا تھا۔ اس بار بھی اس نے حسنات کے کندھے پر بندوق رکھ کر ہی چلانے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆☆☆

حسنات نے تھکن اتارنے کے لیے غسل کیا اور جینز اور ٹی شرٹ پہن کر باہر آ گیا۔ انور کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا گھر بیں پچیس منٹ کی ڈرائیو پر ہی تھا۔

راستے میں حسنات نے اس سے پوچھا۔ "تم میرے گھر کیسے آئے تھے۔"

"ٹیکسی سے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ وہ فکرمند لگ رہا تھا۔

"بائیک پہ کیوں نہیں آئے؟" حسنات نے اگلا سوال جڑا۔

"میری مرضی۔" وہ چڑ گیا تھا۔

حسنات نے کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔

حسنات اس کے گھر کم ہی آتا تھا۔ اس کے کمرے میں پہنچ کر اسے ایک عجیب سی مانوسیت کا سا احساس ہوا مگر وہ فوری طور پر اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ لاش کھڑکی کے آگے پڑی تھی۔ اس کا سر ایک سائڈ سے بری طرح کچلا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ادھر کوئی بھاری چیز ماری گئی ہو۔ مگر اس کے پاس ایسی کوئی چیز پڑی ہوئی نہیں تھی۔ اس کے سر سے خون نکل کے جم چکا تھا۔ حسنات نے قریب جا کے اس کی نبض چیک کی۔ حسنات کی توقع کے مطابق نبض رکی ہوئی تھی۔ اس کا جسم بالکل ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

انور کچھ فاصلے پر کھڑا بغور اس کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ وہ لاش کا معائنہ کر کے اس کی طرف مڑا تو انور جلدی سے بولا۔ "تم اسے اٹھا کے لے آؤ میں گاڑی کی ڈکی کھولتا ہوں۔ چابی مجھے دو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے حسنات کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

انور دبلی پتلی جسامت کا مالک تھا۔ وہ اکیلے لاش نہیں اٹھا سکتا تھا جبکہ حسنات کے لیے اکیلے لاش اٹھانا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ شخص بھی انور کی طرح کافی دبلا پتلا اور چھوٹے قد کا مالک ہی تھا۔ اس نے یہ سوچ کے چابی اسی کی طرف بڑھا دی اور خود لاش اٹھا کے باہر کی طرف چل پڑا۔

وہ لاش اٹھا کے باہر آیا تو ڈکی کھلی ہوئی تھی۔ انور کچھ دور کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے اکیلے لاش کو ڈکی میں ٹھونسا۔ اس دوران میں انور کچھ دور کھڑا تماشا ہی دیکھتا رہا۔ اس نے قریب آ کر اس کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی۔

گاڑی میں بیٹھ کے اسے انور کے والدین اور بہن کے متعلق پوچھنے کا خیال آیا۔

"وہ سب میرے ننھیال میں ایک شادی پر گئے ہوئے ہیں۔" حسنات کے استفسار پر انور نے اسے بتایا۔

"میں اکیلا تھا تبھی تو اس گھر بلا لیا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ میں اپنی شامت کو دعوت دے رہا ہوں۔"

"اچھا اب بتاؤ تو سہی یہ سب کیسے ہوا۔" وہ جب

گاڑی مین روڈ پر سے آیا تو اس نے انور سے سوال کیا۔

''یہ کافی عرصے سے میری بہن نوشی کے پیچھے پڑا تھا۔ اس نے رشتہ بھیجا مگر امی نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد بھی یہ اسے کالج جاتے ہوئے تنگ کرتا رہا ہے۔ نوشی نے اس کے متعلق مجھے سب بتا دیا تھا۔ تم جانتے ہو میں لڑنے بھڑنے والا آدمی تو ہوں نہیں۔ میں نے اس سے بات کر کے سمجھانے کا فیصلہ کیا۔ آج میں جب گھر آیا تو یہ ہماری گلی میں ہی کھڑا تھا۔ وہ شاید نوشی کو تنگ کرنے کے لیے ہی ادھر آیا تھا۔ مگر اس کی وجہ سے نوشی کو میں نے اپنی خالہ کے گھر شفٹ کر دیا ہے۔ کچھ عرصہ وہ وہیں رہے گی۔

میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اسے اندر لے گیا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ الٹا مجھے دھمکیاں دینے لگا کہ ہم نے اسے رشتہ نہ دیا تو یہ ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔

مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اسے پکڑ کے باہر نکالنے کی کوشش کی تو وہ مجھ سے لڑنے لگ گیا۔ میں نے اسے دھکا دیا تو وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ وہ اٹھ کے پھر میری طرف لپکا تو میں نے قریب رکھا ایک بڑا سا گلدان اس کے سر میں دے مارا۔ وہ ادھر ہی پٹ سے گر گیا۔

میں گھبرا گیا۔ کافی دیر جب اس نے کوئی حرکت نہیں کی تو میں نے اس کی نبض چیک کی، وہ مر چکا تھا۔ میں پریشان ہو گیا۔ گلدان کے ٹکڑے میں باہر پھینک آیا۔ اب مسئلہ لاش کو ٹھکانے لگانے کا تھا اور یہ میرے اکیلے کے بس کی بات نہیں تھی سو تمہیں بلا لیا۔'' اس نے سچ اور جھوٹ کو مکس کر کے بڑی خوبصورت اسٹوری تیار کی تھی۔ مگر حسنات کو ساری ہی کہانی سچ لگی۔ وہ اس پر اعتماد بھی اتنا کرتا تھا۔

''اسے تمہارے ساتھ اندر جاتے ہوئے تو کسی نے نہیں دیکھا تھا'' ساری روداد سننے کے بعد حسنات نے اس سے سوال کیا۔

''نہیں۔ میں جب اسے اندر لے کے جا رہا تھا تو میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔ کوئی بھی شخص اس وقت ہماری گلی میں نہیں تھا۔''

''ہمم۔'' اس نے ہنکارا بھرا۔

''اب کیا کرنا ہے؟''

''چلو میں تمہیں گائیڈ کرتا ہوں۔'' اس کا جواب سن کے حسنات نے کندھے اچکا کے رہ گیا۔

وہ کچھ ہی دیر میں مطلوبہ مقام پر پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک ویران علاقہ تھا۔ اس علاقے میں ایک نالا بہہ رہا تھا۔

انور نے اُدھر گاڑی رکوائی اور حسنات کو بتانے لگا کہ اس کو کہاں سے لاش نالے میں پھینکنی ہے۔

حسنات نے لاش کار کی ڈگی سے نکالی اور انور کی بتائی ہوئی جگہ سے اسے نالے میں پھینک دیا۔ چھپاک کی آواز آئی اور چند لمحوں میں ہی لاش پانی کی سطح سے غائب ہو گئی۔ یہ دلدلی سا نالا تھا۔ لاش کے واپس باہر آنے کے چانس کم ہی تھے۔ اس دوران انور نے ٹارچ لائٹ جلائے رکھی تھی تاکہ حسنات کو راستہ دیکھنے میں آسانی رہے۔

واپسی پر وہ دونوں پُرسکون لگ رہے تھے۔ دونوں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔

☆☆☆

حسنات گھر پہنچا تو اس کے پیٹ میں بھوک کے باعث چوہے دوڑ رہے تھے۔ اس کے گھر والے اس وقت گھر میں ہی تھے۔ اس نے کھانا کھایا اور لیٹ گیا مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ لاش پھینکتے وقت اتنا نہیں ڈرا تھا مگر اب وہ خوف کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھ جوں ہی لگتی اسے خوفناک خواب آنے لگتے۔ کبھی وہ خود کو پھانسی کے پھندے سے لٹکا دیکھتا تو کبھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے۔ اسی طرح سوتی جاگتی کیفیت میں رات کٹ گئی۔ صبح اس کے سر میں شدید درد تھا۔ اس نے بینک سے چھٹی کر لی۔

پین کلر کھا کے وہ لیٹا تو اس بار اس کی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو بارہ بجنے والے تھے۔ اس کی حالت اب کافی بہتر تھی۔

اس نے ٹی وی آن کیا تو ٹی وی پر نیوز کی پٹی دیکھ کے وہ اچھل پڑا۔

''نالے سے ''ایکس'' ٹی وی کے رپورٹر کی لاش برآمد۔ ندیم کو سر پر بھاری چیز مار کے قتل کیا گیا۔ پولیس کی تفتیش جاری۔ سنسنی خیز حقائق متوقع۔ لاش صبح صبح ایک گوالے نے برآمد کی تھی۔ وہ نالا کراس کر رہا تھا کہ اس کی نظر پانی سے جھانکتی لاش پر پڑی۔ اس نے اسی وقت پولیس کو انفارم کر دیا تھا۔ حسنات کے سر میں ایک بار پھر سے درد شروع ہو گیا۔ اچانک اسے کال بیل کی آواز سنائی دی۔ اس نے کھڑکی پر پڑا پردہ سرکا کے نیچے جھانکا۔ باہر پولیس کھڑی تھی۔

☆☆☆

آج اسے حوالات میں دوسرا دن تھا۔ پولیس کو اس کے خلاف ناقابل تردید ثبوت ملے تھے۔ یہ ثبوت تصویروں کی شکل میں تھے۔ لاش کا معائنہ کرتے ہوئے۔ لاش کو ڈگی

میں رکھتے اور نکالتے ہوئے، لاش نالے میں پھینکتے ہوئے۔ ہر منظر تصاویر میں مقید تھا۔ یہ تصاویر انور کے سوا کوئی نہیں بنا سکتا تھا۔ پولیس اس کے کمرے کا معائنہ بھی کر گئی تھی۔ جن تصاویر میں وہ لاش کا معائنہ کر رہا تھا ان کے بیک گراؤنڈ میں کھڑکی پر لگا پردہ اور دیوار کا تھوڑا سا منظر نظر آرہا تھا۔ دیوار پر پینٹ اور کھڑکی میں لگے پردوں کا رنگ بالکل وہی تھا جیسے اس کے کمرے کی دیواروں اور کھڑکیوں پر لگے پردوں کا تھا۔ اب حسنات کو یاد آرہا تھا کہ انور کے کمرے میں جا کر اسے کچھ مانوسیت کا احساس کیوں ہو رہا تھا۔

انور نے اسے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پھنسایا تھا۔ حسنات شدید دکھ کی کیفیت سے دوچار تھا۔ اس نے انور کے لیے کیا کیا نہیں کیا تھا مگر وہ آستین کا سانپ نکلا۔ وہ ساری زندگی اسے استعمال کرتا رہا اور حسنات اپنی حماقت کی بدولت ہمیشہ اس کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا۔ اب اسے اپنے والدین اور دوستوں کی انور کے بارے میں رائے یاد آرہی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

پولیس کو لاش دریافت ہونے کے کچھ دیر بعد ہی ایک لفافہ ملا تھا جو گیٹ کے باہر سے اندر پھینکا گیا تھا۔ لفافے میں تصاویر کے علاوہ ایک پرنٹ شدہ کاغذ بھی تھا جس میں قاتل کا نام و پتے کے علاوہ قتل کی وجہ بھی لکھی گئی تھی۔ پولیس کو تو پکی پکائی دیگ مل گئی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے حسنات کے گھر پہنچے اور اسے گرفتار کر لیا۔ انہوں نے باقی جو تھوڑی بہت تفتیش کی، وہ بھی حسنات کے خلاف ہی جا رہی تھی۔

پولیس کو تصاویر کے ساتھ جو خط ملا، اس میں لکھا تھا کہ حسنات بینک کے اکاؤنٹس میں گڑبڑ کر رہا تھا جس کا علم ندیم کو ہو گیا۔ ندیم نے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی اس لیے حسنات نے اسے قتل کر دیا تھا۔ پولیس نے تفتیش کی تو .... بینک انتظامیہ کی مدد سے وہ اکاؤنٹس میں گھپلوں کا سراغ لگانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ گو کہ وہ رقم اتنی بڑی نہیں تھی جو حسنات جیسے شخص کے لیے زیادہ معنی رکھتی ہو مگر پولیس نے زیادہ باریکی میں جانا پسند ہی نہیں کیا۔

حسنات کا موبائل پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے سیل میں ندیم کے سیل سے کچھ میسیجز بھی کیے گئے تھے۔ جن میں لکھا تھا کہ میں تمہارے گیٹ پر پہنچ گیا ہوں۔ دروازہ کھولو۔ رقم تمہارے پاس ہے نا؟ اگر پانچ لاکھ سے ایک پائی بھی کم ہوئی تو میں تمہارے گھپلوں کے بارے میں بینک انتظامیہ کو بتا دوں گا۔

ان میسیجز پر وہی وقت درج تھا جس وقت ندیم قتل ہوا تھا۔

حسنات کو آج ہی یہ سب پتا چلا تھا۔ اسے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ سب انور کی کارستانی ہے مگر اس نے ویڈیو کیسے بنائی؟ ندیم کے سیل سے اسے میسیجز کیسے کیے کہ اس کی نظر ہی نہ پڑ سکی۔ ان پر وہی وقت درج تھا جس وقت وہ آفس سے گھر واپس آرہا تھا۔ سونے سے پہلے وہ اپنے سیل پہ تمام نوٹیفکیشنز چیک کر کے سویا تھا مگر ان میسیجز کی اسے کوئی نوٹیفکیشن نہیں ملی تھی۔ اس کے سیل میں ندیم کا نام بھی ندیم بلیک میلر کے نام سے سیو تھا۔ وہ نام کس نے اور کب سیو کیا تھا، ان سب سوالوں کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

اس کے علم میں جب یہ سب آیا تو اس کا دل غم سے پھٹنے لگا۔ اس کے بہترین دوست انور نے اس کے ساتھ یہ سب کیا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ ”میں نے اس پر اتنے احسان کیے ہیں۔ جب بھی اس کو میری مدد کی ضرورت پڑی، میں نے آؤٹ آف وے جا کر بھی اس کی مدد کی۔ وہ بھی کیا یاد کرے گا کہ اس کا کیسے دوست سے پالا پڑا تھا۔ اس بار وہ زندگی کی سب سے بڑی مصیبت کا شکار ہوا ہے، میں آخری بار اس کے لیے زندگی کا نذرانہ ہی پیش کر دیتا ہوں۔“

وہ عام زندگی میں تو بہت پریکٹیکل تھا مگر انور سے دوستی کے معاملے میں ہمیشہ ایسے ہی جذباتی انداز میں سوچا کرتا تھا۔ اس بار بھی اس نے جذبات میں آ کر قتل کا اعتراف کر لیا۔ اب پولیس اس کے خلاف چالان تیار کر رہی تھی۔

پولیس نے اس شخص کے متعلق کوئی تفتیش نہیں کی جس نے تصاویر بنائی تھیں اور پولیس تک پہنچائی تھیں۔ حالانکہ ان سے صاف پتا لگ رہا تھا کہ قتل میں حسنات کے سوا بھی کوئی شخص ملوث ہے جس نے تصاویر بنائیں اور اب وہ حسنات کو پھنسا رہا ہے۔ انہیں بیٹھے بٹھائے قاتل مل گیا تھا اور اس نے بغیر کسی دباؤ کے قتل کا اعتراف بھی کر لیا تھا تو انہیں مزید کسی جھنجھٹ میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

☆☆☆

انور کو شروع میں بہت دھڑکا لگا تھا مگر اب وہ قدرے پُرسکون تھا۔ پولیس نے اس کی توقع کے مطابق زیادہ باریکی سے تفتیش نہیں کی تھی۔ اس پولیس اسٹیشن کے لوگ بھی اسی اکاؤنٹ آفس سے تنخواہ لیتے تھے جس میں وہ کلرک تھا۔ وہ

ان میں سے اکثر کو جانتا تھا۔ ان میں سے ایک پولیس والے کے ذریعے ہی پتا چلا تھا کہ حسنات نے قتل کا اعتراف کر لیا تھا۔ اسے اس کے اعتراف سے بہت حیرانی کے ساتھ بے پناہ خوشی بھی ہوئی تھی۔

’’میں نے منصوبہ ہی اتنا شاندار بنایا تھا کہ اس کے پاس اعتراف کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں بچا تھا۔‘‘ اس نے مغرورانہ انداز میں سوچا۔

انور نے ندیم سے چھٹکارے کا منصوبہ بڑی باریک بینی سے بنایا تھا۔ اسے اس مسئلے کا ایک ہی حل نظر آ رہا تھا کہ ندیم کا کانٹا اس کی راہ سے ہمیشہ کے لیے ہٹ جائے اور پولیس کو فوراً قاتل مل جائے تاکہ وہ مزید تفتیش نہ کر سکے۔ کیونکہ پولیس اگر تفتیش کرتی تو اس کی ویڈیو پولیس کے ہاتھ لگ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے اس شخص کی طرف سے بھی خطرہ تھا جو ندیم کے ساتھ بل بنوانے آیا تھا۔ وہ یقیناً اس کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ ندیم قتل ہو جاتا تو وہ اس کے متعلق پولیس کو بتا سکتا تھا۔ قربانی کے بکرے کے طور پر اس کے ذہن میں صرف حسنات کا نام ہی آیا جو اس کا کبھی بھی نانا نہیں تھا۔

وہ اس رات ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک کمرشل پر پڑی۔ اس میں ایک پین نما اسپائی کیمرے کی خصوصیات بتائی جا رہی تھیں۔ اسے یاد آیا کہ ندیم جب اس شخص کے ساتھ اسے ملا تھا۔ اس کی جیب میں ایسا ہی پین لگا تھا۔ ٹی وی پر کیمرے کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ بار بار نمبر بھی دیے جا رہے تھے۔ جن پر رابطہ کر کے خواہش مند حضرات ہوم ڈلیوری کا آرڈر کر سکتے تھے۔ اس نے فون کر کے کیمرے کا آرڈر کر دیا۔ تین گھنٹے میں ہی کیمرا اس کی دسترس میں آ چکا تھا۔

اس نے اپنے ڈرائنگ روم کی دیواروں کا رنگ ویسا ہی کر دیا جیسا حسنات کے کمرے کا رنگ تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کھڑکی میں لگے پردے بھی تبدیل کرائے۔ یہ پردے بھی بالکل ویسے ہی تھے جیسے حسنات کے کمرے میں کھڑکیوں پر لگے تھے۔ ندیم کے قتل سے ایک دن قبل اس نے موقع نکال کے حسنات کے سیل میں ندیم کا نمبر ندیم بلیک میلر کے نام سے سیو کر کے اسے بلیک لسٹ کر دیا۔

اس نے اپنے ایک دوست کو حسنات سے سفارش کرا کے اسے اس کے بینک میں کیشئر لگوایا تھا۔ وہ بھی اسی کی قماش کا آدمی تھا۔ انور نے اسے اکاؤنٹس میں گڑبڑ کے طریقے بتائے۔ حسنات کے پکڑے جانے کے بعد وہ ان گھپلوں کا ذمے دار حسنات کو ٹھہرا سکتا تھا اور یہ قتل کا محرک بھی بن سکتا تھا۔ اب اس کا منصوبہ تیار تھا بس اس پر عمل درآمد کا مشکل مرحلہ باقی تھا۔

اگلے دن اس کے گھر والوں کو ایک شادی پر جانا تھا۔ اس نے ندیم کو پیمنٹ کے بہانے اپنے گھر پر ہی بلا لیا۔ وہ صوفے پر بیٹھا تھا کہ اچانک انور نے اس کے سر پر ایک بھاری گلدان دے مارا۔ وہ ادھر ہی لڑھک گیا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا۔ گلدان ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے لوہے کی ایک بھاری راڈ سے اس کے سر پر دو تین زوردار وار کیے۔ اس کی کھوپڑی پچک کر رہ گئی مگر اس سے زیادہ خون نہیں نکلا تھا۔ یہ بات اس کے حق میں جا رہی تھی۔

اس کے بعد اس نے ندیم کے موبائل سے حسنات کے نمبر پر میسج بھیجے۔ اب حسنات سے مدد لینے کا وقت آ گیا تھا۔

اس نے وتوبے کو اپنی مرضی کا رنگ دیا اور حسنات کو کال کرنے لگا مگر کافی دیر کی کوشش کے بعد بھی اس نے کال ریسیو نہیں کی تو وہ پریشان ہو گیا۔

اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی خوش قسمتی کہ وہ نہ صرف اسے گھر پر ہی مل گیا بلکہ اس کے ساتھ چلنے پر تیار بھی ہو گیا۔ وہ کیمرے کا استعمال اچھی طرح سیکھ چکا تھا۔ اس نے اس کے اپنے گھر آنے کے بعد ساری ویڈیو بنا لی۔ راستے میں اس نے حسنات سے اس کا سیل لے کر ندیم کے نمبر سے بھیجے جانے والے میسج بھی دوبارہ ’’ری اسٹور‘‘ کر دیے تھے۔ اب کوئی بھی وہ میسج اس کے میسج ایپ میں پڑھ سکتا تھا۔

ویڈیو میں ان کی باتیں بھی محفوظ ہو گئی تھیں اس لیے اس نے ویڈیو میں سے اپنی مرضی کی تصاویر نکال لیں۔ اس کے کمپیوٹر کورس اس کے کام آ رہے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ اگر لاش دریافت ہو گئی یا اس کے غیاب کے بعد پولیس نے اس کے بارے میں تفتیش شروع کر دی تو وہ، تصاویر پولیس کو بھیج دے گا۔ کیونکہ پولیس باریک بینی سے تفتیش کرتی تو اس کی ویڈیو پولیس کے ہاتھ لگ سکتی تھی۔ ندیم کا سیل اس کے پاس تھا جس میں اس کی ویڈیو محفوظ تھی۔ مگر یہ بات یقینی تھی کہ ویڈیو اس نے مزید بھی کسی جگہ پر محفوظ کی ہوگی۔ سیل اس نے آف کر کے اس میں سے اس کی سم نکال لی تھی۔ سیل اس نے ری سیٹ کر کے اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا۔ اس نے پولیس کے لیے ایک ٹائپ شدہ خط بھی تیار کر دیا تھا جس میں ندیم کے قتل کی وجہ بیان کی گئی تھی۔

خلاف توقع لاش صبح ہی مل گئی۔ اس نے ایک

ہیروئنچی کو پانچ سو روپے دے کر بارود والا پیکٹ تھانے کی عمارت کے اندر پھینکنے کا کہا۔ وہ بخوشی تیار ہو گیا۔ پانچ سو روپے کے لیے تو وہ تھانے کی عمارت کے اندر بم پھینکنے کے لیے بھی تیار ہو جاتا۔ یہ تو صرف ایک پیکٹ تھا۔

پولیس نے لفافہ ملنے کے کچھ دیر بعد ہی حسنات کو گرفتار کرلیا۔ اب وہ ڈر رہا تھا کہ یہ نہ ہو حسنات کے خلاف سارے ثبوتوں کے باوجود وہ جب پولیس کو اس کے بارے میں بتائے تو وہ اسے بھی دھر لے۔ ایسے وقت میں اس نے پولیس والوں سے جان پہچان کا پتا سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔ اس نے پولیس والوں سے کبھی رشوت نہیں لی تھی اور ان کے بل فوراً پاس کرادیا کرتا تھا۔ اسے امید تھی کہ پولیس والے اس سے تعاون کریں گے۔ اگر وہ مفت میں تعاون نہ کرتے تو وہ ''خرچہ'' کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔

یہ تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ حسنات اس کا نام تک نہیں لے گا اور خاموشی سے قتل کا اعتراف کرلے گا۔ وہ اس کی حماقت پر قہقہے لگانے لگا۔ وہ اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

☆☆☆

حسنات سے اس کے والدین ملنے آئے تھے۔ ان کے ساتھ فرحین بھی تھی۔ وہ اس کے اعترافِ جرم کا سن کے سخت پریشان تھے۔

''تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟'' اس کے والد صاحب کے لہجے میں غصہ تھا۔ جواب میں حسنات خاموش رہا۔ وہ کافی دیر تک اس سے اس واقعے کے بارے میں پوچھتے رہے مگر وہ کچھ بول کے ہی نہیں دیا۔ آخر کار وہ تنگ آکر باہر چلے گئے۔ اس کی والدہ رو رہی تھیں مگر اس کے احساسات منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ ابھی تک شاک کی کیفیت میں لگ رہا تھا۔ اس کے والدین تو باہر چلے گئے مگر فرحین ادھر ہی رک گئی۔ وہ اس سے بولی۔

''میں جانتی ہوں کہ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تمہاری کوئی مجبوری ہے جس کے تحت تم نے اعترافِ جرم کیا ہے۔ پلیز مجھے تو بتادو کہ آخر تمہیں ایسی کیا مجبوری ہے؟''

وہ جواب میں بس اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔

''دیکھو تمہاری زندگی صرف تمہاری نہیں ہے، اس کے ساتھ اور بھی بہت ساری زندگیاں منسلک ہیں...... تمہیں اپنی پروا نہیں تو ہم سب کے لیے ہی مجھے حقیقت بتادو۔ ہو سکتا ہے ہم تمہارے لیے کچھ کرسکیں۔ تم نے آنٹی کی حالت دیکھی ہے۔ انہوں نے دو دن سے نہ کچھ کھایا ہے اور نہ سوئی ہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

حسنات کی آنکھوں میں تکلیف کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اتنی دیر میں پہلی بار اس کے چہرے پر کوئی تاثر ابھرا تھا۔

اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ انور جیسے خودغرض شخص کے لیے سوچتا رہا ہے مگر اتنی دیر میں اسے اپنے پیاروں کا خیال کیوں نہیں آیا۔

''میرے لیے اب کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میں بہت بری طرح سے پھنس گیا ہوں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ اس کے لہجے میں چھپی مایوسی کو محسوس کر کے فرحین کا دل کٹ گیا۔

''تم ہمیں حقیقت بتاؤ گے تو ہم کچھ کر سکیں گے نا؟''

حسنات کے چہرے پر اب کشمکش کے تاثرات تھے۔

''ہم بڑی مشکل سے تم سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انکل نے تھانے دار کو دس ہزار رشوت دی تو وہ ہمیں تم سے ملاقات کرانے پر رضامند ہوا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ انکل اس معاملے میں کتنے اصول پرست ہیں۔ انہوں نے تمہاری خاطر اپنے اصول توڑے مگر تم کچھ بول رہے ہی نہیں ہو۔'' فرحین کافی حد تک مایوس ہو چکی تھی۔

آخرکار حسنات کے احساسات پر جمی برف پگھلنے لگی۔ ''یہ قتل انور نے کیا ہے۔ اس نے مجھے پھنسانے کے لیے بڑا مضبوط جال بچھایا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں اس سے نکل سکوں گا۔'' اس نے انتہائی کرب سے بولا۔

فرحین کے چہرے پر امید کی کرن پھیلی۔ ''تم مجھے سب تفصیل سے بتاؤ مگر پلیز جلدی بتانا۔ ابھی کوئی پولیس والا ملاقات کا وقت ختم ہونے کا اعلان کرنے کے لیے آجائے گا۔'' وہ بے تابی سے بولی۔

حسنات نے رک رک کے اسے ساری رام کتھا بیان کردی۔ ساری کہانی سن کے فرحین کے چہرے پر بھی مایوسی پھیل گئی تھی۔ اتنی دیر میں پولیس والا دو بار ملاقات ختم ہونے کا اعلان کر چکا تھا۔ وہ ایک الگ کمرے میں بیٹھے تھے۔ یہ سارا ''پروٹوکول'' انہیں دس ہزار کی رشوت کی وجہ سے ملا تھا۔

فرحین اٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم فکر نہ کرو انشاء اللہ تم اس مصیبت سے نکل آؤ گے۔ ابھی انکل ایک وکیل کو بھی

ساتھ لا رہے تھے کہ اسے اچانک کوئی ایمرجنسی پیش آگئی۔ ہم اس سے مشورہ کریں گے۔"

حسنات نے سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر اب امید اور مایوسی کی ملی جلی کیفیت تھی۔

☆☆☆

فرحین، حسنات کے والدین کے ساتھ اسی شام وکیل سے ملی۔ اشتیاق احمد عموماً قتل کے کیسز ہی لیتے تھے اور ان کی شہرت بھی کافی اچھی تھی۔ وہ پچپن برس کے ہو چکے تھے۔ وکلا برادری میں ان کی بہت عزت تھی۔ اس نے اشتیاق احمد کو ساری کہانی بیان کر دی۔ سن کے ان کے چہرے پر گمبھیرتا چھا گئی۔

وہ کچھ دیر سوچ میں گم رہنے کے بعد گویا ہوئے۔ "دیکھیں جی حسنات کے خلاف کیس بہت مضبوط ہے مگر اچھی بات یہ ہے کہ اس کیس میں کچھ ایسے پہلو ہیں جس سے اسے شک کا فائدہ مل سکتا ہے۔"

وہ سب غور سے اس کی بات سن رہے تھے۔ "وہ کیا؟" فرحین بیتابی سے بولی۔

"سب سے پہلی بات تو یہ کہ وہ تصاویر کس نے بنائیں؟ پولیس اس سوال کا جواب نہیں دے سکے گی۔ یہ بات حسنات کے حق میں جا سکتی ہے۔"

"حسنات کو پتا ہی نہیں چلا۔ حیرت ہے۔" حسنات کے والد بولے، مگر ان کے لہجے میں حیرت سے زیادہ جھنجلاہٹ تھی۔

"ہاں یہ بات کافی بعید از قیاس لگتی ہے۔ اس کے لیے وہ تصاویر دیکھنا پڑیں گی۔ پھر ہی ہم کچھ کہہ سکیں گے۔" اشتیاق احمد بولا۔

"چلیں میں خود حسنات سے مل لیتا ہوں اور پولیس سے سارے کیس کی فائل نکلوانے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ اس کے خلاف ثبوتوں کی تفصیل جان کر ہی ان کا توڑ کیا جا سکتا ہے۔"

کچھ دیر کی مزید گپ شپ کے بعد وہ وہاں سے اٹھ گئے۔ اُن کے چہروں پر امید و بیم کی کیفیت تھی۔

☆☆☆

اگلے دن اشتیاق احمد، حسنات سے ملا۔ اس سے پہلے وہ نہ صرف تصاویر دیکھ چکا تھا بلکہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی پڑھ چکا تھا۔ یہ سب چیزیں حاصل کرنے کے لیے انہیں کچھ "خاص" قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرنا پڑے تھے۔ تصویروں کے متعلق استفسار پر وہ بولا۔ "میرا نہیں خیال کہ اس نے وہ تصاویر ہاتھ سے بنائی ہیں۔ وہ ایسا کرتا تو میری نظر اس پر ضرور پڑتی۔ میرے خیال میں اس نے اس مقصد کے لیے...... کوئی خفیہ کیمرا استعمال کیا ہے۔ ہاں یاد آیا......" یہ کہتے ہوئے اچانک وہ جوش سے بولا۔

"اس کی سامنے والی پاکٹ پر ایک قدرے موٹا سا پین لگا ہوا تھا جبکہ اسے اس طرح سامنے پین لگانے سے سخت چڑ تھی۔ وہ پین کے بجائے یقیناً کوئی اسپائی کیمرا ہو گا۔ میں اس قسم کے کیمرے کے اشتہارات ٹی وی پر چلتے ہوئے بھی دیکھ چکا ہوں۔ اس نے اس کیمرے سے تصاویر کے بجائے پوری ویڈیو بنائی ہو گی۔ اور بعد میں اپنی مرضی کی تصاویر نکال کے پولیس تک پہنچا دی ہوں گی۔" اس کی آواز جوش سے لرز رہی تھی۔

"ہم......" اشتیاق احمد نے ہنکارا بھرا۔ "بات تو تمہاری ٹھیک لگ رہی ہے۔"

"اگر وہ ویڈیو کسی طرح مل جائے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس نے میرے سامنے قتل کا اعتراف کیا تھا، وہ بھی شاید ریکارڈ ہو گیا ہو۔" آخری جملہ بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں امید کے دیے جل بجھ رہے تھے۔

"تمہارا کیا خیال ہے، وہ ویڈیو اس نے کہاں رکھی ہو گی؟"

اس کے پاس ایک ہی کمپیوٹر ہے جو اس کے کمرے میں رکھا رہتا ہے۔ اس کا پاس ورڈ بھی مجھے معلوم ہے۔ وہ یقیناً اسی میں ہو گی۔ اگر اس نے ڈیلیٹ نہ کر دی ہو تو؟" اس بار بھی آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جلتی امید کا دیا مدھم پڑ گیا تھا۔

"اس کے کمپیوٹر تک کس کی رسائی ہو سکتی ہے؟"

"میرے خیال میں یہ کام فرحین کر سکتی ہے۔ انور کی مدر کے ساتھ اس کے کافی اچھے تعلقات ہیں، وہ ان کی اسٹوڈنٹ بھی رہ چکی ہے اور کئی بار ان کے گھر بھی جا چکی ہے۔ وہ کسی بہانے سے جب انور گھر پر نہ ہو تو اس کا کمپیوٹر استعمال کر سکتی ہے۔ آنٹی کو کمپیوٹر کی الف ب بھی نہیں آتی۔ انہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ اس نے کیا کیا ہے؟ انور کی بہن اپنی خالہ کے گھر شفٹ ہو گئی ہے۔ اس لیے میرے خیال میں یہ کام اس کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہو گا۔ وہ ویسے بھی ... کمپیوٹر میں ماسٹرز کر رہی ہے۔" یہ سب کہتے ہوئے پہلی بار فرحین کے لیے اسے اپنے دل میں محبت محسوس ہو رہی تھی۔

"کیا وہ یہ سب کرنے پر تیار ہو جائے گی؟" اشتیاق احمد نے سوال کیا۔

"ہاں...... وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے اور میرے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔" اس کے لہجے میں اعتماد بول رہا تھا۔

"ٹھیک ہے میں اس سے بات کرتا ہوں۔ وش یو بیسٹ آف لک۔" اس نے اس کی کمر تھپکی۔ "میں اب چلتا ہوں۔"

"تھینکس سر۔" اس کے لہجے میں شکرگزاری تھی۔

اشتیاق احمد نے اس سے ہاتھ ملایا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وکالت نامے پر وہ اس سے دستخط پہلے ہی لے چکا تھا۔

☆☆☆

فرحین سارا آئیڈیا سن کے اچھل پڑی تھی۔ وہ فطرتاً کافی مہم جو قسم کی لڑکی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی ذات سے حسنات کو کوئی فائدہ پہنچتا تو شاید اس کے دل میں اس کے لیے محبت پیدا ہو جاتی۔ یہ سب سوچتے ہوئے وہ فوراً تیار ہو گئی۔

اشتیاق احمد نے حسنات کے والد کو فون کر کے اپنے آفس بلا لیا اس نے فرحین کو بھی ساتھ لانے کی تاکید کی تھی۔

حسنات کے والد کو تو یہ سب عجیب لگ رہا تھا مگر بیٹے کی محبت میں وہ بھی تیار ہو گئے تھے۔

"بیٹا تم احتیاط سے یہ کام کرنا۔ انور ایک قتل کر چکا ہے اس کو اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو تمہاری جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔" وہ فکرمندی سے بولے۔

"انکل آپ فکر ہی نہ کریں میں ایسے وقت جاؤں گی جب انور گھر پر ہی نہیں ہوگا۔ ویڈیو اگر مجھے مل گئی تو وہ فوراً میں اشتیاق صاحب کے حوالے کر دوں گی۔ اس کے بعد اسے پتا لگ بھی جائے تو وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔" وہ جوش سے بولی تھی۔

"پھر بھی بیٹا مجھے تمہاری بہت فکر ہے۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو میرا ضمیر ساری زندگی مجھے ملامت کرتا رہے گا کہ بیٹے کو بچاتے ہوئے میں نے اپنی بیٹی کی جان خطرے میں ڈال دی۔"

"انکل وہ صرف آپ کا بیٹا نہیں میرا بھی اس سے کوئی تعلق ہے۔ آج اگر وہ مصیبت میں ہے تو اس کی مدد کرنا میرا فرض بنتا ہے۔" فرحین نے نظریں جھکا کر جواب دیا تھا۔

اب وہ بے چینی سے اگلے دن کا انتظار کر رہی تھی۔

انور کی ماں ایک اسکول میں ٹیچنگ کرتی تھی۔ وہ دو بجے تک گھر آ جاتی تھی۔ وہ جب گھر آئی تو فرحین ان کے گیٹ پر ہی کھڑی تھی۔

وہ انہیں دیکھتے ہی اُن کے گلے لگ گئی۔ "اوہ میڈم میں کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔" وہ اپنی بیتابی چھپا نہیں سکی۔

وہ حیرت سے بولی۔ "کیوں خیریت ہے نا؟" یہ کہتے ہوئے وہ اندر کی طرف بڑھیں۔

"جی جی خیریت ہے۔ اندر چل کر بات کرتے ہیں نا۔" وہ اپنے انداز میں خوش دلی پیدا کرتے ہوئے بولی۔

اندر پہنچ کر وہ لاؤنج میں بچھے صوفوں پر بیٹھ گئیں تو انور کی ماں بولی۔ "اب بتاؤ اتنی بے چینی سے میرا انتظار کیوں ہو رہا تھا؟"

"ایسے ہی کافی دن سے آپ سے بات نہیں ہوئی تھی تو سوچا آپ سے مل لوں۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے سیل فون بیگ سے نکالا اور اس پر کچھ کرنے لگی۔

انور کی ماں جواب میں کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "اوہ میڈم آپ کے گھر میں کمپیوٹر ہو گا۔ مجھے ایک بہت ضروری میل فوراً چیک کرنی ہے۔" فرحین اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق چل رہی تھی۔

"ہاں وہ انور کے کمرے میں رکھا ہے۔ آؤ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اندر کی طرف بڑھی۔ فرحین بھی دھڑکتے دل کی ساتھ ان کے ساتھ ہو لی۔

کمرے میں پہنچ کر انہوں نے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہے، مجھے تو یہ چلانا نہیں آتا تم خود ہی دیکھ لو میں جب تک تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اوہ میڈم بہت شکریہ۔" اس کے لہجے میں حقیقی ممنونیت تھی۔

وہ باہر چلی گئی تو فرحین نے کمپیوٹر کا آن کا بٹن دبایا۔ اس سے پہلے وہ ایکسٹینشن کا تار قریب ہی لگے ساکٹ میں لگا چکی تھی۔

کمپیوٹر آن ہو گیا تو وہ بے تابی سے ونڈو اسٹارٹ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے جلدی سے پاس ورڈ انٹر کیا۔ جو اشتیاق احمد نے اسے بتایا تھا مگر یہ کیا۔ اسکرین پر "رونگ پاس ورڈ" کا کھلا ڈائیلاگ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس نے کیپس لاک کا بٹن چیک کیا مگر وہ آف تھا۔ اس نے پاس ورڈ دوبارہ انٹر کیا۔ مگر اس بار بھی "رونگ پاس ورڈ" کا

میسج نمودار ہوگیا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ نمودار ہوگیا۔

اس نے ایک دو بار اندازے سے پاسورڈ میں معمولی ترمیم کے ساتھ پھر کوشش کی مگر اس بار بھی وہی نتیجہ نکلا تھا۔ انور نے پاسورڈ شاید چینج کرلیا تھا۔

اس کے پاس وقت کم تھا۔ اس نے سی پی یو کا کور ہٹایا اور اس میں سے ہارڈ ڈسک نکال لی۔ اس لمحے دروازے پر انور کی ماں نمودار ہوئی اس کے ہاتھوں میں چائے اور آنکھوں میں الجھن تھی۔

☆☆☆

انور آفس میں تھا۔ آج صبح سے ہی اس کے آدھے سر میں شدید درد تھا۔ وہ صبح سے تین چار بار سر درد کی گولی لے چکا تھا مگر اسے کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ دو بجے تک اس نے کام کیا مگر اب مزید کام کرنا اسے مشکل لگ رہا تھا۔ اس نے ایک ساتھی کلرک کو بتایا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے وہ گھر جارہا ہے اور باہر نکل آیا۔

موٹر سائیکل پر وہ آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں گھر پہنچ چکا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل گیٹ پر روکی ہی تھی کہ اچانک گیٹ کھلا اور اس میں سے فرحین کا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ حسنات کی منگیتر ہے اور اس کی ماں کی اسٹوڈنٹ بھی رہ چکی ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار ان کے گھر آچکی تھی۔

''ہائے فرحین.....کیسی ہو؟'' اس نے خوشدلی سے پوچھا۔

فرحین اسے دیکھتے ہی گھبرا گئی۔ ''ہم...... میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟'' وہ گھبراتے ہوئے بولی۔

''بیٹھو نا۔ کچھ گپ شپ کرتے ہیں۔'' وہ اس کی گھبراہٹ پر غور کیے بغیر بولا۔ اب حسنات تو تھا نہیں اس سے تعلقات بڑھانے کا یہ اچھا موقع تھا۔ وہ ویسے بھی خوبصورت لڑکیوں سے تعلقات بنانے کا شوقین تھا اور فرحین تو کافی سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کی سیاہ آنکھیں انور کو اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''نہیں میں چلتی ہوں۔ میڈم سے ملنے آئی تھی ان سے مل چکی۔'' یہ کہتے ہی اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

''ان سے تو ملتی رہتی ہو کبھی ہم سے بھی مل لیا کرو۔'' وہ اس کے قریب سے گزرنے لگی تو اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ مگر فرحین اس کا جملہ نظرانداز کر کے آگے بڑھ گئی۔ اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

وہ اشتیاق سے اپنے مڑ کے دیکھنے لگا۔ وہ تب تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی نظر سے اوجھل نہیں ہوگئی۔ اسے امید تھی کہ وہ کم سے کم ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھے گی مگر اسے مایوسی ہوئی تھی۔

اس کی ماں اسے دیکھ کے بولی۔ ''آج جلدی آگئے؟''

''ہاں بس سر میں درد تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سر مسلا۔ اچانک اسے یاد آیا تو اس نے ماں سے پوچھا۔ ''یہ فرحین کیوں آئی تھی؟''

''پتا نہیں میرے پاس تو وہ اتنا بیٹھی ہی نہیں۔ تمہارے کمپیوٹر پر کچھ کیا اور چلی گئی میں نے اس کے لیے چائے بنائی تھی مگر اس نے وہ بھی نہیں پی۔''

کمپیوٹر کا سن کے اس کا ماتھا ٹھنکا۔ میرے کمپیوٹر پر اسے کیا کام ہوسکتا ہے؟ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح لپکا۔

شاید اسے حسنات نے ساری حقیقت بتادی ہے اور وہ میرے کمپیوٹر پر وہ ویڈیو ڈھونڈنے آئی تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تیزی سے کمرے کی طرف لپکا۔

اس نے فوراً کمپیوٹر آن کیا۔ چند لمحوں بعد کمپیوٹر پر ''نو ہارڈ ڈسک ڈرائیو'' کا میسج نمودار ہوا تو اس کے پیروں سے گویا زمین ہی نکل گئی۔ اس نے فوراً سی پی یو کا کور کھولا۔ اندر ہارڈ ڈسک غائب تھی۔

وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ اس کی ماں اسے اتنی تیزی سے باہر جاتے دیکھ کے حیران رہ گئیں۔ انہوں نے اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ انہیں نظرانداز کرکے باہر جا چکا تھا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے اس کے موٹر سائیکل کی آواز سنی شاید وہ کہیں باہر جارہا تھا۔ فرحین بھی اسی طرح انہیں ان سنی کرتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔ پتا نہیں یہ کیا چکر ہے۔ انہوں نے پریشانی سے سوچا۔

☆☆☆

فرحین، انور کی ماں کو دیکھ کے گھبرا گئی تھی مگر پھر اسے اچانک یاد آیا کہ وہ تو کمپیوٹر کے متعلق کچھ جانتی ہی نہیں۔ اس نے ہارڈ ڈسک اپنے جسم کی اوٹ میں رکھ کر اپنے بیگ میں ڈال لی۔ سکون سے سی پی یو پر کور لگایا اور بولی۔ ''اس پر نیٹ نہیں چل رہا تھا اس لیے میں نے اس میں اپنی ''انٹرنیٹ ڈیوائس'' لگا کے میل چیک کی ہے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے میڈم کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

اس کی وضاحت سن کے میڈم کے چہرے پر اطمینان

جھلکایا۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ انٹرنیٹ ڈیوائس لگانے کے لیے سی پی یو کو کھولنا ضروری نہیں ہوتا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ چائے لو۔" انہوں نے چائے اور بسکٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

"اوہ سوری میڈم۔ مجھے ابھی یونیورسٹی جانا پڑ گیا ہے۔ میل اسی سلسلے میں تھی۔ آپ کی چائے ادھار رہی۔" یہ کہتے ہی وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ وہ اسے روکتی رہ گئیں مگر وہ انہیں ان سنی کرتی ہوئی گیٹ کھول کے باہر نکل گئی۔

انور کو دیکھ کے وہ گھبرا گئی تھی۔ اس سے اس کی بس ہلکی سی دعا سلام تھی مگر آج وہ اسے ایسے بے تکلفی سے مخاطب ہوا تھا جیسے ان میں برسوں کی جان پہچان ہو۔ اس کا آخری جملہ سن کے تو اس کا جی چاہا تھا کہ اپنے ہاتھ میں موجود بیگ گھما کے اس کے منہ پہ مار دے مگر اس وقت اس کے منہ لگنا مناسب نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد ادھر سے نکل جانا چاہتی تھی۔

وہ جب اس مقام پر پہنچی جہاں اس نے گاڑی کھڑی کی تھی تو حیران رہ گئی۔ گاڑی غائب تھی۔ انور کے گھر والی گلی قدرے تنگ تھی وہاں گاڑی جا تو سکتی تھی مگر آگے سے اسے ریورس کرنا کافی مشکل تھا۔ اس نے گاڑی ایک کشادہ گلی میں کھڑی کی تھی مگر اب وہ ہکا بکا خالی جگہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر اسے آس پاس کہیں گاڑی کھڑی نظر نہ آئی، شاید میں بے دھیانی میں غلط گلی میں مڑ گئی ہوں۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ وہ واپس پیچھے آئی۔ انور کی گلی کے سامنے سے وہ گزرنے لگی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ انور بائیک پر اپنے گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کی نظر فرحین پر پڑی تو اس کے چہرے پر جارحانہ تاثرات نمودار ہوئے۔

فرحین تیزی سے آگے بڑھی۔ اس نے بھاگتے ہوئے گلی کراس کی۔ گلی میں موجود کچھ لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے مگر اس وقت اسے لوگوں کی نظروں کی ذرا برابر پروا نہیں تھی۔ اس کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ اگلی گلی کے سرے پر اسے اپنی گاڑی نظر آ گئی۔ اس کے قدموں میں گویا بجلی بھر گئی۔

اسی لمحے اسے اپنے عقب میں بائیک کی غراہٹ سنائی دی۔ اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو اس کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ انور گلی کے سرے پر نمودار ہو چکا تھا۔ اس نے نظروں ہی نظروں میں گاڑی تک کا فاصلہ ناپا، اسے مایوسی ہوئی۔ وہ انور سے پہلے گاڑی تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اچانک اسے سائڈ پر ایک تنگ سی گلی نظر آ گئی۔ وہ بے دریغ اس میں گھس گئی۔ گلی میں مڑتے ہی اس کا سینڈل ٹوٹ کے اس کے پاؤں سے نکل گیا۔ ایک سینڈل کے ساتھ بھاگنا مشکل تھا، اس نے دوسرا سینڈل بھی اتار دیا۔ اب وہ ننگے پاؤں بھاگ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ انور نے اسے اس گلی میں مڑتے دیکھ لیا ہوگا۔ یہ تنگ سی گلی کافی طویل تھی۔ انور لمحوں میں ہی اسے چھاپ لیتا۔ اسے ایک بار پھر اپنے عقب میں بائیک کی غراہٹ سنائی دی تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

انور کی رفتار کافی زیادہ تھی اس لیے وہ عین گلی کے سرے پر رک نہیں سکا تھا۔ یہ گلی ویسے بھی کافی تنگ تھی رکے بغیر اس گلی میں مڑنا ممکن نہیں تھا۔ وہ سیدھا آگے نکل گیا۔ جتنی دیر میں وہ واپس اس گلی میں مڑتا، فرحین کو اتنی دیر میں گلی کراس کرنا تھی مگر اسے یہ ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ اسے ایک مکان کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا انور ابھی اس گلی میں نہیں مڑا تھا۔ وہ اندر گھس گئی۔ اندر گھستے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ اس کا ہاتھ دروازے کی کنڈی پر پڑا تو اس نے دروازے کو کنڈی چڑھا دی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ اُدھر ہی رک کر اپنی سانس درست کرنے لگی۔ دروازے سے ایک تنگ سی راہداری اندر جا رہی تھی۔ راہداری میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ راہداری کے سرے پر ایک کھلا صحن تھا۔ جو اس وقت خالی تھا۔ اچانک اس نے راہداری کے سرے پر ایک شخص کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ شاید دروازے کی آواز سن کر آیا تھا، وہ کافی بھاری بھر کم بندہ تھا۔ فرحین کا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اس شخص نے فرحین کو دیکھتے ہی ایک غراہٹ نما آواز نکالی۔ پہلے سے خوفزدہ فرحین کو وہ آواز اتنی خوفناک لگی کہ اس کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کے بمشکل اس چیخ کا گلا گھونٹا تھا۔

وہ شخص آواز نکالنے کے بعد چند لمحے بعد تک ادھر ہی کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اچانک اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھا کہ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ اب اس کا ادھر رکنا بھی محال تھا، اس نے اپنے عقب میں موجود دروازے کی کنڈی کھولی۔ وہ باہر نکلنے ہی لگی تھی کہ اسی لمحے اسے باہر موٹر سائیکل رکنے کی آواز آئی۔ فرحین کے لیے باہر کنواں اندر کھائی والی صورت حال تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں اپنے بچاؤ کی دعائیں مانگنے لگی۔

☆☆☆

انور کی نظر جب فرحین پر پڑی تو وہ اپنی خوش قسمتی پر حیران رہ گیا۔ اس کے خیال میں تو اب فرحین کے اسے ملنے کے بہت کم چانسز رہ گئے تھے مگر جانے کیوں وہ ابھی تک اسی گلی میں گھوم رہی تھی۔ وہ پیدل تھی اور انور کے پاس موٹر سائیکل تھی، وہ اسے پل میں ہی جا لیتا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ تھا۔ ہارڈ ڈسک یقیناً اسی میں ہوگی۔ اس نے اندازہ لگایا۔

وہ اس کے پاس پہنچنے ہی والا تھا کہ وہ ایک تنگ گلی میں گھس گئی۔ وہ تیز رفتاری کے باعث آگے نکل گیا۔ اس نے موٹر سائیکل روکی۔ یہ گلی کافی طویل تھی، اسے یقین تھا کہ وہ آسانی سے اسے پکڑ لے گا۔ اس نے سکون سے موٹر سائیکل گلی کی طرف موڑی۔ جب وہ گلی میں داخل ہوا تو اس نے فرحین کے سینڈلز گلی میں پڑے دیکھے مگر فرحین غائب تھی۔

وہ گلی اس کے وجود سے خالی دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ وہ شاید کسی گھر میں گھس گئی ہے۔ اس نے درست اندازہ لگایا۔

وہ گلی میں موجود دروازوں کو دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اچانک اس کی نظر گلی میں کیچڑ زدہ ننگے پاؤں کے نشانات پر پڑی۔ یہ فرحین کے پاؤں کے ہی نشانات تھے۔ قدرت اس کی مدد کر رہی تھی۔ یہ نشانات لوہے کے ایک دروازے تک جا رہے تھے۔ اس نے موٹر سائیکل روک دی۔

اس نے دروازے پر نظر جمائی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلنے لگا تھا۔ وہ چوکنا ہو گیا۔ اسی لمحے اس نے ایک نامانوس سی آواز سنی، اسے ایسا لگا تھا جیسے کوئی درندہ دہاڑا ہو۔ وہ ایک گھر سے ایسی آواز آنے پر حیران رہ گیا۔

وہ آنکھیں پھاڑے دروازے کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ دروازہ پُرشور آواز کے ساتھ کھلا اور اس میں سے فرحین برآمد ہوئی۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اس کے پیچھے ہزاروں بلائیں لگی ہوں۔ اس کی نظر انور پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں ناچتے ہراس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے گلی کی دوسری سمت دوڑ لگا دی۔

اسے دوسری سمت بھاگتے دیکھ کے انور کو جیسے یکدم ہوش آ گیا۔ وہ اس کے پیچھے جانے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر دروازے پر موجود شخص پر پڑی.... اس کے ہاتھوں میں فرحین کا بیگ تھا۔

☆☆☆

ننھا کافی دیر سے اپنے بھائی اور بھابی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دیکھنے میں تو بچہ لگتا تھا مگر سب ہی اسے بچہ سمجھتے تھے جو اس کی جسامت پر ایک پھبتی سی تھی۔ وہ بہرا نہیں مگر ان پڑھ تھا۔ وہ ذرا توتلا بھی تھا۔ اسے بولنے میں بھی دقت ہوتی تھی۔ اس کا ذخیرۂ الفاظ چند الفاظ پر مشتمل تھا جن میں "بابا" "بابی" کے علاوہ چند کھانے پینے کی چیزوں کے نام ہی تھے۔

وہ ادھر اپنے بھائی اور بھابی کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کا ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا جس میں اس کی جان تھی۔ جب سے ان کے گھر بچہ آیا تھا وہ بہت خوش رہنے لگا تھا۔ ورنہ وہ پہلے اپنے بھائی اور بھابی کو بہت تنگ کیا کرتا تھا۔ اسے وقت پر کھانا نہ ملتا تو وہ برتن توڑنے لگتا۔ مگر اب اس کے ہاتھ ایک نیا مشغلہ لگ گیا تھا۔ وہ ہر وقت بچے سے کھیلتا رہتا۔ آج اس کے بھائی اور بھابی صبح سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔

وہ ان کا انتظار کر کر کے تھک چکا تھا۔ اسے بھوک بہت لگی تھی۔ وہ کچن میں موجود سارے برتن کھنگال چکا تھا مگر اسے کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں ملی۔

ویسے تو اگر ان کے بھائی اور بھابی نے زیادہ دیر تک باہر جانا ہوتا تو اس کے لیے کھانا رکھ جاتے تھے یا اسے پیسے دے جاتے تھے جن سے وہ ایک قریبی ہوٹل میں کھانا کھا لیا کرتا تھا مگر آج نہ وہ پیسے دے کے گئے تھے اور نہ ہی کچھ کھانے کے لیے رکھ کے گئے تھے۔

بھوک سے اس کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے اور وہ بار بار پیٹ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اچانک اسے دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ وہ خوشی سے چلایا۔ "بابی..." مگر دروازے پر پہنچا تو اس کے بھائی کے بجائے دروازے پر کوئی انجان لڑکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ اس کی بھابی کے پاس بھی ایسا ہی بیگ تھا جس میں وہ پیسے رکھا کرتی تھی۔ وہ بیگ دیکھ کے خوش ہو گیا۔ اس بیگ میں پیسے ہو سکتے تھے جس سے اس کی بھوک کا سدباب ہو سکتا تھا۔ اس نے خوشی کے اظہار کے طور پر چیخ ماری۔ لڑکی خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بیگ لینے کو اسے دیکھتا رہا جب لڑکی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تو وہ تیزی سے اس کے بیگ کی طرف جھپٹا۔

وہ لڑکی اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کے ڈر گئی۔ اس نے تیزی سے دروازہ کھولا۔ وہ باہر نکلنے ہی لگی تھی کہ ننھے نے اس کا بیگ اس سے چھین لیا۔ وہ بیگ کی پروا کیے بغیر باہر نکل گئی۔

ننھے نے بیگ کی زپ کھولی۔ اس کا اندازہ بالکل صحیح نکلا تھا۔ بیگ کے اندر ایک اور چھوٹی تھیلی موجود تھی جس سے پیسے جھانک رہے تھے۔

وہ پیسے نکالنے ہی لگا تھا کہ اس کے کانوں نے آواز سنی۔

"بھائی صاحب یہ بیگ میرا ہے۔"

اس نے نظر اٹھا کے سامنے دیکھا تو ایک دبلا پتلا سا آدمی اس کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ اس نے جلدی سے بیگ پیچھے کر لیا۔ اس کے چہرے پر غصیلے تاثرات نمایاں ہو گئے تھے۔

"یہ بیگ میرا ہے یہ مجھے واپس دو۔" یہ کہتے ہوئے اس شخص نے ایک بار پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ اس نے اس شخص کو ایک زوردار دھکا دیا۔ وہ اڑتا ہوا سامنے کی دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔ دیوار سے ٹکرا کے وہ منہ کے بل گرا۔ اس کا سر عقب سے پھٹا ہوا تھا۔

ننھے نے اسے بے حسی سے دیکھا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

اندر جا کے اس نے بیگ کھول کے اس میں سے پیسے نکالے اور بیگ ادھر ہی پھینک کے باہر کی طرف لپکا۔ گلی میں کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ انہیں نظر انداز کر کے آگے جانے لگا۔

گلی کے سرے پہ اس کی نظر ایک بار پھر اس لڑکی پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کے بھاگی مگر اب اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ تیزی سے ہوٹل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ گرم گرم روٹی کے تصور سے اس کے منہ میں پانی آ رہا تھا جو رال کی صورت میں اس کی باچھوں سے بہہ رہا تھا۔

☆☆☆

فرحین اس شخص کی وجہ سے ڈر گئی تھی۔ یہ شخص اسے انور سے بھی زیادہ خوفناک لگا۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کے وہ انور کو بھول ہی گئی۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کے باہر کی طرف بھاگی مگر اسی دوران وہ شخص اس سے بیگ چھین چکا تھا۔ وہ باہر نکلی تو اس کا سامنا انور سے ہوا۔ وہ ایک دم دوسری سمت میں بھاگی۔ اس کی ٹانگوں میں گویا بجلیاں بھر گئی تھیں۔ اسے اپنے ننگے پاؤں کا بھی کوئی احساس نہیں تھا۔ گلی کے سرے پر پہنچ کے اس نے پیچھے کی طرف دیکھا۔

انور اس شخص سے کوئی بات کر رہا تھا۔ اچانک اس نے انور کو گرتے دیکھا۔ وہ سامنے والی دیوار سے ٹکرا کے

گرا۔ تھوڑی دیر میں اس کے قریب ہی بھیڑ جمع ہو گئی۔ وہ ادھر ہی کھڑی اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اس نے اس پہلوان نما شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ ایک دم گھبرا کر خوفزدہ ہو گئی۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف بھاگی کیا اسے مہک کا خیال آیا۔ گاڑی کی چابیاں تو بیگ میں تھیں۔ اس نے ورک کے عقب میں رکھا۔ وہ شخص گاڑی کی دوسری سمت موجود تھا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے جس کا مطلب تھا کہ بیگ وہ اپنے گھر ہی چھوڑ آیا ہے۔

یہ خیال آتے ہی اسے کچھ سکون کا احساس ہوا۔ اس نے گلی میں جھانکا تو وہ چھوٹا لڑکا کہیں سے جا رہے تھے۔ وہ تیزی سے اس گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ گلی میں چلتے ہوئے اس کی نظر اپنے برہنہ پاؤں پر پڑی۔ کیچڑ میں لتھڑے اپنے پیروں کو دیکھ کے اسے گھن آ گئی۔ اس کے ذہن میں ایک ہی گانا گونجا۔ تیرے عشق "نچایا" کر تھیا تھیا تھیا...

اسے اپنے ہی خیال پر ہنسی آ گئی۔

اس ہنسی نے پل بھر میں ہی اس کی جسمانی اور ذہنی تھکن بھگا دی۔ وہ ایک نئے جوش و ولولے کے ساتھ اس مکان کی طرف بڑھنے لگی جہاں اس کے محبوب کی زندگی کی امانت ایک ہارڈ ڈسک کی صورت میں "قید" تھی۔

☆☆☆

حسنات کے والد نے فرحین کے نمبر پر کال کی۔ اسے گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اب تک تو اسے واپس آ جانا چاہیے تھا۔ ان کے ذہن میں خیال آیا۔

وہ اس کے ساتھ ہی جانا چاہتے تھے مگر اس نے کہا تھا "انکل آپ فکر نہ کریں، میں اکیلے ہی یہ کام آسانی سے کر سکتی ہوں۔" انہوں نے آخرکار اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے مگر اب جب کافی دیر سے انہیں اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تو وہ پریشان ہو گئے۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی مگر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ ان کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

انہوں نے کئی دفعہ اسے کال کرنے کی کوشش کی مگر کال کسی نے ریسیو نہیں کی۔

انہوں نے گاڑی نکالی اور انور کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ پریشانی میں انہیں زاہد کو بھی ساتھ لینے کا خیال نہیں آیا تھا۔

وہ انور کے گھر کے پاس پہنچے تو انہیں فرحین کی گاڑی کھڑی نظر آ گئی مگر گاڑی خالی تھی۔ انہوں نے قریب کے ایک دکان دار سے فرحین کے بارے میں استفسار کیا۔

وہ اس محلے میں کافی عرصہ رہ چکے تھے۔ دکان دار ان سے اچھی طرح واقف تھا۔

وہ انہیں فرحین کے متعلق بتانے کے بجائے ان سے ان کا حال احوال دریافت کرنے لگ گیا۔

انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی جھنجلاہٹ چھپاتے ہوئے اسے اپنے حال احوال کے بارے میں آگاہ کیا۔

انہوں نے جب فرحین کے بارے میں تیسری بار سوال کیا تو وہ شخص بولا۔ "ہاں کافی دیر پہلے اس گاڑی میں سے ایک لڑکی کو اترتے میں نے دیکھا تھا مگر اسے واپس آتے میں نے نہیں دیکھا۔"

انہوں نے دکان دار کا شکریہ ادا کیا اور انور کے مکان کی طرف ہو لیے۔

اپنی گاڑی انہوں نے فرحین کی گاڑی کے ساتھ ہی پارک کر دی تھی تاکہ فرحین اگر آئے تو ان کی گاڑی دیکھ کے ان سے رابطہ کرے۔

انور کے گھر انور کی ماں اکیلی پریشان بیٹھی تھی۔ وہ آخری بار کچھ دیر پہلے انور کے والد کے انتقال پر ان کے گھر آئے تھے۔

انور کی ماں نے انہیں بتایا کہ فرحین آئی تھی مگر آتے ہی وہ انور کے کمپیوٹر پر کوئی کام کر کے واپس چلی گئی تھی۔

ان کے دل کو کچھ ڈھارس ملی۔ اسے شاید اپنے مقصد میں کامیابی ہو گئی تھی اس لیے وہ اتنی جلدی واپس چلی گئی تھی۔ مگر اتنی دیر میں وہ گاڑی تک کیوں نہیں پہنچی۔ اس سوال کا جواب ابھی تک انہیں نہیں ملا تھا۔

"انور کہاں ہے؟" اچانک انہیں انور کا خیال آیا تو انہوں نے اس کے متعلق پوچھا۔

"وہ بھی فرحین کے جانے کے فوراً بعد آیا تھا مگر میں نے جیسے ہی اسے فرحین کے بارے میں بتایا کہ اس نے تمہارے کمپیوٹر پر کوئی کام کیا ہے تو وہ بھی فوراً اس کے پیچھے نکل گیا۔"

یہ سن کے ان کی پریشانی میں یک لخت اضافہ ہو گیا۔ "یا اللہ! میری بچی کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔" ان کے دل سے بے اختیار دعا نکلی۔

☆☆☆

فرحین اس مکان کے سامنے پہنچی تو اس نے دروازہ کھلا دیکھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ راہداری میں سے گزرتے ہوئے اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

وہ شخص تو باہر چلا گیا تھا مگر اس گھر میں اور بھی کوئی شخص ہو سکتا تھا۔ یہ خیال اسے خوفزدہ کر رہا تھا۔ راہداری کے ساتھ ہی سیڑھیاں چھت پر جا رہی تھیں۔ وہ انھیں نظرانداز کرتے ہوئے دبے پاؤں اندر کی طرف بڑھی۔ راہداری کے سرے پر کچن تھا اس کے ساتھ ہی ایک برآمدہ تھا جس میں دو کمرے ایک ہی لائن میں تھے ان دونوں کمروں کے ایک طرف کچن اور باتھ تھا جبکہ دوسری طرف تیسرا کمرا تھا۔ اس کمرے کے دروازے پر تالا پڑا تھا۔ جبکہ دیگر دو کمروں میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اسی کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا۔

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اندر جھانکا۔ اس کی توقع کے مطابق کمرا خالی تھا۔ اپنا بیگ اسے سامنے ہی صوفے پر پڑا نظر آ گیا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکی۔ بیگ کھول کے اس نے دیکھا تو پرس، والٹ، اس کا سیل فون اور اس کی دیگر چیزیں جوں کی توں موجود تھیں۔ مگر رقم غائب تھی۔ اسے اصل فکر اپنا والٹ کی تھی اس لیے رقم کے غائب ہونے پر اسے کوئی فکر نہیں ہوئی۔ اس نے سیل فون نکال کے دیکھا تو اس میں تین مسڈ کالز کا نوٹیفکیشن جگمگا رہا تھا۔

مسڈ کالز حسنات کے ابو کی تھیں۔ وہ انھیں کال بیک کرنے ہی لگی تھی کہ اسے خیال آیا کہ وہ ایک اجنبی گھر میں موجود ہے جہاں کسی بھی وقت کوئی آ سکتا ہے۔

یہ خیال آتے ہی اس نے کال کرنے کا فیصلہ ملتوی کیا اور سیل فون بیگ میں ڈال دیا۔

وہ راہداری کے سرے پر پہنچی ہی تھی کہ اسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی اسے ایک مرد اور عورت کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کی نظر چھت پر جانے والی سیڑھی پر پڑی مگر اب اس کے پاس اتنا موقع نہیں تھا کہ وہ سیڑھی کے ذریعے اوپر جاتی۔ وہ واپس پیچھے پلٹی۔

کھلے دروازے سے وہ اندر داخل ہو کے خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ کوئی چھپنے کی جگہ تلاش کر رہی تھی۔ اسے اس مقصد کے لیے بیڈ ہی موزوں لگا۔ اس کے نیچے چھپنے کے لیے اس نے بیڈ شیٹ کا کونا پکڑا ہی تھا کہ اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ بیڈ کے نیچے ایک بڑا سا سوٹ کیس پڑا تھا اسے ہٹائے بغیر وہ بیڈ کے نیچے نہیں گھس سکتی تھی۔ اور سوٹ کیس ہٹانے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

ابھی وہ کمرے میں ہی تھی کہ آوازیں دروازے کے باہر تک پہنچ گئی تھیں وہ کسی بھی وقت کمرے میں داخل ہو سکتے تھے۔ اس نے ایک بار پھر متلاشی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا تو اس کی نظر دروازے کے ساتھ ہی ایک قدِ آدم لوہے کی الماری پر پڑی۔ اس نے تیزی سے بڑھ کے الماری کھولی۔ اس میں چند کپڑوں کے جوڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ وہ اندر چھپ سکتی تھی۔ وہ اندر گھس گئی۔ الماری کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے اپنی طرف سے احتیاط کی تھی کہ آواز نہ بلند ہو مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ الماری بند کرتے ہوئے اچھی خاصی آواز بلند ہوئی۔ اس کا دل خوف سے اچھل پڑا۔

☆☆☆

اس وقت حسنات کے والد انور کی ماں کے پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے جب انور کا فرقان کے پیچھے جانے کا سنا تو وہ پریشان ہو گئے۔ وہ انور کی ماں سے اجازت لے کر جانے ہی لگے تھے کہ دروازے پر کال بیل کی آواز سنائی دی۔ انور کی ماں ان کے ساتھ ہی باہر آئی۔ دروازے پر ان کا ایک پڑوسی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

اس کی نظر پہلے حسنات کے والد پر ہی پڑی۔ وہ انھیں جانتا تھا۔ اس نے ان سے ہاتھ ملایا اور پوچھا۔ "رخسانہ باجی گھر پر ہی ہیں؟"

وہ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے سامنے سے ہٹ گئے۔ رخسانہ نے گیٹ کے اندر سے ہی پوچھا۔ "کیا بھائی خیریت؟"

"باجی خیریت نہیں ہے۔ انور زخمی ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ اسے اسپتال لے گئے ہیں۔"

یہ سنتے ہی رخسانہ گھبرا کر گیٹ سے باہر آ گئی۔ وہ خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "کیسے زخمی ہوا اور کون سے اسپتال لے کے گئے ہیں؟" اس کی آواز سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

"مجھے نہیں پتا کہ وہ کیسے زخمی ہوا ہے، شاید موٹر سائیکل سے گرا ہے۔ مجھے ارشد صاحب نے کہا کہ آپ کو اطلاع دے دوں۔ وہ اس کے ساتھ گئے ہیں۔"

"کون سے اسپتال لے کے گئے ہیں؟" اس نے اپنے سوال کا دوسرا حصہ دہرایا۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ سول اسپتال لے کے جائیں گے۔ آپ ان سے خود رابطہ کر لیں۔ یہ ان کا نمبر ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک وزیٹنگ کارڈ ان کی طرف

اسی لمحے دکان پر ایک چودہ سولہ سالہ لڑکا آکھڑا ہوا۔

دکان دار اس سے گویا ہوا۔ ''چھوٹے تم انہیں پاگل منجے کے گھر چھوڑ آؤ۔'' وہ جھٹ سے تیار ہو گیا۔

اب وہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ دل ہی دل میں وہ فرحین کی خیریت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

☆☆☆

ثمر نے جب اس کے جانے کا سنا تو اسے منجے سے چھٹکارے کا منصوبہ برباد ہوتا نظر آنے لگا۔ وہ چلائی۔ ''تم ہماری اجازت کے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ اس کے قریب آ کے اس نے فرحین کے ہاتھ سے سیل چھین لیا۔ فرحین کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی۔

سیل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے فرش پر جا گرا تھا۔ مرد اپنی بیوی کی اس حرکت سے ایک بار پھر پریشان ہو گیا۔ ''کیا کر رہی ہو ثمر اسے جانے دو۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''مجھے اس کی کہانی پر یقین نہیں آیا۔ میں اس کے بیگ کی تلاشی لوں گی۔'' وہ سخت لہجے سے بولی۔

''لے لیں تلاشی بے شک۔'' فرحین نے لہجے سے اپنا بیگ اس کی طرف بڑھایا۔ بیگ بڑھانے سے پہلے اس نے اس میں سے ہارڈ ڈسک نکال لی تھی۔

ثمر نے اس کے ہاتھ میں ہارڈ ڈسک کو مشکوک انداز میں دیکھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''یہ ہارڈ ڈسک ہے کمپیوٹر میں لگاتے ہیں۔'' اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

ثمر نے کندھے اچکائے اور اس کے بیگ کی تلاشی لینے لگی۔ بیگ کے اندر ہی چھوٹی سی جیب میں اسے ایک انگوٹھی ملی اس میں ہیرے جڑے تھے۔ انگوٹھی دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں لالچ ابھرا۔

اس نے پل بھر میں ہی انگوٹھی چھپانے کا منصوبہ ذہن میں ترتیب دے دیا۔ ''دیکھا میں کہتی تھی نا یہ چور ہے۔ یہ دیکھیں میری یہ انگوٹھی اس نے دراز سے چرائی ہے۔'' وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے اپنے شوہر سے بولی۔

یہ فرحین کی منگنی کی انگوٹھی تھی۔ ''جھوٹ مت بولو۔ میری انگوٹھی ہے۔ تم نے کبھی ہیرے جڑی انگوٹھی خواب میں بھی دیکھی ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ مگر ثمر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''[illegible]'' اس نے ترنت جواب دے دیا۔

''آپ فوراً پولیس کو فون کریں یا میں خود اس سے حقیقت اگلوا لوں گی۔'' وہ تحکمانہ انداز میں اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔ وہ اسے بے بسی سے دیکھ کے رہ گیا۔

اسی لمحے انہوں نے دروازہ دھڑدھڑائے جانے کی آواز سنی۔

ثمر کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات عیاں ہوئے۔ مرد باہر کی طرف بڑھا۔

فرحین نے آگے بڑھ کے فرش سے اپنا سیل اٹھایا۔ نیچے گرتے ہوئے وہ آف ہو گیا تھا۔ اس نے اسے آن کیا تو وہ آن ہو گیا۔ اس نے فوراً حسنات کے والد کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ وہ کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

ثمر اسے معاندانہ نظروں سے گھور رہی تھی۔ مگر اب اسے ان نظروں کی کوئی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

حسنات کے والد نے منجے کے گھر کا گیٹ زور سے بجایا۔ وہ لڑکا انہیں ادھر چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اب وہ بے تابی سے دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی لمحے ان کا سیل بجنے لگا انہوں نے جیب سے اپنا سیل نکال کے کال ریسیو کی۔ یہ فرحین کی کال تھی۔

کال ریسیو کرتے ہی وہ بے تابی سے بولے۔ ''فرحین! کدھر ہو تم میں منجے کے گھر کے سامنے کھڑا ہوں۔''

''میں اندر ہی ہوں۔ آپ بس میں ابھی آئی۔'' ان کے کانوں سے فرحین کی خوشی بھری آواز ٹکرائی تو ان کے رگ و پے میں سکون دوڑ گیا۔ ان کی آواز سن کے فرحین بھی اتنی خوش ہوئی تھی کہ اسے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ انکل ان کے منجے کے گھر ہونے کا کیسے پتا چلا ہے۔

فرحین نے جھپٹ کے ثمر کے ہاتھوں سے انگوٹھی کھینچی۔ بیگ اٹھایا اور تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ ثمر نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ باہر کی طرف بھاگتے ہوئے اس نے ہارڈ ڈسک اور انگوٹھی بیگ میں ڈال کے اس کی زپ بند کر دی تھی۔ ثمر کا شوہر دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ فرحین نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے گیٹ کھولا اور باہر نکل گئی۔ گیٹ سے کچھ دور پہنچی تھی کہ باہر نکلتے ہوئے وہ اس شخص کو دیکھ ہی نہیں سکی۔ نتیجے میں وہ اس سے ٹکرائی..... خود کو

سنبھل کے وہ تیزی سے اٹھی۔ اس کی سیدھی ذہنی بناوٹ میں لہرا گیا۔

حسنات کے والد پر نظر پڑتے ہی وہ ان کی طرف گئی۔ ان کی پیشانی شکن آلود تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر ان کا دل کٹ کے رہ گیا تھا۔ وہ اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ "انکل....." یہ کہتے ہی وہ ان سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو دھاروں کی صورت میں بہہ رہے تھے۔

اس کی اجڑی شکل دیکھ کے ان کا دل کٹ کے رہ گیا۔ وہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگے۔ اس کی حالت دیکھ کے ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔

کچھ دیر کے بعد اس کی حالت سنبھلی تو وہ ان سے الگ ہوئی۔ "بیٹھیں انکل۔" وہ بولی۔

وہ اس کے برہنہ پاؤں کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے ان کی نظروں کے تعاقب میں اپنے پاؤں پر نظر ڈالی۔ "میں ان ننگے پاؤں کے سہارے آج بہت بھاگی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ آپ بیٹھیں۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اس نے دروازہ کھولا اور وہ باہر نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں چند لفافے تھے۔ "آپ بیٹھیں گی... آپ کو حسنات کی وجہ سے جو تکلیف پہنچی، میں اس کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ بیٹا مجھے بھی معاف کر دینا اور اسے بھی۔" اس نے التجائیہ انداز میں کہتے ہوئے سینہ پر ان کے پاؤں کے پاس بیٹھ گئے۔

نرگس نے سٹپٹا کے پیچھے ہٹ کے بولی۔ "پلیز انکل۔"

اس نے مزید کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ انکل بیٹھنے سے بھی انکار کر گیا۔

☆☆☆

نرگس سیدھی حسنات کے گھر ہی آئی تھی۔ وہ ادھر پہنچ کر ہی ہارڈ ڈسک پہ ویڈیو دیکھنا چاہتی تھی مگر حسنات کے والد نے اس سے کہا پہلے وہ نہا دھو کے فریش ہو جائے۔

وہ ان کی بات ٹال نہ سکی۔

نہانے کے بعد وہ خود کو کافی حد تک تروتازہ محسوس کرنے لگی۔ باہر نکلتے ہی اس نے ہارڈ ڈسک حسنات کے کمپیوٹر کے ساتھ اٹیچ کی۔ اس کے سی ڈی روم میں اسے ونڈوز کی سی ڈی مل گئی تھی۔ اس ونڈو پہ پاس ورڈ لگا تھا۔ اس کا حل اس نے یہی سوچا تھا کہ ونڈو ری سیٹ کر کے نئی ونڈو انسٹال کر لے۔ ری سیٹ کمپیوٹر کی صرف ایک ڈرائیو ہوتی۔

زیادہ چانس یہ تھا کہ ویڈیو کسی دوسری ڈرائیو میں محفوظ ہو گی۔ وہ ہارڈ ڈسک کے پیچھے بھاگ دوڑ سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ ویڈیو اسی میں محفوظ ہو گی۔ ورنہ صرف ہارڈ ڈسک کے لیے وہ اس کا پیچھا نہ کرے۔

اس نے ونڈو والی ڈرائیو فارمیٹ کر کے نئی ونڈو انسٹالیشن پہ لگا دی۔ اتنی دیر میں ملازمہ چائے اور اس کے ساتھ دیگر لوازمات کی ٹرے میز پہ رکھ گئی تھی۔ حسنات کے ڈیڈی بھی اس کے پاس آ کے بیٹھ گئے تھے۔ اس نے صبح کا کھانا ابھی تک نہیں کھایا تھا۔ بھاگ دوڑ میں تو اسے بھوک کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ مگر اب غسل کے بعد اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ وہ چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ انصاف کرنے لگی۔ ساتھ ہی وہ حسنات کے والدین کو اپنی آپ بیتی سنا رہی تھی۔

اس کی ساری کہانی سن کے حسنات کی ماں نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ "تم نے ہمارے بیٹے کے لیے جو کچھ کیا اس کا قرض ہم ساری زندگی نہیں اتار سکتے۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی تھیں۔

"آنٹی، حسنات سے میرا بھی تعلق ہے، میں نے یہ سب صرف آپ کے لیے نہیں کیا۔ اپنے لیے بھی کیا ہے۔" اس نے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

اتنی دیر میں ونڈو انسٹال ہو چکی تھی۔ وہ بے تابی سے کمپیوٹر کے سامنے جا کے بیٹھ گئی۔

ہارڈ ڈسک میں ونڈو کے علاوہ تین ڈرائیوز تھیں جن میں سے ایک پہ پرسنل ڈیٹا کا لیبل لگا تھا۔ اس نے وہی کھول لی۔

اس میں اسے حسنات کی تصاویر تو مل گئیں مگر ویڈیو نہ ملی۔ اس نے فولڈر میں جا کے "ہیڈن" فائلز شو کیں۔ مگر اس کے باوجود اس ڈرائیو میں کوئی ہیڈن فائل شو نہیں ہوئی۔ اس نے ساری ڈرائیوز چھان ماریں مگر اسے ویڈیو نہیں ملی۔ اس کے چہرے پہ پریشانی نمودار ہو گئی۔ حسنات کے والدین بے تابی سے اسے یہ سب کرتے دیکھ رہے تھے۔ اسے پریشان دیکھ کر حسنات کے والد اس سے بولے۔ "کیا ہوا؟ ویڈیو نہیں مل رہی کیا؟"

"ہاں جی، تصاویر تو مل گئی ہیں مگر ویڈیو نہیں مل رہی۔ شاید اس نے ویڈیو ہٹا دی یا ڈیلیٹ کر دی۔" وہ پریشانی کے عالم میں بولی۔

"تم تصاویر کھول کر دیکھو، شاید ان سے ہی کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔" انہوں نے اسے مشورہ دیا۔ ان کے لہجے

سی امید تھی۔

☆☆☆

رخسانہ اسپتال میں پہنچ چکی تھی۔ اسے حسنات کے والد کے دوست نے بتا دیا تھا۔ وہ سارا راستہ روتی ہوئی آئی تھی۔ اسے لوگ انور کو ایمرجنسی میں لے گئے تھے۔ ان سے اسے پتا چلا تھا کہ انور ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔

"اس کے ساتھ کیا ہوا تھا، یہ کوئی نہیں بتا سکا۔ میں گلی سے گزر رہا تھا کہ میں نے اسے گلی میں بے ہوش پڑے دیکھا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ الٹا پڑا تھا۔ میں اسے کوئی اجنبی سمجھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا تو وہ انور تھا۔ اس کی موٹر سائیکل بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ میں نے چند اور لوگوں کو آواز دی اور ہم سب اسے ادھر لے آئے۔"

اس کے ایک پڑوسی نے اسے تفصیل بتائی۔ وہ ڈاکٹر سے ملی تو اس نے بتایا کہ "آپ بس دعا کریں۔ اس کے دماغ پر چوٹ لگی ہے۔ اگلے چند گھنٹے میں وہ ہوش میں نہ آیا تو وہ کومے میں جا سکتا ہے۔"

وہ رخسانہ کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کا کل اثاثہ۔ وہ رو رو کے اس کی صحت یابی کے لیے دعا مانگنے لگی۔

اس کی دعا کچھ رنگ لے آئی۔ وہ دو گھنٹے بعد ہوش میں آ گیا۔ مگر وہ کچھ بول چال نہیں رہا تھا بس خالی خالی نظروں سے سب کو دیکھے جا رہا تھا۔

ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ اس کے چند ٹیسٹ لیے گئے ہیں، ان کی رپورٹ دیکھ کے ہی اس کی حالت کے بارے میں وہ درست بتا سکیں گے۔

وہ ایک بار پھر دعائیں مانگنے لگی۔ ٹیسٹ کی رپورٹس آ گئیں مگر ڈاکٹرز اسے کچھ بتا نہیں سکے تھے۔ اس نے پوری رات جاگتے اور دعائیں مانگتے گزار دی۔

اگلے دن ایک نیورو سرجن نے انور کی رپورٹس دیکھ کے رخسانہ کو بلایا۔

اس نے انور کی حالت کے بارے میں اسے تفصیل سے بتایا۔ اس نے کئی مشکل میڈیکل اصطلاحات استعمال کیں۔ رخسانہ کو بس اتنی ہی سمجھ آئی تھی کہ اس کا دماغ چوٹ لگنے سے شدید متاثر ہوا ہے۔ اب وہ شاید ساری زندگی ٹھیک نہ ہو پائے۔ وہ یہ سب سن کے رونے لگی۔ وہ جو بڑھاپے میں اس کا واحد سہارا تھا، اب خود سہارے کے لیے اس کا محتاج بن چکا تھا۔

خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ انور نے جس شاطر دماغ کے ساتھ حسنات کو پھنسانے کا منصوبہ بنایا تھا، اب وہ کسی کام کا نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

فرحین نے تصاویر والا فولڈر اوپن کیا۔ شروع کی تصاویر میں حسنات لاش کے قریب جھکا لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ پس منظر اس کے اپنے کمرے کا لگ رہا تھا۔

"یہ تو حسنات کا اپنا کمرا لگ رہا ہے۔" حسنات کے والد بولے۔ ان کے لہجے میں تشویش تھی۔ انہیں نہیں پتا تھا کہ انور نے حسنات کو پھنسانے کے لیے اپنے گھر کے ایک کمرے کو حسنات کے کمرے کا رنگ دے دیا ہے۔

فرحین کو بھی باقی ساری کہانی کا تو پتا تھا مگر کمرے کے متعلق اسے بھی علم نہیں تھا۔ وہ بولی۔ "اس نے شاید فوٹو شاپ کی مدد سے ان تصاویر میں حسنات کے کمرے کا بیک گراؤنڈ دیا ہے۔" مگر آگے آنے والی تصاویر نے اس کے خیال کی تردید کر دی۔ اگلی تصویر میں حسنات اپنی گاڑی کی ڈگی میں لاش رکھ رہا تھا۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

یہ تصاویر دیکھتے ہوئے سب کے چہروں پر جوش کے تاثرات نمایاں ہوئے۔ ان میں ایک تصویر ایسی تھی جس کے بیک گراؤنڈ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ تصویر انور کے گھر کی ہے۔ باقی تصاویر "کراپ" کی ہوئی تھیں۔ ان میں بس حسنات گاڑی میں لاش رکھتا نظر آ رہا تھا۔ ان کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے تصاویر "کراپ" کر کے شاید ڈیلیٹ کر دی تھیں اور یہ تصویر شاید غلطی سے بچ گئی تھی۔

فرحین نے اپنی یو ایس بی کمپیوٹر کے ساتھ اٹیچ کر کے یہ تصویر اس میں کاپی کر لی۔ اچانک اس کی نظر اپنی یو ایس بی میں موجود ایک سافٹ ویئر پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی در آئی۔ یہ کمپیوٹر سے ڈیلیٹ شدہ ڈیٹا ریکور کرنے کا سافٹ ویئر تھا۔ اس نے ایک امید کے سہارے سافٹ ویئر کمپیوٹر میں انسٹال کیا۔ اس کے بعد اس نے سافٹ ویئر کو ڈیٹا ریکور کرنے پر لگا دیا۔ اس کے چہرے پر تناؤ کے تاثرات تھے۔ اس نے حسنات کے والدین کو بتایا کہ وہ اب کیا کر رہی ہے۔ ان کے چہروں سے بھی بے چینی کا اظہار ہو رہا تھا۔

کچھ دیر میں ہی ڈیٹا ریکور ہو گیا۔

فرحین نے صرف تصاویر اور ویڈیوز ہی ریکور کی

تھیں۔ زیادہ تر ویڈیوز گانوں اور بیہودگی پہ مشتمل تھیں۔ ان میں سے ایک ویڈیو نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ ویڈیو "اپنی ہنرا ویڈیو" کے نام سے محفوظ کی۔ اس نے بے تابی سے ویڈیو چلائی۔ ویڈیو کا پہلا سین ہی دیکھ کر کمرے میں موجود تینوں نفوس اپنی جگہ پر اچھل پڑے تھے۔ یہ وہی ویڈیو تھی جس کی انہیں تلاش تھی۔

ویڈیو میں آوازیں بھی واضح طور پر ریکارڈ ہوئی تھیں۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے انور نے حسنات کو اس شخص کے قتل کی کہانی سنائی تھی۔ کہانی درست تھی یا غلط اس کے متعلق تو وہ کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ ان کے لیے یہی بات کافی تھی کہ انور اس شخص کے قتل کا اعتراف کر رہا تھا۔

☆☆☆

اشتیاق احمد ویڈیو دیکھ کے بہت خوش ہو رہے تھے۔ وہ ویڈیو دیکھتے ہی بولے۔ "اب حسنات سے قتل کا کیس تو خارج ہو جائے گا البتہ ثبوت جرم کی سزا اسے بھگتنی ہو گی۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے کم سزا ہو۔"

دو دن بعد ہی کیس کی پہلی پیشی تھی۔ پولیس کا انکوائری آفیسر بولا کہ اس کیس میں مجرم کو قتل کی سزا دی جائے کیونکہ سب ثبوت حسنات کے خلاف تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے قتل کا اعتراف بھی کر لیا تھا مگر جب حسنات نے اپنا بیان ریکارڈ کرایا تو وہ قتل کے الزام سے مکر گیا تھا بلکہ عدالت کو وہی اور یہی کہانی سنا رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب اسے نئے سرے سے پیش کرنا ہو گی۔

اشتیاق احمد نے حسنات سے اپنی کی تصدیق کے لیے ویڈیو پیش کر دی۔ ویڈیو دیکھ کے جج نے پولیس کو انور کی گرفتاری کا حکم دیا۔ یہ پیشی اسی حکم کے ساتھ ختم ہوئی تھی۔

اگلی پیشی میں پولیس نے انور کا ذہنی معذوری کا سرٹیفکیٹ پیش کر دیا۔ ڈاکٹرز نے اسے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ اس پہ مقدمہ نہیں چل سکتا تھا۔ اس پیشی میں حسنات پر سے قتل کا کیس خارج کر دیا گیا۔ البتہ اعانت جرم کا الزام اس پر لگا تھا جس کا اس نے خود بھی اعتراف کیا تھا اور ویڈیو سے بھی یہ ثابت ہو رہا تھا۔ اسے ایک سال کی سزا دی گئی۔

حسنات کو اس سارے چکر میں ایک بہت بڑا سبق ملا تھا۔ آج کے دور میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے دوستوں، رشتے داروں کی مدد کرتے ہوئے جائز ناجائز

عورت

کراچی کی شاہراہ فیصل پر رات گئے اب روزی چڑیل کی جو دال کوٹھی کے قریب کبھی کبھی نمودار ہوتی ہے۔ چڑیل اس وقت اپنے اصل روپ میں تھی۔ اس پر جھریاں ہو گئی۔ "بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے خود سے بیس برس چھوٹی بیوی دلا دو۔"

چڑیل نے چٹکی بجا کر کچھ بول پڑھے اور اس شخص کی عمر میں یک دم بیس برس کا اضافہ ہو گیا۔ اس کی ہم سن بیوی اس سے بیس برس چھوٹی ہو چکی تھی۔

"آخر چڑیل بھی تو ایک عورت ہی ہے۔" اس نے بے بسی سے سر جھکا کر سوچا۔ "اپنی ہی صنف کی حمایت کرے گی۔"

کراچی سے ولید جانی کا تعاون

کی چیز بھول جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک سب سے اہم چیز تعلق ہوتا ہے۔ وہ غلط کام نہیں کرتے مگر اپنے احباب کی غلط کاموں میں بھی مدد کر دیتے ہیں اور اسی موقع سے بیچارے میں کر پھنس کو بھگتنا پڑتا ہے۔ حسنات نے سوچ رکھا تھا کہ اب کسی کی بھی آگے اس نے زندگی میں مدد کی تو صرف جائز کام میں کرے گا۔ ناجائز کام میں نہیں۔

☆☆☆

حسنات جیل سے چھوٹ کے آیا تو اس نے اپنے والد کا بزنس جوائن کر لیا۔ چند ماہ بعد ہی اس کی فرحین سے شادی ہو گئی۔ فرحین نے اس کے لیے جو کچھ کیا تھا اس کے بعد اس کے دل میں اس کے لیے بے پناہ محبت پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے تو وہ بار بار اس کی کالز اور میسجز سے تنگ ہو جاتا تھا مگر اب وہ آفس میں کوئی انتہائی ضروری کام بھی کر رہا ہوتا تو سارے کام چھوڑ کے اس کی کال اٹینڈ کر کے اس سے باتیں کرنے لگتا۔

اس کے آفس میں کام کرنے والے ایک ملازم کو فالج کا اٹیک ہوا تھا وہ اسپتال میں داخل تھا۔ حسنات اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کی عیادت کے لیے اسپتال گیا۔ وارڈز کی طرف جانے والا راستہ او پی ڈی سے ہو کے گزر رہا تھا۔ وہ ابھی او پی ڈی کے دروازے سے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ اس کی نظر انور پر پڑی وہ وہیل چیئر پر تھا۔ دبلا پتلا تو وہ پہلے بھی تھا مگر اب وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا۔ وہ اسے پہلی نظر میں پہچان ہی نہیں سکا۔ اس کی ماں بھی اس کے پاس ایک بنچ پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر برسوں کی تھکن نظر آرہی تھی۔ وہ شاید ڈاکٹر کے پاس آئے تھے اور اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ حسنات انہیں دیکھ کے تیزی سے ان کی طرف لپکا۔

جیل سے واپس آنے کے بعد اسے انور کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اسے مقدمے کے دوران ہی پتا چلا تھا کہ انور سر میں چوٹ لگنے کی وجہ سے ذہنی طور پر معذور ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے اس پر مقدمہ بھی نہیں چلا تھا۔ بعد میں تہمینہ نے اسے اس کے متعلق ساری تفصیل بتادی تھی۔ آج اسے اس حال میں دیکھ کر اس کا دل کٹ گیا۔

"کیسی ہیں آنٹی، اور کیا حال ہے انور کا؟" وہ ان کے پاس پہنچ کے مخاطب ہوا۔

"بس دیکھ لو اسے۔ تمہارے سامنے ہے۔ تم کب آئے؟" وہ شاید انور کے متعلق زیادہ بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے پتا لگ گیا تھا کہ انور نے قتل کے جرم میں حسنات کو پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ جس کی سزا اسے قدرت کی طرف سے ملی تھی۔

"مجھے تو کافی عرصہ ہو گیا جیل سے آئے۔ آپ یہاں؟ خیریت ہے نا؟"

"اسی کو چیک اپ کے لیے لائی ہوں۔ یہ روز بروز کمزور سے کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ بہت بے چین بھی رہتا ہے۔" وہ افسردگی سے بولی۔ "بیٹا تم اسے معاف کر دینا' میں جانتی ہوں اس نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا مگر اسے اپنے کرموں کی سزا مل رہی ہے۔" وہ رو پڑی تھی۔

حسنات تڑپ گیا۔ "کیسی بات کر رہی ہیں آنٹی۔ یہ میرا دوست ہے جس کے لیے تو میں نے اس کی خاطر قتل کا اعتراف تک کر لیا تھا۔ وہ تو بعد میں مجھے سب نے مجبور کیا اور اسی دوران انور بھی زخمی ہو گیا تو میں نے بیان بدلا تھا۔ میں نے تو اسی وقت اسے معاف کر دیا تھا۔"

ان کی بات سن کے اس کے چہرے پر شکر گزاری کے تاثرات ابھر آئے۔

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں کیا یہ ٹھیک نہیں ہو سکتا؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں... ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ اب کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اس کے دماغ کے اندر خون بہہ گیا تھا جس کے باعث اس کے دماغ کا وہ حصہ جو دماغ کے ارادی افعال کنٹرول کرتا ہے، نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ڈاکٹر اس بیماری کا ایک مشکل سا نام بتا رہے تھے جو مجھے ابھی یاد نہیں آرہا۔ تم اسے ایک طرح کا فالج سمجھ لو۔ اب یہ سن سکتا ہے، اس کے سامنے کوئی چیز رکھی جائے تو وہ دیکھ سکتا ہے، سوچ سکتا ہے مگر یہ اب خود سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔" اس نے ساری تفصیل بتائی۔

"پھر تو یہ کچھ بول بھی نہیں سکتا ہو گا؟"

"ہاں، یہ اپنی مرضی سے منہ تک نہیں کھول سکتا۔" وہ افسردگی سے بولی۔ "غذا اسے ڈرپ کی صورت میں دی جاتی ہے۔"

"اور وہ تو آپ اکیلے اس کی دیکھ بھال کیسے کرتی ہیں؟"

"تہمینہ کی شادی میں نے اپنی بہن کے بیٹے سے کر دی تھی۔ وہ اب ہمارے ساتھ رہتا ہے اسی کی مدد سے گزارا چل رہا ہے۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"میں اسے کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ کوئی تو علاج ہو گا اس کی بیماری کا۔"

"نہیں بیٹا، میں بہت سے بڑے ڈاکٹروں سے مشورہ کر چکی ہوں۔ کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی معذوری زندگی بھر اس کے ساتھ رہے گی۔ شاید اس کے باعث خدا اسے معاف کر دے۔"

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

حسنات انور کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ انور کی آنکھوں میں اسے آنسوؤں کی چمک نظر آئی۔ حسنات کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ وہ گمبھیر لہجے میں اس سے بولا۔ "میں نے تمہیں معاف کیا میرے دوست۔ خدا بھی تمہیں معاف کرے۔"

اسی لمحے دروازے پر کھڑے شخص نے انور کا نام پکارا۔ ان کی باری آگئی تھی۔

رخسانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بہت شکریہ بیٹا۔ بس تم ان کے لیے دعا کرنا۔" وہ یہ کہتے ہوئے انور کی چیئر دھکیلتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

حسنات ٹھہرا انہیں دیکھتا رہا۔